ہندوستان کی معاشی تاریخ

جلد اوّل

رمیش دت

ہندوستان کی معاشی تاریخ

1757 سے 1837

جلد اوّل

مصنّف

رمیش دت

مترجم

غلام ربّانی تاباں

ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی

بہ اشتراک

انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی

پہلا اُردو ایڈیشن —— 1000 — 1979ء —— 1900 (شک)

اُردو :- انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ ، نئی دہلی

THE ECONOMIC HISTORY
OF INDIA
VOLUME ONE
BY
ROMESH DUTT

قیمت: 18/75 روپے

اس کتاب کا اُردو ترجمہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی سے حاصل ہوا

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر بیورو فار پروموشن آف اُردو ، ویسٹ بلاک نمبر ۸ آر کے پورم نئی دہلی ۲۲ نے جے۔ کے آفسٹ پریس دہلی سے چھپوا کر ترقی اُردو بورڈ ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود ، نئی دہلی کے لیے شایع کیا۔

ہندوستان کی معاشی تاریخ

1757ء سے 1837ء

جلد اوّل

پیش لفظ

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچوں کے ادب، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقیِ اردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اب تک بچوں کے ادب کے علاوہ بہت سی نصابی، علمی، ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عباس شارب)
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومت ہند

فہرست

دیباچہ

بلاشبہ رمیش چندر دت اپنی نسل کے ہندوستانیوں میں ایک اہم شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے جو کام بھی شروع کیا اس میں اپنے لیے ایک راستہ بنایا اور فوری کامیابی حاصل کی۔ وہ اُن پہلے ہندوستانیوں میں سے تھے جنھیں ہندوستان کی سول سروس میں داخل ہونے کا موقع ملا اور سول سرونٹ کی حیثیت سے انھوں نے ہر کام میں یکساں طور سے کامیابی حاصل کی۔ وہ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز ہوئے اور چھبیس سال کام کرنے کے بعد جب وہ از خود ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو وہ ایک کمشنری کے قائم مقام کمشنر رہ چکے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ادبی شہرت کے خواہشمند تھے اور تمام عمر ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ملازمت کے دوران بھی ان کا فرصت کا وقت ادبی کاوشوں میں صرف ہوتا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف بنگالی ادب کی تاریخ تھی جو انگریزی میں لکھی گئی تھی لیکن انھوں نے بنگالی زبان میں بھی ادب کی تخلیق کی۔ پہلے انھوں نے کچھ تاریخی ناولیں لکھیں۔ اس کے بعد ایسی کہانیاں لکھیں جن میں عصری سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ انھوں نے رگ وید کا بنگالی میں ترجمہ کیا اور بنگال کی ادبی انجمن کے صدر کی حیثیت سے بیش بہا تنظیمی کام کیے۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں قدیم ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا اہم اور وقت طلب کام اپنے ذمہ لیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مصنف مغربی علوم کے ساتھ سنسکرت کے ادب سے بھی پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔ دت نے دکھا دیا کہ یہ دونوں اوصاف پوری طرح ان میں موجود ہیں۔ ان کی قدر و منزلت ہوئی۔ ان کے اس علمی کارنامے کی بڑی تعریف کی گئی جس کے ذریعے جدید ترین سائنسی تخلیق کی روشنی میں عام قاری کے لیے قدیم ہندوستان کی دلچسپ تصویر پیش کر دی گئی تھی۔

فرائض منصبی کی ادائیگی میں وہ جو کام اپنے ہاتھ میں لیا کرتے تھے اسے بہت سوچ سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ان کی سرکاری اور دوسری تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں بنگال کے کسانوں کے متعلق ایک مضامین کا سلسلہ تھا جو 1874ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ 1884ء کے ٹیننسی بل TENANCY BILL پر جس زمانے میں غور کیا جارہا تھا اس وقت انھوں نے بنگال کے لگان داری کے طریقے کے متعلق جو سرکاری رپورٹیں تیار کی تھیں وہ ان کی معلومات اور ہمدردی کے ثبوت فراہم کرتی تھیں۔ اور ان کی قدر و قیمت کو عام طور سے تسلیم کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے چوکیداری ایکٹ کے سلسلے میں گانو کی پنچایت اور پولیس کے متعلق اپنے خیالات کو ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا تھا۔

ان کی تمام سرگرمیوں کی محرک "وطن کی خدمت" تھی۔ دت کا خیال تھا کہ انیسویں صدی کے بنگال کی تمام ناقابل فراموش ادبی شخصیتوں کی سرگرمیوں کی جان یہ تصور تھا اور خود ان کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ ان کی تاریخی ناولوں، ان کی تاریخ تمدن ہند اور عظیم رزمیہ نظم کے ترجمے کا محرک یہ جذبہ تھا کہ ہندوستانیوں اور بدیسیوں کو ہندوستان کی بہترین میراث سے روشناس کرایا جائے۔ ہندوستان کے لوگوں سے ان کی گہری ہمدردی اور ان کی خوش حالی کی خواہش کے انعکاسات ECONOMIC HISTORY اور BENGAL PEASANTRY کے علاوہ ان سیاسی کاموں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں جو ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے انگلستان میں انجام دیے۔

یہ ظاہر ہے کہ وقت سے پہلے ملازمت سے علیحدگی کے جو بھی اسباب تھے ان میں سب سے زیادہ سبب یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور معاشی مسائل پر عام مباحث میں موثر انداز سے حصہ لے سکیں۔ ملازمت سے علیحدگی کے بعد کے زمانے میں انھوں نے ادبی سرگرمیوں کے بجائے سیاسی کاموں اور معاشی تحریروں میں زیادہ وقت صرف کیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی مال گزاری کے بندوبست اور قحط کے سلسلے میں نزاعی امور پر لارڈ کرزن سے بحث کی۔ اکنامک ہسٹری Economic History کی دو جلدیں مکمل کیں ہندوستان کی طرف سے انگلستان میں اہم سیاسی کام کیے جس میں کچھ مدت تک دادابھائی نوروجی، ڈبلو۔ سی بنرجی وغیرہ کا تعاون انھیں حاصل رہا اور اس کے بعد گوکھلے کا تعاون انھیں حاصل ہوا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی گیکواڑ ان کی خدمات حاصل کرسکا جس کی وجہ سے بروڈا کے نظم و نسق میں اصلاحات ہوئیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے لامرکزیت سے متعلق رائل کمیشن Royal Commission on Decentralisation کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کی

بڑی مصروف زندگی تھی۔ طرح طرح کی سرگرمیوں کی زندگی جو نہایت سودمند تھی۔ ان کی زندگی کا بنیادی اصول ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ انتہائی ذہین ہونے کے ساتھ جفاکش بھی تھے۔ وہ علم کے ساتھ حقائق کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ مصلحت وا عتدال کے ساتھ وہ جذبات کی شدت اور ہمہ گیر ہمدردی سے بھی عاری نہیں تھے۔

2

پچیس سال کی ملازمت کے بعد دت نے 1896ء میں پنشن لے لی۔ کئی سال تک وہ اور ملازمت کر سکتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ غیر متوقع بھی تھا اور عام دستور کے خلاف بھی۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ دو اسباب نے دت کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ ان کی ادبی امنگ اور سیاسی کام کرنے کے لیے زیادہ آزادی کی خواہش۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انگلستان میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ کر یہ دونوں مقصد حاصل کر سکیں گے اور ملازمت سے علیحدگی کے بعد انھوں نے انگلستان میں بود باش اختیار کرلی۔ ان کے سوانح نگار کا خیال ہے کہ انگلستان میں ان کے مشن کے خاص خاص مقصد مندرجہ ذیل تھے:۔

1. انگلستان میں ایسے انگریزوں کی ایک جماعت کی تنظیم کرنا جو ہندوستان سے ہمدردی رکھتے ہوں۔
2. ہاؤس آف کامنز کے اہم اراکین کے ذریعہ برطانوی پارلیمنٹ پر اثر ڈالنا۔
3. برطانیہ کے عام لوگوں اور خاص طور سے وہاں کے جمہوری اداروں کو ہندوستانی موضوعات کے متعلق معلومات فراہم کرنا اور ان کی ہمدردی و حمایت حاصل کرنا۔
4. ادبی تخلیقات اور تاریخی تحریروں کے ذریعہ یورپ کی وسیع تر دنیا سے اپیل کرنا۔

1904ء میں بروداآنے سے پہلے انھوں نے 1897ء سے 1904ء تک تقریباً سات سال انگلستان میں گزارے۔ 1897ء میں لندن کے یونیورسٹی کالج میں ان کا تقرر تاریخ ہند کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا تھا اور اس طرح انھوں نے تقریریں کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم اور تاریخ کے عالمانہ مطالعہ کے لیے ایک محرک مل گیا تھا۔ 1898ء اور 1899ء میں دت نے زیادہ وقت مہابھارت اور رامائن کے ترجمے میں صرف کیا اور دسمبر 1899ء میں انھوں نے لکھنؤ میں منعقد ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی۔ 1897ء ہی میں انھوں نے ہندوستان کے قحطوں کے متعلق ایک مضمون لکھ کر جو فارٹ نائٹلی ریویو ...... FORTNIGHTLY REVIEW میں شائع

ہوا تھا اور ENGLAND & INDIA کے عنوان سے ایک تاریخی خاکہ تصنیف کرکے جو 1757ء سے 1857ء تک کے سوسال کی ترقی کا ریکارڈ کے ذیلی عنوان کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اپنی آئندہ سرگرمیوں کی نشاندہی کردی تھی۔ اس کتابچے میں آئندہ لکھی جانے والی اکنامک ہسٹری کی خاص خاص باتیں جزوی طور سے دی گئی ہیں۔ حالانکہ معاشی تاریخ کے متعلق اس میں براہ راست کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں برطانوی ہند کی پالیسی اور برطانیہ کی گھریلو سیاست کی نشوونما کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ برطانوی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے دت نے ہندوستان کی غربت اور قحطوں پر زور دیا ہے اور انھیں غیرضروری برطانوی اخراجات کا نتیجہ بنایا ہے جو عام لوگوں کی تباہی کے باعث تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ انتظامیہ عام لوگوں سے رابطہ قائم کرے۔ ان کے جذبات وخواہشات کی نمائندگی کرے اور ان کا تعاون وہمدردی حاصل کرے۔

1900ء کے ابتدائی مہینوں میں دت نے مختلف ہندوستانی صوبوں میں مال گزاری کے بندوبست کے متعلق لارڈ کرزن کو کھلی چٹھیاں لکھی تھیں۔ اسی سال کے آخری مہینوں میں انھوں نے ایک کتاب شائع کی تھی جو ان کھلی چٹھیوں کے علاوہ ایسے مضامین پر مشتمل تھی جو قحطوں اور ہندوستان میں مال گزاری کی تشخیص کے متعلق لکھے گئے تھے۔ دسمبر 1900ء میں انھوں نے ہندوستان کے کئی سابق انگریز حکام کا تعاون حاصل کیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو ایک مشترک یادداشت پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں مال گزاری کی تشخیص پر معقول بندشیں عائد کی جائیں۔ سابق ملازمین کی اس اہم عرضداشت کا جواب حکومت ہند کو دینا پڑا۔ یہ جواب ہندوستان میں مال گزاری کی پالیسی کے متعلق لارڈ کرزن کی مشہور تجویز کی صورت میں دیا گیا جو 1902ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان واقعات کے سیاق وسباق میں اکنامک ہسٹری لکھی گئی۔ انگلستان کے دوران قیام دت ہندوستان کے حالات پر تقریریں کرنے اور مضامین لکھنے میں مصروف رہے۔ ان تقریروں اور تحریروں کے موضوعات ان کی خاص خاص دلچسپیوں اور انداز فکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1901ء اور 1902ء کی تقریریں اور تحریریں ہندوستان کے معاشی حالات، قحط اور اراضی کے مسائل کے علاوہ کاشتکاری اور صنعتوں کے موضوعات پر ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر تحریروں اور تقریروں میں اس نامکمل مواد کی ابتدائی شکل دیکھی جاسکتی ہے جو اکنامک ہسٹری میں شامل کیا گیا۔

اکنامک ہسٹری آف انڈیا..... ECONOMIC HISTORY OF INDIA (دو ضخیم جلدوں

صنعتوں، کاروباروں اور حرفتوں کی واضح تاریخ ہے۔ آراضی کے بندوبستوں کی تاریخ کے متعلق یہ حرفِ آخر ہے۔ سرکاری حوالوں کے علاوہ آج لارڈ کرزن کی آراضی کی تجویز کو کوئی مشکل ہی سے پڑھتا ہوگا مسٹر رمیش دت کی اکنامک ہسٹری کے دو یا تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہر وہ ہندوستانی جو ہندوستان کے معاشی حالات میں اور یہاں کے لوگوں کی تاریخ میں دلچسپی رکھتا ہے اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔"

اگر کوئی تاریخی تصنیف بنیادی طور سے ماضی کو عصری حالات سے مربوط کرے تو اس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہوا کرتی ہے۔ حقیقت میں اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا ہے کہ بار بار تاریخ لکھنے کا جواز یہ ہے کہ ماضی یا ماضی کے کچھ حصوں کی تعبیر تو اس طرح کی جائے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے بامعنی بن جائیں۔ عصری حالات سے دت کی تاریخ کے گہرے ربط نے ان حالات کے متعلق دت کے تصورات اور ان کے تاریخی ارتقا کے متعلق مصنف کے خیالات کو سمجھنے کے لیے نہایت کار آمد بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے تناظر کو نہایت عمدگی سے پیش کرنے کا نمونہ مختلف کتابوں کے پیش لفظ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں کے کچھ ٹکڑے ذیل میں یکجا کر دیے گئے ہیں تاکہ ایک اجمالی خاکہ بن جائے

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے معاشی حالات پر قحطوں کے گہرے سائے پڑ رہے تھے۔ دت نے ...... ENGLAND AND INDIA کے پیش لفظ کے ابتدائی جملوں میں جو تصویر پیش کی ہے اس سے ان حالات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

" دنیا کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی برطانوی سلطنت کے لیے یہ سال مسرت کا سال تھا، لیکن ہندوستان کے لیے انگریزی راج قائم ہونے کے بعد یہ سب سے تباہ کن سال تھا۔ طاعون نے ایک صوبے کے قریب قریب سبھی بڑے شہروں کو ویران کر دیا۔ ایک دوسرے صوبے کے شہروں اور قصبوں کو ایک تباہ کن زلزلے نے برباد کر ڈالا اور ایک ایسے قحط نے جس کی وسعت کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تباہی مچا دی۔

لیکن 1897ء کا قحط تو قحطوں کے اس سلسلے کی ایک کڑی تھا جو موجودہ صدی میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہندوستان میں پڑتے رہے تھے۔ یورپ کی حد تک قحط داستان پارینہ بن گئے ہیں لیکن ہندوستان میں ہر نسل، بیس سال کی مدت، اپنے دکھوں کی ایک کہانی سنا سکتی ہے۔ ملکہ کی تخت نشینی کے سال میں ایسا شدید قحط پڑا کہ شمالی ہند تباہ ہو گیا۔ قحط کے شکار ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی۔ اگلے بیس سال کی مدت کا آغاز اس سال ہوا جس سال ہندوستان میں بغاوت ہوئی تھی۔ اس میں تین قحط پڑے۔ شمال۔ مغرب کا قحط، اڑیسہ کا قحط اور بہار کا قحط۔ جس

میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد *The Economis History of India*
Under Early British Rule کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ دسمبر 1901ء میں لکھا گیا تھا اور دوسری
جلد THE ECONOMIC HISTORY OF INDIA IN THE VICTORIAN AGE کے پہلے ایڈیشن
کا پیش لفظ دسمبر 1903ء میں لکھا گیا تھا۔ دونوں جلدوں کے دوسرے ایڈیشنوں کے پیش لفظ اگست 1906ء
میں لکھے گئے تھے۔ دت کا انتقال نومبر 1909ء میں ہوا۔ ان کی زندگی میں اکنامک ہسٹری کا کوئی اور ایڈیشن
شائع نہیں ہوا۔ دوسرے ایڈیشنوں کے پیش لفظوں میں معمولی اصلاحوں اور دونوں جلدوں میں تھوڑی
بہت ردوبدل کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں 1901ء
اور 1903ء کی درمیانی مدت کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

دت کے کام کی اہمیت کو اور اکنامک ہسٹری کے اثر کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف تھی جو حاکم رہ چکا تھا، وسیع تجربہ رکھتا تھا اور معاشی پالیسی اور سیاسی اصلاحات کے متعلق اپنے تصورات کو تسلیم کروانے کے لیے عملی سیاسی جدوجہد میں حصہ لے رہا تھا اس لیے تاریخ کی تصنیف لازمی طور سے عصری معاشی حالات اور ان کے نشوونما پانے کے انداز کے متعلق دت کے تصورات سے متاثر ہوئی۔ دت* کے بہت سے ہم عصروں نے اس تاریخ کو سیاسی جدوجہد کا حصہ سمجھا۔ دت کی زندگی میں ان کی سوانح حیات کا ایک چھوٹا سا خاکہ شائع ہوا تھا۔ اس کا مندرجہ ذیل اقتباس اس نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

"اگر لارڈ کرزن سمجھتا تھا کہ اس مشہور نزاعی مسئلے پر وہ کوئی مسکت دلیل پیش کرسکے گا تو اس نے اپنے مخالف فریق کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ کھلی چٹھیوں کو شائع کرنے اور یادداشت پیش کرنے کے بعد مسٹر رمیش دت ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہے۔ انھوں نے جو کام ہاتھ میں لیا تھا اس میں اپنی تمام قوت لگادی۔ ہندوستان میں برطانوی راج کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک تمام نیلی کتابوں BLUE BOOKS کا ایک بڑا ذخیرہ انھوں نے جمع کرلیا تھا جو دو سو سے زیادہ مجلد ضخیم کتابوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ان بیش بہا معلوماتی کتابوں کو کھنگال ڈالا۔ مال گزاری کے بندوبست نسخوں اور ہندوستان کی مالیات کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور ایک جامع اکنامک ہسٹری آف انڈیا تیار کی جو جنگ پلاسی سے لے کر بیسویں صدی کی ابتدا تک کی مدت پر حاوی تھی۔ یہ اہم کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد 1902ء میں چھپی اور دوسری 1904ء میں۔ یہ کتاب مسٹر رمیش دت کی مستقل مزاجی، محنت اور ادبی صلاحیتوں کا شاہکار ہے۔ یہ ہندوستان کی

سال ملکہ نے ملکۂ ہند کا لقب اختیار کیا اس سال مدراس میں خوفناک قحط پڑا جس میں جنوبی ہند کے پچاس لاکھ انسانوں کی جانیں گئیں۔ بدقسمتی سے ملکہ کی تاج پوشی کے ساٹھویں جشن کے سال میں ہندستان میں ایک اور قحط پڑا ہے جس کی زد پر ہندوستان کا بڑا حصہ آگیا ہے اور خیال ہے کہ لوگوں کو سہولت پہنچانے کی کوششوں کے باوجود لاکھوں انسان اس کے شکار ہو جائیں گے۔ جدید ہندوستان کی تاریخ میں 1837ء، 1857ء، 1877ء اور 1897ء سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترقی اور خوشحالی کے بجائے تباہی اور بربادی کے سنگ میل۔"[1]

دت غربت اور ترقی نہ کرنے کے اسباب معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ مکمل صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے انھوں نے مندرجہ ذیل سوال اٹھائے۔

"کیا کاشتکاری کے میدان میں ترقی ہو رہی ہے؟ کیا صنعت وحرفت فروغ پا رہے ہیں؟ کیا مالیات کا مناسب انتظام کیا جا رہا ہے تاکہ محصول ادا کرنے والوں کو اس کا موزوں معاوضہ مل جائے؟ کیا عام لوگوں کی مادی خوش حالی کی خواہشمند حکومت قومی دولت کے وسائل کو توسیع دے رہی ہے۔ جب ایک عام انگریز کسی ملک کی معاشی حالت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس قسم کے سوالات اٹھایا کرتا ہے۔ ہندوستان کے حقیقی حالات معلوم کرنے کے لیے بھی اس قسم کے سوالات کرنے پڑیں گے۔"[2]

دت نے اپنی تاریخ کی دونوں جلدوں میں اس قسم کے سوالوں کے جواب وضاحت کے ساتھ دیے ہیں۔ دونوں جلدوں کے پیش لفظوں میں ان کی تلخیص پیش کی گئی ہے جن کے مختصر اقتباسات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

"کسی قوم کی دولت کے ذرائع کاشت، صنعت وحرفت اور صحت مند مالیاتی نظام ہوا کرتے ہیں۔ انگریزی راج نے ہندوستان کو امن وچین کی دولت بخشی لیکن اس نے ہندوستان کی قومی دولت کے ذرائع کو نہ تو ترقی دی اور نہ ان کی توسیع کی۔"

"اس وقت تجارت اور صنعتوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دوسری کتاب میں (INDIA UNDER EARLY BRITISH RULE 1757-1837) اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدائی برسوں میں ہندوستان کے تعلق سے حکومت برطانیہ کی تجارتی پالیسی کا جائزہ لیا ہے۔ اس

---

[1] Dutt, England and India (1897) Preface

[2] Dutt Economic History of India, Under Early British Rule, Preface

زمانے میں حکومت برطانیہ نے آئرلینڈ اور نوآبادیوں کے تعلق سے جو پالیسی اپنائی تھی اس کا اطلاق ہندوستان پر بھی کیا گیا۔ کوشش کی جاتی تھی کہ ہندوستانی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات حاصل کریں۔ یہ پالیسی کامیاب اور ہندوستان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ امتناعی محاصل عائد کر کے یورپ میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کو ختم کر دیا گیا اور برائے نام محاصل لگا کر برطانوی مال کی ہندوستان کو برآمد کی ہمت افزائی کی گئی۔ انگلستان کی ابتدائی تجارتی پالیسی کے دو مقصد تھے۔ برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال ہندوستان میں پیدا کیا جائے اور برطانوی مصنوعات کی ہندوستان میں کھپت ہو۔ 1837ء میں جب ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی..... اس وقت بھی سابقہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی...... ڈیڑھ صدی تک ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی تجارتی پالیسی کا تعین ہندوستانی صنعت کاروں کے مفاد کے بجائے برطانوی صنعت کاروں کے مفاد کی بنا پر کیا جاتا رہا۔"[1]

"اب لے دے کے صرف کاشت ہندوستان کی قومی آمدنی کا ذریعہ رہ گئی ہے اور ہر پانچ میں سے چار ہندوستانی کاشت پر انحصار کرتے ہیں لیکن برطانوی حکومت کا عائد کردہ اراضی کا محصول نہ صرف بہت زیادہ ہے بلکہ اس کی بڑی خرابی یہ ہے کہ بہت سے صوبوں میں یہ بدلتا رہتا ہے اور غیر یقینی ہوتا ہے..... ہندوستان میں ریاست نے لوگوں کے لیے نہ جدید صنعتیں شروع کیں ہیں اور نہ قدیم صنعتوں کی تجدید کی ہے۔ اس کے برخلاف حکومت ہر نئے بندوبست میں دخل اندازی کرتی ہے اور زمین کی پیداوار کا وہ حصہ لے لیا کرتی ہے جس کو وہ اپنا سمجھتی ہے۔"[2]

"ایک ہندوستانی شاعر نے کہا ہے کہ بادشاہ کے عائد کردہ محاصل زمین کا وہ نم ہے جس کو سورج پی جاتا ہے اور زرخیز بنانے والی بارش کی صورت میں زمین کو واپس کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی زمین کا نم ہندوستان کے بجائے دوسرے ملکوں پر برستا ہے اور انھیں زرخیز بناتا ہے۔"[3]

"چالیس سالہ زمانہ امن میں..... ہندوستان کا قرض برابر بڑھتا رہا اور اب (1901ء) 200,000,000 پاؤنڈ ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی قومی آمدنی سے جو رقم "گھریلو اخراجات" کے

---

[1] ECONOMIC HISTORY OF INDIA IN THE VICTORIAN AGE PREFACE

[2] ECONOMIC HISTORY OF INDIA UNDER EARLY BIRTISH RULE PREFACE

[3] ایضاً

لیے ہر سال انگلستان بھیجی جاتی ہے وہ بڑھ کر سولہ ملین ہو چکی ہے۔ ان یورپی حاکموں کی مجموعی تنخواہ دس ملین ہو جاتی ہے جو قریب قریب سب اعلیٰ عہدوں پر فائض ہیں۔ اس طرح ہندوستان کی خالص آمدنی کا نصف حصہ جو اس وقت چوالیس ملین پونڈ ہے۔ ہر سال ہندوستان کے باہر چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کا نم دوسرے ملکوں کی خوش حالی اور زرخیزی کا باعث بن رہا ہے۔"[1]

"ایک ایسے شخص کے لیے جس نے اپنی زندگی کے بہترین اور آسودہ ترین سال ہندوستانی انتظامیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے گزارے ہوں۔ یہ کام نہ صرف تکلیف دہ بلکہ احسان فراموشی کے مترادف ہے کہ اسے انتظامیہ کے کمزور پہلوؤں یعنی حکومت ہند کی مالیاتی اور معاشی پالیسی کا تذکرہ کرنا پڑے۔ برطانوی ہند کی معاشی کہانی سنانے اور ہندوستان کی شدید افلاس کی توجیہہ کرنے کا وقت آگیا ہے اس لیے میں یہ ناگوار فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کسی ملک میں اس قسم کے حالات پیدا کر دیجیے کہ اس کی صنعتیں تباہ ہو جائیں، اس کی زراعت پر غیر یقینی محاصل عائد کر دیے جائیں اور وہاں اس قسم کا مالیاتی نظام قائم کر دیا جائے کہ اس کی آدھی آمدنی ہر سال ملک کے باہر چلی جایا کرتی ہے تو دنیا کی خوش حال ترین قوم کو بھی جلد قحطوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔"[2]

چنانچہ دت نے اس وقت کے حالات کی تصویر پیش کی، ان کا تجزیہ کرنے کے لیے ضروری سوالات اٹھائے اور ان سوالوں کے ایسے جواب دیے جن سے حالات کے تاریخی ارتقاء کی توضیح کی جا سکے۔ تاریخی تحریروں کو عصری مسائل سے اس طرح مربوط کر کے ان کے حل تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کے اقدام کی واضح نشان دہی دت نے مندرجہ ذیل انداز میں کی۔

"ہر خرابی میں اس کے تدارک کی صورت مضمر ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان کی مشینی صنعتوں پر عائد کیے جانے والے اکسائز کے محاصل ختم کر دیے جائیں اور جس طرح ہر متمدن حکومت اپنے ملک کی صنعتوں کی مدد کرتی ہے، ہندوستان کے لوگوں کی بھلائی کے پیش نظر ہندوستان کی حکومت کو جرأت کے ساتھ ہندوستانی صنعتوں کی امداد کرنی چاہیے۔ مال گزاری کے علاوہ آراضی کے تمام محاصل منسوخ کر دیے جائیں اور مال گزاری کی تشخیص میں اعتدال کے ساتھ ضبط و نظم سے بھی کام لیا جانا چاہیے۔ قومی قرض چاہے ابتدا میں غیر منصفانہ ہو مگر اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے۔ پھر بھی

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً

شہنشاہی ضمانت کی بنا پر سود کی شرح میں کمی کی جاسکتی ہے اور ایک ذخیرہ ادائی کے ذریعے رفتہ رفتہ اس کا حجم کم کیا جاسکتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والے سول اور فوجی اخراجات انگلستان کو برداشت کرنے چاہئیں یا کم از کم جس طرح وہ نوآبادیات کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرتا ہے ویسے ہی اس کو ہندوستان کے اخراجات کا حصہ رسدی بار اٹھانا چاہیے۔ زیادہ ہندوستانیوں کو ملازمتیں دے کر ہندوستان کے سول اخراجات میں کمی کی جانی چاہیے۔ ہندوستان کے فوجی اخراجات کو سختی کے ساتھ کم کیا جانا چاہیے اور ہندوستان میں صرف ضرورت کے مطابق فوج رکھنی چاہیے۔ سرکاری قرضوں یا اس سود کی بنا پر جس کی ضمانت ہندوستانی محاصل کی بنیاد پر کی جائے۔ ریلوں کی مزید توسیع کی ممانعت کر دینی چاہیے۔ عام محاصل سے حاصل ہونے والے روپے سے آب پاشی کے ذرائع کو توسیع دی جانی چاہیے۔ ہندوستان سے سالانہ دولت کے نکاس کو رفتہ رفتہ کم کرنا چاہیے۔ ان مالیاتی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے ہندوستان کے لوگوں کے نمائندوں کا یعنی محصول دہندگان کے نمائندوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے اور ان سے مدد لینی چاہیے جو دنیا کے ہر ملک میں اخراجات کی کمی کے مسئلے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"[لے]

3

دت کی اکنامک ہسٹری ایک مستند کتاب ہے۔ خاص طور سے ابتدائی زمانے کی تاریخ کے لیے پارلیمانی دستاویزات کے بڑے ذخیرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ دت نے بھی محسوس کیا کہ ہندوستان کی حکومت کمپنی سے شاہ انگلستان کو منتقل ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کے نظم ونسق کے متعلق پارلیمنٹ کی اس تحقیق و تفتیش کا سلسلہ منقطع ہوگیا جو کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت کی جاتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہونے والی اس تفتیش کے نتیجہ اور دوسری معلومات جو وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ سے حاصل ہوتی رہتی ہے، ایک بڑے ذخیرے کی صورت اختیار کر چکی تھی اور دت نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دت کی تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ رپورٹوں اور شہادتوں کے طویل اقتباسات دیے گئے ہیں۔ دت نے رپورٹوں، مراسلوں اور شہادتوں کے جو اقتباسات دیے ہیں ان کے سلسلے میں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اکنامک ہسٹری لکھتے وقت دت کے ذہن میں زیادہ تر انگریز قاری تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا کیس پیش کرتے وقت انگریز حکام کی کہی ہوئی باتوں

ECONOMIC HISTORY OF INDIA IN THE VICTORIAN AGE. PREFACE [لے]

کے اقتباسات کو بنیاد بنایا چاہے وہ بیانات سرکاری تھے یا غیر سرکاری۔

دت نے خصوصیت کے ساتھ اپنی پہلی جلد میں جو مواد پیش کیا ہے وہ زیادہ تر پارلیمنٹ کی دستاویزات، خصوصیت کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹوں اور ان کے سامنے پیش کی جانے والی شہادتوں حکام کی رودادوں اور سرکاری مراسلوں پر مشتمل ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ انھیں جو بھی ماخذ میسّر آسکے انھوں نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے مل (MILL) کے (KAYE) اور ہنٹر (HUNTER) کی طرح مستند تاریخوں، الفنسٹن (ELPHINSTON) کاٹن (COTTON) لارنس (LAWRENCE) اور مل (MILL) کی طرح کی سوانح عمریوں، بکانن (BUCHANAN) اور بشپ ہیبر (BISHOP HEBER) کے طرح کے مستند سفرناموں اور منرو (MUNRO) اور سلی مین (SLEEMAN) کی طرح کی مستند یادداشتوں سے مواد حاصل کیا۔ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ اٹھارویں صدی کے آخری دور اور اس زمانے میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق کتابچوں، تجارتی مراکز کی رپورٹوں، انتظامی رپورٹوں تجارتی مراکز میں نافذ ہونے والے ضابطوں اور قوانین مال کے اقتباسات پیش کیے۔ دت نے زیادہ تر ایسا مواد استعمال کیا جو سرکاری سرگرمیوں یا تحقیقات کا نتیجہ تھا اور زیادہ تر غیر سرکاری مواد بھی خصوصی معلومات پر مبنی تھا۔ چنانچہ دت کی تاریخ بڑی حد تک ان اعداد و شمار، بیانات، واقعات، شہادت و خیال پر مشتمل ہے جو سرکاری رپورٹوں اور دوسرے ماخذوں سے نہایت سمجھداری کے ساتھ اخذ کیے گئے ہیں اور توضیحات و تشریحات کے ذریعے مربوط کر دیے گئے تاکہ تاریخی ارتقا کے ساتھ ان مقاصد اور پالیسیوں کی ایک واضح تصویر پیش کی جا سکے جو ارتقا کی سمت کا تعین کرتے تھے۔

جس قسم کا مواد انھیں حاصل ہو سکا اس کے نتیجے کے طور پر اور تاریخی ارتقا کے متعلق ان کے تصورات کے نتیجے کے طور پر بھی دت نے انگریزوں کو اور خصوصیت کے ساتھ انگریزی راج کو چاہے وہ کمپنی کا تھا یا شاہ انگلستان کا، فعال عامل سے تعبیر کیا اور ہندوستان کے لوگوں اور یہاں کے حالات کو بڑی حد تک مجہول قرار دیا۔ وہ صرف کبھی کبھی فعال عامل کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب ان پر ضرورت سے زیادہ بار پڑا اور اس کا شدید اور کبھی کبھی تشدد آمیز ردعمل ہوا۔ چونکہ اکنامک ہسٹری کی بنیاد پر سرکاری سرگرمیاں اور پالیسیاں ہیں اس لیے اس میں سیاسی حادثات و واقعات کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ان واقعات کو معاشی تاریخ سے مربوط بھی کر دیا گیا ہے۔ سیاسی تاریخ کے لیے سمجھا جاتا تھا کہ وہ مختلف گورنر جنرلوں اور وائسرایوں کے ادوار حکومت اور ان کی داخلی اور خارجی جنگوں اور فتوحات کی تاریخ ہے۔ ہر دور کے سیاسی حالات بیان کرنے کے بعد

دت نے مختلف معاشی موضوعات کا جائزہ لیا۔ انگریزی راج کے ابتدائی دور کی معاشی تاریخ میں دت نے تمام موضوعات اور تمام علاقوں کا جائزہ لینے کے لیے ادوار کی تقسیم کا طریقہ نہیں اختیار کیا۔ اس میں انھوں نے اپنے بیان کو مختلف سرگرمیوں، انتظاموں یا واقعوں مثلاً جنگوں یا مال گزاری کے بندوبستوں سے مربوط کر دیا ہے۔ کسی خاص موقع پر جس موضوع کے متعلق انھیں زیادہ اور اہم مواد مل گیا۔ انھوں نے اس کو مرکزی موضوع بنا کر تاریخ لکھنی شروع کر دی لیکن عہد وکٹوریہ میں انھوں نے موضوع کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہندوستان کمپنی کے زیر حکومت، ملکہ انگلستان کے زیر حکومت اور ملکہ سلطنت برطانیہ کے زیر حکومت۔

دونوں جلدوں میں دت نے مال گزاری کے بندوبست کے موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ مال گزاری کے بندوبست، مال گزاری کی تشخیص اور مال گزاری کی شرح کو اہمیت دینا بھی چاہیے تھی۔ ہندوستان میں مال گزاری آمدنی کا اہم ترین ذریعہ تھی اور اس زمانے میں بھی رہی جس پر دت کی اکنامک ہسٹری محیط ہے۔ حکومت انتظامی ساخت مال گزاری کی تشخیص اور اس کی وصولیابی کے طریقوں سے قریبی تعلق رکھتی تھی۔ اس لیے ملک کی انتظامی اور مالیاتی تاریخ کی تشکیل میں مال گزاری کے طریقے اور اس کے عمل درآمد کا اہم رول ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں زراعت ہندوستان کی سب سے اہم معاشی سرگرمی تھی اور کاشت اور کاشتکار کی قسمت کا دارومدار مال گزاری کی شرح اور اس کی تشخیص اور وصولیابی کے طریقوں پر تھا۔ مدتوں تک ہندوستان میں فیض رساں اور جابر حکومت کے فرق کی بنیاد مال گزاری کے طریقوں کو سمجھا جاتا رہا تھا۔ اگر مال گزاری کا طریقہ اعتدال اور انصاف پر مبنی تھا تو حکومت فیض رساں سمجھی جاتی تھی اور ظالمانہ اور تباہ کن تھا تو حکومت جابر سمجھی جاتی تھی۔

انگریزوں نے پرانے زمانے کے بیرونی فاتحوں کے طریقہ عمل سے انحراف کیا اور اپنے پیش روؤں کے طریقوں اور ضابطوں کو منسوخ کر کے اپنے تصورات کی روشنی میں نظم ونسق اور مال گزاری کا ایک نیا ڈھانچہ بنانے کی کوشش کی۔ اس ملک اور یہاں کے لوگوں کے لیے انگریز اجنبی تھے اور اس لیے عبوری دور میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مورخ کو اس عبوری دور کا جائزہ لینے کے لیے اسے تین ذیلی ادوار میں تقسیم کرنا پڑا۔ پہلا ذیلی دور وہ تھا جب انگریزوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے زیادہ مداخلت کرنی شروع کی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہت سے علاقوں میں بدامنی پھیل گئی۔ اور اس وقت تک پھیلی رہی جب تک انگریزوں نے ان علاقوں پر قبضہ نہیں کر لیا۔ دوسرا ذیلی دور وہ

تھا جو انگریزوں نے ان علاقوں کو اپنے قبضے میں لینا شروع کیا۔ شروع شروع میں اور خاص طور سے بنگال کی حد تک یہ قریب قریب تاراج کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ امن قائم ہوا اور مال گزاری اور نظم ونسق کے نئے طریقوں پر عمل ہونے لگا۔ نئے نئے حاکم حالات سے پوری طرح واقف نہیں تھے ان میں جوش تھا اور کمپنی کے مطالبوں اور ضرورتوں کو پورا کرنا تھا اس کی وجہ سے تیسرے ذیلی دور میں بھی مال گزاری کی اتنی رقم وصول کرنے کی کوشش کی گئی جو زیادہ تر کسانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس قسم کی کوششیں اس وقت کی گئیں جب کہ جنگ اور تاراج کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے اس لیے ان کے نتائج شدید بھی ہوئے اور دوررس بھی۔ دت نے یہ مناسب سمجھا کہ مندرجہ بالا تینوں ذیلی ادوار پر طریقہ مال گزاری کے ارتقا کی روشنی میں غور کریں۔

دت کی تاریخ کی دوسری جلد میں بھی مال گزاری اور بندوبست مرکزی موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب کا تعلق اس دور سے ہے جب ہندوستان پر شاہ انگلستان کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور نسبتاً زیادہ پر امن حالات پیدا ہو چکے تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں دت کا خیال تھا کہ ہندوستان کی غربت کی ذمہ داری بڑی حد تک مال گزاری کے ناقص طریقے پر عائد ہوتی ہے۔ بندوبست کی جن خرابیوں کی طرف انھوں نے اشارہ کیا وہ تھیں تشخیص کی زیادہ شرح، شرح کا غیر یقینی ہونا اور اس امر کا امکان کہ تھوڑی مدت کے بعد ہونے والی نظر ثانی کے موقع پر زراعت کی تمام تر مزید آمدنی مال گزاری میں شامل کرلی جائے۔ صرف بنگال کا بندوبست استمراری ان نقائص سے پاک تھا۔ ان حالات میں دت نے حتی الامکان کوشش کی کہ مختلف صوبوں میں مال گزاری کے نظریے اور عمل درآمد میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ وہاں کے کسانوں کی فلاح وبہبود میں ان تبدیلیوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں مال گزاری کا بوجھ یقینی بہت زیادہ تھا اور صدی کے نصف آخر میں بھی یہ بوجھ اتنا زیادہ ضرور تھا کہ لاگت اور قیمتوں میں اہم تبدیلیوں اور پیداوار کی کمی کے زمانے میں اس کو محسوس کیا جاتا تھا۔ اس صدی میں مال گزاری کے طریقے برابر تبدیل ہوتے رہے اور بندوبست وتشخیص مال گزاری کے اصولوں پر مسلسل بحث ومباحثہ ہوتا رہا۔ دت نے ان واقعات ومباحثات سے مواد حاصل کیا تاکہ مال گزاری کی پالیسی میں اعتدال، دوررس تحفظ اور ترقی کے لیے محرکات کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرسکیں۔

اس مخلصانہ تجزیے اور زوردار نزاعی بیانوں کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کے متعلق کچھ شکوک وشبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ ہے بنگال کی دیہی علاقوں کے حالات کا بیان اور بندوبست استمراری

کے فوائد۔ یہ بات زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ مشرقی بنگال کے کسانوں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے کسانوں کی معاشی حالت کے فرق کو مال گزاری کے مختلف طریقوں کا نتیجہ سمجھا جائے۔ اپنی ایک ابتدائی کتاب THE BENGAL PEASANTRY میں دت نے بنگال کے کسانوں کی حالت کی کوئی دل خوش کن تصویر نہیں پیش کی تھی۔ حالانکہ اس کتاب کا اصل موضوع تو کسانوں کے حالات تھے لیکن اس میں نظم و نسق، دیہی صنعت اور محاصل کا جائزہ بھی لیا گیا تھا۔ ان مضامین میں جو 74-1873ء میں لکھے گئے تھے دت کی ان تحریروں کے متعلق جو 1897ء کے بعد لکھی گئیں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دت نے ابتدا سے ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی وقت ان کے خیالات میں پختگی آ چکی تھی۔ 1874ء میں کسانوں کی حالت اور بنگال کے بندوبست استمراری کے اثرات کے متعلق وہ جو خیالات قائم کر چکے تھے ان کا اظہار..... THE BENGAL PEASANTRY کے دیباچے کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔

"ان لوگوں کے علاوہ جو عمداً نظریں چراتے ہیں یہ واقعہ سب پر روشن ہے کہ کچھ زمینداریوں میں اور خاص طور سے چھوٹی چھوٹی زمینداریوں میں اور غیر منافع بخش شکمی کاشت میں متفوت یا انفرادی محصول اب بھی تباہ کن حد تک وصول کیا جاتا ہے اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس کی وجہ سے ادا کی جانے والی رقم قانونی مطالبے یا لگان سے دوگنی ہو جاتی ہے۔ کچھ زمینداریوں میں متفوت اب بھی وصول کی جاتی ہے۔ تمام زمینداریوں میں قانونی مطالبے سے زیادہ رقم خاص خاص موقعوں پر نذرانے کے طور پر یا تو زمیندار خود وصول کرتے ہیں یا ان کے کارندے وصول کرتے ہیں۔ زمینداروں کے ہاتھوں میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ وہ کسانوں پر طرح طرح کے ظلم توڑ سکیں، انھیں پریشان کر سکیں اور برباد کر سکیں۔ ان کے خلاف قانون کسانوں کا تحفظ نہیں کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اکثر مقامات پر اب بھی کسانوں کو غلام بنا کر رکھا جاتا ہے اور وہ اپنے مالکوں کے غیر منصفانہ احکام و مطالبات کو تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے خلاف مزاحمت کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے غیر یقینی حالات اور روز افزوں مطالبات نے اور اس قسم کی غلامی نے کسانوں کو اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ وہ سمجھداری اور دور رسی سے کام لے سکیں، سوچ بچار کی عادت ڈال سکیں اور اپنی حالت سدھار سکیں۔ اس لیے ہم نے آئندہ صفحات میں زمینداروں کے اختیارات پر دائمی بندشیں عائد کرنے کی وکالت کی ہے۔"

بنگال کے حالات کے متعلق دو متضاد تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں دیہی بنگال کے حالات جزوی طور سے خاصے سنبھل گئے تھے اور دت

بعد میں جن نتیجوں پر پہنچے تھے وہ مطلق ہونے کے بجائے صرف اضافی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ لکھتے وقت دت کا خیال تھا کہ بنگال کے کسانوں کی حالت ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے کسانوں سے بہتر ہے۔

دوسرے موضوعات جن پر دت نے قلم اٹھایا صنعت و حرفت، محاصل درآمد برآمد اور بیرونی تجارت ریلیں، آب رسانی کے ذرائع اور مالیات عامہ ہیں۔ ان کا جائزہ لیتے وقت انھوں نے بدیسی راج اور برطانوی پالیسی کے مضر اثرات کی نشاندہی کی۔ عصری اعداد و شمار، روداودں اور کتابچوں سے سندیں مہیا کرتے وقت یہ ثابت کر سکے کہ کمپنی نے، کمپنی کے برطانوی ملازمین اور ہندوستانی گماشتوں نے تھیتیں گماکے ہندوستانی جنکروں پر کتنے مظالم کیے۔ صنعتی انقلاب کے بعد جب انگلستان کے لوگوں نے تجارت میں نسبتاً بہتر حیثیت حاصل کر لی اور مشین سے بنے ہوئے انگلستان کے مصنوعات کم قیمت پر فروخت ہونے لگے تو برطانیہ نے ان مصنوعات کو ہندوستانی منڈیوں تک پہنچانے کی پالیسی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی مصنوعات کم ہوگئے اور بیرونی مصنوعات کی درآمد میں اضافہ ہوگیا۔

دت کی تاریخ میں اور دوسرے ہندوستانی مصنفین کی تحریروں میں انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ریلوں اور آب رسانی کے ذرائع میں جو امتیاز کیا گیا ہے وہ بھی ہندوستانی معیشت کے بنیادی تصورات سے تعلق رکھتا ہے۔ ریلوں کی تعمیر کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد دفاعی تھا تاکہ سرحدوں کی حفاظت اور داخلی امن و امان کو برقرار رکھنے کے لیے فوجوں کو تیزی کے ساتھ لایا لے جایا جا سکے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ "ملک کے دروازے کھول دیے جائیں"۔ انگریزوں کے نزدیک اس کے معنی یہ تھے کہ دور دراز حصوں کو بندرگاہوں سے ملایا جائے تاکہ درآمد ہونے والے برطانوی مصنوعات کی فروخت میں اور ملک کے اندرونی حصوں میں پیدا ہونے والے خام مال کی برآمد میں آسانی ہو۔ اس زمانے میں انگریزوں کے نزدیک ملک کے دروازے کھولنے کے معنی یہ نہیں تھے کہ ملک کی معیشت کو ترقی دی جائے جیسا کہ دت نے بار بار اشارہ کیا ہے پرانی نوآبادیاتی پالیسی اس وقت بھی برقرار تھی۔ اس پالیسی کا مقصد تھا کہ نوآبادیات اور مقبوضات کو انگلستان کے مصنوعات کی منڈی سمجھا جائے اور انگلستان کی معیشت کو جس خام مال اور خصوصی اشیاء کی ضرورت ہو ان کو مہیا کرنے کا ذریعہ سمجھا جائے۔ دت کا اصرار تھا کہ آزاد تجارت کے اصول کو تسلیم کرنے سے بظاہر کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ آتی ہو پھر بھی برطانوی پالیسی وہی پرانی نوآبادیاتی پالیسی ہے جس کی شکل بدل گئی ہے۔ انھوں نے اپنی بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے لسٹ (LIST) کا ایک اقتباس موثر انداز سے استعمال کیا۔

ایک طرف ریلوں کا یہ رول تھا اور دوسری طرف اس کا امکان تھا کہ ایک کامیاب طریقۂ آب رسانی

کا ملک پر خوش گوار اثر پڑے۔ آب رسانی سے کاشتکار کا تحفظ ہو سکتا تھا اور زرعی پیداوار میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور تنوع بھی پیدا کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ ریلوں اور آب رسانی کے ذرائع دونوں کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت تھی لیکن اول الذکر کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت کا مزید استحصال ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس آب رسانی صرف ایسا ذریعہ تھا جس سے ہندوستانی معیشت کی بنیاد مضبوط بھی ہوتی اور اس میں وسعت بھی پیدا ہوتی۔ یہ وجہ تھی کہ تیزی کے ساتھ ریلوں کی توسیع پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے کی مخالفت کی گئی خصوصیت کے ساتھ آب رسانی کے کاموں کو توسیع دینے کے بجائے ریلوں کو توسیع دینے پر وہ روپیہ خرچ کرنے کی مخالفت کی گئی جو قحط کے زمانے میں سہولت بہم پہنچانے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

آخر میں مالیات عامہ کا مسئلہ تھا جس کے کئی پہلو تھے۔ برطانوی ہند کے نظم و نسق کے بھاری مصارف نے مال گزاری کی اونچی شرح کو ضروری بنا دیا تھا۔ برطانوی سلطنت کی توسیع کے لیے جو جنگیں لڑی گئیں اور اس مقصد کے لیے ہندوستان میں جو فوجیں رکھی گئیں ان پر خرچ ہونے والے روپے نے ان مصارف میں اور اضافہ کر دیا۔ ریلوں اور دوسرے غیر پیداواری کاموں کے لیے جو قرض لیا گیا تھا اس کے سود کی شرح انگلستان میں ہونے والے مصارف یا گھریلو مصارف، سرکاری ملازموں اور دوسرے لوگوں کا پس انداز کیا ہوا روپیہ جو انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک سے قابل لحاظ دولت باہر جانے لگی۔

ان حالات کے سیاق و سباق میں دت کی تاریخ کا مقصد تھا کہ سرگرمیوں کے بنیادی محرکات پر روشنی ڈالے۔ مخصوص پالیسیوں کے پس پشت کام کرنے والی طاقتوں کا تجزیہ کرے اور دکھائے کہ مسلسل ہونے والی تبدیلیاں بدیسی راج اور مقامی لوگوں اور ان کے رہنماؤں کی بے بسی کا لازمی نتیجہ تھیں۔ ان کی تاریخ نے جس میں دستاویزی شہادتیں فراہم کی گئی تھیں اس بات کی تشریح کر دی کہ برطانوی صنعت کار ایک زمانے میں ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی کپڑے کو کیوں انگلستان نہیں آنے دینا چاہتے تھے اور دوسرے زمانے میں ہندوستان میں درآمد ہونے والے برطانوی کپڑے پر ۵ فیصدی محصول عائد کرنے کے خلاف کیوں تھے؟ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح برطانوی تجارت اور صنعتی مفادات نے ہندوستان میں ریلوں کی توسیع کی حمایت کی اور سرمایہ داروں نے ریلوں کی تعمیر کے سلسلے میں سود کے لیے سرکاری ضمانت حاصل کر لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جنگیں اور سیاسی اقتدار کی توسیع کے منصوبے بلا ضرورت اور بلا سوچے سمجھے شروع کیے جاتے تھے اور ان میں سے ہر جنگ اور ہر منصوبے کی بنا پر ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ مالی بار برداشت کرنا پڑتا تھا جس میں سرمائے اور رواں اخراجات دونوں کا بار شامل ہوتا تھا۔ ان طاقت ور سیاسی اور معاشی مفادات کے مقابلے میں جو ان پالیسیوں

کو رواج دیتے تھے۔ خال خال دوراندیش برطانوی حاکم یا غیر سرکاری ممبر ہوتے تھے جو ان سے اختلاف کرتے تھے۔ چنانچہ یہ دکھایا گیا ہے کہ پالیسیوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کی ذمہ داری ایسے گروہوں کی سرگرمیوں پر عائد ہوتی تھی جن کے ہاتھ میں سیاسی طاقت ہوا کرتی تھی۔ ماضی بعید اور ماضی قریب کی معاشی تاریخ کا ایک اہم اور فوری سیاسی نتیجہ بھی نکلا اور اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ہندوستان کے لوگوں کو ذمہ داری میں شریک ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔

4

دت نے ایک تاریخی دور ختم ہونے کے بعد اپنی کتاب لکھی تھی۔ ان کی تاریخ چھپنے کے فوراً بعد کئی ایسی تبدیلیاں آئیں کہ پانچ دہائیوں میں حالات بالکل بدل گئے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں مال گزاری کی تشخیص اور وصولیابی، آب رسانی کے ذرائع کی تعمیر اور لوگوں کو نمائندگی دینے کے متعلق سرکاری پالیسی میں خاصی تبدیلی آئی۔ تبدیلی کم از کم جزوی طور سے دت اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اسی زمانے میں زراعتی پیداواروں کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا جس کا بہت سے کسانوں کی معاشی حالت پر خوش گوار اثر پڑا۔ زراعتی پیداواروں کی قیمتیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھنے لگیں اور مانٹ فورڈ (MONT FORD) اصلاحات نے ہندوستانیوں کو سیاسی طاقت منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا۔ معاشی میدان میں پہلی انقلابی تبدیلی یہ آئی کہ ضروری تفتیش کے بعد خاص خاص معاشی سرگرمیوں کی حد تک حفاظتی محاصل عائد کرنے کی پالیسی تسلیم کر لی گئی۔ اس کے علاوہ صوبوں میں عوامی وزیروں کا تقرر ہوا جس کی وجہ سے صنعت، زراعت، جنگلات وغیرہ کی طرف سرکار کی توجہ مبذول کرائی جا سکی اور ان کے لیے سرکار کی امداد حاصل کی جا سکی۔ بہت سی ریاستوں میں نظام مال گزاری میں اصلاح کے مطالبے پیش کیے جانے لگے۔ اس کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی مدت بعد نظر ثانی کرنے کے کام میں رکاوٹ پڑنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی دہائی کی کساد بازاری کے زمانے میں بھی ملک کے زیادہ تر حصوں میں کاشتکاروں پر مال گزاری کا بوجھ اس سے کم تھا جتنا اس وقت تھا جب دت نے اپنی تاریخ لکھی۔ دوسری عالمگیر جنگ اور ملک کی آزادی کے بعد حالات بالکل بدل گئے۔ دت کی تاریخ لکھے جانے کے پچاس سال بعد کے حالات میں اور ان حالات میں جو دت نے پیش کیے تھے کوئی مطابقت نہیں رہی تھی۔ یہ بات حکومت کی سرگرمیوں اور پالیسیوں پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔

ان تاریخی تبدیلیوں کی وجہ سے دت کی کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور نہ ان کے بیان و

تجزیے کا کوئی اہم حصہ غیر مستند و غیر معتبر قرار دیا جاسکتا ہے۔ مالتھس MOLTHUS کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آیا کہ اس نے انسانی آبادی کے بڑھنے کے متعلق جو نظریہ پیش کیا تھا اور جو اس کی تحریر کے زمانے سے پہلے مدتوں انسانی تاریخ کی امتیازی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی کتاب پرنسپلس PRINCIPLES کی اشاعت کے کچھ سال بعد تیزی سے بدل گیا۔ مسئلہ آبادی کے متعلق مالتھس نے جو بنیادی اصول بنائے تھے اس تبدیلی کی بنا پر نہ توان کی قدر و قیمت کم ہوئی اور نہ مقبولیت۔ دت نے بڑے عالمانہ انداز سے ڈیڑھ صدی کی معاشی تاریخ پیش کی اور غالب رجحانات کا تجزیہ کیا۔ وہ تاریخی دور جس کا انھوں نے ذکر کیا اور جس کے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا خود ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالات کی جو تصویر انھوں نے بنائی تھی اس پر تاریخ بھی پڑ گئی۔ اس سے نہ ان کے کام کی اہمیت کم ہوتی ہے اور نہ ان کے خیالات کی صحت۔ لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ دت کے کام کی اہمیت اس زمانے سے متعلق ہے جس کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا۔ ان کا معاشی تجزیہ دنیا کی جدید معاشی تاریخ کے اس اہم دور کی نمایاں خصوصیتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

غالباً دت نے سامراجی دور کی پہلی تاریخ لکھی جو سامراجی سلطنت کے محکوموں کا نقطہ نظر پیش کرتی ہے۔ اس میں اس مخصوص معاشی نظریے کی موٹی موٹی باتیں ملتی ہیں جو کچھ مدت بعد نوآبادیاتی معاشیات کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دت نے قبل از وقت وہ باتیں بیان کردی تھیں جو کچھ مدت بعد نوآبادیاتی معاشیات کے مباحثوں میں کہی گئیں۔ ان کے بیان میں کچھ ایسی باتیں بھی مضمر تھیں جو پس ماندہ قوموں کی معاشی ترقی سے متعلق تھیں۔ دت کی تمام تحریروں میں سیاسی تصورات اور معاشی پالیسیوں کے باہمی ربط کا شعور ملتا ہے۔ انگلستان کی عصری معاشی تحریروں میں اس ربط کو عام طور سے نظر انداز کردیا جاتا تھا۔ دت نے بڑی کوشش کے ساتھ اس بات پر بھی روشنی ڈالی جواب تو سب ہی جانتے ہیں مگر اس زمانے میں سب کی نگاہ اس پر نہیں تھی یعنی غالب معاشی مفاد اور معاشی پالیسی کا باہمی رشتہ۔ چونکہ انھوں نے خود کو تاریخی مباحث تک محدود رکھا اس لیے راناڈے کے برعکس انھوں نے معاشی تصورات کی اضافیت سے بحث نہیں کی۔

معاشی مباحث اور ترقی کے تعلق سے یہ بات اہم ہے کہ دت نے معیشت کی اساس پر زور دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معیشت کی پھیلاؤ رکھنے والی ہمہ جہتی ترقی کا پورا پورا شعور رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ترقی بڑی حد تک بچت کی بنا پر ممکن ہوسکے گی جو پیداواری طبقوں کے پاس چھوڑ دی جائے اور بار آور ہونے دی جائے۔ اس بات پر زور دینے کی وجہ یہ تھی کہ دت کے تصورات ان کے ماحول سے

بہت متاثر تھے۔ صنعت کا تحفظ کرنے اور کاشتکاروں کی تکالیف دور کرنے کے علاوہ دت نے ریاست کی پالیسی اور سرگرمی کے مثبت پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ واقعہ یہ ہے کہ بھاری محاصل اور حکومت کے مصارف کی اونچی سطح پر ان کی نکتہ چینی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حکومت کی سرگرمیوں اور اخراجات میں کمی کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہیے کہ زیادہ محاصل اور بھاری اخراجات پر دت کے اعتراضات کا بنیادی تعلق اس بات سے تھا کہ محاصل و اخراجات کی وجہ سے ملک سے دولت باہر جاتی ہے۔ اس سلسلے میں دت اور ان کے ہم عصر انگریزی راج کا مقابلہ گزشتہ دور کے مطلق العنان حکمرانوں تک سے کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں اگر کوئی بادشاہ زیادہ محاصل لگاتا بھی تھا اور پیداکار لوگوں کے پاس بار آور ہونے کے لیے پیسہ نہیں چھوڑتا تھا پھر بھی وہ وسائل ملک کے اندر رہتے تھے اور بادشاہوں اور درباروں کے اخراجات کی وجہ سے آبادی کے کسی نہ کسی حصے کو ان سے فائدہ پہنچتا تھا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دت کی تحریروں میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ ایک فلاحی ریاست کے بھاری اخراجات کو بھی ناپسند کرتے تھے۔

تاریخ لکھنے کے دوران دت کو اس بات کے زیادہ مواقع نہیں ملے کہ وہ معاشی ترقی کے عمل کا جائزہ لے سکیں یا ان اثرات پر غور کر سکیں جو ایک محکوم ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جن کا مظاہرہ انگلستان اور ہندوستان کے باہمی رشتے سے ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کی کتاب ENGLAND AND INDIA کے "اختتامیہ" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عمل کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نظر تھی اور وہ اس کا پورا پورا اور منصفانہ تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔

"ہندوستان میں ریلیں اور باربرداری کے لیے دخانی کشتیاں انگریزی سرمائے سے بنی ہیں اور ان کا سود اور منافع انگلستان آتا ہے۔ ان ترقی یافتہ ذرائع نقل و حرکت سے ملک کو طرح طرح کے فائدے ہوتے ہیں جن میں یہ فائدہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا کہ ملک کی فاضل پیداوار منڈیوں تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ نقل و حمل کے ان نئے ذریعوں سے ملک کے ایسے علاقوں کو بہت فائدہ ہوا ہے جن کی پیداوار کی کھپت پرانے زمانے میں صرف مقامی طور پر ہوتی تھی اور جو اپنی پیداوار منڈیوں تک نہیں بھیج سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں پیداوار کی قیمت میں عام طور سے اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی مزید آمدنی عام لوگوں کی جیبوں میں صرف وہیں جاتی ہے جہاں ریاست کے مطالبے کا دائمی تعین کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے بڑے حصے میں یہ مزید آمدنی

ریاست حاصل کر لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں جہاں ریلیں تعمیر ہو رہی ہیں کم مدت کے لیے مال گزاری کا بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ یہ مدت ختم ہونے کے بعد ریلوں سے حاصل ہونے والے فوائد ریاست حاصل کرے۔ ہندوستان میں چائے کی قسم کی نئی چیزیں پیدا کی جا رہی ہیں لیکن انھیں انگریز پیدا کر رہے ہیں اور ان میں انگریزی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ان کا منافع انگلستان آ جاتا ہے۔ ان سے ہندوستان کے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ قانون ہندوستان میں "غلامی کا قانون" کہلاتا ہے جس کے تحت چائے کے باغوں کے لیے مزدور بھرتی کیے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ حقیقت میں سونے کی سالانہ درآمد سونے کے زیورات اور زرلبفت و کمخواب جیسے قیمتی کپڑوں کی فرسودگی اور گھس پس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ آرائشی اشیاء ہیں جو ہندوستان کے مالدار طبقے استعمال کیا کرتے ہیں۔ جس طرح پیرس سے آنے والے ریشمی ٹوپیاں اور چمڑے کے دستانے انگلستان کے کھیت مزدوروں کی دولت کے مظاہر نہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں ہونے والی سونے کی درآمد ہندوستانی کسان کی دولت کو ظاہر نہیں کرتی۔ تجارت اور مفاد عامہ کے کام جو کسی ملک میں خود اس کے سرمائے سے کیے جائیں۔ وہاں کے لوگوں کی مادی خوشحالی کی دلیل سمجھے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان کی حد تک اس قسم کے کام انگریزی پونجی کی منفعت بخش سرمایہ کاری ہے۔ اس سے ہندوستان کو طرح طرح کے فائدے ضرور ہوئے لیکن اس کی وجہ سے ہندوستان کے کاشتکاروں اور دستکاروں کو کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچا۔[1]

دت اور ان کے ساتھیوں کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے اور اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ لوگوں کے معیار زندگی کی سطح اور اسی قسم کی دوسری باتوں سے ان کی تحریریں بھری ہوتی ہیں۔ قومی آمدنی کے سلسلے میں جو بھی معلومات وہ حاصل کر سکے اس کا انھوں نے پورا پورا استعمال کیا۔ اکنامک ہسٹری کے آخری بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دت اعداد و شمار کا استعمال نہایت موثر انداز سے کرتے تھے۔ قومی آمدنی کے تناسب سے ہندوستان کے اوسط محاصل کے متعلق ان کی مندرجہ ذیل رائے جدید انداز فکر کی غمازی کرتی ہے۔ "یہ بار ان لوگوں کو پیسے ڈال رہا ہے جن کی بافت ان کی غذائی ضرورتوں کو مشکل سے پورا کر سکتی ہے۔"

آج ہمارے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے کہ کسانوں کے وسائل کی کمی اور ہندوستان کی معیشت

---

[1] DUTT ENGLAND AND INDIA (1897) PP 130 TO 132

پر سالانہ دولت کی نکاس کے مضر اثرات سے متعلق دت کی تشویش پوری طرح سمجھ سکیں۔ جدید معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک غریب اور غیر ترقی یافتہ ملک ہمیشہ غریب رہے گا۔ اگر اس کی چھوٹی موٹی بچت اور تھوڑا بہت پس انداز کیا ہوا روپیہ مسلسل ملک کے باہر جاتا رہے۔ دت کی اکنامک ہسٹری کے دونوں جلدوں سے ہمیں یہ درس ملتا ہے۔

آخر میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کی تشکیل میں اور ان کے پرچار میں دت تنہا نہیں تھے۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں کہ اس میدان میں پہلا قدم دادا بھائی نوروجی نے اٹھایا تھا۔ معاصرین کے کئی ہم عصروں نے جن میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شامل تھے اس کی وضاحت کی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا۔ جدید تاریخ ہند کے نوآبادیاتی دور کی مسلسل و مربوط داستان دت نے سنائی۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں ایسا تاریخی مواد پیش کر دیا جو مدتوں اپنی تازگی برقرار رکھے گا۔ اس کے بیش بہا فوری نتائج سے قطع نظر یہ کتاب دت کی ذہانت، علمیت اور بے پناہ وطن دوستی کی ایک زندہ یادگار ہے۔

ڈی۔ آر۔ گیڈگل
گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالیٹکس اینڈ اکنامکس، پونا
6 اکتوبر 1959ء

پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ

معروف مورخوں نے ہندوستان میں برطانیہ کی فوجی اور سیاسی سرگرمیوں کے متعلق بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں لیکن ہندوستان کے لوگوں اور ان کی تجارت، صنعت، زراعت اور انگریزی راج میں ان کی معاشی حالت کے متعلق ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

ہندوستان کے حالیہ قحطوں نے اس اہم موضوع پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرادی ہے ہندوستان کے لوگوں کے حالات، ان کی آمدنی کے ذرائع اور ان کی غربت کے وجوہ کو سمجھنے کی خواہش عام طور سے پائی جاتی ہے۔ اس وقت برطانوی ہند کی ایک مختصر معاشی تاریخ کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جو کارنامے سرانجام دیے ہیں ان سے وہ مطمئن ہوں یا نہ ہوں مگر ان پر فخر ضرور کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو وہ چیزیں دی ہیں جو انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہیں یعنی امن و امان۔ انھوں نے مغربی تعلیم کو رواج دیا اور اس طرح ایک قدیم اور متمدن قوم کو جدید افکار، جدید علوم اور زندگی کے جدید اداروں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے نظم و نسق کا ایک ایسا ڈھانچہ بنایا جو پائدار بھی ہے اور کار آمد بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اصلاح ہونی چاہیے۔ انھوں نے دانشمندی کے ساتھ قوانین بنائے اور عدالتیں قائم کیں جو اسی حد تک بے لوث و پاکباز محض ہیں جیسی کہ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی سرگرمی کے یہ ایسے نتیجے ہیں جن کی تعریف کرنے پر برطانیہ کا ہر ایماندار ناقد مجبور ہے۔

دوسری طرف کوئی غیر متعصب انگریز ایسا نہیں جو انگریزی راج میں ہندوستانیوں کے مادی حالات سے غیر مطمئن نہ ہو۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کی غربت ایسی ہے کہ اس کی

نظیر کسی متمدن ملک میں نہیں ملتی۔ وہ قحط جنہوں نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کو تباہ کر دیا۔ اتنے وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے اور اتنے شدید تھے کہ ان کی مثال قدیم و جدید زمانے کی تاریخیں نہیں پیش کرتی ہیں۔ بغیر کسی مبالغے کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ 1877ء اور 1878ء کے قحط میں 1889ء اور 1892ء کے قحط میں ' 1897ء اور 1900ء کے قحط میں پندرہ ملین انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ پچیس سال میں ہندوستان کے لوگ جتنی تعداد میں قحط کے شکار ہوئے ہیں وہ یورپ کے کسی خاص بڑے ملک کی پوری آبادی کے برابر ہے۔ اس زمانے کے ادھیڑ عمر کے ہر مرد اور ہر عورت کو یاد ہے کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد انگلستان کی کل آبادی کے نصف کے برابر تھی۔

ہندوستان کی اس شدید غربت اور بار بار پڑنے والے قحطوں کے اسباب کیا ہیں؟ ایک کے بعد ایک سطحی تشریحات پیش کی گئیں اور ان پر غور کرنے کے بعد انھیں رد کر دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ ہندوستان کی آبادی تیزی سے بڑھی جس کا لازمی نتیجہ قحطوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں آبادی کے اضافے کی رفتار اتنی نہیں تھی جتنی انگلستان میں تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا پچھلے دس سال میں آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہندوستانی کسان غیر محتاط اور فضول خرچ ہیں۔ جو لوگ زمانہ افراط میں کچھ پس انداز نہیں کیا کرتے ہیں وہ کمی کے زمانے میں بھوکوں مرا کرتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے کسانوں کے درمیان عمریں بتائی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں تک روکھی سوکھی کھانے اور کفایت شعاری سے کام لینے کا تعلق ہے دنیا کا کوئی کسان ہندوستانی کسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ تمام خرابیوں کی جڑ مہاجن ہے جو دھوکے دھڑی سے کسانوں کا خون چوستا ہے اور انھیں قرض کے جال میں پھانسے رکھتا ہے۔ لیکن حالیہ فیمین کمیشن FAMINE COMMISSION کی تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مال گزاری کے مطالبوں کے سلسلے میں حکومت کی سخت گیری کی وجہ سے ہندوستان کے کسان مہاجن کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ایسے ملک میں جہاں لوگوں کی گزر بسر کا دارومدار فصلوں پر ہو سوکھا پڑنے اور فصلیں خراب ہونے کی صورت میں وہ فاقے نہیں کریں گے تو کیا کریں گے۔ لیکن ایسا کوئی زمانہ نہیں آیا جب پورے ہندوستان میں فصلیں خراب ہو گئی ہوں۔ ایسا کوئی سال نہیں گزرا جب ملک کے تمام لوگوں کے لیے غذا کافی نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی ہی خرابی ہے جن کی بنا پر ایک صوبے کی فصلیں خراب ہونے کی وجہ سے قحط پڑ جاتا ہے اور لوگ

آس پاس کے ان صوبوں سے غذا حاصل نہیں کر سکتے جہاں فصلیں اچھی ہوں۔

ان سطحی تشریحات سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں ہندوستان کی غربت اور ہندوستان کے قحطوں کے حقیقی اسباب کی کھوج لگانی ہوگی۔ ہندوستان میں معاشی قوانین کا طبعی عمل ویسا ہی ہے جیسا کہ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ہوتا ہے۔ جن اسباب کی بنا پر دنیا کے دوسرے ملک دولتمند ہو سکتے ہیں ان کی بنا پر ہندوستان بھی خوش حال ہو سکتا ہے۔ جو اسباب دنیا کے دوسرے ملکوں کو تباہ کرتے ہیں وہ ہندوستان کو بھی تباہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہر معاشیات ہندوستان سے متعلق تحقیقات کرنے وقت وہی طریقہ اختیار کرے گا جو دوسرے ملکوں کی دولت یا افلاس کی وجوہ معلوم کرنے کے لیے اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ کیا زراعت کو فروغ ہو رہا ہے؟ کیا صنعتیں ترقی کر رہی ہیں؟ کیا مالیات کا ٹھیک ٹھیک انتظام کیا جا رہا ہے تاکہ لوگوں کو ان محاصل کا مناسب معاوضہ مل سکے جو وہ ادا کرتے ہیں؟ کیا حکومت نے لوگوں کی مادی حالت سنبھالنے کے لیے دولت آفرینی کے ذرائع کو توسیع دی ہے؟ جب کوئی انگریز دنیا کے کسی ملک کی معاشی حالت کی تحقیقات کرتا ہے تو اس قسم کے سوال کیا کرتا ہے۔ ہندوستان کے حقیقی حالات معلوم کرنے کے لیے بھی اسے اس قسم کے سوال کرنے ہوں گے۔

یہ ہماری بد قسمتی سہی لیکن اس واقعہ سے کوئی باخبر ہندوستان کا حاکم انکار نہیں کر سکتا کہ انگریزی راج میں ہندوستان کی قومی دولت کے ذرائع کئی اعتبار سے محدود ہو گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستان ایک بڑا صنعتی اور زراعتی ملک تھا اور ہندوستانی بنکروں کا بنایا ہوا کپڑا ایشیا اور یورپ کی منڈیوں میں بکا کرتا ہے۔ بد قسمتی سے یہ بات جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ نے ایک صدی پہلے کی خود غرضانہ تجارتی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انگریزی راج کے ابتدائی زمانے میں ہندوستانی دستکاروں کی ہمت شکنی کی تاکہ ابھرتے ہوئے برطانوی مصنوعات کو فروغ دیا جا سکے۔ اٹھارویں صدی کی آخری اور انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں انھوں نے اس پالیسی پر عمل کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان برطانوی صنعتوں کے تابع رہے اور زیادہ سے زیادہ خام مال پیدا کرے تاکہ برطانیہ کے کارخانوں کو ضروری خام مال مہیا کیا جا سکے۔ اس پالیسی پر سختی سے عمل کیا گیا اور اس میں انھیں ایسی کامیابی ہوئی جو ہندوستان کے لیے مہلک تھی۔ احکام جاری کیے گئے کہ ہندوستانی دستکار کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں۔ کاروبار کی نگہداشت کرنے والوں کو ہندوستان کے گانووں اور بنکروں پر وسیع اختیارات حاصل ہو گئے۔ ہندوستان سے

انگلستان جانے والے ریشمی اور سوتی کپڑے پر بھاری محصول درآمد عائد کیا گیا تاکہ ان کی درآمد رک جائے ہندوستان میں درآمد ہونے والا انگلستان کا مال محصول سے بری تھا یا اس پر صرف برائے نام محصول عائد کیا جاتا تھا۔

مشہور مورخ ایچ۔ایچ ولسن نے برطانوی صنعت کاروں کے لیے لکھا ہے کہ انھوں نے "سیاسی ناانصافی سے کام لے کر ایک ایسے مدمقابل کو دبایا اور آخر میں اس کا گلا گھونٹ دیا جس سے وہ برابر کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتے تھے"۔ لاکھوں ہندوستانی دستکاروں کا روزگار ختم ہو گیا۔ ہندوستان سے دولت آفرینی کا ایک اہم ذریعہ چھن گیا۔ انگریزی راج کا یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ لیکن ہندوستان کی معاشی حالت اور وہاں کے لوگوں کے زراعت پر موجودہ انحصار کی وضاحت کرنے کے لیے یہ کہانی سنانا ضروری ہو گیا ہے۔ ہندوستانی صنعتوں کی تباہی اس دن مکمل ہو گئی جس دن یورپ میں مشینی کرگا ایجاد ہوا۔ حالیہ زمانے میں جب مشینی کرگے ہندوستان میں لگائے گئے تو انگلستان نے ایک دفعہ پھر ہندوستان کی طرف بے جا رشک و حسد کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان میں بننے والے سوتی کپڑے پر اکسائز ڈیوٹی عائد کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کی مصنوعات چینی اور جاپانی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور ہندوستان کے نئے نئے کارخانے تباہ ہو رہے ہیں۔

اب ہندوستان کی قومی آمدنی کا ذریعہ صرف زراعت ہے اور ہر پانچ میں سے چار ہندوستانیوں کا انحصار زراعت پر ہے۔ لیکن برطانوی حکومت کی عائد کردہ مال گزاری نہ صرف یہ کہ زیادہ ہے بلکہ بہت سے صوبوں میں اس کی شرح غیر یقینی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ 1798ء سے پہلے ایک صدی تک انگلستان میں مال گزاری کی شرح ایک شلنگ سے چار شلنگ فی پاونڈ تک تھی یعنی لگان کی پانچ سے لے کر بیس فی صدی تک۔ 1789ء میں ولیم پٹ نے اس کو دائمی اور قابل انفکاک قرار دے دیا۔ 1793ء اور 1882ء کی درمیانی مدت میں بنگال میں لگان کے 90 فیصدی اور شمالی ہند میں 80 فیصدی کے حساب سے مال گزاری کا تعین کیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ برطانوی حکومت نے گزشتہ مسلمان حکمرانوں کی قائم کردہ نظیر کی پیروی کی جو بھاری مالگزاری وصول کیا کرتے تھے۔ لیکن مسلمان حکمرانوں اور برطانوی حکومت میں فرق یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی تشخیص کردہ مال گزاری پوری طرح کبھی وصول نہیں کر پاتے تھے۔ انگریز جو مال گزاری تشخیص کرتے ہیں اسے سختی سے وصول بھی کرتے ہیں۔ بنگال کے آخری تاجدار نے اپنی حکومت کے آخری سال میں 1764ء کل 817,553 پاونڈ مال گزاری کی رقم وصول کی تھی لیکن تیس سال بعد انگریز حکمرانوں نے اسی صوبے میں 2,680,000 پاونڈ مالگزاری

وصول کی۔ 1802ء میں اودھ کے نواب نے الٰہ آباد اور شمالی ہند کے کچھ اور زرخیز اضلاع برطانوی حکومت کے حوالے کردیے۔ نواب ان اضلاع سے 13,52,347 پاؤنڈ مال گزاری وصول کیا کرتا تھا۔ لیکن تین سال بعد انھی اضلاع سے برطانوی حکومت نے 16,82,306 پاؤنڈ مال گزاری وصول کی۔ مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے زمین کی مجموعی پیداوار کے نصف کی شرح سے مال گزاری کا تعین کیا۔ بمبئی کے اس علاقے کی مال گزاری جو 1817ء میں مرہٹوں سے چھینا گیا تھا اس سال میں جس سال وہ علاقہ فتح کیا گیا 8,00,000 پاؤنڈ تھی لیکن فتح کے کچھ ہی سال بعد یہ رقم بڑھ کر 1500000 ہوگئی تھی جو اس کے بعد بھی برابر بڑھتی گئی۔ بشپ ہیبر نے پورے ہندوستان میں سفر کرنے کے بعد جس کے دوران اسے برطانوی علاقوں اور دیسی ریاستوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ 1826ء میں لکھا تھا "کوئی دیسی حکمران اتنی مال گزاری وصول نہیں کرتا جتنی ہم کرتے ہیں" کرنل برگس COLONEL BRIGGS نے 1830ء میں لکھا تھا "جس طرح مال گزاری ہندوستان میں وصول کی جاتی ہے اس کی نظیر یورپ اور ایشیا کی کسی حکومت کے دور میں نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ محصول زمینداروں کو ملنے والے لگان کی پوری رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔"

بنگال اور شمالی ہند کی حد تک رفتہ رفتہ انگریزی راج کے ابتدائی زمانے کی بھاری مال گزاری کی شرح میں کچھ کمی ہوگئی۔ بنگال میں استمراری بندوبست کردیا گیا۔ زراعت کی توسیع کے باوجود چونکہ مال گزاری میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے اس لیے یہ رقم لگان کے 35 فیصدی کے تناسب سے وصول ہوتی ہے (جس میں سڑکوں اور مفاد عامہ کے کاموں کے محاصل بھی شامل ہیں جو لگان پر عائد کیے جاتے ہیں) شمالی ہند میں استمراری بندوبست تو نہیں کیا گیا لیکن 1855ء میں مال گزاری کی شرح کم کرکے 50 فیصدی سے کچھ زیادہ مقرر کی گئی جس میں تمام دوسرے محاصل بھی شامل ہیں لیکن نئے نئے محاصل کا اضافہ بھی کیا گیا۔ محاصل کا حساب رواں لگان کے بجائے زیادہ سے زیادہ متوقع لگان کی بنیاد پر لگایا گیا یہاں تک کہ محصول کی شرح لگان کی 60 فیصدی ہوگئی۔

مدراس اور بمبئی کے حالات زیادہ خراب ہیں۔ چونکہ وہاں کے زیادہ تر علاقوں میں زمیندار نہیں ہوتے ہیں اس لیے مال گزاری کھیت جوتنے والوں کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ 1864ء میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ معقول لگان کے نصف کے حساب سے مال گزاری وصول کی جائے گی۔ لیکن اس وقت برطانوی حکومت پورا کا پورا معقول لگان بطور مال گزاری وصول کررہی ہے۔ کسان کے حصے میں اس کی محنت کی اجرت اور زراعتی ذخیرے کا منافع آتا ہے۔ مال گزاری پر ہر تیس سال بعد نظر ثانی کی جاتی

ہے۔ کسان کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کن بنیادوں پر مال گزاری میں اضافہ کیا گیا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ یا تو اضافہ کو تسلیم کرے یا موروثی کاشت سے دست بردار جائے اور بھوکوں مرنے لگے۔ مال گزاری کی غیر یقینی شرح نے زراعت کو مفلوج کر دیا ہے۔ یہ روپیہ پس انداز کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کسان غربت کا شکار رہتا ہے اور قرض کے جال میں پھنسا رہتا ہے۔

مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مال گزاری نہ صرف زیادہ اور غیر یقینی ہے بلکہ وہ اصول جن کی بنا پر اس میں اضافہ کیا جاتا ہے دوسرے متمدن ممالک کے اصول محاصل سے مختلف ہیں۔ دوسرے متمدن ممالک میں ریاست دولت اندوزی میں معاون ہوتی ہے، روپیہ پس انداز کرنے میں لوگوں کی مدد کرتی ہے، لوگوں کو دولت مند اور خوشحال بنانا چاہتی ہے اور اس کے بعد ریاست کے اخراجات کے لیے ان کی آمدنی کے ایک چھوٹے سے حصّے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہندوستان میں زمین سے حاصل کی ہوئی دولت کو پس انداز کرنے میں ریاست مخل ہوتی ہے۔ کسان کی آمدنی اور منافع اس سے چھین لیتی ہے اور ہر بندوبست میں مال گزاری کے مطالبے میں اضافہ کر دیتی ہے جس کی وجہ سے کسان ہمیشہ افلاس کے شکار رہتے ہیں۔ انگلستان، جرمنی، امریکہ، فرانس اور دوسرے ممالک میں ریاست لوگوں کی آمدنی میں اضافہ کرتی ہے، منڈیوں کی توسیع کرتی ہے، دولت آفرینی کے نئے ذرائع تلاش کرتی ہے، قوم کے فائدے نقصان کو اپنا فائدہ نقصان سمجھتی ہے اور قوم کے ساتھ خود بھی دولت مند ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ریاست نے نہ جدید صنعتیں شروع کیں اور نہ پرانی صنعتوں کی تجدید کی۔ اس کے برعکس وہ ہر نئے بندوبست کے موقع پر مداخلت کرتی ہے اور زمین کی پیداوار کا اتنا حصّہ چھین لیتی ہے جس کو وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔ مدراس اور بمبئی میں لوگ ہر نئے بندوبست کو اپنے اور ریاست کے درمیان ایک ایسا جھگڑا سمجھتے ہیں جس میں یہ طے ہوتا ہے کہ کتنا حصہ لوگ بچا پائیں گے اور کتنا حصّہ حکومت چھین لے گی۔ یہ ایسا جھگڑا ہے کہ جس کا تصفیہ کرنے کے لیے کوئی ضابطے یا قاعدے نہیں ہیں۔ ایسا جھگڑا جس میں حکام مال کی رائے قطعی فیصلے کا حکم رکھتی ہے اور ان کے فیصلے کے خلاف کسی عدالت میں اپیل دائر نہیں کی جا سکتی۔ مال گزاری بڑھتی رہتی ہے اور لوگوں کی تباہ حالی برقرار رہتی ہے۔

ایک ہندوستانی شاعر نے کہا ہے کہ بادشاہ کا لگایا ہوا محصول زمین کا وہ نم ہے جسے سورج چوس لیتا ہے اور زرخیز بنانے والی بارش کی صورت میں زمین کو واپس کر دیتا ہے۔ مگر ہندوستان کی زمین کا نم ہندوستان کے بجائے زیادہ تر دوسرے ملکوں پر برستا ہے۔ یہ ملک توقع کرتا ہے

کہ محاصل سے حاصل ہونے والی رقم خود اسی ملک میں خرچ کی جائے گی۔ بدترین حکومتوں کے زمانے میں بھی اس پر عمل ہوتا رہتا تھا۔ افغان اور مغل شہنشاہ اپنی فوجوں پر جو بڑی بڑی رقمیں صرف کیا کرتے تھے ان میں شہزادوں اور امیروں کے خاندانوں کے ساتھ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کے خاندان بھی مستفید ہوتے تھے۔ انھوں نے جو عالیشان محل اور یادگاریں تعمیر کیں اور جس قسم کی آسائش اور آرائش کے مظاہرے کیے اس سے ہندوستان کی صنعت کاروں اور دست کاروں کی ہمت افزائی ہوئی۔ امراء اور فوجی سالار صوبے دار، دیوان، قاضی اور صوبے اور ہر ضلع کے دوسرے چھوٹے موٹے حکام دربار کی نقل کرتے تھے۔ مسجدیں، مندر، سڑکیں، نہریں اور پانی کے ذخیرے نہ صرف داد و دہش بلکہ ان کی نام و نمود کی خواہش کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ بادشاہ چاہے سمجھدار تھا یا بے وقوف محاصل کی رقم بہر حال لوگوں کو واپس مل جاتی تھی۔ جس سے ان کی تجارت اور صنعتیں پھولتی پھلتی تھیں

لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں ایک تبدیلی آئی۔ کمپنی نے ہندوستان کو ایک بڑی زمینداری یا چائے کا ایک وسیع باغ سمجھا جس کے منافع ہندوستان سے باہر لے جاکر یورپ میں جمع کیے جائیں۔ انھوں نے تمام اعلیٰ عہدوں پر اپنے نامزد کیے ہوئے ایسے لوگوں کو ملازم رکھا جو مشرق میں منفعت بخش روزگار کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی آمدنی تجارتی مال خریدنے پر صرف کی اور اس مال کو یورپ میں بیچ کر اس کا منافع اپنی جیبوں میں رکھا۔ انھوں نے اپنے کل اثاثے پر ہندوستان سے بھاری سود وصول کیا۔ طرح طرح کے بھاری محاصل لگاکر وہ جتنا بھی روپیہ کھینچ سکے اسے یورپ لے گئے۔ صرف انتظامی کاموں پر کچھ روپیہ صرف کیا گیا وہ بھی ہاتھ روک کے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو 1833ء میں تجارت کرنے سے روک دیا گیا۔ 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کردی گئی۔ لیکن کمپنی کی پالیسی برقرار رہی۔ ان کے اصل کی ادائگی قرض سے کی گئی۔ یہ قرض ہندوستان کے ذمہ ڈالا گیا جس کا سود ہندوستانی محاصل سے ادا کیا جاتا ہے۔ کمپنی کی سلطنت شاہ انگلستان کو منتقل کردی گئی لیکن اس کی قیمت ہندوستانیوں کو ادا کرنی پڑی۔ ہندوستان کا قرض جو 1857ء میں 10,00,000 پاؤنڈ تھا۔ 1862ء میں بڑھ کے 7,00,00,000 پونڈ ہوگیا۔ چالیس سال کے پرامن مدت میں ہندوستان کا قرض برابر بڑھتا رہا اور اب (1901) 2,00,00,00,000 پونڈ ہوچکا ہے۔ ہندوستان کی آمدنی میں سے "گھریلو اخراجات" کے لیے جو رقم ہر سال انگلستان بھیجی جاتی ہے وہ اب بڑھ کے سولہ ملین ہوچکی ہے۔ ان یورپی حکام کی تنخواہیں دس ملین ہوجاتی ہیں جو قریب قریب سب اعلیٰ عہدوں پر قابض ہیں۔ ہندوستان کی خالص آمدنی کا نصف حصہ جو اس وقت چوالیس ملین پاؤنڈ ہے

ہر سال ملک کے باہر چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کا غم دوسرے ملکوں کے لیے باران رحمت بن گیا ہے اور ان کی زرخیزی میں اضافہ کر رہا ہے۔

ایک ایسے شخص کے لیے جس نے اپنی زندگی کے بہترین اور آسودہ ترین سال ہندوستان کی انتظامیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے گزارے ہوں یہ کام نہ صرف تکلیف دہ ہے بلکہ احسان فراموشی کے مترادف بھی ہے کہ اسے انتظامیہ کے کمزور پہلوؤں یعنی حکومت کی مالیاتی اور معاشی پالیسیوں کا تذکرہ کرنا پڑے ہے۔ ہندوستان کی معاشی کہانی سنانے اور ہندوستان کے شدید افلاس کی توجیہہ کرنے کا وقت آگیا ہے اس لیے میں یہ ناگوار فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کسی ملک میں اس قسم کے حالات پیدا کیجیے کہ اس کی صنعتیں تباہ ہو جائیں۔ اس کی زراعت پر غیر یقینی محاصل عائد کر دیے جائیں اور اس میں اس قسم کا مالیاتی نظام قائم کر دیا جائے کہ اس کی آدھی آمدنی ہر سال ملک کے باہر چلی جایا کرے تو دنیا کی خوش حال ترین قوموں کو بھی جلد قحطوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کوئی قوم صرف اس صورت میں خوش حال ہو سکتی ہے کہ اس کے دولت کے ذرائع بڑھیں اور محاصل کے ذریعے حاصل کی ہوئی رقم لوگوں میں اور لوگوں کے لیے صرف کی جائے۔ اگر کسی قوم کے دولت کے ذرائع کم ہو جاتے ہیں اور محاصل کے ذریعے حاصل کی ہوئی رقم ملک کے باہر خرچ کی جاتی ہے تو وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے یہ سیدھے سادے بدیہی معاشی قانون ہیں جو دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مدبروں اور حاکموں کو یہ جاننا چاہیے کہ ہندوستان کی غربت اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک ہندوستان کی صنعتوں کی تجدید نہ کی جائے۔ مال گزاری پر ایک معقول اور دائمی حد نہ عائد کی جائے اور ہندوستان کی فوجی آمدنی کا بڑا حصہ ملک کے اندر خرچ نہ کیا جائے۔

ہندوستان کے مدبروں اور حاکموں کو خصوصی اور دشوار حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک کے بعد ایک تین گورنر جنرلوں یعنی لارڈ ولیزلی، لارڈ منٹو اور لارڈ ہیسٹنگز نے چاہا کہ ہندوستان میں مال گزاری کی ایک دائمی حد مقرر کر دی جائے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے مطالبوں کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی اور ان کی تجویزوں کو مسترد کر دیا۔ شاہ انگلستان کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد تین وائسرائے یعنی لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس اور لارڈ رپن نے ایک دفعہ پھر مال گزاری کی ایک حد مقرر کرنے پر زور دیا لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے ان کی تجاویز ماننے سے انکار کر دیا۔ خود ہمارے زمانے میں برطانوی صنعت کاروں کے زیر اثر ہندوستان کے مفاد کے خلاف اور وائسرائے کی کونسل کی اکثریت کی مخالفت کے باوجود تین دفعہ محاصل درآمد و برآمد میں تبدیلی کی گئی۔ آسام کے چائے کے باغوں کے لیے جو مزدور بھرتی کیے جاتے ہیں وہ معاہدوں پر دستخط کرنے کے بعد اپنی آزادی

کھو دیتے ہیں۔ وہ معاہدوں پر یا تو غلط فہمی کی بنا پر دستخط کرتے ہیں یا انھیں دھوکہ دیا جاتا ہے۔ بہر حال موجودہ زمانے میں تین دفعہ کوشش کی گئی کہ ان کا مناسب تحفظ کیا جائے۔ لیکن آج بھی ان کے پاؤں میں قوانین کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اور اب بھی ان کے خلاف فوجداری قانون کے تحت چارہ جوئی کی جا سکتی ہے آسام کے چیف کمشنر عزت مآب مسٹر کاٹن نے ان کو مناسب اجرت دینے کے لیے حال میں جو تجویزیں پیش کی تھیں وائسرائے کی کونسل میں ان کی کاٹ چھانٹ کر دی گئی اور چونکہ چائے کے باغات کے برطانوی حصہ داروں نے ان پر اعتراض کیا اس لیے لارڈ کرزن نے ان کا نفاذ دو سال کے لیے ملتوی کر دیا۔ ان حالات میں ہندوستان کے حاکم مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ان طبقوں کے مفاد کو خطرہ لاحق ہوا جو پارلیمنٹ کے ووٹوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں تو تدارک کی ایسی تدابیر انگلستان کے صاحبان اقتدار نے مسترد کر دیں جس سے محاصل پر مناسب حدود عائد کیے جا سکتے ہیں اور ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی کے لیے تحفظی اقدام کو ختم کر دیا گیا۔

ہندوستان کے حکام ہندوستان کے لوگوں کی مدد کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔ حکومت ہند کے معنی ہیں وائسرائے اور ایگزیکٹو کاؤنسل کے اراکین یعنی کمانڈر انچیف، فوج کا ممبر، مفاد عامہ کے کاموں کا ممبر، مالیات کا ممبر اور قانون کا ممبر۔ اس کاؤنسل میں لوگوں کو نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ کاشتکار زمیندار، تاجر اور صنعت کار کسی کو نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ کاؤنسل میں ایک بھی ہندوستانی ممبر نہ کبھی رہا ہے اور نہ آج ہے۔ کاؤنسل کے تمام اراکین اخراجات کے حق میں ہیں۔ اخراجات کی کمی کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں۔ سر ڈیوڈ بار بور - Sir David Barbour نے کہا تھا "عام رجحان یہ ہے کہ محکمہ مالیات پر زور ڈالا جائے کہ وہ روپیہ خرچ کرے۔ اس کو زور کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے محکمے ہمیشہ زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر اصرار کیا کرتے ہیں۔ وہ برابر زوردار مطالبے کرتے رہتے ہیں۔ ایسے کوئی لوگ نہیں جو اس پر زور دیں کہ اخراجات میں کمی کی جائے، محاصل کی سطح نیچی کی جائے۔ لوگوں کے زراعتی مفاد کی حفاظت کی جائے اور ان کی صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کی جائے۔ چنانچہ حکومت ہند کی ساخت نے ایک بدیسی حکومت اور ہندوستان کے لوگوں کے درمیان اور زیادہ بُعد پیدا کر دیا اور اسے کمزور بنا دیا۔ ہر بڑے مسئلے کا فیصلہ ایک طرفہ ہوتا ہے۔ کاؤنسل کے اراکین لائق، عاقل، تجربہ کار اور ایماندار ہیں لیکن دنیا کا لائق سے لائق منصف بھی صرف ایک فریق کی شہادت سن کر صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ حکومت ہند نہایت ایمانداری سے اپنے فرائض ادا کرنے کی کوشش کے باوجود لوگوں کی مادی خوش حالی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے حالات

سے واقف نہیں ہے۔ ان کا تعاون حاصل نہیں کرنا چاہتی اور اس کا نظام ایسا ہے کہ وہ مفاد عامہ کے کام نہیں کر سکتی۔

جان اسٹورٹ مل نے کہا ہے "لوگوں کی اپنی حکومت ایک معنی رکھتی ہے اور حقیقت ہے لیکن ایسی حکومت جس میں ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں پر حکومت کریں نہ وجود رکھتی ہے اور نہ وجود رکھ سکتی ہے۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں کا صرف استحصال کر سکتے ہیں وہاں سے دولت حاصل کر سکتے ہیں اور انسانوں کو اپنے ہم وطنوں کے مفاد میں جانوروں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔"

اس سخت بیان میں اس سے کہیں زیادہ حقیقت پوشیدہ ہے جتنی کہ بادی النظر میں معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا جب ایک ملک کے لوگوں نے دوسرے ملک پر محکوموں کے مفاد میں حکومت کی ہو۔ انسان نے ایسا طریقہ حکومت ابھی دریافت نہیں کیا ہے جس میں محکوموں کی اپنے ملک کے انتظام میں کوئی آواز بھی نہ ہو اور ان کے مفادات کا تحفظ بھی ہو سکے۔ مزید براں اس قسم کے مطلق العنان حکومت سے جس میں محکوموں کی شرکت کا موقع نہ ملے۔ محکوم قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ انگلستان کی تجارت جو ہندوستان میں دلچسپی لینے کی سب سے بڑی وجہ ہے پچھلے دس سال سے ایک جگہ رکی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں سالانہ درآمد ہونے والے مصنوعات (جو سب کی سب نہ سہی مگر زیادہ تر برطانوی ہیں) پچھلے دس یا بارہ سال میں پچاس ملین پونڈ سے آگے نہیں بڑھ پائے۔ اس کے معنی ہیں کہ ہندوستان میں تین شلنگ فی کس کی کھپت ہے۔ اگر ہندوستان خوشحال ہوتا تو یہ کھپت بڑھ کے پانچ یا چھ شلنگ فی کس ہو سکتی تھی۔ غربت اور قحطوں میں اگر اضافہ ہوا تو ممکن ہے کہ کھپت اور کم ہو جائے۔ چنانچہ ہندوستان کی غربت کی وجہ سے برطانوی تجارت کم ہو رہی ہے جو ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لیے دولت کا ایک جائز اور موثر ذریعہ ہے۔ جیسا کہ لارڈ سیلس بری نے کہا ہے ہندوستان کی قومی آمدنی میں سے جو روپیہ "بغیر کسی راست معاوضے کے" باہر جا رہا ہے وہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے۔ اس روپے سے نہ انگلستان کو تقویت مل رہی ہے اور نہ اس کے اداروں کی آزادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کسی قوم کی صنعتی، عملی اور ترقیاتی صلاحیتیں اس دولت کو حاصل کرنے سے نہیں بڑھتی ہیں جس کا "راست معاوضہ" نہ ادا کیا جائے اس کا اطلاق افراد کی طرح قوموں پر بھی ہوتا ہے۔ جو روٹی ہم اپنی محنت سے حاصل کرتے ہیں اس سے ہمارے جسم کی نشو و نما ہوتی ہے اور ان میں طاقت آتی ہے۔ جو غذا بغیر محنت کے حاصل

کی جاتی ہے وہ ہمارے جسم کے لیے زہر کا کام کرتی ہے۔ گزشتہ ادوار اور قدیم قوموں کی تاریخ سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہم اس سے یہ درس نہ حاصل کریں کہ زمانہ قدیم اور زمانہ جدید میں محکوم سلطنتوں کے بڑے بڑے خراجوں نے آسائش پسندی اور اضمحلال کو جنم دیا ہے۔"

انگلستان نے ہندوستان کی سلطنت جس وقت فتح کی تھی اس وقت تک اس کی موجودہ نوآبادیات نے اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ اس امر کا امکان ہے کہ ہندوستان کی سلطنت اس وقت بھی برقرار رہے جب برطانوی نوآبادیات شاہ انگلستان کی اطاعت سے منہ موڑلیں حالانکہ اس وقت یہ بات بدعت سمجھی جائے گی۔ نوآبادیات کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پھل ہیں جو پکنے کے بعد درخت سے گر جاتے ہیں۔ اس بات کی پیشین گوئی کرنے کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے کہ موجودہ آبادی طاقت اور وسائل میں اضافے کے بعد اسٹریلیا اور اس کے ملحقہ جزائر اور کناڈا بیسویں صدی کے وسط تک بھی برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے رہیں گے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہاں کے لوگ ایمانداری کے ساتھ اس امر کے خواہشمند ہیں کہ تادیر انگلستان کے ساتھ ان کے روابط قائم رہیں۔ اس کی وجہ جذباتی وفاداری کے بجائے بقول لارڈ ڈفرن مفادات کے تحفظ کا جذبہ ہے۔ وہ اب بھی سمجھتے ہیں کہ ایک مغربی طاقت کے زیر حکومت رہ کر مغرب سے روابط دمراسم قائم رکھنا ان کے لیے مفید ہے انھوں نے انگلستان کا دامن پکڑا ہے' انھوں نے برطانوی حکومت سے ناتا جوڑا ہے اور وہ ایمانداری کے ساتھ چاہتے ہیں کہ یہ حکومت برقرار رہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ موجودہ حکومت مطلق العنان ہو اور انھیں اپنے ساتھ ذمہ داری میں شریک نہ کرے۔ موجودہ نظم ونسق کا طریقہ جس کی تشکیل وارن ہیسٹنگز اور کارنواس کے زمانے میں ہوئی اور جس کی منرو' الفنسٹن اور بین ٹنک نے اصلاح کی، ستر سال سے چل رہا ہے۔ اب اس میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ ہندوستان کی ابھرتی ہوئی طاقت وہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ وہ اپنے ملک کی اعلیٰ ملازمت میں منصفانہ حصے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سلطنت کی اعلیٰ کاؤنسلوں میں ان کی بھی آواز ہو۔ یہ بات آسان ہے کہ اس مطالبے کو نظر انداز کیا جائے' ہندوستان کے با اثر اور تعلیم یافتہ طبقوں کو بدظن کر دیا جائے' ملک میں ہیجان اور غیر اطمینانی کو بڑھا دیا جائے اور بلا شرکت غیرے ملک پر حکومت کر کے سلطنت کو کمزور کر دیا جائے۔ لیکن سمجھداری کی بات یہ ہوگی کہ حکومت ابھرتی ہوئی طاقتوں کی حمایت حاصل کرے' ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور با اثر لوگوں کو حکومت کے کاروبار میں شریک کرے۔ انھیں اس کا موقع دے کہ وہ اپنے مفادات یعنی صنعت وزراعت کی نمائندگی کریں اور قحطوں کی روک تھام اور ملک کے لوگوں کی

مادی حالت سنبھالنے کی ذمہ داری ان پر ڈالے۔ جان اسٹورٹ مل کا ایک اور اقتباس پیش کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے "انسانی، حالات کی یہ لازمی شرط ہے کہ دوسروں کے مفادات کے تحفظ کا ارادہ اپنی تمام ترسنجیدگی کے باوجود اس حالت میں نہ مفید ثابت ہوگا اور نہ محفوظ اگر ان کے ہاتھ باندھ دیے جائیں جن کے مفادات کا تحفظ مقصود ہو۔ انسان صرف اپنے ہاتھوں سے اپنے حالات زندگی میں ثبت اور دیرپا تبدیلی کرسکتا ہے۔"

ہندوستان کے لوگ ناگہانی تبدیلیوں اور انقلابوں کے شائق نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ نئے نئے آئین مقننہ کے عظیم دیوتا جوپیٹر JAFITER کے سر سے اسلحہ بند منروا (عقل و دانش کی دیوی) کی طرح نکلتے ہیں۔ وہ ان خطوط پر کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جن کا تعین کر دیا گیا ہے۔ وہ موجودہ حکومت کو تقویت پہنچانا چاہتے ہیں اور لوگوں سے اس کے روابط کو زیادہ مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ ہندوستانی اراکین سکریٹری آف اسٹیٹ کی کاؤنسل میں اور وائسرائے کی ایگزیکیٹو کاؤنسل میں ہندوستان کی زراعت اور صنعتوں کی نمائندگی کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر صوبے کی ایگزیکیٹو کونسل میں ہندوستانی اراکین شامل کیے جائیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تمام انتظامی مسائل پر بحث و مباحثہ کے دوران وہ عام لوگوں کے مفادات کی نمائندگی کریں۔ وہ اس امر کے خواہشمند ہیں کہ سلطنت اور اس کے عظیم صوبوں کے انتظام میں لوگوں کو شریک کیا جائے۔

ہندوستان کے ہر بڑے صوبے میں ایک مجلس قانون ساز ہے اور اس کے کچھ اراکین 1892ء کے ایکٹ کے تحت منتخب ہوتے ہیں یہ تجربہ کامیاب ہوا ہے۔ ان کاؤنسلوں کو اگر توسیع دی جائے تو اس سے نظم و نسق کو تقویت ملے گی اور لوگوں کی زیادہ حمایت حاصل ہو جائے گی۔ ہندوستان کا ہر صوبہ بیس تیس اضلاع پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ اضلاع انگلستان کی کاؤنٹیز کے مماثل ہیں اور ہر ضلع کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہر ضلع سے لیجسلیٹو کاؤنسل کے لیے ایک رکن چنا جائے۔ یہ انصاف کے عین مطابق ہے کہ ایک ایسے صوبے کی لیجسلیٹو کاؤنسل میں تیس منتخب اراکین ہوں جو تیس اضلاع پر مشتمل ہو اور جس کی مجموعی آبادی تیس لاکھ ہو۔ ہر ضلع یہ محسوس کرسکے کہ صوبے کے نظم و نسق میں اس کی بھی آواز ہے۔

گو ہندوستان کی اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے نظری طور سے 1833ء اور 1853ء میں اور 1858ء کے ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان کے ذریعے عام لوگوں کے لیے کھول دیے گئے ہیں لیکن اب وہ دروازے عملی طور سے لوگوں کے لیے کھول دینے چاہئیں اور ملازمتوں کو ان انگریز نوجوانوں

کے لیے محفوظ نہیں کیا جانا چاہیے جو روزگار کی تلاش میں مشرق آتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو سول سروس کے علاوہ تعلیم، انجینیرنگ، ڈاک، تار، پولیس اور طب کے محکموں میں بھی اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انگریز بھی ان محکموں میں کام کریں، ہم ان کی اعانت کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ تمام اعلیٰ عہدوں پر قابض ہو جائیں اور ہمارے وطن کے لوگ ان سے محروم رہیں

ہندوستان کے ہر ضلع میں ایک ضلع افسر ہوتا ہے جو انتظامی سربراہ ہونے کے ساتھ پولیس کا افسر اور مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے۔ اب ان فرائض کو تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔ اگر انتظامی سربراہ اور پولیس افسر کو مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل نہ ہوں تو ہندوستان کا نظم و نسق نقائص سے پاک ہو جائے اور زیادہ ہر دلعزیز ہو جائے۔

اس کے علاوہ ہر ضلع میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ ہوتا ہے اور گانو پنچایتیں بنائی جا رہی ہیں۔ یہ پنچایتیں قدیم گانو پنچایتوں کے جدید چربے ہیں۔ آئندہ صفحات میں قدیم گانو پنچایتوں کی بار بار وضاحت کی گئی ہے۔ ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ان کی حیثیت چھوٹی چھوٹی خود مختار جمہوریتوں کی سی تھی۔ انگریزی راج میں انھیں ناسمجھی اور تیزی کے ساتھ ختم کر دیا گیا لیکن جدید حالات میں ذرا دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ان کی تجدید کی جا سکتی ہے۔ ان پر اعتماد و اعتبار کرنا چاہیے۔ کچھ مفید عملی کام ان کے سپرد کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ گانو والوں کے تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات ان کے سپرد کیے جائیں تاکہ وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے بجائے آپس میں راضی نامے کرا دیں۔ ان عدالتوں کی بہ نسبت جو بیس یا تیس میل کے فاصلے پر ہوتی ہے گانو پنچایتیں موقع پر زیادہ بہتر فیصلے کر سکتی ہیں۔ اس طرح لاکھوں گواہ دور دراز عدالتوں میں حاضری دینے کے اخراجات اور تکالیف سے بچ جائیں گے۔ لاکھوں بھولے بھالے دیہاتی مقدمے بازی کے دکھوں سے بچ جائیں گے اور اس جھوٹ سے بچ جائیں گے جس کا درس عدالتوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گانو پنچایتیں اور ان کے اراکین حکومت اور لوگوں کے درمیان ایسی کڑی بن جائیں گے جو اس وقت معدوم ہے۔

یہ وہ تجاویز ہیں جن پر سمجھداری کے ساتھ عمل کر کے حکومت ہند عام لوگوں کی مزید حمایت حاصل کر سکتی ہے۔ ان میں سر دلعزیز ہو سکتی ہے اور ان کی بھلائی کے کام زیادہ موثر انداز سے کر سکتی ہے۔ علیحدگی پسندی سلطنت کو تقویت نہیں پہنچا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اور جلدی میں قوانین بنائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں میں بے اطمینانی اور بے چینی پھیل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

بھی ہوتا ہے کہ انگلستان میں مختلف سیاسی جماعتوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کی وجہ سے اتنی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی ہیں کہ لوگ حیران و پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اخراجات میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ دوسرے ملکوں کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اخراجات میں کمی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے اگر محصول دہندگان چوکس رہیں۔ اس کی وجہ سے انتظامیہ کے لیے لوگوں کی معاشی حالت کو سدھارنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے حالات کو صرف ان کے تعاون سے سدھارا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ، جدید خیالات رکھنے والا اور بااثر طبقہ انتظامی کاموں میں حصہ لینے اور اپنے ہم وطنوں کی حالت سدھارنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے حکومت سے بیگانہ و برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے قوم تباہ ہو جاتی ہے اور سلطنت کمزور ہو جاتی ہے۔

منرو، الفنسٹن اور بینٹنک جیسے گزشتہ دور کے ذی فہم حاکموں نے جس حد تک اس زمانے میں ممکن تھا، لوگوں کے اشتراک سے ان کی حالت سدھارنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کی سرگرمیوں کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علیحدگی پسندی اور بے اعتمادی کی پالیسی کی بجائے امن کی پالیسی کو برقرار رکھا جائے اور ترقی دی جائے۔ آج اس امر کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ برطانوی حکمران جو اس وقت ہندوستان کے حالات سے اتنے باخبر نہیں جتنے کہ پچاس سال پہلے ان کے پیش رو تھے، انھیں چاہیے کہ اپنی خبرہ کن علیحدگی سے باہر آئیں، لوگوں کے شانوں سے شانے ملا کر کھڑے ہوں، لوگوں کو اپنا دوست اور رفیق کار سمجھیں اور ان پر نظم و نسق کو سدھارنے کی ذمہ داری ڈالیں۔ ہر متمدن ملک میں کامیاب نظم و نسق کے لیے لوگوں کا تعاون ضروری ہوا کرتا ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک سے زیادہ ہندوستان میں اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔

نئی صدی کے آغاز کے وقت ہندوستان جن تکلیفوں اور بے اطمینانیوں میں مبتلا ہے اس کی نظیر گزشتہ دور کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک قحط ملک کو تباہ کر چکا ہے۔ پچھلے قحطوں کے مقابلے میں ملک کا زیادہ بڑا علاقہ اس قحط کا شکار ہوا۔ ہندوستان کے ان حصوں میں جو اس قحط سے متاثر نہیں ہوئے لوگوں کی گرتی ہوئی صحت نیم فاقہ کشی کی شہادت دیتی ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں روزانہ ان کی ضرورت کی غذا بھی میسر نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ عمر بھر کی فاقہ کشی نے ہمارے غریب طبقوں کو اس کا عادی بنا دیا ہے کہ وہ صرف اتنی غذا پر زندہ رہیں جو ان کی جسمانی نشو و نما کے لیے بھی کافی نہیں۔

ان حقائق کی موجودگی میں جماعتی تنازعے ختم ہو جاتے ہیں اور ہر وہ انگریز اور ہر وہ ہندوستانی جو نظم ونسق کا تجربہ رکھتا ہے اور انگریزی راج کا وفادار ہے محسوس کرتا ہے کہ اس کو ایسے طریقے تجویز کرنے چاہییں جس سے ہندوستانی حکومت کو لاحق ہونے والا سب سے بڑا خطرہ دور ہو جائے۔

لندن، دسمبر 1901ء

رمیش چندر

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ

دوسرے ایڈیشن میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں اور کچھ غلطیوں کی درستی کی گئی ہے۔ کچھ موضوعات INDIA IN THE VICTORIAN AGE میں شامل کر دیے گئے اور اس کتاب سے حذف کر دیے ہیں۔ دونوں کتابیں مجموعی طور سے ہندوستان میں انگریزی راج کے پورے دور پر مشتمل ہیں۔ یعنی 1857ء میں جنگ پلاسی سے لے کر موجودہ صدی اور موجودہ دور حکومت کے آغاز تک۔

لندن، اگست 1906ء

رمیش چندر

باب — 1

برطانوی راج کا ارتقا

"مجھے یقین ہے کہ میں ملک کو بچا سکتا ہوں، میرے علاوہ کوئی یہ کام نہیں کر سکتا،" عظیم ولیم پٹ نے جو بعد میں لارڈ چیتھم کے نام سے مشہور ہوا "ڈینگ نہیں ماری تھی بلکہ طاقت کے احساس اور بڑے واقعات کی اس پیش بینی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا جو کبھی کبھی ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جنھیں کسی اعلیٰ مقصد کی تحریک حاصل ہو۔ ولیم پٹ نے اپنے اس عہد کو پورا کر دکھایا۔ اس نے 1757ء سے 1761ء تک اپنے ملک کی قیادت کی اور عجیب بات یہ ہے کہ ان ہی پانچ برسوں میں جدید برطانوی سلطنت نے ارتقائی منازل طے کیں۔ انگلستان کے دوست فریڈرک اعظم نے 1757ء میں راش باغ Rossbach کے جنگ میں فتح حاصل کی، پرشیا PRUSSIA کی داغ بیل ڈالی اور فرانس کو نیچا دکھایا۔ ولف Wolfe نے 1759ء میں کیوبک کو فتح کیا اور 1760ء میں فرانسیسیوں سے پورا کناڈا چھین لیا۔ کلایو نے 1757ء کی پلاسی کی جنگ میں فتح پائی اور آئرکوٹ EYRE COOTE نے 1761ء میں ہندوستان میں فرانسیسیوں کو کچل دیا۔ پانچ سال میں انگلستان ایک عالمی طاقت بن گیا۔ فرانس کو یورپ میں نیچا دیکھنا پڑا اور ایشیا اور امریکہ سے اس کا نام ونشان مٹ گیا۔

ہماری کہانی کا تعلق ہندوستان میں برطانوی راج کے ارتقاء سے ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ برطانوی راج میں عام لوگوں کی معاشی حالت سے ہے۔ اگر ہم ابتدائی ابتدائی باب میں ان عظیم سیاسی واقعات کا اجمالی مطالعہ کر سکیں جن کی بنا پر 1757ء کی جنگ پلاسی سے لے کر 1837ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی تک کے اسّی برسوں میں جو اس جلد کا موضوع ہیں برطانوی سلطنت کی لگاتار توسیع ہوتی رہی تو ہم عام لوگوں کی معاشی تاریخ کا زیادہ صراحت کے ساتھ جائزہ لے سکیں گے۔

ان اسّی برسوں میں برطانوی مدبروں اور حاکموں کی تین نسلوں نے انگریزی راج کی توسیع اور استحکام کے لیے خون پسینہ ایک کیا۔ ہر نسل کی اپنی ایک علیحدہ اور امتیازی پالیسی تھی پہلے کلایو

اور وارن ہیسٹنگز کا دور آیا۔ یہ باجرأت مہم جوئی اور خطرناک جدوجہد کا دور تھا جس نے تاجروں کی ایک کمپنی کو ہندوستان میں با اقتدار طاقت بنا دیا۔ یہ اور دور پٹ کے 1784ء کے انڈیا ایکٹ (INDIA ACT) اور اس کے دوسرے سال وارن ہیسٹنگز کی ہندوستان سے واپسی پر ختم ہوگیا۔ دوسرا دور کارنوالس، ویزلی اور لارڈ ہیسٹنگز کا تھا۔ اس زمانے میں میسور اور مرہٹوں کے ساتھ آخری جنگیں لڑی گئیں جن کی وجہ سے کمپنی کو ہندوستان میں اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگیا۔ یہ دور 1817ء میں صوبہ بمبئی کے الحاق اور اس کے ایک سال بعد آخری پیشوا کی گرفتاری کے ساتھ ختم ہوگیا۔ تیسرا دور امن، اخراجات میں کمی اور نظم و نسق کے اصلاحات کا دور تھا۔ یہ الفنسٹن اور بین ٹنگ کا دور تھا جن کے نام آج بھی ہندوستان کے لوگ سازشوں اور فاتحوں کے ناموں سے زیادہ جذبہ احسان مندی کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں۔ یہ دور 1836ء میں لارڈ آک لینڈ کی ہندوستان میں آمد اور ایک سال بعد ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے ساتھ ختم ہوگیا۔

کلایو اور ہسٹنگز کا دور جو 1758ء میں ختم ہوا

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام 1600ء میں 70000 پاؤنڈ کے سرمائے سے عمل میں آیا تھا۔ کمپنی نے 1639ء میں سینٹ جارج کا قلعہ (FORT ST GEORGE) مدراس میں تعمیر کیا۔ شاہ چارلس دوم سے بمبئی کا جزیرہ خریدا اور 1687ء میں اپنے کارخانے وہاں منتقل کر دیے اور 1700ء میں کلکتہ میں بنگال کا صدر دفتر قائم کیا۔ فرانسیسیوں کا ایک تجارتی مرکز ہندوستان کے جنوب میں پانڈیچری کے مقام پر تھا اور دوسرا کلکتہ کے شمال میں چندر نگر کے مقام پر۔

فریڈرک اعظم کی جنگوں نے انگلستان اور فرانس کو یورپ، ایشیا اور امریکہ میں تقریباً بیس سال یعنی 1744ء سے 1763ء تک ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رکھا۔ انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے ملازمین نے ہندوستان میں بھی جھگڑا شروع کر دیا۔ ہندوستانی حکمرانوں سے معاہدے کیے، ایک دوسرے کے تجارتی مراکز کا محاصرہ کیا اور مشرق میں بھی ان رقابتوں کا مظاہرہ کرنے لگے جو مغرب میں ان کے باہمی نفاق کی وجہ تھیں۔ ان بیس برسوں میں جو تین جنگیں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہندوستان سے لڑی گئیں وہ کرناٹک کی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں۔

کرناٹک کی پہلی جنگ میں فرانسیسی کامیاب ہوئے۔ انھوں نے انگریزوں سے مدراس چھین لیا اور کرناٹک کے نواب کی فوج کو جو مدراس پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہتی تھیں، شکست دے کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا لیکن 1748ء میں معاہدہ اے لاشپیل (AIX-LA-CHAPELLE) کی رو سے مدراس انگریزوں کو واپس کر دیا گیا۔

فرانسیسی کمپنی کا ڈائریکٹر جنرل ڈیوپلے (DUPLEIX) بہت عالی حوصلہ تھا اور ہندوستان میں اپنے ہم وطنوں کے لیے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ وقتی طور سے اسے پوری کامیابی حاصل بھی ہوگئی۔ اس نے اپنے ایک دوست کی نظام دکن بننے میں مدد کی اور ایک دوسرے دوست کو کرناٹک کا نواب بنا دیا۔ چنانچہ وہ جنوبی ہند کا سب سے طاقت ور "شاہ گر" بن گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ انگریزوں کا اثر بالکل ختم ہو چکا ہے لیکن رابرٹ کلایو کی خلقی صلاحیتوں نے کایا پلٹ دی۔ پہلے اس نے کرناٹک کے دارالسلطنت ارکاٹ پر ایک دوسرے نواب کی طرف سے قبضہ کرکے جو وہاں کے نواب کا رقیب اور انگریزوں کا دوست تھا اور اس کا تحفظ کرکے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ آخر کار کرناٹک کی دوسری جنگ ختم ہوئی۔ انگریزوں کا دوست کرناٹک کی گدی پر قائم رہا اور فرانسیسیوں کا دوست دکن کے نظام کی حیثیت سے بحال رہا۔ اس طرح جنوبی ہند کی حد تک دو یورپی قوموں میں توازن طاقت قائم ہوگیا اور فرانسیسیوں نے تمام کا تمام مشرقی ساحل نظام سے حاصل کرلیا جو شمالی سرکاروں کے نام سے مشہور تھا۔

کرناٹک کی تیسری جنگ نے فرانسیسیوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ فرانسیسیوں کے وطن پرست اور جذباتی سالار لیلی (LALLY) نے مدراس کے قلعے کا محاصرہ کیا لیکن وہ اس کو فتح نہ کرسکا۔ ائرکوٹ (EYRE COOTE) نے 1761ء میں وانڈی واش کی لڑائی میں اس کو شکست دی اور پانڈیچری کے فرانسیسی تجارتی مرکز پر بڑی خوں ریز دفاعی جنگ کے بعد انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ حالانکہ معاہدہ پیرس کے بعد 1763ء میں پانڈیچری فرانسیسیوں کو واپس مل گیا لیکن ہندوستان میں ان کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ 1763ء کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی یورپی رقیب باقی نہیں رہا تھا۔

اس دوران بنگال میں اہم واقعات رونما ہو چکے تھے۔ بنگال کے نواب سراج الدولہ نے 1756ء میں انگریزوں سے کلکتہ چھین لیا تھا اور زیادہ تر انگریز قیدی گرمیوں کی ایک رات ایک ایسے تنگ و تاریک کمرے میں گھٹ کر مر چکے تھے جہاں ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ وہ کمرہ بلیک ہول (BLACK HOLE) کے نام سے مشہور ہے۔ کلایو نے یورپ سے واپسی کے اگلے سال کلکتہ پر پھر قبضہ کرلیا، نواب سے صلح کرلی اور اس کے بعد نواب کے خلاف ایک خفیہ سازش میں شریک ہوگیا۔ جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس نے نواب پر حملہ کر دیا۔ اسے 1757ء میں پلاسی کی لڑائی میں شکست دی۔ اور اس طرح قریب قریب پورا بنگال فتح کرلیا۔ کلایو نے فرانسیسیوں سے شمالی سرکاروں کا علاقہ بھی

چھین لیا۔ اور 1760ء میں یورپ واپس جانے سے پہلے اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کی ایک بڑی باا قتدار طاقت بنا دیا۔

اس کا طریقہ نظم و نسق کامیاب نہیں ثابت ہوا۔ نواب اور کمپنی کی دو عملی کے بوجھ سے بنگال کے لوگ بری طرح پس رہے تھے، مال گزاری وصول نہ ہو پائی اور 71-1770ء میں بنگال کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ایک بڑے قحط کا شکار ہو گیا۔

مدراس میں برطانوی حکام نے حیدر علی سے لڑائی مول لی جو اٹھارویں صدی کے نصف آخر کا سب سے زیادہ باصلاحیت ہندوستانی فوجی سالار تھا۔ حیدر علی نے کرناٹک کو تباہ کر ڈالا اور بڑھتا ہوا مدراس سے چند میل کے فاصلے تک پہنچ گیا۔ کاؤنسل خوفزدہ ہو گئی اور اس ہیبت ناک فاتح سے 1769ء میں صلح کر لی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے 1773ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ 1773 REGULATING ACT کے نام سے ایک قانون منظور کیا جس کا مقصد ہندوستان کے حالات کو سدھارنا تھا۔ اس ایکٹ نے ہندوستان میں نظم و نسق کو پارلیمانی سند دی اور ملک میں کمپنی کے تمام مقبوضہ علاقوں کے لیے گورنر جنرل کی حیثیت سے 1774ء میں وارن ہیسٹنگز کا تقرر ہوا جو اس وقت بنگال کا گورنر تھا۔

اس زمانہ میں وارن ہیسٹنگز سے زیادہ قابل اور باصلاحیت کوئی دوسرا انگریز ہندوستان میں نہیں تھا اور ملک اور وہاں کے لوگوں کے متعلق اس سے زیادہ گہری واقفیت کسی کو حاصل نہیں تھی۔ وہ 1750ء میں بہت نوعمری میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے مدراس اور بنگال میں اپنے ہم وطنوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اب جبکہ اس کے ہاتھ میں طاقت آگئی تھی نظم و نسق کو بہتر بنانے کی خواہش نے اس کو واقعی بے چین کر دیا تھا لیکن اس کی مالی دشواریاں، کونسل میں اس کی مخالفت جس کی سربراہی فلپ فرانسس Phillip Francis کر رہا تھا۔ بار بار ہونے والی جنگوں اور خود اس کی مطلق العنانی جبلّت نے اس سے اس قسم کے بے قاعدہ اور من مانے کام کروائے جنھوں نے کچھ مدت بعد برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اس پر مقدمہ لغاوت چلانے کے لیے مواد فراہم کیا۔

ہیسٹنگز نے شہنشاہ دہلی کو طے شدہ خراج ادا کرنا ترک کر دیا، شہنشاہ سے کورا اور الٰہ آباد کے علاقے چھین لیے اور 500000 پاؤنڈ میں نواب اودھ کے ہاتھ بیچ دیے اور اس نے رہیلوں کو کچلنے کے لیے انگریزی فوج کا ایک دستہ اودھ کے نواب کو دے دیا اور اس کے معاوضے میں اس سے 400000 پاؤنڈ وصول کیے۔

بمبئی کی حکومت نے مرہٹوں سے جھگڑا مول لے لیا تھا جو اس وقت ہندوستان کی سب سے

بڑی طاقت تھے۔ پیشوا یا مرہٹا ریاستوں کے اتحاد کے سربراہ کے عہدے کے دو دعوےدار تھے۔ بمبئی کی حکومت نے ان میں سے ایک سے فوجی امداد کا معاہدہ کر لیا اور اس طرح مرہٹوں سے پہلی جنگ کا آغاز ہوا۔ انگریزی دستوں نے گوالیار اور احمد آباد کو فتح کر کے کارنمایاں ضرور انجام دیے لیکن جنگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ حالانکہ انگریزوں کے دوست کو محض وظیفے پر اکتفا کرنا پڑا لیکن 1782ء کے صلحنامہ سے سال سیٹ اور کچھ دوسرے جزیرے انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔

میسور کے حیدر علی اعظم سے دوسری جنگ چھڑ گئی تھی۔ چار لڑائیوں میں اسے سر آئر کوٹ نے شکستیں دیں جو بیس سال پہلے وانڈی واش کے مقام پر فرانسیسیوں کو شکست دے چکا تھا لیکن حیدر علی ہر میدان جنگ سے اپنی فوجوں کو بحفاظت بچا لے گیا اور اس کی طاقت ختم نہیں کی جا سکی۔ دوسری طرف اس نے نہایت حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے دو برطانوی دستوں کا محاصرہ کر لیا جن کی کمان کرنل بیلی اور کرنل برتھ ویٹ کر رہے تھے اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔ لیکن 1782ء میں حیدر علی کا انتقال ہو گیا اور 1783ء میں اس کے لڑکے ٹیپو سلطان کے ساتھ صلح کے بعد جنگ ختم ہو گئی۔

اودھ کے نواب کے انتقال کے بعد وارن ہیسٹنگز نے 1775ء میں اس کے جانشین سے بنارس کی ریاست حاصل کر لی اور اس طرح بنارس کا راجہ انگریزوں کا باج گزار ہو گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے مقررہ خراج کے علاوہ راجہ سے بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کیا۔ اس پر بھاری جرمانہ کیا۔ اس کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا اور اس کی رعایا کو بغاوت پر مجبور کر دیا۔ راجہ کو گدی سے اتار دیا گیا اور اس کے ایک عزیز کو اس شرط پر راجہ بنا دیا گیا کہ وہ زیادہ خراج ادا کرے۔

ان حادثوں نے وارن ہیسٹنگز کے نظم و نسق کی چمک دمک کو ماند کر دیا۔ پٹ کا انڈیا ایکٹ - INDIA Act 1784ء میں منظور ہوا اور اس نے پہلی دفعہ ہندوستان میں کمپنی کے نظم و نسق پر شاہ انگلستان کے اختیار کو تسلیم کیا۔ اس کے اگلے سال وارن ہیسٹنگز ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔

1785ء تک ہندوستان میں برطانوی طاقت کے ارتقاء کی اجمالی تاریخ یہ ہے۔ کلایو اور ہیسٹنگز کی نسل کو جو فوجی کارروائیاں کرنی پڑیں ان میں فرانسیسیوں کے ساتھ لڑی جانے والی تین جنگیں تھیں جن کی بنا پر انگریزوں کو کرناٹک میں اقتدار اعلیٰ حاصل ہو گیا۔ سراج الدولہ اور میر قاسم سے لڑی جانے والی دو جنگیں تھیں جن میں بنا پر وہ بنگال کے مالک بن بیٹھے اور میسور اور مرہٹوں کے خلاف لڑی جانے والی پہلی لڑائیاں تھیں۔ 1785ء میں جب وارن ہیسٹنگز ہندوستان سے رخصت ہوا تو بنگال، شمالی سرکاریں، بنارس، مدراس اور بمبئی کے نواح کے کچھ علاقے کمپنی کے قبضہ و اختیار میں آ چکے تھے۔

2۔ کارنوالس، ویلزلی اور لارڈ ہیسٹنگز کا دور 1785ء — 1717ء

پٹ کا انڈیا ایکٹ 13 اگست 1784ء کو منظور ہوا تھا۔ کمپنی کے تمام سول فوجی اور مالی معاملات کی نگہداشت چھ کمشنروں کے سپرد کر دی گئی تھی جن کا تقرر شاہ انگلستان کیا کرتا تھا۔ ہندوستان کے نظم و نسق کو بہتر بنانے اور ان لوگوں کو سہولتیں فراہم کرنے کی واقعی خواہش پائی جاتی تھی جو انگریزی راج کے پہلے دور میں مظالم اور حکومت کی بدانتظامی کے شکار رہ چکے تھے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر خود بھی چاہتے تھے کہ حالات کو سدھارا جائے۔ انھوں نے وارن ہیسٹنگز کے بعد لارڈ کارنوالس کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا جو طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والا ایک بلند کردار اور نیک سرشت انسان تھا۔ انھوں نے نئے گورنر جنرل کو خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ وہ زمین سے متعلق سرکاری مطالبے کا استمراری بندوبست کرے تاکہ زراعت کو ترقی دینے اور خود اپنی حالت سدھارنے کے لیے لوگوں کو عوامل و محرکات مہیا کیے جا سکیں۔

طوفانی رات ختم ہوئی اور ہندوستان کے افق پر صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ لارڈ کارنوالس سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں وہ اس نے کر دکھائیں۔ اس نے نظم و نسق کو بہتر بنا دیا، اس نے کمپنی کو مجبور کر دیا کہ اپنے ملازمین کو وہ معقول مناسب تنخواہیں دے اور اس طرح ان لوگوں کو ایماندار حکام میں تبدیل کر دیا۔ اس نے ہندوستان کی سول سروس (CIVIL SERVICE) کی داغ بیل ڈالی جو آج تک بحال ہے۔ اس نے صرف میسور کے ٹیپو سلطان کے ساتھ ایک جنگ لڑی۔ اس نے سلطان کے دارالسلطنت کو فتح کر لیا اور اس کے بعد اس کے کچھ علاقے پر قبضہ کر کے اور اس کی طاقت کم کر کے اس سے صلح کر لی۔

1793ء میں ہندوستان کو خیرباد کہنے سے پہلے اس نے بنگال میں مال گزاری کا استمراری بندوبست کر دیا۔ یہ ایسا کام تھا جس نے برطانوی حکومت کے کسی دوسرے اقدام کی بہ نسبت ہندوستان میں برطانوی رعایا کو زیادہ خوش اور خوشحال کر دیا۔

1793ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر CHARTER کی تجدید ہوئی۔ پارلیمنٹ میں ہندوستان کے حالات پر مباحثہ ہوا اور پٹ کے 1784ء کے انڈیا ایکٹ کی خاص خاص دفعات کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہدایت کی گئی کہ وہ مشرق سے کاروبار کرنے والے دوسرے تاجروں کو بھی تین ہزار ٹن کے بقدر سامان جہازوں سے لے جانے کی سہولت فراہم کرے۔ کمپنی کی اجارہ داری کی یہ پہلی خلاف ورزی تھی۔ سر جان شور جو کچھ مدت بعد لارڈ ٹین ماؤتھ ہو گیا تھا، لارڈ کارنوالس کی جگہ گورنر جنرل

مقرر ہوا۔ اس نے بھی اپنے پیش رو کی پر امن پالیسی پر عمل کیا۔ لارڈ کارنوالس نے بنگال میں مال گزاری کا بندوبست استمراری کیا تھا۔ سر جان شور نے اس کی توسیع کی اور بنارس کو بھی اس میں شامل کر لیا۔

جان شور کے بعد لارڈ مارننگٹن LORD MORNINGTON گورنر جنرل مقرر کیا گیا جو بعد میں مارکوئز آف ویلزلی MARQUIS OF WELLESLY کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ 1798ء میں ہندوستان آیا جس طرح پچھلے زمانے میں فریڈرک اعظم کی جنگوں نے ہندوستان میں برطانوی پالیسی کو متاثر کیا تھا۔ اسی طرح اب نپولین بونا پارٹ NEPOLEON BONAPARTE کی جنگوں نے متاثر کرنا شروع کیا۔ ولیم پٹ یورپ کی بڑی طاقتوں کی مالی امداد کر رہا تھا تاکہ وہ نپولین کے خلاف اپنے فوجوں کو تیار رکھیں۔ ویلزلی پٹ کا دوست بھی تھا اور اس کا ہونہار شاگرد بھی۔ اس نے مالی امداد کی پالیسی ہندوستان میں بھی شروع کی لیکن مقررہ اصول سے ایک اہم انحراف بھی کیا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا کہ ہندوستانی راجوں اور نوابوں کو مالی امداد دے کر ان کی ناکارہ فوجوں کو برقرار رکھا جاتا اس لیے ویلزلی نے ان سے مالی امداد حاصل کی تاکہ ان کی ریاستوں میں برطانوی فوج کے دستے رکھے جائیں۔ اس سے کمپنی کو روپیہ بھی حاصل ہو گیا اور ہندوستانی حکمرانوں پر تسلط بھی۔ یہ پالیسی "امدادی فوجی معاہدوں" کی پالیسی کے نام سے مشہور ہے۔

میسور کے سیماب صفت ٹیپو سلطان نے فرانسیسیوں سے مذاکرات شروع کر دیے تھے اور اس کو کچلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیے میسور کے خلاف چوتھی جنگ شروع کی گئی اور ٹیپو اپنے دارالسلطنت کا دفاع کرتے ہوئے 1799ء میں مارا گیا۔ فاتحوں نے میسور کا کچھ علاقہ اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔ مرہٹوں کو کچھ علاقے کی پیش کش کی گئی لیکن شرط یہ تھی کہ وہ امدادی فوجی معاہدہ قبول کریں۔ انھوں نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ علاقہ دکن کے نظام کو دیا گیا لیکن اس امدادی رقم کے عوض جو برطانوی دستے کے سلسلے میں ہر سال نظام کو ادا کرنی ہوتی تھی۔ ویلزلی نے کچھ مدت بعد وہ علاقہ واپس لے لیا میسور کے بچے کھچے علاقے کو ایک چھوٹی سی ریاست کی شکل دے دی گئی اور پرانے ہندو راجہ کے خاندان کو اقتدار سونپ دیا گیا۔

چھوٹی موٹی ریاستوں کے معاملات زیادہ سرسری انداز میں طے کیے گئے۔ ویلزلی کو اپنے طریقہ کار میں جزوی تبدیلی کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوا کرتا تھا۔ 1799ء میں سورت کے نواب کا انتقال ہوا۔ ویلزلی نے اس کے بھائی کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر کے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور ریاست کو برطانوی قلمرو میں شامل کر لیا۔ تنجور کے راجہ کو تخت سے اتار دیا گیا۔ اس کا بھائی انگریزوں کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا اور وظیفہ قبول کر لیا۔ کرناٹک کا نواب 1801ء میں مر گیا۔ اس کے

جانشین نے تخت سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے شاہی خاندان کے ایک اور رکن کو گدی پر بٹھا دیا گیا جس نے اپنی ریاست انگریزوں کے حوالے کر دی اور خود وظیفہ قبول کر لیا۔ فرخ آباد کا کم عمر نواب سن بلوغ کو پہنچنے والا تھا۔ اس کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی ریاست انگریزوں کے حوالے کر دے اور وظیفہ قبول کر لے۔ اودھ کے نواب سے کہا گیا کہ یا تو وہ اپنی سلطنت کا دیوانی اور فوجی نظام انگریزوں کو منتقل کر دے یا ان سے امدادی فوجی معاہدہ کرے اور برطانوی دستوں کے اخراجات کی کفالت کے لیے اپنی نصف سلطنت انگریزوں کے حوالے کر دے۔ اس کو دوسری شرط منظور کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس نے 1801ء میں الہ آباد اور دوسرے اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیے۔

ہندوستان میں ایک بڑی طاقت اور تھی یعنی مرہٹے۔ لارڈ ویلزلی کی خوش قسمتی سے مرہٹا ریاستوں کے سربراہ پیشوا کو دوسرے مرہٹا سرداروں نے دبانا شروع کیا اور اسے مجبوراً انگریزوں سے مدد طلب کرنی پڑی۔ 1802ء میں اس کے ساتھ ایک فوجی امدادی معاہدہ کیا گیا اور انگریزی فوج کی مدد سے پیشوا تخت پر بیٹھ گیا۔ ان کے علاقے میں انگریزوں کی دخل اندازی سے دوسرے مرہٹا سردار یعنی سندھیا، ہلکر اور بھونسلا ششدر رہ گئے اور اس کے بعد وہ لڑائی شروع ہوئی جو تاریخ میں مرہٹوں کی دوسری جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ جنرل ویلزلی نے جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا۔ 1803ء میں آسائے اور آرگاؤں کے مقاموں پر سندھیا اور بھونسلا کی فوجوں کو فاش شکستیں دیں اور لارڈ لیک نے اسی سال لاسواری کے مقام پر سندھیا کی فوجوں کو پسپا کیا اور کامیابی کے ساتھ دہلی میں داخل ہو گیا لیکن ہلکر جو ابھی تک موقع کے انتظار میں تھا، جنگ میں شامل ہو گیا۔ مرہٹا ریاستوں کے اتحاد کے ساتھ لامتناہی جنگوں کا سلسلہ ابھی چل رہا تھا کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے جنگ جو گورنر جنرل کو واپس بلا لیا اور ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے ایک دفعہ پھر لارڈ کارنوالس کو گورنر جنرل مقرر کر دیا۔

مشرق کے عظیم گورنر جنرل نے انگلستان کے اس عظیم شہری سے ملاقات کی جس کی یورپی پالیسی ہندوستان میں خود اس کی پالیسی کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئی تھی لیکن ویلزلی جس وقت ولیم پٹ کے یہاں پہنچا تو وہ بستر مرگ پر تھا۔ جس طرح ویلزلی ہندوستان کی جنگوں کو ختم نہیں کرا سکا تھا اسی طرح ولیم پٹ یورپ کی جنگوں کو ختم نہیں کرا سکا تھا۔ ولیم پٹ نے یورپ کے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو لپیٹ دیجیے۔ اب دس سال تک اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی"۔ برخاست شدہ گورنر جنرل اور قریب المرگ وزیر اعظم کی یہ ملاقات بڑی رقت انگیز تھی۔ پٹ کی موت سے پہلے یہ آخری

موقع تھا جب اس نے کسی سے ملاقات کی۔ جنگیں جو اس کے بعد بھی جاری رہیں یورپ میں 1815ء میں ختم ہوئیں اور ہندوستان میں 1817ء میں۔

اس دوران ہندوستان میں عارضی طور سے امن قائم ہوگیا۔ ہندوستان پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد کارنوالس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے جانشین سرجان بارلو اور لارڈ منٹو نے مرہٹوں سے تعرض نہیں کیا۔ 1813ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی پھر تجدید ہوئی لیکن ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجارہ داری ختم کردی گئی۔ مشرق سے تجارت کرنے کا حق جو 1600ء میں ملکہ الزبیتھ نے ایک چارٹر کے ذریعہ صرف کمپنی کو دیا تھا اب تمام برطانوی تاجروں کو حاصل ہوگیا۔ صرف چین کی چائے اس سے مستثنیٰ تھی۔

1813ء میں لارڈ منٹو کے جانشین کی حیثیت سے لارڈ مائرا (LORD MOIRA) کا تقرر ہوا جو بعد میں مارکوئز آف ہیسٹنگز کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے زمانے میں مرہٹوں سے فیصلہ کن جنگ لڑی گئی۔ نیپال سے ایک جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ہمالیہ کا کچھ علاقہ کمپنی کے قبضہ میں آگیا اور پنڈاروں کی سرکوبی کے لیے فوجی کارروائی کرنی پڑی جو افغان، جاٹ، اور مرہٹا پیشہ ور رسالداروں کے جتھے تھے۔ یہ لوگ روپے کی خاطر ہر سردار یا دیسی حکمراں کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور خود بھی دیہات میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ آخر میں مرہٹوں کے ساتھ تیسری اور فیصلہ کن جنگ کی نوبت آئی۔ پیشوا نے 1802ء میں انگریزوں کے ساتھ امدادی فوجی معاہدہ کرلیا تھا لیکن یہ بندش اس پر شاق تھی۔ آخر کار وہ کھل کر سامنے آگیا اور دوسرے مرہٹا حکمرانوں نے اس کا ساتھ دیا۔ لیکن پیشوا کو کھرکی کے مقام پر شکست ہوئی۔ بھونسلا کی فوجیں سیتا بالدی کے مقام پر پسپا کردی گئیں اور ہلکر کی فوج کو سرجان مالکم Sir John Malcolm نے مہید پور کے مقام پر تباہ کردیا۔ پیشوا کے علاقے پر 1817ء میں قبضہ کرلیا گیا اور اس کو بمبئی کا صوبہ بنا دیا گیا۔ اگلے سال پیشوا گرفتار ہوگیا اور اس کا وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ چھوٹے موٹے مرہٹا سرداروں یعنی سندھیا، ہلکر، بھونسلا اور گیکواڑ کو ان کی ریاستیں واپس کردی گئیں اور ان پر انگلستان کو اختیار اعلیٰ حاصل ہوگیا۔

ہندوستان میں انگریزی راج کے دوسرے دور کی سیاسی اور فوجی کارروائیوں کی اجمالی تاریخ یہ ہے۔ اس دور کے سول نظم ونسق کا سب سے اہم اور مفید کارنامہ مال گزاری کا بندوبست استمراری تھا جو 1793ء میں بنگال میں ہوا۔ 1795ء میں بنارس میں کیا گیا اور 1802ء اور 1805ء کی درمیانی مدت میں اس کی توسیع شمالی سرکاروں اور دوسرے علاقوں میں کی گئی۔

3۔ منرو، الفنسٹن اور بین ٹنک کا دور۔ 1817ء لغایتہ 1837ء

اب ہم ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جو ہندوستان اور یورپ میں امن، اخراجات میں کمی اور اصلاحات کا دور تھا۔ یورپ کے لوگ نپولین کی جنگوں سے تنگ آچکے تھے۔ واٹرلو WATER LOO کی لڑائی کے بعد امن کا ایک طویل وقفہ انھیں نصیب ہوا۔ ہر جگہ اصلاحات کی اور عام لوگوں کے لیے شہری حقوق حاصل کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ فرانس میں طویل جدوجہد کا نتیجہ 1830ء کے انقلاب کی صورت میں رونما ہوا۔ انگلستان میں اس کی وجہ سے 1832ء کا ریفارم ایکٹ REFORM ACT وجود میں آیا۔ بلجیم نے ہالینڈ سے علیحدگی اختیار کی اور وہاں قومی حکومت قائم ہوگئی۔ جرمنی اور اٹلی میں قومی اتحاد اور قومی آزادی کی تحریکات چلنے لگیں۔ یونان 1830ء میں آزاد ہوگیا۔ 1833ء میں کسی کو غلام بنانے کی مخالفت کردی گئی۔ وقت کا تقاضہ تھا کہ اصلاحات کی جائیں اور ہر جگہ عام لوگوں کی حالت سدھاری جائے۔ ہندوستان کے نظم و نسق کی پالیسی پر بھی اس کا اثر پڑا۔

لارڈ ہیسٹنگز نے 1817ء میں کلکتہ میں ہندو کالج قائم کیا۔ 1823ء میں اس کی جگہ لارڈ ایمہرسٹ Lord Amherst ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ 1826ء میں ایک چھوٹی سی جنگ برما کے ساتھ ہوئی جس کے نتیجے میں آسام، اراکان اور ٹیناسیرم TENASSERIM کمپنی کی قلمرو میں شامل ہو گئے۔ دو سال بعد لارڈ ولیم بین ٹنک نے کلکتہ آکر گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اس نے بھی کورگ پر قبضہ کر کے اور 1830ء میں میسور کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر برطانوی علاقے کی توسیع کی لیکن ان چھوٹی موٹی علاقائی تبدیلیوں کو اس دور کے اہم کارناموں سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس دور کے اہم کارنامے وہ اصلاحات ہیں جو منرو، الفنسٹن اور بین ٹنک سے منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ عدالتی نظام ناکام ہو چکا تھا جس کی تنظیم وارن ہیسٹنگز اور کارنوالس کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس ناکامی کا سبب یہ تھا کہ انتظامی کاموں میں ملک کے باشندوں کو موثر انداز سے شریک نہیں کیا گیا تھا۔ عدالتوں میں مقدموں کا ڈھیر ہوگیا۔ برطانوی جج مقدموں کے فیصلوں میں دیر لگاتے تھے جس کی وجہ سے انصاف نہیں ہو پاتا تھا۔ کمپنی کے علاقوں میں جرائم کی تعداد بڑھنے لگی۔ خفیہ مخبروں کی خدمات حاصل کرنے اور شک کی بنا پر لوگوں کو گرفتار کرنے کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ 1810ء میں لارڈ منٹو نے لکھا تھا کہ بنگال کے ہر حصے میں چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں جن میں لوگ قتل بھی کر دیے جاتے ہیں۔ ان حالات میں کمپنی کے قابل ترین ملازموں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ ہندوستان کے نظم و نسق کا

بڑا حصہ یہاں کے لوگوں کے سپرد کر دیا جائے۔ کلکتہ کے جج سر ہنری اسٹریچی نے لکھا تھا" ہندوستان جیسے متمدن اور کثیر آبادی والے ملک میں صرف مقامی لوگوں کی وساطت سے انصاف کیا جاسکتا ہے۔"

ٹامس منرو THOMAS MANRO ہندوستان میں وہ پہلا انگریز تھا جس نے اس اصول کو عملی شکل دی اور ہندوستان کے لوگوں پر اعتماد و اعتبار کرنے کی پالیسی کا آغاز کیا۔ وہ 1780ء میں ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ اس نے حیدر علی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اور 1793ء 1799ء اور 1800ء میں میسور اور دکن سے حاصل کیے ہوئے علاقوں میں مال گزاری کا بندوبست کر کے اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ وہ 1814ء میں ایک کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے جب دوبارہ ہندوستان آیا تو اس کے سپرد مدراس کے عدالتی نظام پر نظر ثانی کرنے اور اس کے سدھارنے کا کام کیا گیا۔ اس نے وہ مشہور ریگولیشن بنائے جن کی بنا پر ہندوستان کے لوگوں کو اہم انتظامی کاموں میں زیادہ حصہ لینے کے مواقع نصیب ہوئے۔ تیسری بار آخری بار منرو 1820ء میں مدراس کے گورنر کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ اس نے مدراس میں رعیت واری بندوبست کو رواج دیا۔ 1827ء میں ہندوستان میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ لوگ اس سے محبت کرتے تھے جن کے لیے اس نے پوری زندگی کام کیا تھا اور اس کی موت نے انھیں غمگین بنا دیا تھا۔

جو کام سر ٹامس منرو نے مدراس میں کیا وہی ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن MOUNTSTUART ELPHINSTON نے بمبئی میں کیا۔ منرو سے الفنسٹن اٹھارہ سال چھوٹا تھا۔ وہ بھی 1796ء میں نوعمری میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور 1803ء میں جب ڈیوک آف ولنگٹن نے اسائی کی لڑائی میں فتح حاصل کی۔ اس وقت الفنسٹن اس کا ایک قسم کا سیاسی سکریٹری تھا۔ لارڈ منٹو نے 1808ء میں اسے ایک مشن پر افغانستان بھیجا۔ اس نے افغانوں اور ان کے ملک کے متعلق پہلی اور غالباً واحد معیاری کتاب لکھی۔ وہاں سے واپسی پر وہ 1811ء میں ریزیڈنٹ کی حیثیت سے پونا بھیجا گیا جہاں پیشوا رہتا تھا۔ اس نے مرہٹوں سے آخری جنگ میں اہم حصہ لیا۔ مرہٹوں کے متعلق اس کے وسیع تجربے کی بنا پر 1819ء میں مرہٹوں کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد اسے بمبئی کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ وہ آٹھ سال تک اس اعلیٰ عہدے کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس نے بمبئی کے ریگولیشنوں کو منضبط کیا، ہندوستان کے لوگوں کو انتظامی محکموں میں زیادہ ملازمتیں دیں۔ اور صوبے میں تعلیم کو فروغ دیا۔ مدراس میں سر ٹامس منرو کے انتقال کے چند مہینے بعد نومبر 1827ء میں وہ بمبئی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔

چنانچہ 1829ء میں جب بین ٹنک گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو اصلاحات کا کام آدھے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ بین ٹنک کی گورنر جزلی کے ابتدائی زمانے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہ انیسویں صدی کی ابتدا میں مدراس کے گورنر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر وطن واپس گیا تھا۔ لیکن ایک بغاوت ہو جانے کی وجہ سے اس کو واپس آنا پڑا تھا۔ یورپ کی سیاست میں اس نے حصہ لینا شروع کیا۔ 1814ء میں اس نے جینوا پر قبضہ کر لیا۔ اس کا پرانا آئین بحال کر دیا اور ایک آزاد متحدہ اٹلی کے تصور کو جنم دیا۔ چودہ سال بعد چوّن سال کی عمر میں وہ گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔

منرو نے جن ریگولیشنوں کی سفارش کی تھی وہ مدراس میں قانون کی شکل پا چکے تھے اور ان کے تحت دیوانی عدالتوں کا قریب قریب سب کام ہندوستانی ججوں کو منتقل ہو چکا تھا۔ الفنسٹن نے بمبئی میں بھی اسی قسم کے اصلاحات نافذ کر دی تھیں۔ لارڈ ولیم بین ٹنک نے بنگال میں دیوانی عدالتوں کا کام ہندوستانی ججوں کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کے اختیارات اور تنخواہوں کا تعین فراخ دلی کے ساتھ اور جامع انداز سے کر دیا تھا۔ مال گزاری کے انتظام میں یورپی کلکٹروں کے مددگاروں کی حیثیت سے ہندوستانی ڈپٹی کلکٹروں کا تقرر کیا گیا۔ انتظامی کاموں میں ہندوستان کے لوگوں کو ملازمتیں دے کر لارڈ ولیم بین ٹنک نے ایک ملین کے سالانہ خسارے کو دو ملین کی بچت میں تبدیل کر دیا 1833ء میں اصلاح شدہ محال واری بندوبست شمالی ہند میں شروع کیا گیا اور 1835ء میں رعیت واری بندوبست بمبئی میں۔

1833ء میں کمپنی کے چارٹر کی پھر تجدید کی گئی لیکن اس دفعہ یہ شرط رکھی گئی تھی کہ کمپنی تجارت ترک کر دے اور آئندہ محض ہندوستان پر حکومت کرے۔ اس وقت یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ ہندوستان کا کوئی باشندہ "اپنے مذہب، جائے پیدائش، نسل، رنگ یا ان میں کسی کی بنا پر کوئی حیثیت، عہدہ یا ملازمت حاصل کرنے سے محروم نہیں رکھا جا سکے گا۔"

لارڈ ولیم بین ٹنک نے واپس جانے کے بعد سر چارلس میٹکاف SIR CHARLES METCALFE ہندوستان کا قائم مقام گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس کا جانشین لارڈ آک لینڈ LORD AUCKLAND تھا جو 1836ء میں ہندوستان آیا۔ اس کے ہندوستان آنے کے ایک سال بعد ملکہ وکٹوریہ انگلستان کے شاہنشاہی تخت پر بیٹھی۔

ان تمام ملکوں کے لیے جو برطانوی سلطنت میں شامل ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی ایک یادگار تاریخی واقعہ ہے۔ لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی حد تک اس نے

ایک تاریخی دور ختم کر دیا اور دوسرا شروع کر دیا۔ 1837ء سے قبل بنگال، مدراس اور بمبئی کے صوبوں کے علاوہ شمالی ہند کے ایک بڑے علاقے پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی عظیم سول سروس کی تنظیم ہو چکی تھی۔ بہت سے ناکامیوں اور ناکام تجربوں کے بعد ملک میں اطمینان بخش عدالتی نظام قائم ہو چکا تھا۔ 1793ء میں بنگال میں، 1820ء میں۔ مدراس میں، 1833ء میں شمالی ہند میں اور 1835ء میں بمبئی میں مال گزاری کا دشوار تر مسئلہ سمجھداری یا ناسمجھی کے ساتھ حل کیا جا چکا تھا۔ ملک میں امن و امان قائم ہو چکا تھا۔ 1833ء میں کمپنی تجارت ترک کر چکی تھی اور ہندوستان کے حکمراں کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ 1817ء میں کلکتہ میں اور 1834ء میں بمبئی میں انگریزی کالج کھل چکے تھے۔ 1836ء میں اخباروں کو آزادی حاصل ہو چکی تھی۔ یورپ اور ہندوستان کے درمیان دخانی جہاز چلنے لگے تھے۔ اخراجات میں کمی ہو گئی تھی۔ سالانہ بجٹ میں بچت ہونے لگی تھی۔ لوگوں کو زیادہ وسیع پیمانے پر انتظامی کاموں میں شریک کیا جانے لگا تھا کم از کم اصولاً ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی کو برطانوی حکومت کا اعلیٰ مقصد سمجھا جانے لگا تھا۔ اس خواہش کا لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ ان میں ذہنی بیداری پیدا ہونے لگی۔ ترقی اور پیش قدمی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1837ء کے لگ بھگ ہندوستان کی تاریخ میں ایک موڑ آتا ہے اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں برطانوی سرگرمیوں کے اسّی سال کی یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

باب۔ 2

بنگال کی داخلی تجارت (1757ء لغایت 1765ء)

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی اٹھارہویں صدی میں سڑکوں اور کشتیوں کے ذریعے مال کے نقل و حمل پر چنگی لگتی تھی لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک شاہی فرمان حاصل کر لیا تھا جس کی رو سے اس کے درآمدات و برآمدات ان محاصل سے مستثنیٰ تھے۔ وہ سامان جو کمپنی یورپ سے درآمد کرتی تھی اور وہ مال جو یورپ کو برآمد کرنے کے لیے ہندوستان میں خریدا جاتا تھا اس قسم کے محاصل ادا کیے بغیر ملک سے گزر سکتا تھا۔ کمپنی کے مال کو چنگی سے بچانے کے لیے برطانوی صدر یا کارخانوں کے انگریز کے حکام اعلیٰ کی سندیں چنگی کی چوکیوں پر دکھادی جاتی تھیں۔

1757ء میں پلاسی کی فتح نے بنگال میں انگریزوں کا اثر بڑھا دیا تھا۔ کمپنی کے ملازمین بھی، جو بنگال میں نجی داخلی تجارت کیا کرتے تھے، مطالبہ کرنے لگے کہ جس طرح کمپنی کے درآمدات برآمدات محصول سے مستثنیٰ ہیں اسی طرح ان کی ذاتی تجارت بھی مستثنیٰ کر دی جائے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ آئندہ برسوں میں بنگال کی معاشی، تجارتی اور سیاسی تاریخ کے عوامل اس مطالبے میں مضمر تھے۔

بنگال کے نواب کمپنی کے اس حق کو تسلیم کرتے تھے کہ وہ محاصل ادا کیے بغیر درآمد اور برآمد کا کاروبار کر سکتی ہے لیکن کمپنی کے ملازم بھی جو نجی داخلی تجارت کر رہے تھے اور بنگال کے ایک حصے سے دوسرے حصے کو اپنا مال لے جایا کرتے تھے مطالبہ کرتے تھے کہ ان کا نجی مال بھی چنگی سے مستثنیٰ رہے۔

جنگ پلاسی کے بعد لارڈ کلایو نے 1757ء میں میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا تھا۔ میر جعفر ایک ناکارہ حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے انگریزوں سے جو وعدے کیے تھے انھیں پورا نہیں کر سکا۔ چنانچہ 1760ء میں اسے تخت سے اتار دیا گیا اور میر قاسم کو نواب بنا دیا گیا۔ نئے نواب نے وعدہ کیا کہ وہ تین ضلعوں یعنی بردوان، مدنا پور اور چٹاگانگ کی تمام آمدنی کمپنی کے حوالے کر دے گا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ بقایا

رقم جو میر جعفر کے ذمے تھی ادا کر دے گا اور جنوبی ہند کی جنگوں کے لیے کمپنی کو پانچ لاکھ روپیہ کا عطیہ دے گا۔
میر قاسم نے نہایت وفاداری کے ساتھ اپنے وعدے پورے کیے اور دو سال سے بھی کم مدت میں انگریزوں کے تمام مالی مطالبے پورے کر دیے۔

لیکن داخلی تجارت کے تعلق سے دشواریوں میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا۔ کمپنی کے ملازم محصول ادا کیے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنا مال لے جایا کرتے تھے جبکہ مقامی تاجروں کو بھاری چنگی ادا کرنی پڑتی تھی۔ مقامی تاجر تباہ ہونے لگے۔ نواب کی آمدنی کم ہونے لگی اور کمپنی کے ملازمین نے تجارت پر اجارہ حاصل کر لیا اور بڑے بڑے منافعے کمانے لگے۔

ہنری ونسٹارٹ HENRY VANISTART نے جو 1760ء میں کلایو کی جگہ گورنر ہوا تھا۔ اس بڑھتی ہوئی خرابی کی نشاندہی کی اور اس کے اسباب کی وضاحت کی۔ "جہاں تک تجارت کا تعلق ہے میر جعفر سے کسی نئی رعایتوں کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کمپنی کو نئی رعایتوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ان حقوق سے مطمئن ہے جو 1717ء میں حاصل ہوئے تھے۔ کمپنی تو صرف ان ادائیگیوں سے بچنا چاہتی ہے جو نواب من ملنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے وصول کرنا چاہتے ہیں لیکن جب ملک میں ہمارا اثر قائم ہو گیا تو کمپنی کے ملازموں نے یا ان لوگوں نے جو ان کی طرف سے کام کرتے تھے نئی نئی بدعتیں شروع کیں۔ انھوں نے ان چیزوں کی تجارت شروع کر دی جن کی تجارت پہلے ممنوع تھی اور ملک کے معاملات میں مداخلت کرنے لگے۔"

مسٹر ورلسٹ VERELST نے بھی جو بعد میں گورنر ہوا تھا' اسی قسم کی باتیں لکھیں۔

"چنگی ادا کیے بغیر تجارت کی جاتی تھی۔ اس تجارت کے سلسلے میں تب سے مظالم کیے جاتے تھے۔ انگریزوں کے گماشتے نہ صرف عام لوگوں کو نقصان پہنچاتے تھے بلکہ حکومت کی پرواہ بھی نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی نواب کے ملازمین دست اندازی کی جرأت کرتے تھے تو انھیں باندھ کر پیٹا جاتا تھا۔ میر قاسم سے جنگ کی فوری وجہ یہ تھی۔"

خود نواب میر قاسم نے کمپنی کے ملازمین کی دراز دستیوں کے خلاف انگریز گورنر سے سخت احتجاج کیا تھا۔

"کلکتے میں واقع انگریزی فیکٹری سے قاسم بازار' پٹنہ اور ڈھاکہ تک انگریز اعلیٰ افسران کے گماشتے اور ملازم حکومت کے ہر ضلع میں کلکٹر' صاحب املاک' زمیندار اور تعلقدار بنے بیٹھے ہیں۔ وہ کمپنی کا نشان استعمال کرتے ہیں اور میرے ملازموں کے تمام اختیارات انھوں نے چھین لیے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے

گماشتے اور دوسرے ملازمین ہر ضلع، ہر گنج، پرگنہ اور گانو میں تیل، مچھلی، بھوسے، بانس، چاول، دھان، چھالی اور دوسری چیزوں کی تجارت کرتے ہیں۔ ہر شخص جس کے پاس کمپنی کی سند ہوتی ہے خود کو کمپنی سے کم نہیں سمجھتا ہے۔"

میر قاسم کی شکایت بے بنیاد نہیں تھی۔ ایلس Ellis نے جو پٹنہ میں کمپنی کا نمائندہ تھا، خاص طور سے نواب کے خلاف قابل نفرت حد تک معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ ایک آرمینی تاجر پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے نواب کے لیے تھوڑا سا شورہ خریدا۔ اس کو کمپنی کے حقوق کی خلاف ورزی سمجھا گیا اور ایلس نے اس تاجر کو گرفتار کر کے ہتھکڑی اور بیڑی کے ساتھ کلکتہ روانہ کر دیا۔ کہا گیا کہ برطانوی فوج سے بھاگے ہوئے دو سپاہیوں نے مونگیر میں واقع نواب کے قلعے میں امان لی ہے۔ ایلس نے قلعہ کی تلاشی لینے کے لیے اپنے سپاہی بھیجے لیکن بھگوڑے سپاہی وہاں نہیں ملے۔ وارن ہیسٹنگز نے جو اس وقت گورنر کی کونسل کا ایک رکن تھا، نواب کے مقابلے میں آنے کو نامناسب سمجھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان واقعات کی بنا پر نواب سے تعلقات خراب ہو جانے کا امکان ہے۔

"جہاں تک مسٹر ایلس کا تعلق ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نواب کے تعلق سے اس کا رویہ اس قدر ناعاقبت اندیشانہ ہے اور نواب کے ساتھ اس کی دشمنی اتنی شدید اور واضح ہے کہ کمپنی اگر قرار واقعی حالات سے مطلع ہو جائے تو وہ اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کرے۔ ان واقعات کی بنا پر دنیا دیکھتی ہے کہ نواب کی کھلم کھلا توہین کی جاتی ہے۔ اس کے ملازموں کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے کہ اس علاقے کا انگریز حاکم اعلیٰ نواب کے حقوق صوبہ داری تسلیم نہیں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ نواب سے ہمارے تعلقات خراب ہو جائیں۔"[1]

وارن ہیسٹنگز کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ وہ کمپنی کے ملازموں کی نجی تجارت کے خلاف مسلسل احتجاج کرتا رہا جس کا محصول وہ ادا نہیں کرتے تھے اور اس کے نتیجہ میں بنگال کے لوگوں کی تجارت کو جو نقصان پہنچ رہا تھا اس پر اظہار افسوس کرتا رہا۔ خود غرضی نے اس کی آنکھیں بند نہیں کی تھیں اور اپنے ہم وطنوں کی طرف فطری میلان طبع کے باوجود اس نے بنگال کے لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی زوردار الفاظ میں مذمت کی۔

"میں اس امر کی اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ ان شکایتوں کی طرف مبذول کراؤں جن کا تدارک

---

[1] ہیسٹنگز کے خطوط گورنر کے نام مورخہ 13 اور 26 مئی 1762ء

ضروری ہے۔ اگر ان کا فوری تدارک نہیں کیا گیا تو یہ شکایتیں کمپنی اور نواب کے درمیان پائدار اور مضبوط دوستانہ مراسم کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیں گی۔ میرا مقصد ان مظالم سے ہے جن کے لیے انگریزوں کا نام استعمال کیا جاتا ہے۔ . . . . . مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جہاں جہاں سے میں گزرا وہاں متعدد برطانوی جھنڈے لہرا رہے تھے اور جو کشتی مجھے راستے میں ملی اس پر بھی جھنڈا لگا ہوا تھا۔ جھنڈے لگانے کے حق کی کوئی بھی بنا ہو (میں نے اپنی آنکھوں کی شہادت پر اعتماد کیا اور ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے راستہ میں رکا نہیں) لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زیادتی نہ نواب کی آمدنی کے لیے مفید ہے، نہ ملک کے امن و امان کے لیے اور نہ ہمارے قومی وقار کے لیے بلکہ ان سے ان تینوں میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ سپاہیوں کے ایک دستے نے جو ہمارے آگے چل رہا تھا اس امر کا کافی ثبوت دیا کہ ان لوگوں کو اگر ان کی مرضی کے مطابق کام کرنے دیا جائے تو وہ غارت گری کے ساتھ بدتمیزی کے مظاہرے بھی کر سکتے ہیں۔ راستے میں مجھ سے ان کی بہت سی شکایتیں کی گئیں۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی چھوٹے موٹے قصبے اور سرائیں خالی ہو جایا کرتی تھیں۔ لوگ اس ڈر سے دکانیں بند کر دیا کرتے کہ ہم بھی سپاہیوں کی طرح لوٹ مار نہ کرنے لگیں۔ جناب سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی چھوٹی موٹی بے ضابطگیاں ایسی بھی نہیں کہ ان کی سیاسی شکایت کی جائے لیکن ان پر مسلسل عمل ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے لوگ ہماری حکومت کے خلاف برے خیالات قائم کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔[1]

ہیسٹنگز بڑی مدت ہندوستان میں گزار چکا ہے۔ اس کا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ لوگ کمپنی کے ملازمین کے انتظامی کاموں کے متعلق بری رائے رکھتے ہیں۔ مشہور تاریخ سیر متاخرین کے مصنف نے میدان جنگ میں تو برطانوی افواج کے کارناموں کی تعریف کی ہے لیکن برطانوی نظم و نسق کی افسوسناک تصویر پیش کی ہے۔ "وہ (انگریز) نہایت بہادر بھی ہیں اور انتہائی سمجھدار اور محتاط بھی۔ نظم و ضبط کے ساتھ میدان جنگ میں اترنے اور جنگی صف بندی کرنے کے فن میں ان کا مقابل کوئی نہیں۔ اگر فوجی اوصاف کے ساتھ وہ حکومت کرنے کے فن سے بھی واقف ہوتے، اگر وہ کسانوں اور شریفوں کے حالات سے باخبر ہونے کی کوشش کرتے اور خدا کے بندوں کو آرام پہنچانے اور ان کے دکھ درد دور کرنے کے لیے وہ اسی قسم کی تدابیر اختیار کرتے اور اسی طرح آمادہ ہوتے جس طرح جنگی معاملات میں ہوا کرتے ہیں تو ان کے مقابلے میں نہ دنیا کی کسی دوسری قوم کو ترجیح دی جا سکتی ہے نہ حکومت کرنے کے

---

[1] Hasting letter dated 26th April 1768.

لیے ان پر فوقیت۔ لیکن سلطنت کے لوگوں کی طرف ان کا رویہ ایسا ہے اور ان کی خوش حالی کے معاملے میں ان کی بے توجہی اور بے پرواہی اتنی زیادہ ہے کہ ان کی حکومت میں لوگ ہر طرف نالہ وبکا کرتے ہیں۔ وہ دکھوں میں مبتلا ہیں اور افلاس کا شکار ہیں۔ اے خدا اپنے غمزدہ بندوں کی مدد کر اور انھیں دکھوں سے نجات دے ۔"[1]

بنگال کا نواب انگریز گورنر سے بجا طور پر فضول شکایتیں کرتا رہا" ہر پرگنے، ہر گاؤں اور ہر تجارتی مرکز میں وہ (کمپنی کے گماشتے) نمک، چھالی، گھی، چاول، بھوسا، بانس، مچھلی، بورے، ادرک، شکر، تمباکو، افیم اور بہت سی اشیا کی خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں۔ میں ان سب چیزوں کے نام لکھ نہیں سکتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ان کا نام بنام ذکر کرنا فضول ہے۔ وہ کسانوں اور تاجروں سے اصل کی چوتھائی قیمت پر مال زبردستی لیتے ہیں اور کسانوں کے خلاف تشدد استعمال کر کے اور ان پر مظالم توڑ کے ایک روپے کی چیز کے پانچ روپے وصول کر لیتے ہیں۔ . . . . . ضلع کے حکام اپنے فرائض منصبی ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ ان مظالم کا اور میرے اختیارات چھین لینے کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھے تقریباً پچیس لاکھ روپے سالانہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ میں نے جو معاہدہ کیا ہے خدا کے فضل سے میں نے اس کی خلاف ورزی نہ پہلے کی ہے، نہ اب کر رہا ہوں اور نہ آئندہ کرنے کا ارادہ ہے۔ ان حالات میں آخر انگریزوں کے سردار میری حکومت کی توہین کیوں کرتے ہیں اور مجھے نقصان کیوں پہنچاتے ہیں ۔"[2]

سرجنٹ برگیو SERGENT BREGO کے خط میں کمپنی کے گماشتوں کی سرگرمیوں کا زیادہ تفصیلی حال ملتا ہے۔

"ایک صاحب خرید و فروخت کے لیے اپنا گماشتہ یہاں بھیجتے ہیں۔ وہ اپنے متعلق سمجھنے لگتا ہے کہ اسے ہر شخص کو مجبور کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنا مال اس کے ہاتھ بیچے یا اس کا مال خریدے۔ انکار کرنے کی صورت میں (چاہے اس انکار کی وجہ یہ ہو کہ وہ خرید و فروخت کی استعداد نہیں رکھتا) اس کے کوڑے لگائے جاتے ہیں یا اس کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اگر لوگ خرید و فروخت کے لیے تیار بھی ہو جائیں تو اس کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک دوسرا ستم توڑا جاتا ہے۔ وہ تجارت کے مختلف شعبے اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں اور کسی کو اس امر کی اجازت نہیں دیتے ہیں کہ وہ ان اشیاء کی خرید و فروخت کر سکے

---

[1] سیر متاخرین، جلد 2، صفحہ 101 ۔مندرج مل، HISTORY OF BRITISH INDIA

[2] نواب کا خط مورخہ مئی 1762ء

جس کی تجارت ان کے ہاتھ میں ہو۔ اگر دیہاتی لوگ ان اشیار کی تجارت کریں تو وہ اختیارات کو ایک دفعہ پھر استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جو اشیار خریدتے ہیں ان کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ کم سے کم انھیں اتنا تو کرنا ہی چاہیے کہ دوسرے تاجروں کے مقابلے میں ان کی بہت کم قیمتیں ادا کی جائیں اکثر اوقات وہ یہ کم قیمت بھی نہیں دیتے ہیں۔ اگر میں مداخلت کروں تو فوراً میری شکایت کی جاتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے اتنے مظالم کہ ان کے بیان سے زبان قاصر ہے اور جو بنگال کے گماشتے روز لوگوں پر توڑا کرتے ہیں۔ باقر گنج کی تباہی کا سبب ہیں جو بنگال کا ایک خوش حال ضلع تھا مگر اب وہاں کے رہنے والے ترک وطن کر رہے ہیں۔ روزانہ بڑی تعداد میں لوگ قصبے سے ہجرت کر رہے ہیں تاکہ زیادہ محفوظ مقامات میں سکونت اختیار کر سکیں۔ بازاروں میں جو پہلے تجارتی اشیار سے بھرے رہتے ہیں۔ اب ضرورت کی چیزیں مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان کے چھوٹے موٹے ملازم لوگوں پر ظلم ڈھایا کرتے ہیں۔ اگر زمیندار اُن کو باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ پہلے کچہری میں انصاف کیا جاتا تھا۔ اب ہر گماشتہ جج ہے اور ہر گھر کچہری۔ وہ زمیندار کو بھی سزا کا حکم سناتے ہیں اور نقصانات کے جھوٹے الزام لگا کر اس سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ اس پر گماشتوں کے ملازموں سے جھگڑا کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یا بالقول زمیندار کے اس پر ان اشیار کی چوری کا الزام لگایا جاتا ہے جو خود گماشتوں کے ملازمین چرایا کرتے ہیں۔"[1]

اسی قسم کا تفصیلی حال ڈھاکہ کے کلکٹر محمد علی کے خط میں بھی ملتا ہے جو اس نے کلکتہ کے انگریز گورنر کو لکھا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت سے تاجروں نے تجارتی مرکز کے لوگوں سے معاملہ کر لیا ہے۔ وہ اپنی کشتیوں پر انگریزی جھنڈا لگا دیتے ہیں اور اپنے مال کو انگریزی مال ظاہر کر کے دھوکہ دیا کرتے ہیں۔ شاہ بندر اور دوسرے محاصل پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لکی پور اور ڈھاکہ کے تجارتی مراکز کے گماشتے تاجروں وغیرہ کو اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ تمباکو، روئی، لوہا اور دوسری اشیا بازار کی قیمت سے زیادہ قیمت پر خریدیں اور ان سے جبراً روپیہ وصول کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ان سے چپراسیوں کی خوراک کے لیے روپیہ لیتے ہیں اور معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں جرمانہ وصول کرتے ہیں۔ ان کارروائیوں نے اَدرنگوں (کپڑے کی صنعت کے مراکز) اور دوسرے مقامات کو

---

[1] خط مورخہ 26 مئی 1762ء

تباہ کردیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ لکی پور کے تجارتی مرکز کے گماشتوں نے تحصیلدار سے جبراً تعلقدار کی کاشت اپنے نام کرالی ہے اور اس کا لگان بھی نہیں ادا کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے بھڑکانے پر ان لوگوں نے شکایت رفع کرنے کے لیے انگریز اور ہندوستانی سپاہیوں کو ایک سند کے ساتھ دیہات روانہ کردیا تھا تاکہ وہاں وہ بدنظمی پھیلا دیں۔ مختلف مقامات پر واقع چنگی کی چوکیوں سے اور غریب لوگوں کے مکانوں سے جو کچھ بھی ان کے ہاتھ لگا وہ انھوں نے فروخت کردیا اور اس کا روپیہ اپنی جیبوں میں رکھ لیا۔ اس بدنظمی نے دیہات کو تباہ کر ڈالا ہے۔ کسان نہ اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں اور نہ مال گزاری ادا کر سکتے ہیں۔ کئی مقامات پر مسٹر شویلیر MR. CHEVALIAR نے جبراً نئے بازار اور نئے تجارتی مراکز کھول دیے ہیں اور کچھ لوگوں کو جھوٹ موٹ سپاہی بنادیا ہے۔ وہ لوگ جس کو چاہتے ہیں گرفتار کرلیتے ہیں اور ان پر جرمانے کرتے ہیں۔ ان جبری کارروائیوں کی وجہ سے بہت سے ہاٹ، گھاٹ اور پرگنے ویران ہوگئے ہیں۔"[1]

ایک طرف تو کمپنی کے ملازموں اور ان کے گماشتوں نے ہر ضلع میں بنگال کی داخلی تجارت درہم برہم کردی۔ دوسری طرف وہ طریقے بڑے ظالمانہ تھے جن کے ذریعے وہ مصنوعات حاصل کرتے تھے۔ ایک انگریز تاجر ولیم بولٹس WILLIAM BOLTS نے ان حالات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

"اب ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ملک کی داخلی تجارت جس انداز سے ہو رہی ہے اور خصوصاً یورپ کے لیے کمپنی جو مال خرید رہی ہے اس میں جبر و ظلم سے کام لیا جارہا ہے۔ اس کے مضر اثرات ملک کے تمام بنکر اور صنعت کار محسوس کر رہے ہیں۔ جو سامان بنایا جاتا ہے اس پر اجارہ داری کے حقوق حاصل کرلیے جاتے ہیں۔ انگریز اور ان کے بنئے اور دیسی گماشتے اپنی مرضی سے اس امر کا فیصلہ کیا کرتے ہیں کہ ہر صنعت کار کتنا مال ان کے حوالے کرے گا اور اس کو کتنی قیمت ادا کی جائے گی۔ . . . . اور رنگ یا صنعتی قصبے میں پہنچنے کے بعد گماشتہ اپنے قیام کی جگہ کا تعین کرتا ہے اور اس کو کچہری کہتا ہے۔ اپنے چپراسیوں اور ہرکاروں کے ذریعہ وہ بنکروں کے ساتھ دلالوں اور پیکاروں کو بلواتا ہے۔ مالکوں کا بھیجا ہوا روپیہ وصول ہونے کے بعد وہ ان سے معاہدے پر دستخط کراتا ہے کہ اتنا مال اتنی قیمت پر اور اتنی مدت کے اندر اس کے حوالے کردیا جائے گا اور انھیں کچھ روپیہ پیشگی ادا کردیتا ہے۔ بنکروں کی منظوری حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے۔ کمپنی کا کاروبار کرنے والے گماشتے عام طور سے اپنی مرضی کے

---

[1] اکتوبر 1762ء میں موصول ہونے والا خط

مطابق ان سے دستخط کرا لیتے ہیں، اگر بنکر روپیہ لینے سے انکار کریں تو یہ دیکھا گیا ہے کہ روپیہ ان کی کمر میں باندھ دیا جاتا ہے اور انھیں کوڑے مار کر بھگا دیا جاتا ہے.... کمپنی کے گماشتوں کے یہاں بہت سے بنکروں کے نام درج ہوتے ہیں، انھیں کسی اور کے لیے کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے اور وہ غلاموں کی طرح ایک گماشتے سے دوسرے گماشتے کو منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ہر نیا گماشتہ ان پر مظالم توڑا کرتا ہے.... اس محکمے میں جس قسم کی بدعنوانیاں کی جاتی ہیں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان سب باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریب بنکروں کو لوٹا جائے۔ جھپی داروں سے مل کر (جو کپڑے کی پرکھ کیا کرتے ہیں) گماشتے ان کے مال کی جو قیمت مقرر کرتے ہیں وہ اس قیمت سے جو بازار میں آزادانہ فروخت کی صورت میں ملتی ہے عام طور سے 15 فیصدی اور کبھی کبھی 40 فیصدی کم ہوتی ہے....
اگر بنکر ان معاہدوں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں جن پر کمپنی کے گماشتے ان سے زبردستی دستخط کرواتے ہیں اور جنھیں بنگال میں عام طور سے مچلکے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تو ان کا مال ضبط کر لیا جاتا ہے اور فوری طور سے نیلام کر دیا جاتا ہے۔ اس نیلام سے جو قیمت وصول ہوتی ہے اس سے گماشتے اپنا خسارہ پورا کر لیا کرتے ہیں۔ خام ریشم کاتنے والوں کے ساتھ بھی جو ناگوڈ کہلاتے ہیں اسی قسم کی ناانصافی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں موجود ہیں کہ ان لوگوں نے خود اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے تاکہ انھیں ریشم کاتنے پر مجبور نہ کیا جا سکے“[1]

اس طریقۂ کار نے بنگال کی صنعتوں کے ساتھ زراعت کو بھی نقصان پہنچایا۔ ملک کے دستکار عام طور سے کسان ہی ہوا کرتے ہیں۔

”اس لیے کہ کسان، جو دستکاری کے ساتھ عام طور سے کاشت بھی کیا کرتے ہیں گماشتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں، ان سے مال حاصل کرنے کے لیے گماشتے انھیں اس قدر پریشان کرتے ہیں کہ وہ اپنی زمین کو ترقی دینے کی صلاحیت کو کھو دیتے ہیں اور لگان ادا کرنے کی سکت بھی ان میں باقی نہیں رہتی ہے۔ لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں حکام مال ان کو سزائیں دیتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان خونخوار حاکموں نے کسانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ لگان ادا کرنے کے لیے اپنے بچے فروخت کر دیں یا گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائیں“[2]

---

[1] CONSIDERATIONS OF INDIA AFFAIRS. (LANDAN, 1772) PP. 191 TO 194

[2] ایضاً

یہ اقتباسات کافی ہونے چاہئیں۔ انھیں مختلف ماخذوں سے لیا گیا ہے۔ یعنی ایک انگریز گورنر کے خطوط اور تحریروں سے، کاؤنسل کے ایک انگریز رکن کی تحریروں سے، ایک انگریز تاجر کی تحریروں سے، خود نواب کی شکایتوں سے، ایک مسلمان کلکٹر کے خط سے اور ایک مسلمان مورخ کی تاریخ سے۔ سب لے ایک سی دکھ بھری کہانی سنائی ہے۔ بنگال کے لوگ ظلم و ستم کے عادی رہے ہیں لیکن اس قسم کے مظالم سے انھیں سابقہ نہیں پڑا تھا جن کے نتائج اتنے دوررس ہوں اور جن کی زد پر ہر گاؤں اور ہر گھر آ جائے۔ وہ بااقتدار لوگوں کی من مانی کارروائیوں کے عادی تھے لیکن ایسے نظام کے شکار نہیں ہوئے تھے جس نے ان کی تجارت ان کے پیشوں اور ان کی زندگی کو اس حد تک متاثر کیا ہو۔ ان کی صنعتوں کے چشمے خشک ہو گئے۔ ان کی دولت کے ذرائع ختم ہو گئے۔

بنگال میں دو انگریز ایسے بھی تھے جنھوں نے ان تکلیف دہ حالات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ وہ تھے ہنری ونس ٹارٹ اور وارن ہیسٹنگز۔ وہ نواب میر قاسم سے ملنے مونگیر گئے اور خوش اسلوبی سے معاملات طے کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ میر قاسم ایک مطلق العنان حکمران تھا لیکن وہ تیز فہم بھی تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مضبوط ارادے کا انسان ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کمپنی کے مقابلے میں وہ بے بس ہے اور صرف ونس ٹارٹ اور ہیسٹنگز اس کے دوست ہیں۔ وہ مطلوبہ رعایتوں کے لیے تیار ہو گیا اور ان تینوں نے ایک اقرار نامے پر دستخط کر دیے۔ اقرار نامے کی شرائط نو عنوانات کے تحت درج کی گئی تھیں جن میں پہلی تین شرطیں اہم ترین تھیں۔ وہ شرطیں یہ تھیں [1]

1۔ جہازوں کے ذریعے ہونے والے درآمد اور برآمد کے کاروبار کے لیے کمپنی کو ایک سند عطا کی جائے۔ اس سامان پر نہ کوئی محصول عائد کیا جائے اور نہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر تعرض کیا جائے۔

2۔ ملک کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ وہ تجارتی مال لے جانے کے لیے جو ملک کے اندر پیدا ہوتا ہے کمپنی کو سند دی جائے۔

3۔ شرح کے مطابق ان اشیاء پر محصول ادا کیا جائے جن سے متعلق طے ہو جائے کہ ان پر محصول دینا ہوگا۔ ان اشیاء کا ذکر اقرار نامے میں کر دیا جائے۔ یہ اقرار نامہ انتہائی منصفانہ تھا لیکن اس

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی تیسری رپورٹ میں معاہدہ مونگیر دیکھیے، 1773ء ضمیمہ، صفحہ 361

کی وجہ سے کلکتہ میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ 17 جنوری 1763ء کو امیٹ (AMYATT) ہے (HAY) اور واٹس (WATTS) نے لکھا "اس نے (ونس نارٹ نے) جو ضابطے تجویز کیے ہیں وہ انگریزوں کی حیثیت سے ہمارے لیے توہین آمیز ہیں اور ان کی وجہ سے تمام سرکاری اور نجی تجارت تباہ ہو جائے گی" 15 فروری کو جنرل کاؤنسل کا جلسہ ہوا۔ یکم مارچ کو سنجیدگی کے ساتھ مشورے کیے گئے۔ یہ طے پایا (ونس ٹارٹ اور ہیسٹنگز کی مخالفت کے باوجود) کہ کمپنی کے ملازموں کو حق حاصل ہے کہ وہ چنگی ادا کیے بغیر داخلی تجارت کر سکیں۔ یہ بھی طے پایا کہ تمام اشیاء پر نو فیصدی چنگی ادا کرنے کے بجائے جن کو ونس ٹارٹ منظور کر چکا تھا، نواب کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لیے نمک پر صرف ڈھائی فیصدی محصول ادا کیا جائے۔

یہ خود غرض لوگوں کا فیصلہ تھا جو اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لیے برسرپیکار تھے۔ وارن ہیسٹنگز کی مخالفت انصاف کے لیے ایک انصاف پسند انسان کی وکالت تھی۔ ہیسٹنگز کے طویل بیان کا ایک ٹکڑا یہاں پیش کیا جاتا ہے اس کو یاد رکھنا مناسب ہو گا۔

"چونکہ اس سے پہلے میں یہاں کے لوگوں کے درمیان اس وقت رہ چکا ہوں جب میری حیثیت بہت معمولی تھی اور وہ زمانہ اس قسم کا تھا کہ جب ہمیں نہایت غلامانہ انداز سے حکومت کی تابعداری کرنا پڑتی تھی۔ اس زمانے میں بھی سب زمینداروں اور شاہی ملازموں نے میرے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میری عزت افزائی کی۔ ان وجوہ کی بنا پر میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ فیصلہ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ متعدد تجربات کی بنا پر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے لوگ اگر مالک و جابر کی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کے بجائے ایمانداری کے ساتھ تجارت کریں اور حکومت کے قانونی اقتدار کو تسلیم کریں تو لوگ ان سے محبت کریں گے اور ان کی عزت کریں گے اور انگریز کا نام ایک گالی بن جانے کے بجائے عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ ہماری تجارت سے ملک کا بھی بھلا ہو گا ــــ انگریزوں کی طاقت لوگوں کو ڈرا دھمکا کر تکلیفوں میں مبتلا کرنے اور مظالم کے سامنے سر جھکانے کے لیے استعمال نہیں ہو گی بلکہ لوگ اس کو ایک نعمت اور تحفظ کا ذریعہ سمجھنے لگیں گے"[1]

نواب میر قاسم کو معلوم ہوا کہ کلکتے کی کونسل نے اقرار نامہ نامنظور کر دیا اور ان احکامات کے عمل درآمد میں اس کے ملازموں کے ساتھ مزاحمت کی گئی جو اقرار نامے کے مطابق صادر کیے گئے تھے۔ میر قاسم نے

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1773ء، ضمیمہ، صفحہ 486

غصہ میں فیض رسانی کے کچھ ایسے اقدام کیے جو اس سے پہلے مشرق کے کسی بادشاہ یا حکمران نے نہیں کیے تھے۔ اس نے اپنی آمدنی قربان کر دی اور تمام داخلی محاصل موقوف کر دیے تاکہ اس کی رعایا بھی تجارت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کا مقابلہ کر سکے۔

شاید اس بات پر کسی کو یقین نہ آئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ونس ٹارٹ اور ہیسٹنگز کے علاوہ کلکتہ کاؤنسل کے تمام اراکین نے محاصل موقوف کیے جانے کے خلاف احتجاج کیا اور اس کو انگریزی قوم کے ساتھ بدعہدی سے تعبیر کیا جیمس مل نے اپنی برطانوی ہند کی تاریخ میں لکھا ہے "اس موقع پر کمپنی کے ملازمین کا رویہ اس امر کی عجیب و غریب مثال پیش کرتا ہے کہ مفادات انصاف پسندی کے ساتھ بے شرمی کا احساس بھی ختم کر دیا کرتے ہیں۔" ایچ۔ ایچ۔ ولسن نے لکھا ہے "اس معاملے میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں تھی۔ تجارت کی ناعاقبت اندیشانہ اور خود غرضانہ طمع نے کاؤنسل کے تمام اراکین کو عقل، انصاف اور پالیسی کے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ صرف دو باعزت اراکین یعنی ونس ٹارٹ اور ہیسٹنگز اس سے مستثنیٰ تھے۔"

ونس ٹارٹ اور ہیسٹنگز نے اختلاف کرتے ہوئے بڑی وضاحت سے اپنی رائے ظاہر کی تھی اور لکھا تھا "حالانکہ یہ باتیں ہمارے مفاد میں ہوں گی اگر ہم فیصلہ کریں کہ ملک کی تمام تجارت ہمارے قبضہ میں رہے گی، نمک سازی کرنے کے لیے ہم اپنے آدمیوں کو استعمال کریں گے، ملک میں پیدا ہونے والی ہر چیز پر ہم قبضہ کر لیں گے۔ لیکن ہم نواب سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اس میں ہمارا ساتھ دے گا کہ ہم ملک کے تمام تاجروں سے تجارت کے ذرائع چھین لیں۔" اس تحریر سے متعلقہ مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ کمپنی کے ملازمین نجی دولت کمانے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ ایک زرخیز اور متمدن ملک کے لوگوں کو دولت کے ان ذرائع سے محروم کر دیں جو اچھی اور بری دونوں قسم کی حکومتوں کے زمانوں میں ان کے قبضہ و تصرف میں رہے تھے اور آزاد پیداوار و آزاد تبادلے کے وہ حقوق ان سے چھین لیں جو دنیا کی ہر متمدن قوم کو حاصل ہوتے ہیں۔ کمپنی کے ملازمین محض ایک یا دو اشیاء کی حد تک اجارہ داری کے خواہش مند نہیں تھے۔ وہ تو چاہتے تھے کہ تمام اشیاء کی حد تک ان کی تجارت میں اور دیسی تاجروں کی تجارت میں امتیاز برتا جائے۔ اس قسم کا امتیاز جس کی بنا پر بنگال کے لوگ ایک ایسے حق سے محروم ہو جاتے جو انسانی معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ بدیسی تاجروں نے اس قسم کے دور رس نتائج رکھنے والے مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے قوت استعمال کی ہو اور ایک کثیر آبادی والے بڑے ملک کی تمام تجارت پر قبضہ کرنا چاہا ہو۔

نواب میر قاسم نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

بنگال پر میر قاسم نے 1760ء سے 1765ء تک حکومت کی۔ یہی زمانہ وہ تھا جب ونس ٹارٹ کلکتے کا گورنر تھا۔ اس نے میر قاسم کی حکومت کے متعلق اپنی رائے مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کی ہے۔

"اس نے (میر قاسم نے) کمپنی کا قرض اور اپنی فوج کی تنخواہوں کی بقایا بھاری رقم ادا کی۔ اپنے دربار کے اخراجات میں کمی کی جن کی بنا پر اس سے پہلے بادشاہوں کی تمام آمدنی برباد ہو جایا کرتی تھی اور زمینداروں کی قوت کم کر کے ملک پر اپنا سکہ خود بٹھلایا جو اس سے پہلے صوبے کے امن و امان کو برابر تباہ کرتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی میں جانتا تھا کہ اسے ہماری امداد کی جتنی کم ضرورت ہو گی کمپنی کے اخراجات اتنے ہی کم ہوں گے اور کمپنی اپنے مقبوضات کی زیادہ دیکھ بھال کر سکے گی۔ اس کے ساتھ مجھے یقین بھی تھا کہ ہم مشترک دشمن کے مقابلے میں ایک اچھے اور کارآمد دوست اور ساتھی کی حیثیت سے اس پر انحصار بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی یقین تھا کہ اگر ہم نواب کے حقوق غصب کرنے اور اس کی حکومت میں مزاحم ہونے کی کوشش نہ کریں تو وہ ہم سے جھگڑا مول نہیں لے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جھگڑے کے بارے میں اتنا محتاط تھا کہ ایک مثال نہیں پیش کی جا سکتی جب اس نے ان علاقوں میں اپنا کوئی آدمی بھیجا ہو جو وہ ہمیں دے چکا تھا یا ان چیزوں میں سے کسی کے بارے میں تعرض کیا ہو جن کی ہم تجارت کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ہمارے گماشتوں کی دست درازیوں نے اور نجی تجارت کے تعلق سے ہمارے نئے مطالبوں نے اسے جھگڑے میں پڑنے پر مجبور نہیں کر دیا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے جب ہمارا تنازعہ اپنے شباب پر تھا اس وقت بھی ملک کے کسی حصے میں کمپنی کی تجارت میں مداخلت نہیں کی گئی۔ صرف مسٹر ایلس نے شورے کی تجارت کے متعلق ایک دو مبالغہ آمیز شکایتیں کی تھیں۔ جن حضرات نے نواب کے خلاف ایک محاذ بنایا تھا ان کا رویہ اس سے کتنا مختلف تھا۔ جس وقت سے وہ صوبہ دار ہوا تھا ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب کسی نہ کسی چھوٹے سے معاملے کو بہانہ بنا کر اس کے احکامات کو ٹھکرایا نہیں گیا، اس کے ملازموں کو گرفتار نہیں کیا گیا اور دھمکیاں دے کر اور گالی گلوچ کر کے ان کی توہین نہیں کی گئی۔ ان واقعات کی مثالیں پیش کرنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس تحریر کے ہر صفحے پر ایسے واقعات آپ کو مل جائیں گے۔[1]"

موجودہ کتاب کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی کارروائیوں کی روداد سنانا نہیں۔ 1763ء

---

[1] NARRATIVE VOL III, P 381

میں میر قاسم کے ساتھ ہونے والی جنگ کے نتیجے کے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں تھا۔ بنگال میں انگریزوں کے خلاف جتنے بھی ہندوستانی حکمران یا فوجیں لڑی تھیں میر قاسم سب سے بہتر ثابت ہوا۔ پھر بھی گھیریا اور اس کے بعد اودے نالا کے مقاموں پر اس نے شکستیں کھائیں۔ غصے میں اس نے پٹنہ کے انگریز قیدیوں کا قتل عام کرا دیا اور اس کے بعد اپنے ملک کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ میر جعفر جس کو 1760ء میں تخت سے اتار دیا گیا تھا اور اب بڈھا ہو چکا تھا، ایک دفعہ پھر نواب بنا دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ناجائز بیٹا نجیم الدولہ 1765ء میں تخت پر بٹھا دیا گیا۔

ہر نئے نواب کی تخت نشینی کو مشرق سے روپیہ بٹورنے کا مناسب موقع سمجھا جاتا تھا۔ 1757ء میں جنگ پلاسی کے بعد جب میر جعفر نواب بنا تو برطانوی فوجی افسروں اور سپاہیوں نے انعام کے طور پر 12,38,575 پاؤنڈ وصول کیے جس میں کلایو نے 31,500 پاؤنڈ پائے۔ اس کے علاوہ بنگال میں ایک زرخیز جاگیر بھی اس کے ہاتھ آئی۔ 1760ء میں جب میر قاسم نواب بنایا گیا تو انگریز حکام نے 2,00,269 پاؤنڈ بطور انعام پائے جن میں سے 58,333 پاؤنڈ ونس ٹارٹ کی جیب میں گئے 1763ء میں جب میر جعفر کو دوبارہ نواب بنایا گیا تو انعام میں ملنے والی رقم 5,00,165 پاؤنڈ تھی۔ 1765ء میں جب نجیم الدولہ گدی پر بیٹھا تو تحفے کی رقم 2,30,356 پاؤنڈ وصول کی گئی۔ ان رقموں کے علاوہ جو آٹھ سال میں وصول کی گئی تھیں اور جن کی مجموعی تعداد 21,69,665 پاؤنڈ تھی نقصانات کی تلافی کے نام سے مزید رقموں کا مطالبہ کیا گیا اور وہ بھی وصول کر لی گئیں۔ ان کی مجموعی تعداد 37,70,833 پاؤنڈ تھی[1]

ان رقموں کی وصولی ہاؤس آف کامنز کی اس کمیٹی کے سامنے ثابت ہو گئی یا تسلیم کر لی گئی جس نے 73-1772ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کی تفتیش کی۔ کلایو نے اپنے رویے کو حق بجانب قرار دیا۔

میں نے اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انڈیا ڈائرکٹرز Directors کی خفیہ کمیٹی کو میں نے جو خط لکھے ان میں صاف صاف کہا کہ نواب کی فیاضی کی بدولت میں آسانی سے دولت حاصل کر سکا ہوں اور اب ہندوستان میں میرے مزید قیام کی وجہ محض کمپنی کی بھلائی کا جذبہ ہے۔ . . . کمپنی یہ توقع کس طرح کر سکتی تھی کہ اس کی خدمت میں اپنی جان بار بار جوکھوں میں ڈالنے کے بعد میں دولت حاصل کرنے کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دوں جس میں کمپنی کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے کم دولت ملنے کی صورت میں بھی کمپنی کو زیادہ دولت نہیں مل سکتی تھی[2]

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1773ء، صفحہ 311

[2] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1772ء، صفحہ 148

کلائیو کو یہ خیال نہیں آیا کہ دولت نہ کمپنی کی تھی اور نہ اس کی بلکہ وہ ملک کی تھی اور ملک کے لوگوں کی بھلائی کے لیے صرف کی جانی چاہیے تھی۔ کمپنی کے لیے اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ اس کے تحفوں کے نام پر حاصل کی جانے والی رقموں کو ناپسندیدہ قرار دیا اور اس تجارت کی بھی مذمت کی جو اس کے ملازم نجی طور سے بنگال میں کر رہے تھے۔ 1765ء میں کمپنی نے احکامات جاری کیے کہ تحفے نہ قبول کیے جائیں اور کلائیو کو ایک دفعہ پھر ہندوستان بھیجا تاکہ وہ کمپنی کے ملازموں کی نجی تجارت کو ختم کر دے جو ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ احکامات بنگال میں آچکے تھے اور یہ توقع کی جارہی تھی کہ کمپنی کے ملازمین جلد اقرار ناموں پر دستخط کر دیں گے۔ وقت کم تھا اس لیے کلکتہ کی کونسل نے جلدی نجم الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا اور آخری بار اس سے تحفے حاصل کر لیے۔

باب — 3

بنگال میں لارڈ کلایو اور اس کے جانشین (1765ء تا 1772ء)

برطانوی ہند کی تاریخ میں 1765ء سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

اس سال لارڈ کلایو تیسری اور آخری بار ہندوستان واپس آیا اور مغل شہنشاہ سے ایک سند حاصل کی جس کی رو سے بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ حالانکہ مغل شہنشاہ کو کوئی حقیقی اختیارات حاصل نہیں تھے پھر بھی وہ ہندوستان کا نام نہاد شہنشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی سند نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملک میں ایک قانونی حیثیت دے دی۔

لارڈ کلایو کو ایک دشوار فرض ادا کرنا تھا۔ کمپنی کے حالات خراب تھے۔ اس کے ملازمین ناقص تھے اور رعایا ظلم و جبر کا شکار تھی۔ کلایو چاہتا تھا کہ اپنے مختصر زمانہ قیام میں ان خرابیوں کو دور کر دے۔ اس نے 30 ستمبر 1765ء کو جو خط کلکتہ سے کورٹ آف ڈائریکٹرز Court of Directors کو لکھا تھا کہ وہ ہندوستان کے حالات کے متعلق شائع ہونے والی جلدوں میں شامل سب سے اہم دستاویز ہے۔

اپنے خط میں لارڈ کلایو نے ان حالات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو اس نے آخری بار ہندوستان آنے کے بعد یہاں پائے اور ان تدارک کی تدابیر کا ذکر بھی کیا جن کو عمل میں لایا گیا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلایو کے کاموں کا حال خود اس کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔

"مجھے افسوس کے ساتھ بیان کرنا پڑتا ہے کہ جب میں یہاں آیا تو آپ کے معاملات اس حد تک خراب تھے کہ ان لوگوں کی تشویش کا باعث بن سکتے تھے جن کا ضمیر اور احساس فرض مفادات کی ضرورت سے زیادہ تلاش نے گمراہ نہ کر دیا ہو۔ تیزی کے ساتھ، اور بہت سے لوگوں کی حد تک، دولت کے بیجا حصول نے ان کی زندگیوں میں ہر قسم کی آسائش و آرائش تباہ کن حد تک شامل کر دی ہے۔ تمام صوبے میں یہ دونوں بڑی خرابیاں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں جن سے ہر محکمے کا ہر رکن متاثر

ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماتحت کی یہ خواہش ہے کہ وہ دولت جمع کرے تاکہ اس کی فراوانی کا احساس اس کے اور اس کے اعلیٰ افسر کے درمیان برتے جانے والے واحد امتیاز کو ختم کر دے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دولت حاصل کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کو لوگ تیار رہا کرتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کی طاقت سے وہ اپنے اختیارات حاصل کرتے ہیں اور ان حالات میں جہاں محض بے ایمانی ان کی حرص و ہوس کی تسکین نہیں کر سکتی وہ بالجبر روپیہ حاصل کرنے پر اتر آتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں جب اعلیٰ حکام قائم کرتے ہیں تو ان کے ماتحت بھی مناسب حد تک ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ خرابی چھوت کی بیماری کی طرح سول اور فوجی ملازموں میں پھیل گئی ہے۔ یہاں تک کہ کلرک، علمبردار اور آزاد تاجر بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔"

"9۔ میرے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ایک وہ راستہ تھا جس میں طرح طرح کے فائدے تھے اور میں جسے آسانی سے اختیار کر سکتا تھا۔ دوسرا راستہ اجنبی تھا جس میں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا تھا۔ میں یہ کر سکتا تھا کہ ان حالات کی بنیاد پر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا جو اس وقت پائے جاتے تھے یعنی میں گورنر کے نام سے فائدہ اٹھاتا لیکن اس عہدے کی عزت، اہمیت اور وقار کو ختم ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا..... میرے سامنے ایک دوسرا راستہ بھی تھا جو زیادہ باعزت تھا۔ مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ میں ان لاتعداد آزمائشوں میں پڑ کر دامن صاف رکھوں جن سے مجھے قدم قدم پر دوچار ہونا پڑا اور اپنے فرائضِ منصبی ادا کر دوں۔ ان کلنک کے ٹیکوں کو برداشت کر دوں جو اصلاح کرنے والوں کے ناموں پر حاسد اور آزردہ خاطر حضرات لگایا کرتے ہیں اور تجارتی مرکز کے لوگوں کی لعنت ملامت کے لیے تیار رہوں۔ میں نے بغیر کسی پس و پیش کے فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے شانوں پر وہ بوجھ اٹھا لیا جن کے لیے ہمت، ثابت قدمی اور ایک خاص سرشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے راستے کا تعین کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہر امکانی کوشش کروں گا۔ اس خیال سے میں خوش تھا کہ میری کامیابی قوم کے وقار اور کمپنی کے وجود کو مستحکم بنا دے گی۔"

"12۔ کمپنی کے ملازمین کے یورپی گماشتوں اور لاتعداد دیسی گماشتوں اور ذیلی گماشتوں نے ان کے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر جو ظلم و جبر روا رکھا ہے وہ میرے خیال میں ہمیشہ اس ملک میں انگریز کے دامن پر ایک بدنما دھبہ بنا رہے گا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں اور دوسرے کئی سلسلوں میں ایک ایسا کام سرانجام دیا ہے جس سے اس قسم کے فائدے حاصل ہونے کا امکان

ہے جیسے کہ ابھی تک نہیں ہوئے تھے۔ ان فائدوں کے ساتھ ان خرابیوں کی روک تھام بھی ہو سکے گی جن کے تدارک کی کوئی سبیل ابھی تک نہیں تھی۔ میرا اشارہ دیوانی کی طرف ہے جس کی وجہ سے بنگال بہار اور اڑیسہ میں ہمیں تمام اراضی کی نگہداشت اور مال گزاری کی وصولی کے اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ مغل اعظم کو ہماری فوجوں اور ہمارے خزانے سے جو امداد ملی تھی اس کی بنا پر اس نے خوشی سے یہ اختیارات کمپنی کے سپرد کر دیے ہیں۔ یہ کام اتنے موثر انداز سے ہوا ہے کہ آپ اس سے زیادہ کی خواہش نہیں کر سکتے ہیں۔ نواب کے وقار اور اختیار کو برقرار رکھنے کے لیے وظیفہ دینا ہوگا اور شہنشاہ (مغل اعظم) کو خراج ادا کرنا ہوگا۔ باقی روپیہ کمپنی کو ملے گا۔"

" 13۔ اس علاقے کے ہمارے قبضے میں آ جانے کی وجہ سے جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی آمدنی آئندہ سال تقریباً 250 لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت ہوگی جس میں بردوان کے سابقہ برطانوی علاقے کی آمدنی بھی شامل ہے۔ اس کے بعد آمدنی بیس سے تیس لاکھ تک بڑھ جائے گی۔ زمانہ امن میں آپ کے سول اور فوجی اخراجات ساٹھ لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ نواب کا وظیفہ کم کر کے بیالیس لاکھ مقرر کیا جا چکا ہے۔ شہنشاہ کا خراج چھبیس لاکھ مقرر کیا گیا ہے۔ اس طرح کمپنی کو 122 لاکھ روپیہ یا 16,50,900 پاؤنڈ کا خالص منافع ہوگا۔"

" 16۔ ہندوستان آنے کی تاریخ سے آپ کے تمام ملازموں کو ملازمت کا بھتا ملنا چاہیے ملازم کی حیثیت کے تناسب سے بھتے میں اضافہ ہونا چاہیے...... اس بھتے کی رقم جہاز کے کرائے تجارت کی مراعات (وہ فوائد جو آپ کے علم میں نہیں ہیں) اور نمک، پانی اور تمباکو کے منافع سے حاصل کی جائے گی۔ یہ بھتا ان نئے ضابطوں سے ہم آہنگ ہوگا جو پچھلی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔"

" 19۔ سول محکمے کے متعلق میں اپنے احساسات و جذبات کا اظہار پوری طرح کر چکا اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں فوجی محکمے کے متعلق بھی اپنے خیالات پیش کر سکوں..... جس خرابی سے میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فوج سول کے دائرہ اختیار میں مداخلت کرتی ہے اور اس کے اقتدار سے روگردانی کرتی ہے...... اس طرح کل کی کل فوج کو سول کے تحت ہونا چاہیے۔ اگر وہ کسی وقت سول پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرے تو گورنر اور کونسل کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ کمپنی کی طرف سے وہ اس تجارتی مرکز میں متولی کے فرائض ادا کر رہے ہیں اور ایک سول ادارے کے تحت املاک عامہ کے نگراں ہیں۔ انھیں سختی کے ساتھ اپنے اختیارات استعمال کرنے چاہئیں۔"

"26۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کو یاد دلا سکوں کہ میرا بڑا خاندان ہے جس کو ایک باپ کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے اس آب و ہوا میں رہ کر اپنی صحت کو قربان کیا ہے اور اپنی زندگی کے ساتھ اپنے مقدر کو بھی خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ براہ کرم مجھے مطلع کیجیے کہ میں نے ابھی تک جو کام کیے ہیں انھیں آپ کی منظوری حاصل ہے یا نہیں۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو ضابطے آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں وہ کلی یا جزوی طور سے آپ کے تصور اصلاح سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ آپ کو منظور ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ سلیکٹ کمیٹی کی رضامندی کے ساتھ مجھے فوراً اختیارات سونپ دیں گے تاکہ میں اس کام کو ختم کر سکوں جسے اتنی کامیابی کے میں نے شروع کیا ہے۔ میں اگلے سال کے آخر تک یہ کام مکمل کر سکتا ہوں اس کے بعد میں نے یورپ واپس آنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہاں آکر میں آپ کو ذاتی طور سے بتاؤں گا کہ بنگال کی خوش حالی کے سلسلے میں آپ کی ہر خواہش پوری ہو گئی ہے۔[1]

خود کلایو کی زبان سے ہم نے اس کارروائی کی روداد سن لی جو ہندوستان میں انگریزی راج کے ارتقاء میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابھی تک ہندوستان میں انگریزوں کی حیثیت محض تاجروں کی تھی۔ حالانکہ 1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے وہ بنگال کے تقریب قریب مالک بن گئے تھے پھر بھی دہلی کے نام نہاد شہنشاہ نے 1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو جب دیوانی کے اختیار سپرد کر دیے تو اس نے ہندوستان میں ایک قانونی حیثیت حاصل کر لی اور بنگال پر حکومت کرنے کا فرض باضابطہ طریقے سے ادا کرنے لگی۔ لارڈ کلایو خود بتا چکا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کس طرح ادا کرنا چاہتے تھے۔ سول اور فوجی انتظام میں اس نے اصلاح کی جو کوششیں کیں ان کی مورخوں نے جتنی بھی تعریف کی ہے وہ بجا ہے لیکن جب ہم اس کی اسکیم کی ضروری باتوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں اور بہت سی اسکیمیں بنائی گئی تھیں یہ اسکیم بھی لوگوں کے مفاد کے بجائے برطانوی حکمرانوں کے مفاد میں بنائی گئی تھیں۔ پورے بنگال کو ایک تعلقہ یا زمینداری تصور کیا گیا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔

"تیس ملین لوگوں سے وصول ہونے والے محاصل اخراجات کی رقم کی منہائی کے بعد ملک میں اور ملک کے لیے نہیں خرچ کیے جاتے تھے بلکہ کمپنی کے منافع کے طور پر انگلستان بھیج دیے

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی تیسری رپورٹ، 1773ء ضمیمہ۔ صفحات 391 — 398

جاتے تھے۔ انگلستان میں رہنے والے حصہ داروں کو ہر سال محکوم ملک سے ڈیڑھ ملین پاؤنڈ کی رقم بھیجی جاتی تھی۔ دنیا کی سب سے دولت مند قوم کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے ایک غریب قوم کی آمدنی میں سے لگاتار روپیہ منتقل کیا جا رہا تھا۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے پہلی ہی جو اسکیم بنائی تھی اس میں وہ جان لیوا دولت کا نکاس شامل تھا جو اب بڑھ کے سالانہ کئی ملین پاؤنڈ تک پہنچ چکا ہے۔ ہندوستان میں برطانیہ کی فتوحات، ملک کا منظم نظم و نسق جو برطانیہ کی دین تھا، امن و امان کی بحالی، عدالتوں کا انتظام اور مغربی تعلیم کا رواج یہ وہ باتیں ہیں جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ لیکن ہندوستان اور انگلستان کے درمیان مالی رشتے ابتدا سے غیر منصفانہ رہے ہیں ہندوستان اپنے وسیع وسائل، زرخیز زمین اور جفاکش لوگوں کے باوجود ڈیڑھ صدی کے انگریزی راج کے بعد بھی دنیا کا غریب ترین ملک ہے۔

کمپنی کے لیے ڈیڑھ ملین سالانہ کا منافع حاصل کرکے بھی لارڈ کلایو مطمئن نہیں ہوا بلکہ کمپنی کے ملازموں کے منافع کے لیے بنگال کی داخلی تجارت پر وہ اصرار کرتا رہا۔ اس نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ نجی تجارت کی ظالمانہ اور جبری نوعیت ختم ہو جائے۔ لیکن تجارت چونکہ بنگال میں رہنے والے انگریزوں کے لیے منافع بخش تھی اس لیے لارڈ کلایو اس کو ترک کرنے کو تیار نہیں ہوا واقعہ یہ ہے کہ اپنے مالکوں یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی کھلی مخالفت کے باوجود لارڈ کلایو نمک، چھالی اور تمباکو کی تجارت کو جاری رکھنے کا تہیہ کرچکا تھا۔ 18 ستمبر 1765ء کو اس نے کمپنی کے دوسرے ملازمین کے ساتھ مل کر کمپنی کی مخالفت کے باوجود تجارت جاری رکھنے کے لیے ایک اقرار نامہ تیار کیا۔ اقرار نامے کا مندرجہ ذیل ٹکڑا بہت اہم ہے۔

"اگر انگلستان کا مذکورہ بالا کورٹ آف ڈائریکٹرز کوئی حکم جاری یا نافذ کرے اور مذکورہ بالا مشترک تجارت اور کاروبار کو منسوخ کرنے یا ختم کرنے کا حکم دے یا تجارت کرے یا اس کو یا اس کے کسی جز کو جاری رکھنے میں مزاحم ہو یا ممانعت کرے یا مذکورہ بالا دستاویز کی شرائط، دفعات، اندراجات یا معاہدات یا ان میں سے کسی ایک کے منافی ہو اور اس کو منسوخ کر دے یا غیر موثر بنا دے تو اس حالت میں مذکورہ بالا رابرٹ لارڈ کلایو، بحیثیت صدر، ولیم برانٹ دیل مسٹر WILLIAM BRIGHANT وغیرہ، بحیثیت مذکورہ بالا فورٹ ولیم کی کاؤنسل، مذکورہ بالا ولیم برانٹ دیل WELL SUMNER مسٹر، ہیری ورلسٹ HARY VERELST رالف لی سیسٹر RALPH LEYCETER اور

جارج گرے اور ان تمام لوگوں کو جنھیں مذکورہ بالا مشترک تجارت میں حق ملکیت حاصل ہو یا آئندہ حاصل ہو جائے اور ان کے وارثوں، عاملوں اور مہتموں کو تمام نقصانات اور قانونی ذمہ داری سے محفوظ رکھیں گے اور کسی ایسے حکم یا ہدایت کے باوجود جو اس اقرار نامے کے منافی ہو۔ مذکورہ بالا مشترک تجارت کو ایک سال کی مدت تک باضابطہ طریقے سے جاری اور برقرار رکھیں گے یا جاری اور برقرار رکھوائیں گے۔[1]

لارڈ کلایو کا اہم خط مورخہ 30 ستمبر موصول ہونے کے بعد کورٹ آف ڈائریکٹرز نے 17 مئی 1766ء کو اس کا جواب کلکتہ کمیٹی کے نام بھیجا اور اس تاریخ کو ایک علیحدہ خط لارڈ کلایو کو لکھا۔ ڈائریکٹرز نے لارڈ کلایو کی خدمات کا گرمجوشی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور دیوانی یا بنگال، بہار اور اڑیسہ کا انتظام سنبھالنے کے لیے اپنی منظوری دے دی۔ لیکن ڈائریکٹرز کو داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے داخلی تجارت کے تعلق سے کلایو کی اسکیم کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

"عطیوں کے ذریعے آپ نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے متعلق ہم اپنے جذبات کا اظہار اس خط میں کر چکے ہیں جو سلیکٹ کمیٹی کے نام بھیجا گیا تھا۔ ہم جو کچھ لکھ چکے ہیں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ داخلی تجارت میں جو دولت کمائی گئی ہے اس کو حاصل کرنے میں اتنے جبر و ظلم کیے گئے ہیں کہ ان کی مثال کسی ملک میں اور کسی دور میں نہیں ملتی ہے۔ اس موضوع پر ہمارے جذبات اور احکامات اس وقت سے آج تک یکساں رہے ہیں جب ہمیں پہلے پہل اس کا علم ہوا۔ جناب کو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اس تجارت کی شدید خرابیوں کے جو خطرناک تجربات ہمیں ہو چکے ہیں ان کی بنا پر ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ کمپنی کی روداد میں شامل محدود اور منضبط منصوبے کے تحت بھی ہم اس کو منظور کر سکیں۔"[2]

کمپنی کے ملازموں کی داخلی تجارت کے متعلق ڈائریکٹرز نے ہمیشہ کھل کر بات کی۔ 8 فروری 1764ء کے خط میں وہ داخلی تجارت کو ممنوع قرار دے چکے تھے۔ 15 فروری 1765ء کے خط میں انھوں نے ایک دفعہ پھر زیادہ زوردار الفاظ میں اس کی ممانعت کی لیکن ان کے ملازموں نے ان کے احکامات کو نظر انداز کیا۔ 17 مئی 1766ء کے خط میں انھوں نے لارڈ کلایو کی اس اسکیم

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1773، ضمیمہ، صفحہ 534

[2] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کی تیسری رپورٹ، 1773ء، ضمیمہ، صفحہ 400

الو منظور کرنے سے انکار کر دیا جس میں اس کے بنائے ہوئے ضابطوں کے تحت تجارت جاری رکھنے کی سفارشش کی گئی تھی لیکن اس حکم کو بھی نظر انداز کر دیا گیا اور معاہدے کرنے اور پیشگی روپیہ دیے جانے کے بہانے سے دو سال تک داخلی تجارت جاری رکھی گئی۔

لارڈ کلایو 1761ء میں واپس چلا گیا۔ اس کی جگہ ورلسٹ گورنر ہوا جس نے 1770ء تک حکومت کی۔ اس کی جگہ کارٹیر Cartier نے لی۔ وہ 1772ء تک گورنر رہا۔ ورلسٹ اور کارٹیر کے پنج سالہ دور حکومت میں بنگال میں وہ بدنظمی برقرار رہی جس کا وہ پہلے سے شکار تھا۔ کلایو نے حکومت کی جو اسکیم بنائی تھی وہ ایک قسم کی دو عملی حکومت تھی۔ اب بھی مال گزاری کا روپیہ نواب کے خزانے میں جاتا تھا۔ اب بھی عدالتوں کا انتظام نواب کے ملازموں کے ہاتھوں میں تھا اور تمام کارروائیوں کے لیے نواب کے اختیارات استعمال کیے جاتے تھے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی جو ملک کی اصل مالک تھی تمام منافع حاصل کیا کرتی تھی۔ کمپنی کے ملازمین اپنے فائدوں کے لیے ہر قسم کے مظالم کیا کرتے تھے۔ نواب کے ملازم ان سے خائف تھے اور نواب کی عدالتوں کو وہ اپنے مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ انگریز گورنر اس سے باخبر تھا اور اس کی مذمت کرتا تھا لیکن حالات کو سدھارنے کی سکت اس میں نہیں تھی۔

"ہم نے حماقت یہ کی کہ اپنے اور حکومت کے درمیان حد فاصل برقرار نہیں رکھی۔ ہندوستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس کی اطاعت کریں۔ اس قسم کے بٹے ہوئے اور پیچیدہ اختیارات نے ان مظالم اور سازشوں کو جنم دیا جن کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی۔ حکومت کے حکام بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے۔ چونکہ ان پر کسی کو اختیار حاصل نہیں تھا اس لیے انھوں نے زیادہ بے باکی سے کام لینا شروع کر دیا۔"[1]

بنگال کے لوگوں کی گزر بسر کا ذریعہ ہمیشہ سے زراعت تھی۔ کمپنی کے ملازموں نے جو مالگزاری کا بندوبست کیا اس نے زراعت کی حالت خراب کر دی۔ پرانے زمانے سے بنگال میں اراضی کے مالک زمیندار ہوتے تھے جن کو نیم جاگیردارانہ اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ وہ نواب کو مال گزاری ادا کرتے تھے اور ضرورت کے وقت فوجی خدمات سرانجام دیا کرتے تھے۔ وہ اپنی جاگیروں میں لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کے کسان اور دوسرے اسامی انھیں راجہ سمجھتے تھے۔ وہ امن و امان

---

[1] گورنر ورلسٹ کا ڈائریکٹروں کے نام، مورخہ 16 دسمبر 1769ء

بحال رکھتے تھے، جھگڑے چکاتے تھے اور مجرموں کو سزا دیا کرتے تھے۔ وہ مذہب کی ہمت افزائی کرتے تھے اور اچھے کاموں پر انعام دیتے تھے۔ وہ علم و فن کی قدردانی کرتے تھے اور ادیبوں کے مربی ہوا کرتے تھے۔ سترھویں صدی میں مرشد قلی اور اٹھارویں صدی میں میر قاسم جیسے مطلق العنان نوابوں نے سختی کے ساتھ زمینداروں کا خون نچوڑا لیکن انھوں نے کبھی بھی وہ جاگیریں ان سے نہیں چھینیں جو رواج کے مطابق موروثی سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن 1760ء میں میر قاسم سے مدنا پور اور بردوان کے ضلعے حاصل کرنے کے بعد کمپنی کے ملازموں نے ایک نئے طریقے کو رواج دیا۔ انھوں نے زمینداروں کے روایتی حقوق کو نظر انداز کیا اور مال گزاری میں اضافہ کرنے کی غرض سے ان کی جاگیروں کو نیلام کرنا شروع کیا جس کے نہایت درجہ افسوسناک نتائج نکلے۔

بردوان اور مدنا پور کے صوبوں میں جن کی ملکیت اور اختیار 1760ء میں میر قاسم نے کمپنی کو منتقل کردیا تھا ان خرابیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی جو مسلمانوں کی ناقص حکومت کا لازمی نتیجہ تھیں۔ اس کے برعکس 1762ء میں ایک منصوبہ بنایا گیا جس کی وجہ سے صوبے میں تباہی آگئی۔ تین سال کی چھوٹی سی مدت کے لیے اراضی کا نیلام کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگ نیلام میں بولی بولنے لگے جن کے پاس نہ دولت تھی اور نہ کردار۔ ایک طرف تو ان پرانے زمینداروں نے جو اپنے گھر بار سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے بڑھ چڑھ کے بولی بولنا شروع کی۔ دوسری طرف ان لوگوں نے جن کو کوئی نقصان کا خطرہ نہیں تھا۔ اور جو ہر حال میں زمین پر قبضہ کرنا چاہتے تھے زیادہ اونچی قیمت لگانی شروع کردی۔ اس طرح لاتعداد خونخوار لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کا موقع دیا گیا۔ غریب لوگوں سے حاصل کیے ہوئے روپے سے ان لوگوں نے پہلے سال کی قسط ادا کردی ہے۔[1]

ہم آئندہ دیکھیں گے کہ کچھ دن بعد وارن ہیسٹنگز نے اس ظالمانہ طریقے کو پورے بنگال میں نافذ کردیا تھا جس کی وجہ سے سخت بے چینی، بدنظمی اور دشواریاں پیدا ہوئیں۔ ورلسٹ اور کارٹیر کے زمانہ حکومت میں مال گزاری بڑی سختی کے ساتھ وصول کی جاتی تھیں تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبات پورے کیے جاسکیں۔

گورنر ورلسٹ نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو لکھا تھا:

View of the Rise of the English Government in Bengal by Harry Verelst, Late Governor of Bengal, London, 1772, P. 70

"ہونا یہ چاہیے تھا" اور کئی دفعہ اس کی سفارش بھی کی گئی تھی کہ ان کی زمینیں جب ہمارے انتظام میں آئیں تو ہمیں اکثر ضلعوں میں لگان میں تھوڑا سا بھی اضافہ کرنے کے بجائے اس کی مقررہ شرح میں کمی کر دینی چاہیے تھی تاکہ لوگوں کو کاشت کرنے اور اس کو ترقی دینے کی تحریک ہوتی.... مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار کر سکوں کہ آپ کی حکومت کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ لگان کی آمدنی میں کوئی اضافہ کر سکے۔ میری اس رائے کی بنیاد وہ انیس سال کا تجربہ ہے جو میں نے آمدنی کے مختلف محکموں اور آپ کے مقبوضہ علاقے کے مختلف اضلاع میں حاصل کیا ہے۔"[1]

اجارہ داری اور جبر و زیادتی نے صنعتوں کو تباہ کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اپنے ملازموں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اب وہ خود زیادہ بڑے جرموں کے مرتکب ہونے لگے۔ انگریز صنعت کار بنگال کے بنکروں سے حسد کرنے لگے جن کے بنائے ہوئے ریشمی کپڑے انگلستان کو برآمد ہوتے تھے۔ کوشش کی گئی کہ کمپنی کی سیاسی طاقت کو استعمال کر کے بنگال کے مصنوعات کی ہمت شکنی اور انگلستان کے مصنوعات کی ہمت افزائی کی جائے۔ کمپنی نے بنگال کو بھیجے جانے والے مراسلے مورخہ 17 مارچ 1769ء میں خواہش ظاہر کی تھی کہ بنگال میں خام ریشم کی تیاری کو بڑھاوا دیا جائے اور ریشمی کپڑے بنانے کی ہمت افزائی نہ کی جائے۔ کمپنی کے مراسلے میں اس امر کی سفارش بھی کی گئی تھی کہ ریشم کاتنے والوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے گھر کے بجائے کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں۔

اس ضابطے کا بہت اچھا اثر ہوا۔ خاص طور سے اس کا اثر یہ ہوا کہ ریشم کاتنے والے جن کی خدمات پہلے ریشم کاتنے کے لیے حاصل کی جاتی تھیں، اب کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اگر بے توجہی کی بنا پر ریشم کاتنے والوں نے پھر گھروں پر کام شروع کر دیا ہے تو بہتر ہے کہ اس طریقے کو ختم کر دیا جائے۔ اب یہ کام زیادہ موثر انداز سے کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے اختیارات کو استعمال کرنا چاہیے۔ وہ اس کی ممانعت کر دے اور خلاف ورزی کی صورت میں سخت سزا دے۔"[2]

سلیکٹ کمیٹی نے ٹھیک ہی کہا تھا "اس خط میں جبر اور ملازمین کی ہمت افزائی کی پالیسی کا پورا منصوبہ شامل ہے جو بنگال کے مصنوعات کو بڑی حد تک تباہ کر سکتا ہے۔ اس کا یہ اثر ہونا چاہیے

---

[1] کورٹ آف ڈائریکٹرز کے نام خط، مورخہ 26 ستمبر 1768ء

[2] ہاؤس کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی ہندوستان کے عدالتی نظام کے متعلق نویں رپورٹ، 1783ء ضمیمہ 37۔

(اگر اس پر پورا پورا عمل ہوا اور اس سے بچا نہ جا سکے) کہ اس صنعتی ملک کا نقشہ بدل جائے اور انگلستان کی صنعتوں کے لیے خام مال پیدا کرنے کے لیے ایک میدان تیار ہو جائے۔[ئے]

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ پچاس سال سے زیادہ مدت تک ہندوستان کے تعلق سے انگلستان کی یہ معینہ پالیسی رہی۔ ہاؤس آف کامنز میں اس کو صاف بیان کیا گیا اور 1833ء کے بعد تک اس پر سختی سے عمل کیا گیا۔ اس نے انگلستان کے مصنوعات کے مفاد میں ہندوستان کی بہت سی قومی صنعتوں کو ختم کر دیا۔

لیکن غالباً سب سے بڑی خرابی جس کا سامنا ملک کو کرنا پڑا بنگال سے ہونے والی مسلسل دولت کا نکاس تھا جو کمپنی کے مفاد میں یا دنیا کے دوسرے حصوں میں ہونے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے سال بہ سال ہوتا رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کے اختیارات ملنے کے بعد جو پہلے چھ سال میں بنگال میں ہونے والی آمدنی اور خرچ کا حساب 1773ء کی ہاؤس آف کامنز کی چوتھی رپورٹ میں دیا ہوا ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل اعداد و شمار اخذ کیے گئے ہیں۔[تہ]

سال	کل وصولیابی	شہنشاہ کے خراج، نواب کے وظیفے، وصولیابی کے اخراجات، تنخواہوں، کمیشن وغیرہ کی منہائی کے بعد خالص آمدنی	فوج، سول، تعمیرات، قلعہ بندیوں وغیرہ پر ہونے والے کل اخراجات	سالانہ خالص بچت
مئی - اپریل		پاؤنڈ	پاؤنڈ	
1765ء تا 1766ء	22,58,227	16,81,427	12,10,360	4,71,067
1766ء تا 1767ء	38,05,817	25,27,594	12,74,093	12,53,501
1767ء تا 1768ء	36,07,009	23,59,005	14,87,383	8,71,622
1768ء تا 1769ء	37,83,207	24,02,191	15,73,129	8,29,062
1769ء تا 1770ء	3348,967	20,89,368	17,52,556	3,36,812
1770ء تا 1771ء	33,48,967	20,07,176	17,32,888	2,75,088
کل	2,01,33,579	1,30,66,761	90,27,609	40,37,152

ئے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی ہندوستان کے عدالتی نظام کے متعلق نویں رپورٹ 1783 ضمیمہ 37، صفحہ 64

تہ چوتھی رپورٹ 1773ء، صفحہ 535

ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی تقریباً ایک تہائی آمدنی ہر سال ملک کے باہر چلی جایا کرتی تھی لیکن ملک سے دولت کا حقیقی نکاس اس سے بہت زیادہ تھا سول اور فوج کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ یورپی حکام کی تنخواہوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنی تمام بچت ہندوستان کے باہر بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی بے اندازہ دولت بھی ہر سال ہندوستان سے باہر جایا کرتی تھی جنھوں نے دیسی تاجروں سے ان کا کاروبار اور صنعتیں چھین لی تھیں۔ بنگال سے باہر جانے والی دولت کی زیادہ صحیح نمائندگی 1766ء، 1767ء اور 1768ء کے درآمدات و برآمدات کے اعداد و شمار کرتے ہیں جو گورنر ہیری ورلسٹ نے جمع کیے تھے۔[1]

برآمدات	درآمدات
63,11,250 پاؤنڈ	6,24,375 پاؤنڈ

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک نے جتنا مال درآمد کیا اس کا دس گنا مال برآمد کیا۔ مسٹر ورلسٹ نے اس خرابی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا اور بنگال کے لوگوں کی مادی حالت پر ان کے افسوسناک اثرات کا وہ ہمیشہ رونا رویا کرتا تھا۔

"دہلی کو جو روپیہ بھیجا جاتا تھا اس کا معاوضہ بنگال کو تجارت کی صورت میں مل جاتا تھا جو بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اس وقت نواب کے علاقے کے حالات ان حالات سے بہت مختلف ہیں۔ ہر یورپی کمپنی نے اس روپیہ کے ذریعے جو اس ملک میں کمایا جاتا ہے اپنی سالانہ سرمایہ کاری میں اضافہ کر لیا ہے لیکن اس سے صوبے کی دولت میں ایک روپیہ کا اضافہ بھی نہیں ہوا ہے۔"[2]

"اس پریسیڈنسی سے روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر طرف سے جو مطالبے ہوتے رہے ہیں ان کی وجہ سے آپ کے خزانے میں روپیہ بہت کم ہو گیا ہے اور ملک سے اتنا روپیہ باہر جانے کے جو لازمی نتیجے ہوں گے انھوں نے ہمیں خائف کر رکھا ہے۔"[3]

---

[1] View of the Rise of the English Government in Bengal, Appendix, 8;117

[2] مراسلہ مورخہ 26 ستمبر 1767ء

[3] مراسلہ مورخہ 29 مارچ 1768ء

"یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی ملک چاہے وہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو ان حالات میں پھل پھول تو کیا زندہ بھی رہ سکے گا جب اس کو کوئی ضرورت کا مال نہ ملے اور اس کی ایک تہائی سے زیادہ آمدنی ہر سال اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کے علاوہ اس سے ملتی جلتی دوسری باتیں بھی ایسی ہیں جن کی وجہ سے ملک کی دولت کم ہو رہی ہے۔ اگر ان کا تدارک نہیں کیا گیا تو جلد ہی ملک قلاش ہو جائے گا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قدیم زمانے میں ملک کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ مختلف خاندانوں کو بڑی بڑی معافیاں دی جاتی تھیں اور گورنر اپنی آسائش و آرائش کے سامان پر بہت روپیہ خرچ کیا کرتے تھے۔ اب زمین سے حاصل ہونے والا سارا روپیہ آپ کے خزانے میں چلا جاتا ہے۔ ہماری سرمایہ کاری اور دوسرے ضروری اخراجات کے علاوہ اس روپے کا کوئی حصہ گردش میں نہیں آتا ہے"[1]

سرمایہ کاری کس قسم کی ہوتی تھی یہ بات ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی 1783ء کی نویں رپورٹ میں وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

"کئی سال سے اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے کہ بنگال کی آمدنی کے ایک مخصوص حصے کو اس مال کی خریداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو انگلستان کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اس کو سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سرمایہ کاری کی اہمیت یہ ہے کہ اس کو کمپنی کے خاص خاص ملازمین کی کارکردگی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی غربت کے اس اصل سبب کو عام طور سے اس کی دولت اور خوش حالی کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ مشرق کی بیش بہا اشیاء سے لدے ہوئے لاتعداد جہاز ہر سال مسلسل انگلستان آتے رہتے ہیں۔ یہ جہاز لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور انھیں اس ملک کے خوشگوار حالات اور بڑھتی ہوئی دولت کا یقین دلاتے ہیں جس کی فاضل پیداوار نے تجارتی دنیا میں اتنا اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے آنے والے مال کے معاوضے میں وہاں بھی مال جاتا ہو گا جس کی وجہ سے اس تجارتی سرمایے کو تقویت پہنچتی ہو گی جو پیداوار کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منافع بخش تجارت کے بجائے یہ ایک خراج ہے جس نے گمراہ کن نقاب چہرے پر ڈال رکھی ہے"[2]

ہندوستان سے مسلسل دولت کے نکاس کی خرابی کی، جس کی نشاندہی گورنر ورلسٹ اور ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کر چکی تھی، انگلستان کے سب سے بڑے ماہر فلسفہ سیاست برک نے

---

[1] مراسلہ مورخہ 5 اپریل 1769ء

[2] نویں رپورٹ، 1783ء، صفحہ 54

جن الفاظ میں مذمت کی ہے وہ اس وقت تک پڑھے جاتے رہیں گے جب تک انگریزی زبان زندہ پائندہ رہے گی۔

1783ء میں فاکس کے ایسٹ انڈیا بل پر تقریر کرتے ہوئے ایڈمنڈ برک (EDMUND BURKE) نے ہندوستان سے دولت کے مسلسل نکاس کے تباہ کن اثرات پر روشنی ڈالی۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس عظیم مقرر نے اپنی شاندار پارلیمانی زندگی میں کبھی اس سے زیادہ پر زور فصیح اور حقیقت پسندانہ تقریر نہیں کی۔

ایشیائی فاتحوں کی خونخواری جلد ختم ہو جاتی تھی وہ مفتوحہ ملک کو اپنا گھر بنالیا کرتے تھے جہاں وہ رہتے تھے ان علاقوں کی خوشحالی کو اپنی خوشحالی اور بد حالی کو اپنی بد حالی سمجھتے تھے۔ وہاں باپ اپنے بچوں کو زندگی کے سہارے مہیا کرتے تھے اور بچے اپنے باپوں کی یادگاریں دیکھا کرتے تھے۔ ان ملکوں سے ان کی قسمت وابستہ ہوا کرتی تھی اور یہ بات ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی قسمت کسی خراب ملک سے وابستہ نہ ہو۔ غربت، تباہی اور بربادی انسانی آنکھوں کو نہیں بھاتی ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو ایک پوری قوم کی بددعاؤں کے درمیان پل کر بوڑھا ہونا چاہیں۔ اگر تاتاری حکمرانوں کے جذبات یا ان کی حرص و ہوس نے انھیں مظالم کرنے پر مجبور بھی کیا تو خود ان کی زندگی میں وہ وقت آگیا جب طاقت کے غلط استعمال کے برے نتیجے خود ان کے سامنے آگئے۔ اگر تشدد وجبر استعمال کرکے دولت جمع بھی کی گئی تو وہ گھریلو دولت تھی۔ وہ اندوختہ تھا جو گھر کا گھر میں رہا۔ یا اسے کسی شاہ خرچ حکمراں کی فضول خرچی نے پھر لوگوں کو واپس کر دیا۔ بدنظمیاں بہت تھیں اور سیاسی طاقت پر رکاوٹ نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ پھر بھی فطرت اپنا کام کرتی رہی۔ دولت حاصل کرنے کے ذرائع ختم نہیں ہوتے تھے اور اس لیے ملک کی تجارت اور صنعت فروغ پاتی رہی۔ حرص اور سود خوری نے بھی قومی دولت کا تحفظ کیا اور اسے استعمال کیا۔ حالانکہ کسانوں اور دستکاروں کو بھاری سود ادا کرنا ہوتا تھا لیکن وہ روپے کے اس ذخیرے کو بڑھا رہے تھے جہاں سے انھیں دوبارہ قرض مل سکتا تھا۔ انھیں اپنے وسائل کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی لیکن ان وسائل کے متعلق انھیں یقین تو ہوتا تھا اور اس کے اثرات اس قسم کے تھے جن سے ملک کی عام دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن انگریزی راج میں حالات بدل گئے۔ تاتاریوں کا حملہ شر انگیز سہی لیکن ہمارا تحفظ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے۔ ان کی دشمنی نے ہندوستان کو تباہ کیا لیکن ہماری دوستی اس کی تباہی کا سبب بن گئی ہے۔ بیس سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری فتح اتنی ہی نا تمام ہے جتنی پہلے دن تھی۔ ہندوستان

کے لوگوں نے کوئی ایسا انگریز نہیں دیکھا ہے جس کے بال سفید ہوں۔ وہاں حکومت نوجوانوں بلکہ لڑکوں کے ہاتھ میں ہے جن کو نہ تو کوئی صحبت میسر آتی ہے اور نہ ہندوستانیوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ وہاں کے لوگوں سے ان کے کوئی تعلقات نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اب بھی انگلستان میں رہ رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دولت کمانے کی کوششوں کے علاوہ وہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دولت کماتے ہیں تاکہ مستقبل بعید میں کاروبار کرسکیں۔ کم عمری کی حرص اور نوجوانی کا جوش ان میں تحریک پیدا کرتا ہے اور وہ ایک کے بعد ایک آتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دیکھتے ہیں کہ گزرتی ہوئی شکاری چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے ہیں۔ وہ اس غذا کی مسلسل تلاش میں رہتے ہیں جو رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ انگریز جو روپیہ کماتا ہے وہ روپیہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کھو دیا کرتا ہے۔"

گورنر ورلسٹ اور ایڈمنڈ برک کے زمانے میں ہندوستان کے نظم و نسق کا جو عالم تھا اس میں بہت تبدیلی ہو گئی ہے۔ پچاس سال سے ہندوستان کے برصغیر میں ایسا امن و چین قائم ہے جس کی مثال اٹھارویں صدی میں نہیں ملتی۔ تجارت ناقابل برداشت اور غیر منصفانہ محاصل سے چھٹکارا پا چکی ہے۔ عدالتی نظام اور جان و مال کا تحفظ بہتر ہے۔ تعلیم پھیلنے کی وجہ سے لوگوں میں ایک نئی بیداری پائی جاتی ہے جس کی بنا پر ان میں بہتر کام کرنے اور زیادہ ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان سے دولت کا مسلسل نکاس آج بھی جاری ہے جس کی شکایت اپنے زمانے میں ورلسٹ اور برک نے بھی کی تھی۔ اس نے ہندوستان کو غربت اور قحطوں کا ملک بنا دیا ہے۔

قحطوں کی راست وجہ بارش کی کمی ہوا کرتی ہے۔ لیکن ان کی شدت کا بڑا سبب لوگوں کا افلاس ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں کی مالی حالت اچھی ہوتی تو وہ مقامی فصلوں کی خرابی کے زمانے میں آس پاس کے صوبوں سے غلہ وغیرہ حاصل کر سکتے اور بھک مری کی نوبت نہ آتی۔ لیکن لوگ چونکہ بے وسیلہ ہیں اس لیے وہ آس پاس کے علاقوں سے ضرورت کی چیزیں خرید نہیں سکتے اور مقامی فصلیں خراب ہو جانے کی صورت میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

1769ء کے ابتدائی زمانے میں قیمتیں بڑھنی شروع ہوئیں۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ قحط پڑنے والا ہے لیکن مال گزاری کی وصولی میں زیادہ سختی سے کام لیا گیا۔ "اس سے پہلے کبھی اتنی مالگزاری وصول نہیں ہوئی تھی"[1]

---

[1] دربار سے متعلق ریزیڈنٹ، 7 فروری 1769۔ انڈیا آفس کا ریکارڈ مندرج ہنٹر۔

سال کے آخر میں موسمی بارش وقت سے پہلے ختم ہو گئی۔ کلکتہ کونسل نے اپنے مراسلے مورخہ 23 نومبر کے ذریعے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا کہ مال گزاری کم وصول ہو گی لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ وہ لوگوں کی امداد کے لیے کیا اقدام کر رہے ہیں۔ 9 مئی 1770ء کو کلکتہ کونسل نے لکھا "قحط پڑ گیا ہے۔ لوگ کس طرح بھوکوں مر رہے ہیں اور بھیک مانگتے پھر رہے ہیں اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پورنیا کے صوبے میں جو کبھی نہایت آسودہ حال تھا ایک تہائی آبادی ختم ہو چکی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی یہی حال ہے۔" 11 ستمبر کو انھوں نے لکھا "لوگوں کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کے بیان میں مبالغے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اس قہر خداوندی نے مال گزاری کی وصولی کو بھی متاثر کیا ہے۔ پھر بھی ہمیں خوشی ہے کہ مال گزاری کی وصولی میں اتنی کمی نہیں ہوئی جتنی ہم سمجھتے تھے۔" 12 فروری 1771ء کو انھوں نے لکھا "گزشتہ قحط کی شدت اور اس کی وجہ سے لوگوں کی تعداد میں کمی آجانے کے باوجود بنگال اور بہار کے صوبوں کے بندوبستوں میں امسال کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔" 10 جنوری 1772ء کو انھوں نے لکھا "امسال آمدنی کے تمام محکموں میں وصولیابی ہماری خواہش کے مطابق کامیابی سے ہوئی۔"[1]

لوگوں کی تکلیفوں اور بھک مری کے زمانے میں اتنی سختی کے ساتھ مال گزاری وصول کرنا اسقدر تکلیف دہ ہے کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کاؤنسل کے ارکین نے قحط کے اثرات معلوم کرنے کے لیے جو دورہ کیا تھا اس سے انھیں معلوم ہوا کہ بنگال کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ یا تقریباً ایک کروڑ انسان قحط کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف تو ہر گانو، بازار اور راستے میں مرنے والے بدقسمتوں کی امداد کے کوئی باقاعدہ اقدامات نہیں کیے گئے۔ دوسری طرف کمپنی کے ملازموں کی کارروائیوں نے مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ ان کے گماشتوں نے نہ صرف کل غلے پر اجارہ حاصل کر لیا تاکہ دکھوں کے مارے لوگوں کے ہاتھ زیادہ قیمت پر فروخت کیا جا سکے بلکہ کسانوں کو مجبور کیا کہ وہ بیج بھی فروخت کر دیں جو اگلی فصل کے لیے بچا کر رکھا گیا تھا۔ اس قسم کی اطلاعات ملنے پر کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ناراضگی کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ "ان مجرموں کو سخت سزائیں دی گئی ہوں گی جنھوں نے کمپنی کے فیض رسانی کے کاموں میں رکاوٹ ڈالی اور لوگوں کے دکھوں سے فائدہ اٹھانے کا خیال بد دل میں لائے۔"[2]

---

[1] انڈیا آفس کے ریکارڈ کے اقتباسات مندرج ہنٹر، صفحات 399 —— 404

[2] انڈیا آفس کے ریکارڈ کے اقتباسات مندرج ہنٹر، صفحہ 420

لیکن جہاں خود ان کے مفاد کا سوال ہوتا تھا وہاں کمپنی کی "فیض رسانی" دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ بنگال کی ایک تہائی آبادی کے ختم اور ایک تہائی اراضی کے بنجر ہو جانے کے بعد مال گزاری میں کوئی کمی کی گئی ہو۔ وارن ہیسٹنگز نے 3 نومبر 1772ء کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کو لکھا تھا۔

اس کے باوجود کہ صوبے کی ایک تہائی آبادی ختم ہو گئی اور اس کے نتیجے میں کاشت بھی کم ہو گئی۔ 1771ء کی خالص وصولیابی 1768ء سے بھی زیادہ تھی۔ امید تو یہ کی جاتی تھی کہ اس عذاب الٰہی کے دوسرے نتائج کے ساتھ مال گزاری بھی کم وصول ہو گی۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے اس کو سختی کے ساتھ پرانے معیار کے مطابق رکھا۔[1]

ہندوستان کی جدید انتظامیہ کی زبان میں مال گزاری کو سختی کے ساتھ وصول کرنے کو ہندوستان کی قوت تلافی کہا جائے گا۔

---

[1] انڈیا آفس کے ریکارڈ کے اقتباسات مندرج ہنٹر، محولہ بالا کتاب، صفحہ 381

باب — 4

وارن ہیسٹنگز بنگال میں (1772 لغایت 1785)

برطانوی پارلیمنٹ نے 1773ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ Regulating Act منظور کیا۔ وارن ہیسٹنگز جو 1772ء میں بنگال کا گورنر مقرر ہوا تھا نئے ایکٹ کی رو سے 1774ء میں پہلا گورنر جنرل ہوگیا۔ اس کی کونسل کے تین اراکین کی تقرری انگلستان میں عمل میں آئی۔ ان میں فلپ فرانسس بھی شامل تھا۔ دو اراکین کا انتخاب کمپنی کے ملازمین میں سے کیا گیا۔ کلکتے میں ایک سپریم کورٹ قائم کیا گیا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان نئے انتظامات کی بنا پر ہندوستان کا نظم و نسق بہتر ہو جائے گا۔

وارن ہیسٹنگز کا نام تاریخ ہند کے ناقابل فراموش واقعات کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو پارلیمنٹ، کے ایوان میں طویل بحثوں کا موضوع بنے تھے۔ یہ اودھ کی بیگموں، بنارس کے راجہ اور رہیلوں کی جنگ کی کہانیاں یاد دلا دیتا ہے۔ ہیسٹنگز کے زمانہ حکومت کے وہ واقعات جو زیادہ ڈرامائی نہ سہی مگر زیادہ اہم ضرور تھے۔ مغرب میں مرہٹوں اور جنوب میں حیدر علی کے ساتھ انگریزوں کی جنگیں تھیں۔ حالانکہ ہیسٹنگز کا زمانہ حکومت ایک صدی پہلے ختم ہو چکا لیکن ان تمام واقعات کے تعلق سے ہیسٹنگز کا رویہ آج بھی نزاعی ہے۔

ہمیں اس سے بہت اطمینان حاصل ہوا ہے کہ موجودہ کتاب اس نزاع سے پاک ہے۔ اس کتاب کے مقصد کے پیش نظر ہم وارن ہیسٹنگز کی ان سرگرمیوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے جن کا اثر لاکھوں انسانوں کی خوش حالی یعنی قوم کی معاشی حالت پر پڑا۔ اس کتاب میں ہم صرف وارن ہیسٹنگز کے سول اور مالی انتظام کا جائزہ لیں گے۔ ان نزاعی باتوں سے ہم اپنا دامن بچائے رکھیں گے۔ جن کے لیے سو سال سے زیادہ کی مدت تک مقرروں کی زبانیں اور مورخوں کے قلم وقف رہے ہیں۔

ہم وارن ہیسٹنگز سے ایک مضبوط اور باصلاحیت انسان اور ایک انصاف پسند اور باعزت آدمی

کی حیثیت سے پہلے بھی مل چکے ہیں جس نے نہایت جرأت کے ساتھ کمپنی کے ملازمین کی دست برد سے میر قاسم کے حقوق کو بچانے کی کوشش کی اور بنگال کے لوگوں کی داخلی تجارت کو نئے حکمرانوں کی حرص و ہوس سے محفوظ رکھنا چاہا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اپنے زمانے کے تمام دوسرے انگریزوں کی طرح ہیسٹنگز بنگال کے مال گزاری کے طریقوں اور مسائل سے نابلد تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹرز برابر مال گزاری میں اضافے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے اسے مسائل کو سمجھنے اور منصفانہ انداز سے ان کو حل کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اٹھارویں صدی میں انگریز محض آراضی کے انگریزی نظام سے واقف تھے جس کے تحت زمین زمیندار کی ملکیت ہوتی تھی، کسانوں کو اٹھائی جاتی تھی اور مزدوروں کے ذریعے جوتی جاتی تھی۔ بنگال کا طریقہ اس سے بہت مختلف تھا۔ ریاست، زمیندار اور کسان وقتاً فوقتاً جو متضاد مطالبے پیش کیا کرتے تھے انھوں نے مدت تک اس ادارے کے حقیقی خط و خال کو نظروں سے اوجھل رکھا۔ ریاست کو کسی طرح مالک نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ صرف مال گزاری وصول کرنے کی حقدار تھی۔ زمیندار نسلاً بعد نسل جاگیروں پر قابض رہا کرتے تھے۔ وہ جاگیردار تھے جنھیں دیوانی اور فوجداری اختیارات حاصل ہوا کرتے تھے اور کسانوں سے روایتی لگان وصول کرنے کے حقدار تھے۔ کسان محض مزدور نہیں تھے۔ انھیں کاشت پر حقوق حاصل ہوا کرتے تھے جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے تھے۔ رواج کے مطابق وہ زمیندار کو لگان ادا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بنگال کے نواب جاگیروں کی پیمائش نو کیا کرتے تھے اور مالگزاری بڑھا دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی زمیندار بھی لگان بڑھا دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود صدیوں تک اس انتظام کی خاص خاص باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ریاست مال گزاری کی حقدار تھی۔ زمیندار روایتی لگان کے حقدار تھے اور ریاست کو مال گزاری دیا کرتے تھے۔ کسانوں کو کاشت میں موروثی حقوق حاصل تھے بشرطیکہ وہ زمیندار کو لگان ادا کرتے رہیں۔

1765ء میں جب شاہی فرمان کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی کے حقوق حاصل ہو گئے تو کمپنی کے ملازمین نے فوراً نہ مال گزاری کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا اور نہ عدالتی نظام۔ مرشدآباد کا مسلمان حاکم نواب کے دربار سے وابستہ کمپنی کے ریزیڈنٹ کی نگرانی میں بنگال کی مالگزاری وصول کرتا رہا۔ ایک ہندو سردار ستاب رائے کمپنی کے ایجنٹ مقیم پٹنہ کی نگرانی میں بہار کی مال گزاری وصول کرتا رہا۔[1] صرف کمپنی کے پرانے مقبوضات یعنی چوبیس پرگنہ، بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 5

کا انتظام کمپنی کے ان ملازمین کے ہاتھوں میں تھا جن سے معاہدۂ ملازمت کیا گیا تھا۔

1769ء میں کمپنی کے سپروائزر مقرر کیے جن کو اختیار دیا گیا کہ وہ مال گزاری کی وصولیابی اور عدالتی کی نگہداشت کریں۔ یہ "دو عملی حکومت" کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ ملک کے حقیقی حکمران ہندو اور مسلمان مال گزاری وصول کرنے والوں کی آڑ میں رہا کرتے تھے۔ وہ مال گزاری کی رقم حاصل کرلیا کرتے تھے لیکن حکمرانوں کی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کیا کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان مال گزاری وصول کرنے والے خود کو کمپنی کے ایجنٹ تصور کیا کرتے تھے اور اس لیے حکمرانوں کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا کرتے تھے۔ لوگوں پر ظلم توڑتے تھے۔ کوئی ان کا تحفظ نہیں کرتا تھا۔

1769ء میں مقرر ہونے والے سپروائزروں کی تحقیقات نے ظاہر کیا کہ حکومت میں ہر طرف بدنظمی تھی۔ مال گزاری وصول کرنے والے حکام "زمینداروں اور دوسرے بڑے مال گزاروں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کرتے تھے اور انھیں اجازت دیتے تھے کہ وہ لپنے سے کمتر حیثیت والوں کو لوٹیں۔ صرف وہ اپنے اس حق کو برقرار رکھتے تھے کہ وہ زمینداروں کو لوٹ سکیں — جہاں تک عدالتوں کا تعلق تھا" باضابطہ عدالتیں ہر جگہ موقوف ہوگئی تھیں لیکن ہر وہ شخص عدالت کے اختیار استعمال کرتا تھا جو دوسروں کو اپنے فیصلے تسلیم کرنے پر مجبور کرسکتا تھا"[1]

1772ء میں طے کیا گیا کہ ملک کا انتظام برطانوی حکام کے سپرد کر دیا جائے۔ گورنر ان ہیسٹنگز نے ایک کمیٹی بنائی جس میں کاؤنسل کے چار اراکین شامل تھے اور مال گزاری اور عدلیہ کے انتظام کے اقدام کیے۔ خزانہ اور مالیات کا محکمہ مرشدآباد سے کلکتے منتقل کر کے ایک بورڈ آف ریونیو... (BOORD OF REVENIVE) کے سپرد کر دیا گیا جو گورنر اور اس کی کاؤنسل کے اراکین پر مشتمل تھا اضلاع میں یورپی سپروائزروں کو، جواب کلکٹر کے نام سے پکارے جاتے تھے، مال گزاری وصول کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ پانچ سال کے لیے مال گزاری کا بندوبست کر دیا گیا اور کمیٹی کے چار اراکین کو دورے پر بھیجا گیا تاکہ اس منصوبے پر عمل کراسکیں۔ انصاف کے لیے ہر ضلع میں ایک دیوانی اور ایک فوجداری عدالت قائم کی گئی۔ کلکٹر دیوانی عدالت کا سربراہ تھا اور فوجداری عدالت میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ جہاں ایک مسلمان قاضی دو مولویوں کی مدد سے انصاف کیا کرتا تھا۔ ان دیوانی اور فوجداری عدالتوں کی اپیلیں کلکتہ کی دو اعلیٰ عدالتوں میں سنی جاتی تھیں۔ پولیس کا ایک نیا نظام وجود میں آیا۔ اس زمانے میں ——— بنگال جن ——— چودہ ضلعوں میں ——— منقسم تھا ان میں

[1] ریزیڈنٹ اور کاؤنسل کا خط مورخہ 3 نومبر 1772ء

دیسی پولیس افسر مقرر کئے گئے جو فوجدار کہلاتے تھے اور حکام مال اور حکام عدلیہ کے لیے جو ضابطے بنائے گئے تھے وہ مقامی زبان میں شائع کرکے نافذ کیے گئے۔ یہ انتظامی اصلاحات وارن ہیسٹنگز کی صلاحیت اور قابلیت کا ثبوت ہیں لیکن ان سے برطانوی نظم ونسق کی اس خرابی پر بھی روشنی پڑتی ہے جو آج تک بحال و برقرار ہے یعنی عام لوگوں پر اعتماد کی کمی۔ کمپنی کے ملازموں کی طرح اٹھارویں صدی کے ہندو اور مسلمان حکام کا بھی دامن صاف نہیں تھا اور وہ بھی انتہائی حریص تھے۔ ہیسٹنگز اور اس کے جانشین کارنوالس نے کوشش کی کہ برطانوی حکام ایمانداری سے کام لیں۔ ان پر اعتماد کیا اور انھیں ذمہ داری سونپی اور ان کے کام کا مناسب معاوضہ دیا۔ ہندو اور مسلمان حکام پر نہ اعتماد کیا گیا اور نہ انھیں ذمہ داری سونپی گئی۔ انھیں مناسب تنخواہیں نہیں دی گئیں اور انتظامی کاموں میں ان کا تعاون حاصل نہیں کیا گیا۔

ریگولیٹنگ ایکٹ کی رو سے وارن ہیسٹنگز 1774ء میں گورنر جنرل ہو گیا۔ مال گزاری کا پانچ سالہ بندوبست ناکام ہو چکا تھا۔ زمینداروں کے حقوق نظر انداز کر دیے گئے تھے جو موروثی مالکان اراضی تھے اور بندوبست میں زمینیں نیلام کی گئی تھیں۔ نیلام میں بولی بولنے والوں کو مقابلے کی خواہش نے بڑی بڑی بولیاں بولنے پر اکسایا تھا۔ انھوں نے زمین جوتنے والوں کا خون نچوڑا اور اس کے باوجود مال گزاری کی وہ رقم ادا نہیں کر سکے جس کا انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ بنگال کے طریقہ مالگزاری کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی، زمینداروں کے قدیم خاندان تباہ ہو گئے تھے اور کسانوں کے ساتھ سخت مظالم ہوئے تھے۔ 1774ء میں یورپی کلکٹر واپس بلا لیے گئے۔ وصولیابی کی نگرانی کا کام کلکتہ، بردوان، ڈھاکہ، مرشد آباد، دیناج پور اور پٹنہ کی مقامی کونسلوں کے سپرد کیا گیا اور اضلاع میں ہندوستانی عامل مقرر کیے گئے اور ان کے سپرد وہ کام کیا گیا جو ان کے بس سے باہر تھا۔

1776ء میں منصفانہ بندوبست کی پالیسی پر کلکتے میں بحث ہوئی۔ وارن ہیسٹنگز اور بارویل BARWELL نے تجویز پیش کی کہ جاگیروں کا عام نیلام کیا جائے یا ٹھیکے پر دیے جائیں اور خریداروں یا ٹھیکے داروں سے حین حیات مال گزاری کا بندوبست کیا جائے۔ ایک زیادہ سمجھدار مدبر نے جو انگریزی ادب میں لیٹرس آف جونیس LETTERS OF JUNIUS کے مصنف کی حیثیت سے جانا جاتا ہے وسیع تر اور زیادہ منصفانہ رویہ اختیار کیا۔ فلپ فرانسس اس زمانے میں گورنر جنرل کی کاؤنسل کا رکن تھا اس نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنی روداد میں سفارش کی کہ ریاست کے مال گزاری کے مطالبے کا دائمی تعین کر دیا جائے۔

"زیادہ تر زمیندار تباہ اور اپنی زمینوں سے بے دخل ہو چکے ہیں۔ اب بڑی حیثیت اور بڑے خاندان کے لوگ یا ایسے لوگ جو پہلے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے بہت کم باقی رہے ہیں وہ بھاری منافع کمانا چاہتے ہیں۔ ملک کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لگان بھی وصول کریں اور منافع بھی کمائیں۔ اس لیے چھوٹی حیثیت کے لوگوں کو حکومت کی طرف سے عامل یا کلکٹر مقرر کیا گیا۔ ان لوگوں نے ان اضلاع کے لیے جہاں ان کا تقرر ہوا ایک رقم ادا کرنے کا معاہدہ کیا۔ حقیقت میں ان لوگوں کو مال گزار سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ لوگ صدر یا حکومت کے مرکز سے ضلعوں کو گئے تاکہ زمینداروں یا کسانوں سے اس مال گزاری کا معاملہ طے کرلیں جس کی ادائیگی کی ذمہ داری انھوں نے لی تھی۔"

مال گزاری کے اس طریقے کی خرابیاں ظاہر کرکے اور ملک پر اس کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لے کر فلپ فرانسس نے سفارش کی کہ لوگوں کو خوش حالی میں اضافہ کرنے کی غرض سے مال گزاری کا دائمی بندوبست کیا جائے۔

جمع بندی کا تعین کرکے اس کو سرکاری دستاویزات میں درج کردیا جائے۔ یہ دائمی ہو اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جاسکے اور اگر ممکن ہو تو لوگوں کو اس کی دائمی حیثیت کا یقین دلایا جائے۔ ان شرائط کا تعلق آراضی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت مالک کون ہے یا آئندہ مالک کون ہوگا۔ اگر لوگوں کے پاس چھپی ہوئی دولت موجود ہے تو وہ اس کو نکال کر آراضی کو ترقی دینے پر خرچ کریں گے۔ مالک کو یہ یقین ہوگا کہ وہ اپنے لیے محنت کر رہا ہے۔"[1]

جب یہ تجاویز لندن میں ڈائریکٹرز کے سامنے پیش کی گئیں تو انھیں کوئی قطعی فیصلہ کرنے میں پس وپیش ہوا۔ انھوں نے انگریزوں کی حقیقی یعنی کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کی پالیسی اپناتے ہوئے جواب دیا "ہم نے آراضی کو تازیست یا دائمی طور سے ٹھیکے پر دینے کے متعلق پیش ہونے والے مختلف خیالات پر غور کیا۔ بہت سے اسباب کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ اس وقت ان دونوں میں سے کسی بھی طریقے کو اختیار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" یہ بدترین فیصلہ تھا جو ڈائریکٹروں نے کیا۔ ان نے وارن ہیسٹنگز کے تجویز کردہ تازیست ٹھیکے اور فلپ فرانسس کے تجویز کردہ دائمی ٹھیکے دونوں کی نفی کی اور نیلام کے ذریعے ہونے والے کم مدتی ٹھیکوں کے طریقے کو برقرار رکھا جس نے بنگال کے صوبے کو قریب قریب تباہ کردیا تھا۔ ہندوستان کے تاجر حکمران "دقیع اسباب کی بنا پر"

---

[1] فلپ فرانسس کی روداد' 1776 ' جو 1782ء میں لندن میں شائع ہوئی۔

مال گزاری میں مسلسل اور جلدی جلدی ہونے والے اضافے چاہتے تھے۔ مزید دس سال تک بنگال نیلام کے طریقوں، مدتی ٹھیکوں اور نادہند زمینداروں کی سزایابیوں کو جھیلتا رہا۔

1772ء میں ہونے والے پانچ سالہ بندوبست کی مدت 1777ء میں ختم ہوگئی۔ نیلام کے طریقوں میں جزوی تبدیلی کی گئی اور موروثی زمینداروں کو ترجیح دی گئی۔ لیکن اس طریقے کی سختی میں اس اعلان سے اضافہ ہوگیا کہ آئندہ بندوبست پانچ سال کے بجائے ہر سال کیا جائے گا۔ اس طرح 1778ء 1779ء اور 1780ء میں زمینیں ہر سال زمینداروں کو اٹھائی گئیں۔ اس معاشی ظلم نے ملک کو پیں ڈالا۔ ایک دفعہ پھر آمدنی میں کمی ہوگئی۔

1781ء میں بڑی بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ دیوانی عدالتوں کی ہدایت کے لیے 13 ضابطے تیار کیے گئے جو کچھ مدت بعد بچانوے دفعات کے ضابطہ دیوانی میں شامل کر دیے گئے۔ اس کو فارسی اور بنگالی ترجموں کے ساتھ شائع کر دیا گیا۔ صوبے میں بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام کے لیے سول ججوں اور کلکٹروں کو مجسٹریٹوں کے اختیارات دے دیے گئے۔ کلکتہ میں مال گزاری کی ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے صرف ایک سال کے لیے نئے بندوبست کا منصوبہ پیش کیا۔ اس میں زمینداروں کو ترجیح دی گئی تھی۔ بندوبست ہوگیا اور مال گزاری میں چھبیس لاکھ روپے یا 2,60,000 پاؤنڈ کا اضافہ کر دیا گیا۔

سالانہ ہونے والے بندوبستوں، بار بار کیے جانے والے اضافوں اور وصولیابی کے سخت طریقوں کی وجہ سے بنگال کے تمام زمینداروں اور مالکان اراضی کے قدیم خاندانوں کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اس قسم کی تکلیفیں انھوں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی تھیں۔ پرانے خاندانوں کے وارثوں کی جاگیریں ساہوکاروں اور کلکتے کے سٹے بازاروں کے قبضوں میں چلی گئیں۔ بیواؤں اور نابالغ مالکان اراضی کی پرامن رعیت پر وہ حریص کارندے مظالم توڑنے لگے جن کا تقرر کلکتہ سے ہوتا تھا۔ اتفاق سے بنگال کی تین بڑی جاگیریں، جن میں سے ہر ایک کی ایک ایک لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی مالگزاری تھی اس وقت تین ممتاز و نمایاں خواتین کے زیر انتظام تھیں۔ ان تینوں خواتین کے نام ان کے ہم وطنوں کے دلوں پر نقش ہیں۔ بردوان کی جاگیر، جس کی مال گزاری 3,50,000 پاؤنڈ سے اوپر تھی، مشہور تلک چند کی بیوہ اور اتنے ہی مشہور تیج چند کی ماں کے زیر نگرانی تھی۔ راج شاہی کی جاگیر جس کی مال گزاری 2,60,000 پاؤنڈ سے اوپر تھی واجب التعظیم رانی بھوانی کے زیر نگرانی تھی جن کی اعلیٰ قابلیت اعلیٰ منصب، پاک دامنی اور داد و دہش کے شاندار کارناموں کو آج بھی ہندوستان کے لوگ

یاد کرتے ہیں۔ دیناج پور کا راجہ 1780ء میں مرگیا تھا اور اس کی بیوہ اس کے وارث کی نگراں تھی جو صرف پانچ سال کا تھا۔ اس جاگیر کی مال گزاری 40,000 پاؤنڈ سے کچھ زیادہ تھی۔ ان جاگیروں کی تاریخ سے لوگوں کی ان تکلیفوں پر کچھ روشنی پڑتی ہے جو وارن ہیسٹنگز کی روز بروز بدلنے والی مالگزاری کی پالیسی کی وجہ سے انھیں اٹھانی پڑیں۔

سب سے زیادہ تکلیف دیناج پور کے لوگوں کو اٹھانی پڑی۔ نابالغ وارث کی طرف سے جاگیر کا انتظام کرنے کے لیے ایک بے ایمان اور مرتشی ایجنٹ دیبی سنگھ کی تقرری عمل میں آئی۔ دیبی سنگھ نے پورنیا اور رنگ پور میں بڑے مظالم کیے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے عہدے سے برطرف کردیا گیا تھا اور کمپنی کے کاغذات میں اس کے خلاف اندراجات ہوگئے تھے۔ لیکن جاگیردار کی نابالغی کے زمانے میں چونکہ دیناج پور کی مال گزاری میں اضافہ کرنا مقصود تھا اس لیے ایک مناسب ایجنٹ کی حیثیت سے دیبی سنگھ کا انتخاب کیا گیا۔ دیبی سنگھ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اس نے وہ ظلم کیے جن کی مثال اٹھارویں صدی کے بنگال میں بھی نہیں ملتی۔ مال گزاری میں اضافہ کرنے کے لیے اس نے زمینداروں کو قید کر دیا۔ اور کسانوں کو کوڑے لگوائے۔ عورتیں بھی ان کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس نے کوڑوں کی صعوبت کے ساتھ ان کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا اور ان کی عصمت ریزی کی۔

دیبی سنگھ کے مظالم نے دیناج پور کے مظلوم کسانوں کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے ضلع سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن مسلح سپاہیوں کے دستوں نے انھیں واپس کہ جانے پر مجبور کیا۔ بہت سے کسانوں نے بھاگ کر جنگلوں میں امان لی۔ دنیا کے سب سے زیادہ پرامن اور اطاعت گزار کسانوں کی ایک بڑی تعداد بغاوت پر کمربستہ ہوگئی۔ دیناج پور اور رنگ پور میں شورش پھیل گئی۔ فوج طلب کرلی گئی۔ اس کے بعد سزاؤں اور ظالمانہ پھانسیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ضلع کے انگریز حاکم مسٹر گوڈلیڈ .... GOODLAD نے اس شورش کو بنگال میں ہونے والے بدترین ہنگامے سے تعبیر کیا۔ جس سختی کے ساتھ اس کو دبایا گیا غالباً اس کی مثال بھی بنگال نہیں پیش کرسکتا۔

بردوان کے حالات اس حد تک افسوسناک نہیں تھے۔ وہاں جو بھی زیادتیاں ہوئیں وہ عام لوگوں کے بجائے زیادہ تر جاگیردار کے خاندان کے ساتھ ہوئیں۔ مہاراجہ تلک چند کا انتقال 1767ء میں ہوگیا تھا۔ اس کے نابالغ بیٹے تیج چند کی وراثت کو تسلیم کرلیا گیا تھا اور اس کی تصدیق ہوگئی تھی۔ مرحوم جاگیردار نے لالہ اُمّی چند کو، جس سے خاندانی مراسم تھے، جاگیر کا مہتمم مقرر کردیا تھا لیکن جان گریہم JOHN GRAHAM نے، جو ضلع کا حاکم تھا، رانی کو مجبور کیا کہ وہ ایک

حریص اور بے ایمان شخص برج کشور کو منیجر مقرر کرے۔ جہاں تک ایک عورت کے لیے ممکن تھا رانی نے اس کی بے ایمانیوں کے سد باب کی کوشش کی اور اسے جاگیر کی مہر دینے سے انکار کر دیا۔

رانی نے 1776ء میں ایک یادداشت وارن ہیسٹنگز کو پیش کی تھی جس میں لکھا تھا "میرے بیٹے کی مہر میرے قبضے میں تھی۔ چونکہ میں کسی کاغذ کو پڑھے بغیر اس پر مہر نہیں لگاتی تھی اس لیے برج نے ہر امکانی کوشش کی کہ مہر اپنے قبضے میں کرے۔ لیکن میں کسی طرح اس پر تیار نہیں ہوئی۔ اس پر بنگالی سن 1179 (1772ء) میں برج نے مسٹر گریہم کو بردوان آنے پر رضامند کیا۔ میرے بیٹے تیج چند کو جو صرف نو سال کا ہے مجھ سے علیحدہ کر دیا اور ایک جگہ اس کو نظر بند کر کے پہرہ بٹھا دیا۔ اس تکلیف اور خوف کے عالم میں جب کہ سات دن تک مجھ پر کھانا بند رہا اور میری جان خطرے میں پڑ گئی۔ مجھے کوئی بچت کی صورت نظر نہیں آئی اور میں نے مہر اس کے حوالے کر دی۔"[1]

خط میں مزید لکھا گیا تھا کہ اس طرح جاگیر کی مہر حاصل کرنے کے بعد برج کشور نے جاگیر کی دولت برباد کی، بڑے بڑے غبن کیے اور حسابات پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ رانی اور اس کے بیٹے کی جان خطرے میں تھی اور اس نے درخواست کی تھی کہ اسے کلکتہ آنے اور وہاں بحفاظت زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے۔

گورنر جنرل کی کاؤنسل کے اراکین کلورنگ (CLURERING) مانسن (MONSON) اور فرانسس نے برج کشور اور جان گریہم کے خلاف غبن کے الزام کی تفتیش کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے 11 جنوری 1775ء کو لکھا "ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ مسٹر گریہم اور بردوان کے دیوان کے خلاف غبن کے الزام میں کتنی حقیقت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے نابالغ لڑکے کا روپیہ غبن کیا گیا ہے۔ اپنے لگائے ہوئے الزامات کو ثابت کرنا اس کا کام ہے۔ ہم ناانصافی سے کام لینا نہیں چاہتے اور کسی باعزت اور معصوم انسان کے خلاف لگائے جانے والے الزامات کو اس وقت تک کوئی وقعت نہیں دینا چاہتے جب تک وہ ثابت نہ ہو جائیں۔ رانی کی درخواست میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ سائل کی درخواست منظور کی جانی چاہیے۔"[2]

لیکن کاؤنسل کے اراکین کے باہمی اختلافات نے باضابطہ تحقیقات میں رکاوٹ ڈالی۔

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی گیارھویں رپورٹ، 1783، ضمیمہ 0

[2] سلیکٹ کمیٹی کی گیارھویں رپورٹ، 1783، ضمیمہ 0

وارن ہیسٹنگز نے جان گریہم کا تحفظ کیا۔ کلورنگ، مانسن اور فرانسس نے لکھا " ایسے چھوٹے شخصوں سے جو بقول گورنر جنرل مسٹر گریہم کو ملے تھے وہ اتنی زیادہ دولت جمع نہیں کر سکتے تھے جتنی کہ ان کے پاس بتائی جاتی ہے "۔ ہیسٹنگز نے جواب دیا۔ " مجھے مسٹر گریہم کی دولت کے متعلق کچھ نہیں معلوم ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اکثریت کے بیان کو نامناسب قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اسے بردوان کی رانی کے الزامات سے بری قرار دیا جائے "۔

اس کے بعد بردوان کی جاگیر پر بھاری مال گزاری لگائی گئی۔ ریونیو بورڈ کا دیوان گوبند گنگا بردوان کے خاندان کا دوست نہیں تھا اور اس نے بنگال کی پرانی زمینداریوں میں سب سے زیادہ مالگزاری بردوان پر لگائی۔ مدتوں تک بردوان اس کا خمیازہ بھگتتا رہا۔ ان جاگیرداروں کے وارث، جو اپنی جاگیروں کے قریب قریب حکمراں ہوا کرتے تھے اور جنھوں نے مرہٹوں کے حملوں کے خلاف بنگال کے نوابوں کی مدد کی تھی، بنگال کے نئے مالکوں کے مالی مطالبات کو پورا کرنے کی خود میں سکت نہیں پاتے تھے۔ اس خاندان کو موروثی لگان داروں کے طبقے نے بچایا جو اسی زمانے میں وجود میں آیا اور زمیندار کی ذمہ داریوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود آج تک بنگال کی تمام دوسری جاگیروں کے مقابلے میں بردوان کی جاگیر نسبتاً زیادہ مال گزاری ادا کرتی ہے۔

لیکن وہ قابل تعظیم خاتون، جس کی بدقسمتی پر اٹھارویں صدی میں بڑا اظہار ہمدردی کیا گیا تھا۔ اور جس کے نام کو قریب قریب مذہبی تقدس کے ساتھ بنگال کے لاکھوں مرد اور عورتیں یاد کرتی ہیں، راج شاہی کی رانی بھوانی تھی۔ لارڈ کلایو کی فتح پلاسی سے پہلے اس کی جاگیر قریب قریب پورے شمالی بنگال پر مشتمل تھی۔ اس نے مسلمان حکمرانوں کی شان و شوکت اور ان کے زوال کے ساتھ برطانوی طاقت کی ابتدا اور ارتقا بھی دیکھا تھا۔ اس کی قابلیت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندو عورت میں انتظامی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کی پاک و صاف زندگی اور بے انتہا داد و دہش نے بنگال کے گھر گھر میں اس کا نام مشہور کر دیا تھا۔ آج تک اس کی کہانی ہندو لڑکے اور لڑکیاں پڑھا کرتے ہیں اور اس کو ان نو عورتوں میں سے ایک سمجھا کرتے ہیں جنھوں نے تاریخ اور حکایتوں میں ہندوستانی عورت کا نام روشن کر دیا۔

وارن ہیسٹنگز کے شروع کردہ مال گزاری کے نئے طریقے نے اور 1772ء کے پنج سالہ بندوبست نے بنگال کی دوسری جاگیروں کی طرح راج شاہی کو بھی متاثر کیا۔ گورنر اور کاؤنسل نے اپنے مراسلے مورخہ 31 دسمبر 1773ء میں لکھا تھا " راج شاہی کی زمیندار، رانی بھوانی ادائیگی

کے معاملے میں دوسروں سے پیچھے ہے۔" 15 مارچ 1774ء کو انھوں نے فیصلہ کیا کہ "رانی کو اطلاع دی جائے کہ اس نے اگر بنگال کے ماگھ مہینے (10 فروری) تک کی واجب الادا رقم 30 پھاگن (یکم مارچ) تک ادا نہیں کردی تو ہم مجبوراً اس کو زمینداری سے بے دخل کردیں گے اور اس پر ان لوگوں کو قبضہ دے دیں گے جو سرکاری مطالبات وقت پر پورے کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔" ایک دوسرے خط مورخہ 18 اکتوبر 1774ء کے ذریعے گورنر جنرل نے فیصلہ کیا کہ اسے زمینداری، کاشت اور دوسرے املاک سے بیدخل کردیا جائے اور اس کی گزربسر کے لیے 4,000 روپیہ (پاؤنڈ 400) ماہوار کا حین حیات وظیفہ مقرر کردیا جائے۔[1]

ان بہت سی عرضداشتوں میں جو معمر رانی نے توہین اور بے عزتی سے بچنے کے لیے پیش کی تھیں کچھ غیر معمولی دلچسپی کی حامل ہیں۔ ایک درخواست میں اس نے 1772ء کے پنج سالہ بندوبست کے وقت سے اپنی جاگیر کی تاریخ دہرائی اور انگریزوں کے مقرر کیے ہوئے ٹھیکیدار دولال رائے کے مظالم کا ذکر کیا جس کے نتیجے میں دیہات ویران ہو گئے تھے

"سن 1179 (1772ء) میں انگریزی سرکار کے کچھ حاکموں نے میری زمینوں کے تمام پرانے لگانوں کو یکجا کردیا اور ضلعداری، متفوٹ اور دوسرے عارضی محصولوں کو دائمی بنادیا۔ . . . . میں پرانی زمیندار ہوں۔ مجھ سے اپنے آسامیوں کے دکھ نہیں دیکھے گئے اس لیے میں اس پر تیار ہوگئی کہ دیہات کو اپنی خود کاشت میں تبدیل کرلوں۔ اس کے بعد میں نے دیہات کا دورہ کیا، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ زمین اس قابل نہیں کہ لگان ادا ہو سکے۔"

بھدر یا اگست 1773ء میں دریا میں باڑ آگئی اور کسانوں کی زمینیں اور فصلیں پانی میں ڈوب کر خراب ہوگئیں۔ میں زمیندار ہوں اور اس لیے میں مجبور تھی کہ اسامیوں کو تباہی سے بچاؤں۔ میں نے انھیں لگان کی ادائیگی کے لیے مہلت دے کر زیادہ سے زیادہ آسانی بہم پہنچائی۔ میں نے ان شریف النسانوں (انگریز حاکموں) سے درخواست کی کہ اسی طرح وہ بھی مجھے مہلت دیں تاکہ میں بھی مال گزاری ادا کرسکوں۔ لیکن انھوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا بلکہ میرے مکان سے کچہری (لگان کی وصولیابی کا دفتر) ہٹا کر موتی جھیل لے گئے اور دولال رائے کو ملازم رکھ کر مجھ سے اور میری جاگیر سے مال گزاری وصول کرنے کا کام اس کے سپرد کردیا۔"

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی گیارھویں رپورٹ، 1783ء، ضمیمہ 0

"اس کے بعد میرے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا اور میری تمام املاک کی تحقیقات کی گئی۔ میں نے زمیندار اور کاشتکار کی حیثیت سے جو چیزیں جمع کی تھیں وہ مجھ سے لے لی گئیں۔ جو روپیہ میں نے قرض لیا تھا اور جو ماہوار وظیفے کی صورت میں مجھے ملا تھا وہ سب مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس کی مجموعی رقم 674، 58، 22 روپیہ تھی۔

" 1181 کے نئے سال میں (1774ء) تمام علاقہ 824، 27، 22 روپیہ کے عوض دلال رائے کو ٹھیکے پر دے دیا گیا اور مجھ سے تمام اختیارات چھین لیے گئے۔ اس کے بعد دلال رائے اور ایک کم حیثیت شخص پرن بوس نے علاقے پر اور محاصل لگائے یعنی ایک اور ضلعداری ستھوٹ اور 187 لگایا یعنی پچھلے کسانوں کے بھاگنے سے جو نقصان ہوا تھا وہ موجودہ کسانوں سے وصول کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ دونوں اشخاص احکام جاری کرتے ہیں اور کسانوں سے ان کا تمام مال و اسباب بیچ کر غلہ اور کھیت جوتنے کا بیل بھی چھین لیتے ہیں۔ انھوں نے تمام علاقے ویران و برباد کر دیے ہیں۔ میں ایک پرانی زمیندار ہوں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ علاقہ لوٹا جا رہا ہے اور کسان شاکی ہیں۔"

"ان وجوہ کی بنا پر میں یہ درخواست پیش کر رہی ہوں۔ اب 817، 27، 22 روپیہ مال گزاری کا مقرر ہوگیا ہے جو امسال دلال رائے ادا کرے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ سرکار کو کوئی نقصان ہو اس لیے میں رقم ادا کرنے کو تیار ہوں۔"[1]

یہ اقتباسات اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کے زیادہ تر حصوں میں اس وقت کیا ہو رہا تھا۔ اگر پرانے زمیندار نیلام میں بولی بولنے والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے تو انھیں ان زمینداریوں سے بے دخل کر دیا جاتا تھا جو نسلاً بعد نسلاً ان کے باپ دادا کے قبضے میں رہی تھیں۔ اگر وہ زیادہ مال گزاری ادا کرنے کا وعدہ کر کے اپنی زمینداریوں کا ٹھیکہ لے لیتے تھے اور وقت پر مال گزاری ادا نہیں کر پاتے تھے تو ان پر بنیے مسلط کر دیے جانے سے جو کسانوں کو لوٹتے تھے اور زمینداریوں کو تباہ اور برباد کر دیتے تھے۔ لیکن تمام جبر و زیادتی کے باوجود مال گزاری ادا نہیں ہو پاتی تھی۔ بنگال کی ایک تہائی قابل کاشت زمین جنگل میں تبدیل ہوگئی تھی۔

رانی بھوانی کے بیٹے پران کرشن نے اور عرضداشتیں پیش کیں۔ مال گزاری سے متعلق

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی گیارھویں رپورٹ، 1783ء، ضمیمہ 5

کئی دفعہ مشورے ہوئے۔ فلپ فرانسس نے اس طریقے کے خلاف احتجاج کیا کہ یورپی ملازمین نہیوں یا اپنے ہندوستانی گماشتوں کے نام سے ٹھیکے لیا کرتے ہیں۔ اس نے کہا "ملک ہندوستانیوں کا ہے۔ پچھلے فاتح ملک سے خراج حاصل کر کے مطمئن ہو جاتے تھے ...... ابھی تک ملک کے پرانے رسم و رواج میں جو بھی تبدیلی کی گئی ہے اس کے نتائج خطرناک حد تک برے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ میری رائے میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بنگال اور بہار کا دو تہائی علاقہ پورے طور سے ویران ہو چکا ہے۔ بزدل ہندو خطرے کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ کھڑا ہوتا ہے"[1]

آخر میں 1775ء میں کونسل کی اکثریت نے فیصلہ کیا "راجہ دلال رائے کا راج شاہی کا ٹھیکہ منسوخ کیا جائے اور رانی کو اپنی زمینوں کا ٹھیکہ دیا جائے اور قبضہ دلا دیا جائے" ہیسٹنگز نے اس فیصلے کو پوری طرح کبھی قبول نہیں کیا۔ اپنے جانشین لارڈ کارنوالس کی طرح اس نے بنگال کے پرانے خاندانوں کے مطالبے کو پسندیدگی کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ نیلام خریدنے والوں اور ٹھیکیداروں کی حمایت کرتا رہا۔ وہ لوگ اس کے سخت اور غیر ہمدردانہ رویّے کی بنا پر فروغ پاتے رہے۔ پرانی راج شاہی جاگیر کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر وارن ہیسٹنگز کے بنئے کانتا بابو کے لیے ایک آسودہ حال جاگیر بنا دی گئی۔

ظالمانہ اور برابر تبدیل ہونے والے نظام مال گزاری کی برائیوں میں اور اضافہ اس واقعہ نے کر دیا تھا کہ صوبے کی آمدنی برابر ملک کے باہر جا رہی تھی۔ یہ آمدنی کسی صورت میں بھی لوگوں کو واپس نہیں ہوتی تھی تاکہ ان کی تجارت، صنعت اور زراعت بار ور ہو سکے۔

"1770ء کے قحط کے باوجود جس نے بنگال کو اتنا تباہ کر دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی سرمایہ کاری کا سلسلہ طرح طرح کی تدبیروں سے جبراً جاری رکھا گیا۔ ان میں سے کچھ تدبیریں تو انتہائی خطرناک نوعیت کی تھیں ..... بنگال کا مال جو مقامی آمدنی کے روپے سے خریدا جاتا تھا اس کی قیمت کبھی ایک ملین پاؤنڈ سے کم نہیں ہوتی تھی۔ عام طور سے اس کی قیمت 12,00,000 پاؤنڈ کے قریب ہوا کرتی تھی۔ ایک ملین پاؤنڈ کم سے کم قیمت ہے اس مال کی جو یورپ بھیجا جاتا تھا اور جس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ قریب قریب 1,00,000 پاؤنڈ بنگال سے کمپنی کے حساب

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی گیارھویں رپورٹ 1783ء ضمیمہ 5

میں چین بھیجا جاتا ہے اور اس رقم سے خریدا ہوا تمام کا تمام مال چین سے یورپ بھیجے جانے والے مال میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زمانہ امن میں بنگال ان پریسیڈنسیوں کو (ہندوستان کے اندر) برابر رسد بھیجا کرتا ہے جو خود کفیل نہیں ہیں۔

"اگر بنگال اور انگلستان کے درمیان اس لین دین کا حساب کیا جائے جس کو تجارت نہیں کہا جا سکتا تو قومی آمدنی کے روپے سے سرمایہ کاری کرنے کے طریقے کے مضر اثرات ایک شدید نقطۂ نظر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تصور کی رو سے جہاں تک کمپنی کا تعلق ہے ملک سے برآمد ہونے والی پیداوار کا کوئی بدل نہیں ملتا ہے۔ اس کا نہ کوئی معاوضہ دیا جاتا ہے اور نہ قیمت ادا کی جاتی ہے۔"

"لیکن اس خیال سے کہ دولت کے اس نکاس کی اور اس کے مضر اثرات کی اہمیت زیادہ واضح ہو جائے آپ کی کمیٹی نے اپنی توجہ بنگال کی آمدنی کے اس حصے پر مرکوز کی ہے جو چین اور یورپ کے لیے کمپنی کی سرمایہ کاری میں استعمال ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس رقم کے سول حکومت پر صرف ہونے والے حصے سے ہندوستانی اس طرح محروم ہیں جس طرح وہ آمدنی کی وصولی کے اصل کام سے محروم ہیں۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر وہ یا تو یورپی لوگوں کے ملازموں اور گماشتوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا وصولی کے چھوٹے چھوٹے محکموں میں ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کیا جاتا ہے جب ان کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانا ناممکن ہوتا ہے۔"[1]

مندرجہ ذیل اعداد و شمار جو بنگال کی پچھلے آٹھ سال کی آمدنی اور خرچ کو ظاہر کرتے ہیں سرکاری کاغذات سے حاصل کیے گئے ہیں۔[2]

سال مئی تا اپریل	مال گزاری پاؤنڈ	کل آمدنی پاؤنڈ	سول اخراجات پاؤنڈ	فوجی اخراجات پاؤنڈ	کل اخراجات پاؤنڈ
1771 تا 1772	23,41,941	32,59,564	2,06,781	11,64,348	28,84,192
1772 " 1773	22,98,441	28,66,968	2,34,051	12,88,667	28,27,141
1773 " 1774	24,38,405	31,60,186	2,13,237	13,04,883	27,27,975
1774 " 1775	27,77,870	35,64,915	2,68,232	10,80,304	33,00,124
1775 " 1776	28,18,07	41,98,017	3,35,968	10,51,969	34,38,480
1776 " 1777	27,55,043	39,71,440	3,25,192	9,42,199	34,24,401
1777 " 1778	25,30,042	36,88,088	4,77,293	11,84,708	33,35,029
1778 " 1779	26,56,809	37,82,690	5,53,810	18,46,237	49,72,590

[1] سلیکٹ کمیٹی کی نویں رپورٹ، 1783، صفحہ 55

[2] خفیہ کمیٹی کی چھ رپورٹوں کی جلد 2، 1782، صفحہ 362

ابھی تک ہم نے بنگال کے حالات بیان کیے ہیں۔ اگر ہم بنگال سے نکلیں اور ان صوبوں کے حالات کا مختصر جائزہ لیں جو وارن ہیسٹنگز کی حکومت میں شامل ہو گئے یا اس کے حلقۂ اثر میں آگئے تو ہم دیکھیں گے کہ اس کی حکومت کی توسیع کے ابتدائی نتائج خوشگوار نہیں تھے۔ جہاں تک ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا تعلق تھا جن میں اٹھارویں صدی کا شمالی ہندوستان بٹا ہوا تھا تمام دیکھنے والوں کے شواہد کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنارس سب سے زیادہ خوش حال اور پھلتی پھولتی ریاست تھی۔ وہاں کے لوگ جفاکش تھے، زراعت اور صنعت فروغ پا رہی تھیں اور راجہ بلونت سنگھ کا دارالسلطنت وہ متبرک شہر تھا جس کو ہندوستان کے ہر حصے میں رہنے والے ہندو مقدس سمجھتے تھے۔

1770ء میں بلونت سنگھ کا انتقال ہوگیا۔ اودھ کے بادشاہ کو جو وزیر کہلاتا تھا اقتدار اعلیٰ حاصل تھا۔ اس نے جانشینی کی فیس وصول کر کے اور خراج میں کچھ اضافہ کر کے اس کے بیٹے جیت سنگھ کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جانشینی کے مسئلے میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ بنگال کے گورنر نے ڈائرکٹروں کے نام ایک عام مراسلے مورخہ 31 اکتوبر 1770ء میں لکھا تھا "ہمیں اس امر سے بڑا اطمینان ہوا کہ وزیر نے ہماری سفارش اور درخواست کو خوشی سے منظور کر لیا ہے۔ اس سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ یہ واقعہ ہندوستان کے دوسرے متعدد حکمرانوں کی اس رائے کو تقویت پہنچائے گا کہ انگریزوں اور اس کے (وزیر کے) درمیان بہت اچھے دوستانہ مراسم ہیں۔"[1]

اودھ کا بادشاہ شجاع الدولہ خود بھی 1775ء میں مرگیا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے انگریزوں کے ایک پرانے دوست کی موت سے فائدہ اٹھا کر برطانوی علاقے اور اقتدار میں اضافہ کر لیا۔ مئی 1775ء میں شجاع الدولہ کے بیٹے اور جانشین آصف الدولہ کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے بنارس کا علاقہ انگریزوں کے سپرد کر دیا گیا اور راجہ جیت سنگھ انگریزوں کا باج گزار ہو گیا۔

گورنر جنرل نے اگست 1775ء میں ڈائرکٹروں کو لکھا تھا "ہمیں یقین ہے کہ آپ اس بات کو پسند کریں گے کہ بنارس اور راجہ جیت سنگھ کے دوسرے علاقے کمپنی کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح کمپنی کو بیش بہا علاقے مل گئے ہیں..... اس علاقے سے ہونے والی آمدنی 23,72,656 روپیہ ہے اور راجہ یہ رقم خراج کے طور پر ماہ بہ ماہ ادا کرے گا۔ نہ اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ وصول ہونے والی رقم کا حساب پیش کرے نہ اسے قابل منہائی مطالبے پیش کرنے کی

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ 1782ء صفحہ 462

اجازت دی جائے گی۔[1]

تین سال بعد بد قسمت جیت سنگھ کو مالکوں کی تبدیلی کی پوری اہمیت کا اندازہ ہوا۔ وارن ہیسٹنگز نے جولائی 1778ء میں جیت سنگھ کو لکھا "شاہ انگلستان اور شاہ فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے۔ 18 مارچ کو شاہ انگلستان نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ . . . . کمپنی کی رعایا ہونے کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے بھی کہ کمپنی کے مفاد کو فروغ دینا آپ کا فرض ہے۔ میں اپنی اور بورڈ کی طرف سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ موجودہ جنگ کا حصہ رسدی بار آپ بھی اٹھائیے۔"[2]

ایک دیانت دار انگریز کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے یہ لکھنا ضروری ہے کہ فلپ فرانسس نے وارن ہیسٹنگز کے اس مطالبے اور بالجبر روپیہ حاصل کرنے کی مخالفت کی۔ بنارس کو برطانوی اقتدار اعلیٰ کے تحت لانے میں وہ پیش پیش تھا لیکن اس نے راجہ سے کیے جانے والے من مانے مطالبوں کے خلاف احتجاج کیا جواب کمپنی کا باج گزار بن چکا تھا۔

"اس حکومت کے اقتدار کے سامنے سپر انداز ہونے کے علاوہ راجہ کچھ نہیں کر سکتا اور جب تک اس بورڈ کی طاقت منصفانہ طور سے استعمال کی جائے گی میں اس کے اختیارات کی حمایت ویسے ہی کروں گا جیسے کوئی دوسرا ممبر کرتا ہے۔ میں نے اس معاملے میں ابتدا سے اپنے شکوک کا اظہار کیا تھا کہ ہمیں راجہ کے تعلق سے اپنے مطالبوں میں ان حدود سے تجاوز کرنے کا واقعی حق حاصل ہے یا نہیں جن پر ہم اتفاق کر چکے ہیں اور جنھیں وہ منظور کر چکا ہے۔ مجھے یہ برابر بتایا گیا کہ ان بنیادی شرائط کی بنا پر وہ اپنی زمینداری پر قابض ہے۔ اگر اقتدار اعلیٰ رکھنے والی حکومت اپنے اختیار تمیزی کی بنا پر ان مطالبوں میں اضافہ کر سکتی ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس کے کوئی حقوق نہیں ہیں، اس کی کوئی جائداد نہیں ہے یا کم از کم نہ اس کے حقوق محفوظ ہیں اور نہ جائیداد۔ پانچ لاکھ کے بجائے ہم اس سے پچاس لاکھ کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ روپیہ ادا کرنے سے انکار کرے یا ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو ہمیں فوراً اس کی زمینداری ضبط کر لینی چاہیے۔"[3]

یہ احتجاج بے سود ثابت ہوئے۔ جیت سنگھ سے دوسرے سال کے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1782ء، صفحہ 460

[2] سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1782ء، صفحہ 493

[3] 〃 〃 〃 〃 465

گیا، پھر تیسرے سال کے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا گیا پھر چوتھے سال کے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ فوج کے اخراجات کے لیے بھی روپیہ طلب کیا گیا۔ روپیہ ادا نہ کر سکنے کی صورت میں اُس کی سرزنش کی کی گئی اور اس کے بعد اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ جب اُس کے لوگوں نے کمپنی کے سپاہیوں پر حملہ کیا تو اُس کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ وہ اپنی جاگیر سے بھاگ گیا۔ اُس کے بھانجے مہیپ سنگھ سے مال گزاری میں اضافے کا وعدہ لے کر اُسے گدی پر بٹھا دیا گیا۔ جاگیر کا نظم و نسق گورنر جنرل کے ذاتی گماشتوں کے سپرد کر دیا گیا۔

نظم و نسق بری طرح ناکام ہو گیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ وارن ہیسٹنگز بلونت سنگھ اور چیت سے کم انتظامی صلاحیتیں رکھتا تھا جن کے زمانے میں بنارس خوش حال ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نئی حکومت نے مال گزاری کے مطالبے میں جو اضافہ کیا تھا اُس نے ریاست کی کو تباہ کر دیا تھا۔

ہیسٹنگز نے راجہ کے جس پہلے نائب کو مقرر کیا تھا اُسے وقت پر ادائیگی نہ کرنے کے جرم میں برطرف کر دیا گیا۔ اس لیے دوسرے نائب نے اس اصول پر عمل کیا کہ "مقررہ مال گزاری ہر حال میں وصول کی جائے گی۔" اراضی پر ضرورت سے زیادہ مال گزاری تشخیص کی گئی، وصولیابی میں انتہائی سختی برتی گئی، لوگ تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے اور 1784ء میں ایک خوفناک قحط نے علاقے کو برباد کر ڈالا۔

ہیسٹنگز قحط اور بربادی کے اثرات کا چشم دید گواہ تھا۔ اُس نے 2 اپریل 1784ء کو کونسل بورڈ کو لکھا تھا "بکسر کی سرحد سے بنارس تک غیر مطمئن لوگوں کی چیخ پکار نے میرا پیچھا کیا اور مجھے تھکا مارا۔ لمبے عرصے تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُس کی بنا پر عام بے اطمینانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی اصل وجہ اگر بد اطوار و ظالم انتظامیہ نہیں تو ناقص انتظامیہ ضرور ہے۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بکسر سے دوسری حد تک میں نے ہر ہر گانو میں تباہی و بربادی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ شہر بنارس کے علاوہ پورے صوبے میں کوئی حکومت نہیں ہے۔ صوبے کا نظم و نسق بدنظمی کا شکار ہے، لوگوں پر مظالم توڑے جاتے ہیں، تجارت نظر انداز کی جاتی ہے اور پیداوار کے ذرائع پر ناجائز قبضہ ہو جانے کی وجہ سے مال گزاری میں کمی واقع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔"[1]

اودھ کی سلطنت سے کمپنی کی سلطنت میں منتقل ہونے کے نو سال بعد بنارس اس حال کو

1۔ سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1782ء صفحہ 465

پہنچ گیا تھا۔ اب ہم زرا اور آگے بڑھیں گے اور اودھ کے حالات کا جائزہ لیں گے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے انگریزوں کے دوست شجاع الدولہ کا انتقال 1775ء میں ہوا۔ اپنے دشمنوں کے لیے وہ انتہائی ظالم اور سخت دل تھا لیکن اُس نے اپنی سلطنت کے لوگوں کو مطمئن، آسودہ حال اور خوش چھوڑا۔ اُس کے زمانہ حکومت کے آخری دنوں میں جو انگریز حکام اودھ گئے تھے وہ اُس کی سلطنت اور رعایا کی خوش حالی کے شاہد ہیں۔

جب آصف الدولہ اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا تو وارن ہیسٹنگز نے اودھ میں کمپنی کے اقتدار کی توسیع کی۔ شجاع الدولہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اُس میں ترمیم کی گئی اور آصف الدولہ کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کیا گیا "جس کی رو سے وہ آخر کار اور لازمی طور سے کمپنی کا باج گزار بن گیا۔"[1]

اس نے اودھ کو تباہ کر دیا۔ کرنل ہینی (Hanny) جسے وارن ہیسٹنگز نے ایک فوجی دستے کے کمانڈر کی حیثیت سے اودھ بھیجا تھا۔ اُس زمانے کے اپنے ہم وطنوں کی طرح موقعوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور اپنے منصب کو استعمال کر کے دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مال گزاری منتقل کر دینے کے طریقے پر اودھ میں بھی عمل کیا گیا جو مدراس اور دوسرے مقامات پر انتہائی نقصان دہ ثابت ہو چکا تھا۔ کرنل ہینی کو اودھ میں سول اور فوجی اختیارات حاصل تھے اور اُس نے بہرائچ اور گورکھپور کی مال گزاری کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ لگان میں اضافہ کیا گیا، وصولیابی میں ہر قسم کی سختی اور جبر سے کام لیا گیا، لوگ اپنے کھیت اور گانو چھوڑ کر بھاگ گئے اور دیہات ویران ہو گئے۔

آصف الدولہ نے محسوس کیا کہ اُس نے کتنی بڑی مصیبت مول لے لی ہے۔ اُس نے 1779ء میں برطانوی حکومت کو لکھا تھا "اخراجات میں بڑا اضافہ ہو جانے کی بنا پر مال گزاری کی شرح میں اضافہ کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال اُس میں کمی ہونے لگی۔ لوگ اپنے کھیت چھوڑ کر علاقے سے بھاگ گئے۔"[2] چنانچہ نواب نے نئے فوجی دستے کے لیے ایک دفعہ پھر مال گزاری حوالے کر دینے کے خلاف احتجاج کیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ فوجی دستے اُس کے لیے بے مصرف ہیں اور اُن کی وجہ سے مال گزاری کا نقصان ہوتا ہے اور اُس کی حکومت کے کاموں میں گڑبڑ ہوتی ہے۔

اس اہم مراسلہ پر کلکتہ کی کونسل میں بحث ہوئی۔ فلپ فرانسس نے اپنی فطری انصاف

1۔ سلیکٹ کمیٹی کی دسویں رپورٹ، 1783ء ضمیمہ 7

2۔ سلیکٹ کمیٹی کی دسویں رپورٹ، 1783ء ضمیمہ 7

پسندی کی بنا پر شاقی یادداشت تحریر کی۔

"مجھے ابھی تک فرماں روائی کی اتنی عادت نہیں ہوئی ہے کہ ایک آزاد بادشاہ کے اس مطالبے کو خطرناک یا غلط سمجھوں کہ ایک بیرونی فوج کے بارے اُس کو سبکدوش کیا جائے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اُس کے ملک کے تحفظ کے نام پر اُس کا روپیہ کھا رہی ہے۔"

"کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اپنے مراسلے مورخہ 15 دسمبر 1775ء کے ذریعے اودھ کے صوبے کی خدمت کے لیے ایک فوجی دستہ رکھنے کی منظوری دی تھی بشرطیکہ صوبہ خوشی سے اس کی اجازت دے۔ بغیر اجازت کسی حال فوج وہاں نہ رکھی جائے۔

"لیکن جہاں تک اس فوجی دستے کا تعلق ہے فی الحال اُس کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ وزیر یہ نہیں چاہتا کہ وہ واپس بلایا جائے۔ اُس کا مطالبہ تو صرف اُن عارضی اور آزاد دستوں کو واپس بلائے جانے تک محدود ہے جن کی کمان میجر پیمنی اور کیپٹن اُوسبرن (Osborn) کے ہاتھوں میں ہے۔ اول الذکر کے متعلق وزیر کہتا ہے کہ وہ نہ صرف اُس کی حکومت کے لیے غیر ضروری ہے بلکہ اُس کی وجہ سے مال گزاری اور محاصل کا نقصان بھی ہو رہا ہے۔ آخر الذکر کے لیے اس کا کہنا ہے کہ حکومت کے کاموں میں گڑبڑ ڈالتا ہے۔ دونوں کسی کی بات نہیں سنتے ہیں۔

"تجویز نہ صرف یہ فرض کرتی ہے کہ یہ بات ہمارے لیے ضروری ہے۔ کہ ہم اُس کو وزیر کو مجبور کریں کہ وہ اُن فوجی دستوں کو اپنی ملازمت میں رکھے بلکہ یہ کہ اُن کو تنخواہیں دینے کے لیے ہمیں مال گزاری وصول کرنا چاہیے۔ موجودہ حالات میں اس کے معنی ہوں گے کہ ہم اُس کے ملک میں فوجی حکومت قایم کردیں۔ اس طرح ایک ضرورت دوسری ضرورت کا پیش خیمہ بنے گی اور اُس وقت تک بنتی رہے گی جب تک ہندوستانی ریاستوں کے پاس ایسی چیزیں رہیں گی جن سے ہماری حرص میں اضافہ ہو یا ہماری توقعات پوری ہو سکیں یا ہمیں تجربہ یہ سکھا دے کہ دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا سمجھداری کی دلیل ہے۔"

1780ء میں برطانوی حکومت کے مطالبے کی رقم 14,00,000 پونڈ ہو چکی تھی۔ گورنر جنرل نے کن حالات میں برسٹو (Bristow) کو لکھنؤ سے واپس بلا کر مڈلٹن (Middleton) کو ریزیڈنٹ مقرر کیا کمپنی کی حکومت کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے کس طرح بیگمات اودھ کی چوری

1۔ سلیکٹ کمیٹی کی دسویں رپورٹ، 1783ء ضمیمہ 7۔

کرنے میں نواب کی مدد کی گئی اور ظالمانہ اور توہین آمیز طریقے سے کس طرح ایک بڑی رقم اُن سے بالجبر حاصل کی گئی۔ یہ واقعات تاریخ کا جزبن چکے ہیں اور ان صفحات پر اُن کا دُہرانا فضول ہے۔ موجودہ کتاب کے لیے شاہی خاندان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی ڈرامائی کہانی کے بجائے اودھ کے کسانوں کے حالات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہونے والے وارن ہیسٹنگز کے مقدمے میں تباہ حال کسانوں سے لگان وصول کرنے کے متعلق جو واقعات ثبوت میں پیش کیے گئے وہ انتہائی افسوسناک تھے۔ ثبوت کی طرف سے کہا گیا تھا کہ جو لوگ لگان ادا نہیں کرپاتے تھے وہ پنجروں میں بند کردیے جاتے تھے۔ جس کے جواب میں وارن ہیسٹنگز نے کہا تھا کہ ہندوستان کی دھوپ میں کسی کو پنجرے میں بند کرنا جسمانی اذیت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ثبوت کی طرف سے کہا گیا کہ باپوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کریں۔ جواب میں کہا گیا کہ کرنل ہینی نے اس غیر فطری خرید و فروخت کے خلاف احکامات جاری کردیے تھے۔ بڑی تعداد میں لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر علاقے سے بھاگنے کی کوشش کرتے تھے تو اُن کو روکنے کے لیے فوج استعمال کی جاتی تھی۔ آخرکار ایک شورش پھوٹ پڑی۔ ناقابل برداشت جبری وصولی کے خلاف کسانوں نے بغاوت کردی۔ اُس کے بعد دل ہلا دینے والے واقعات اور پھانسیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جس کے ذریعے غصہ میں بھرے ہوئے سپاہیوں نے غیر تربیت یافتہ زمین جوتنے والوں کو کچل دیا۔

اُس کے بعد کرنل ہینی کو اودھ سے واپس بلالیا گیا۔ بغاوت تو فرو ہوگئی لیکن اودھ برباد ہوگیا۔ 1774ء اور 1783ء میں کپتان ایڈورڈز (Edwards) اودھ گیا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ وہاں گیا تو اودھ کی صنعتیں، زراعت اور تجارت پھل پھول رہی تھی۔ دوسری دفعہ جب وہ گیا تو اودھ "ویران اور برباد" نظر آیا۔ مسٹر ہولٹ (Mr. Holt) نے بھی لکھا تھا کہ اودھ کی پچھلی خوش حالی ختم ہوچکی ہے، پورے کے پورے قصبے اور گانو خالی ہوچکے ہیں اور ملک میں قحط کے آثار نظر آتے ہیں۔ 1784ء میں واقعی ایک شدید قحط پڑا اور جنگ اور بدنظمی کے دکھوں میں بھک مری کے دکھوں کا اضافہ ہوگیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ظالمانہ جبری وصولی، انگریزی سلطنت میں شامل ہونے والے ہر نئے علاقے کے لوگوں کی تکلیفیں 1773ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ کا مناسب اصطلاحات کے سلسلے میں ناکافی ہونا، یہ تمام واقعات خفیہ کمیٹی کی چھ رپورٹوں اور سلیکٹ کمیٹی کی گیارہ رپورٹوں میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کردیے گئے جو 1782ء اور 1783ء میں شائع ہوئی تھیں۔ لوگوں نے نظم و نسق میں اصلاح کا مطالبہ شروع کردیا۔ فاکس کا پیش کردہ انڈیا بل پارلیمنٹ نے مسترد کردیا جس کی حمایت اڈمنڈ برک نے کی تھی۔

لیکن ہندوستان کی حکومت میں اصلاح کرنے کے لیے مسٹر پٹ نے جو بل پیش کیا تھا اُس نے 1784ء میں قانون کی شکل اختیار کر لی اور پہلی دفعہ کمپنی کے نظم و نسق پر شاہ انگلستان کو اختیار حاصل ہو گیا۔ کمپنی کے تمام سول، فوجی اور مالی معاملات چھ کمشنروں کی نگرانی میں آگئے جن کا تقرر شاہ انگلستان کرتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے اگلے سال استعفےٰ دے دیا۔ لارڈ کارنوالس جو طبقہ اشراف سے تعلق رکھتا تھا اور بڑا عالی ظرف اور فیاض طبع انسان تھا ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہو گیا۔

وارن ہیسٹنگز کے زمانہ حکومت کے اس اجمالی بیان میں ہم نے اپنی توجہ لوگوں کی معاشی حالت پر مرکوز رکھی ہے اور تمام غیر جانب دار مورخوں کی طرح ہمیں بھی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس نقطہ نظر سے اُس کی حکومت ناکام ثابت ہوئی۔ وارن ہیسٹنگز کے ساتھ ناانصافی ہو گی اگر ہم اُن دلیلوں کا اقتباس نہ دیں جو 1789ء میں مسٹر شور نے، جو بعد میں لارڈ ٹین ماؤتھ ہو گیا تھا، اس کی صفائی میں پیش کی تھیں :

"اس بات کو اٹھائیس سال گزر چکے ہیں جب کمپنی کو صوبے کے قابل لحاظ حصے کی مال گزاری وصول کرنے کا حق پہلی دفعہ ملا اور اس واقعہ کو صرف چوبیس سال ہوئے ہیں جب دیوانی کی سند حاصل ہونے کے بعد پورا صوبہ ہمیشہ کے لیے باضابطہ طور پر اُس کے اختیار میں آیا۔ جب ہم حاصل ہونے والے اختیارات کی نوعیت اور وسعت پر، اُن لوگوں کے کردار پر جن پر ہمیں اقتدار حاصل ہوا اور زبان و عادات کے اختلاف پر غور کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس امر پر بھی غور کرتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسی حکومت کی ذمہ داری سنبھالی جس کے سابق دستور سے ہم نابلد تھے اور ایشیائی مالیاتی نظام کا کوئی عملی تجربہ نہیں رکھتے تھے تو اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم سے غلطیاں سرزد ہوئیں یا اس وقت بھی اس قسم کی غلطیاں ہو رہی ہیں جن کا سدباب ضروری ہے۔[1]"

ان باتوں میں بڑی حقیقت ہے۔ لیکن اس کا اطلاق اُس زمانے کے کسی انگریز کے مقابلے میں وارن ہیسٹنگز پر کم ہوتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز نہ ہندوستان کے لیے اجنبی تھا نہ یہاں کے لوگوں کے لیے وہ ہندوستان نو عمری میں آیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں اُس نے چھوٹے موٹے عہدوں پر کام کیا تھا، لوگوں سے ملنے کا اُسے موقع ملا تھا اور اُس نے لوگوں کے طور طریق کا مطالعہ کیا تھا اور اُن سے واقف تھا۔ ہندوستان سے ریٹائر ہونے کے اٹھائیس سال بعد اُس نے پارلیمنٹ کے سامنے بیان دیا تھا۔

"میں حلف سے کہتا ہوں کہ اُن کے متعلق یہ کہنا کہ ہندوستان کے لوگوں کی اخلاقی حالت خراب

1۔ سلیکٹ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 169

ہے) غلط و بے بنیاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شریف ہیں، فیض رساں ہیں، وہ برائیوں کے خلاف جذبہ انتقام کے مقابلے میں بھلائیوں کے لیے جذبہ احسان مندی زیادہ رکھتے ہیں۔ اُن میں انسانی جذبات کی خرابیاں اتنی کم ہیں جتنی کہ دُنیا کی کسی دوسری قوم کے لوگوں میں ہو سکتی ہیں۔"[1]

یہ تھے وہ لوگ جن سے ہیسٹنگز واقف تھا اور 1750ء سے 1785ء تک اپنی عمر کے پینتیس سال جن کے درمیان اُس نے گزارے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بیچ بیچ میں وہ تھوڑی مدت کے لیے انگلستان چلا گیا تھا۔

لوگوں کی طرف وارن ہیسٹنگز کے ان جذبات کی نفی اُس کی سرکاری سرگرمیاں بھی نہیں کرتیں اُس وقت جب کمپنی کے ملازمین بنگال کے لوگوں کو داخلی تجارت سے محروم کر کے تیزی کے ساتھ بڑی دولت پیدا کر رہے تھے تو اپنے ہم وطنوں کے مظالم کے خلاف وارن ہیسٹنگز نے اپنے رہنما وانسی ٹارٹ (Vansittart) کا ساتھ دیا۔ خود اپنے تیرہ سالہ دورِ حکومت میں، جو 1772ء سے 1785ء تک قایم رہا، اُس نے کوشش کی کہ بدنظمی کو نظم و ضبط میں تبدیل کر دے، اُس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین کو منضبط کر کے شائع کیا، اُس نے عدالتیں قایم کیں تاکہ اُن قوانین کے مطابق فیصلے کیے جا سکیں اور اُس نے ایک ایسا نظامِ حکومت بنایا جس میں اُس کے دورِ حکومت کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن جس کا پہلا معمار وہی تھا۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص سے جس میں اتنی انتظامی صلاحیت ہو اور ملک اور اُس کے لوگوں سے اتنا واقف ہو یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک کامیاب نظم و نسق قایم کر سکے گا لیکن کسی حکومت کی کامیابی کا پیمانہ اگر عام لوگوں کی مسرت کو قرار دیا جائے تو وارن ہیسٹنگز کی حکومت کو ناکام کہنا پڑے گا۔ برطانوی حکومت و اثر کی توسیع لوگوں کی معاشی حالت کو نہ سدھار سکی بلکہ بنگال، بنارس اور اودھ میں دکھوں، بغاوتوں اور قحطوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔

ایک صدی گزرنے کے بعد ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس ناکامی کے اسباب پر غور کر سکیں۔ اُس زمانے کے تمام انگریزوں کی طرح ہیسٹنگز کو بھی یقین کامل تھا کہ ہندوستان ایک بہت بڑی جاگیر ہے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور اُس کے ملازمین کو مستفید ہونا چاہیے اور اس لیے اُس نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں روپیہ حاصل کرنے میں صرف کر دیں۔ ہندوستان کے لوگوں کی

1۔ ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت کی روداد، 1813ء، صفحہ 1

بھلائی کو کمپنی کی حکومت کے اس اصل مقصد کے تابع کر دیا گیا۔ ہندوستان کے تاجر حکمرانوں کے اس تصوّر کی بنا پر دیسی حکمرانوں اور اُن کی رعایا اور زمینداروں اور اُن کے آسامیوں کے حقوق قربان کر دیے گئے۔ اُس وقت بھی مال گزاری میں اضافہ کیا گیا جب بنگال کی ایک تہائی آبادی 1770ء کے قحط کی نذر ہو چکی تھی۔ اُن زمیندار خاندانوں کو جن کا صدیوں سے زمینداریوں پر مالکانہ قبضہ تھا مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی زمینداریوں کا سالانا ٹھیکہ لینے کے لیے مہاجنوں اور سٹے بازوں کے مقابلے میں آئیں۔ جو کسان اپنے گانوٗ اور گھروں کو چھوڑ کر بھاگتے تھے یا شورش میں حصہ لیتے تھے اُنھیں نہایت ظالمانہ طریقے سے گھروں کو واپس جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جو روپیہ اس طرح حاصل کیا جاتا تھا اُس کا بڑا حصہ سرمایہ کاری کی صورت میں احسان مند حصہ داروں کو انگلستان بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں مالی پالیسی یہ ہو کہ ایک ملک کی دولت دوسرے ملک کے تاجروں کو منتقل کی جائے وہاں کوئی باصلاحیت حاکم یا مکمل نظام حکومت ملک کو غربت اور قحطوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔

وارن ہیسٹنگز کی حکومت کی ناکامی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُس کی سختی، مطلق العنانی اور من مانی کارروائیوں نے خرابیوں میں شدّت پیدا کر دی۔ بڑے حکمرانوں کے طریقہ کار کے متعلق ایک رائے ایسی بھی ہوتی ہے جو مورخوں کی رائے سے زیادہ دیرپا ہوتی ہے اور وہ رائے ہوتی ہے عوام کی رائے۔ ہندوستان کے لوگ ہیسٹنگز کے زمانہ حکومت کو دکھ اور درد کے ساتھ یاد کرتے ہیں جس نے ملک کو تباہ کر دیا۔ لیکن وہ اُس کے جانشین کے زمانہ حکومت کو جذبہ احسان مندی کے ساتھ یاد کرتے ہیں جو دردمند انسان تھا اور اتنی جرأت رکھتا تھا کہ اُس وسیع آبادی کی مادی خوش حالی کے لیے اقدام کر سکے جن کی نگہداشت اُس کے سپرد کی گئی تھی۔

باب 5

لارڈ کارنوالس اور بنگال کا زمینداری بندوبست 1785ء تا 1793ء

پٹ کا انڈیا بل 13 اگست 1784ء کو قانون بن گیا۔ اس کی رو سے کمپنی کی حکومت پر شاہ انگلستان کو اختیار حاصل ہو گیا جس کی وجہ سے کچھ اصطلاحات ناگزیر ہو گئیں۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے محسوس کیا کہ انھیں بدنظمی دور کرنی چاہیے۔ انھوں نے وارن ہیسٹنگز کے جانشین کی حیثیت سے طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو اعلا ظرف تھا اور درد مند دل رکھتا تھا۔ انھوں نے اپنے مراسلے مورخہ 12 اپریل 1786ء کے ذریعہ نئے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو کام کرنے کے لیے پوری پوری ہدایتیں جاری کر دیں۔

اس یادگار مراسلے میں بنگال کے نظام مال گزاری میں بار بار تبدیلیاں کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ کسی ایک طریقے پر نہایت احتیاط کے ساتھ عمل کیا جائے۔ انھوں نے اس امر کی مذمت کی کہ مال گزاری میں اضافے کی مسلسل کوششیں کی جاتی ہیں اور ٹھیکیداروں، سزاولوں اور امینوں کی خاطر زمینداروں کو بے دخل کیا جاتا ہے جنھیں کسانوں کی خوشحالی میں کوئی دائمی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ خیانت کا تدارک کرنے کا بہتر ذریعہ یہ ہے کہ مال گزاری کا بندوبست استمراری کیا جائے جس کی تشخیص مناسب اصولوں کے تحت کی جائے۔ اس کی ادائیگی کی بہترین اور واحد ضمانت اراضی پر قابض لوگوں کے موروثی حقوق ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ "مناسب جمع بندی سے، جو وقت پر اور پابندی کے ساتھ وصول کی جا سکے، ہمارے مفادات، مقامی لوگوں کی خوش حالی اور زمینداروں کے تحفظ میں ہم آہنگی پیدا ہو گی۔ یہ اُس حالت سے بہتر ہے کہ جمع بندی میں غیر ضروری اضافہ کیا جائے، وصولیابی پوری نہ ہو سکے اور اُس پر عمل درآمد کرنے میں سختی

برتی جائے اور لوگوں کو تکلیف پہنچائی جائے"۔[1] وہ چاہتے تو یہ تھے کہ آخر میں دائمی بندوبست کیا جائے لیکن اُنھوں نے خواہش ظاہر کی کہ پہلے بندوبست کی مدّت صرف دس سال ہو۔ 1786ء کے ڈائریکٹروں کے مراسلے کی اس تلخیص سے قاری پر اتنا تو روشن ہو گیا ہوگا کہ فلپ فرانسس نے 1776ء میں جو مدبرانہ سفارشات پیش کی تھیں اُن کا نتیجہ دس سال بعد نکلا۔ دس سال کے تلخ تجربے کے بعد ـــــ جس کی تلخی کا باعث وہ دکھ تھے جو بنگال کے لوگوں کو جھیلنے پڑے ـــــ فلپ فرانسس کی تجاویز کی دور اندیشی کو تسلیم کیا گیا اور ہیسٹنگز کے سخت اور بار بار بدلنے والے طریقۂ کار کی ناعاقبت اندیشی کی مذّمت کی گئی۔

نئی اسکیم کو عمل میں لانے کے لیے جس شخص کا انتخاب کیا گیا وہ اُس کام کے لیے موزوں تھا۔ حالانکہ اُسے ہندوستان کے متعلق وہ تفصیلی معلومات حاصل نہیں تھیں جو وارن ہیسٹنگز کو تھیں۔ پھر بھی لارڈ کارنوالس اُن لوگوں سے گہری ہمدردی رکھتا تھا جن پر اُسے حکومت کرنی تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بار بار دیکھا گیا ہے کہ جہاں وسیع مقامی تجربہ رکھنے والا مگر تنگ دل حاکم ناکام رہا ہے وہاں گہری ہمدردی رکھنے والا حاکم کامیاب ہو گیا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اٹھارویں صدی میں محسوس کیا جاتا تھا ویسے ہی آج بھی یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے انگریزی نظم ونسق میں یورپ کے وسیع تر تدبر کی آمیزش ہونی چاہیے۔

ہندوستان پہنچنے کے بعد لارڈ کارنوالس کو معلوم ہوا کہ جب تک مقامی رواجوں، لگان داری کے متعلق مزید تحقیقات نہ کرلی جائے اُس وقت دس سال کے لیے بندوبست کرنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اُس نے بڑے زور سے تحقیقات کا کام شروع کر دیا۔ کمیٹی آف ریونیو اس سے پہلے ہی اپنا نام بدل چکی تھی۔ اب وہ بورڈ آف ریونیو کہلاتی تھی۔ اس کے اختیارات اور سرگرمیاں بحال تھیں۔ یورپی سول ملازمین کو کلکٹر، جج اور مجسٹریٹ کے مشترک اختیارات سونپ دیے گئے تھے۔[2] فوجداری اختیارات ابھی تک بنگال کے ڈپٹی نواب کو حاصل تھے۔ یورپی مجسٹریٹ تمام سنگین مقدمات فیصلے کے لیے اُس کی عدالت کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔

1790ء میں انتظام میں ایک بڑی تبدیلی ہوئی۔ گورنر جنرل ان کونسل نے تمام صوبے میں فوجداری مقدمات کی نگرانی کا کام قبول کر لیا۔[3] اعلیٰ فوجداری عدالت مرشد آباد سے کلکتے تبدیل ہو گئی۔ جن مقدموں کی سماعت کا اختیار مجسٹریٹوں کو حاصل نہیں تھا اُن کی سماعت چار گشتی عدالتوں میں ہوتی تھی۔ ان

1۔ سلیکٹ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ 1812ء صفحہ 13

2۔ جون 1787ء کا ریگولیشن

3۔ بنگال کے مشورے، دسمبر 1790ء، لارڈ کارنوالس کی روداد

عدالتوں کی نگہداشت بالترتیب دو معہودہ حاکموں کے سپرد تھی۔ دیوانی، فوجداری اور مال کے محکموں کے ضابطوں پر نظر ثانی کی گئی اور انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں اُن کی اشاعت کردی گئی۔

1793ء میں مزید انتظامی اور عدالتی اصلاحات کی گئیں۔ انتظامی اور عدالتی فرائض علاحدہ کردیے گئے بورڈ آف ریونیو اور ضلع کلکٹروں سے مال کے مقدمات کی سماعت کے اختیارات لے لیے گئے۔ کلکٹروں سے مجسٹریٹ کے اختیارات بھی لے لیے گئے۔ ہر کمشنری میں کلکٹر سے اونچے درجے کے معہودہ حاکم کو جج اور مجسٹریٹ مقرر کیا گیا اور اُس کمشنری میں پولیس کی نگرانی بھی اُس کے سپرد کی گئی۔ اپیلیں سننے کے لیے چار عدالتیں بالترتیب کلکتہ، پٹنہ، ڈھاکہ اور مرشد آباد میں قایم کی گئیں۔[1]

میسور کے ٹیپو سلطان کے ساتھ جب جنگ ہوئی تو لارڈ کارنواس کو اُس میں ذاتی طور سے حصہ لینا پڑا وہ میسور کے دار سلطنت میں داخل ہوگیا اور 1792ء میں سلطان کو معاہدہ امن کے شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کردیا۔ انگریزوں نے مغرب میں کالی کٹ اور کورگ اور مشرق میں بارہ محل کا ضلع حاصل کرلیا۔ ٹامس منرو نے 1792ء اور 1799ء کی درمیانی مدت میں بارہ محل میں مال گزاری کے بندوبست کا جو کام کیا اور اُس میں جو تجربہ اور کامیابی حاصل کی اُس نے اُسے مدراس کا سب سے ممتاز و نمایاں حاکم مال بنا دیا۔

بنگال مال گزاری کی تحقیقات تیزی سے ہو رہی تھی اور ختم ہونے والی تھی۔ "بنگال کے صوبے میں بندوبست استمراری کے متعلق" مسٹر شور کی جو بعد میں لارڈ ٹین ماؤتھ ہوگیا تھا مشہور روداد مورخہ 18 جون 1789ء نے اُس بندوبست کی داغ بیل ڈال دی جس کا ایسٹ انڈیا کمپنی اور لارڈ کارنواس تہیہ کرچکے تھے ہمارے محدود وسائل اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ اس قابلانہ اور مفصل روداد کی تلخیص پیش کرسکیں جو بشمول ضمیمہ جات و تجاویز مشہور و معروف پانچویں رپورٹ کے ٹائپ کیے ہوئے ستر صفحات پر مشتمل ہے۔[2] لیکن یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر شور کی تفصیلی تحقیقات جن واقعات پر روشنی ڈالتی ہے اُن میں سے کچھ پیش کر دیے جائیں۔

مسٹر شور نے 1582ء کے ٹوڈر مل کے بندوبست اور 1722ء کے جعفر خاں کے بندوبست کا حوالہ دیا۔

1۔ ریگولیشن نمبر 5 1793ء، اپیل سننے کے لیے، پانچویں عدالت بنارس میں قایم کی گئی 1795ء اور چھٹی عدالت برائے شمال۔ مغربی صوبجات 1803ء میں قایم کی گئی۔

2۔ پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحات 169—238

"اگر ہم ٹوڈرمل کی تشخیص کو اعتدال پر مبنی تصور کریں تو مذکورہ اضافے کو بہت زیادہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے ٹوڈرمل کے زمانے سے جعفر خاں کے زمانے تک ملک کی دولت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ تجارت کے نئے ذرائع کھل گئے تھے اور کاروبار عام طور سے زیادہ پھیل گیا تھا۔ زرِ نقد جو اکبر کے زمانے میں نسبتاً کم تھا ملک میں مختلف ذریعوں سے آنے لگا تھا۔ دوسری طرف ہم اُس سیاسی فراست کی قدر کرتے ہیں، اُس کو تسلیم کرتے ہیں اور اُس کی داد دیتے ہیں جس نے وصولیابی پر حدود عائد کیے اور ملک کے لوگوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ اپنی محنت اور سلیقے کے پھل پا سکیں۔"[1]

اُس کے بعد مسٹر شور نے اُن اضافوں کا حوالہ دیا جو شجاع خاں، علی وردی خاں اور میر قاسم نے کیے۔ ایک ضمیمہ[2] میں مندرجہ ذیل اعداد شمار درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں بنگال کی مال گزاری کی رقم کیا تھی۔

	روپیہ	پاؤنڈ
ٹوڈرمل کا بندوبست۔ 1582ء	1,06,92,152	10,70,000
سلطان شجاع کا بندوبست۔ 1658ء	1,31,15,907	13,12,000
جعفر خاں کا بندوبست۔ 1722ء	1,42,88,186	14,29,000
شجاع خاں کا بندوبست۔ 1728ء	1,42,45,561	14,25,000

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے اختتام تک مال گزاری کی رقم میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی حالانکہ 1722ء اور 1763ء کی درمیانی مدت میں کچھ اور محصول لگائے گئے تھے۔

انگریزی حکومت کے آغاز سے فوراً پہلے کی وصولیابی کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر شور نے مندرجہ ذیل چار برسوں کے اعداد و شمار پیش کیے۔

"اس زمانے کے پہلے سال کا تعلق قاسم علی (میر قاسم) سے ہے، دوسرے اور تیسرے برسوں کا تعلق نند کمار سے ہے جو میر جعفر کے زیر اقتدار تھا اور چوتھے سال کا تعلق محمد رضا خاں سے ہے۔ یہ دیوانی کا پہلا سال تھا۔"[3]

1۔ پیراگراف 14

2۔ روداد کا ضمیمہ 1

3۔ پیراگراف 68

سال	حقیقی وصولیابی روپے میں	حقیقی وصولیابی پونڈ میں
1762ء، 1763ء	64,56,198	6,46,000
1763ء، 1764ء	76,18,407	7,62,000
1764ء، 1765ء	81,75,533	8,18,000
1765ء، 1766ء	1,47,04,875	14,70,000

برطانوی حکومت کی خصوصی معاشی نوعیت جو اُسے پہلے کی مسلمان حکومت سے ممتاز کرتی تھی اور جس کو بدیسی حکمرانوں نے جنم دیا تھا یہ تھی کہ ہر سال ملک کی دولت کا نکاس ہو رہا تھا۔ مسٹر شور نے اس کے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا۔ "کمپنی تاجر بھی ہے اور ملک کی حکمراں بھی۔ اپنی پہلی حیثیت میں وہ اُس کی تجارت پر قبضہ کرتی ہے اور دوسری حیثیت میں اُس کی آمدنی اپنے استعمال میں لاتی ہے۔ انگلستان کو روپیہ، اُن اشیاء کی شکل میں بھیجا جاتا ہے جو وہ اس ملک میں خریدتی ہے۔"

"ریاست کی رعایا کی صنعتی ترقی کا ہم کتنا ہی لحاظ کیوں نہ کریں جس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اُن کی پیداوار کی طلب میں اضافہ ہو گیا ہے (اگر ہم یہ فرض کریں کہ طلب میں اضافہ ہو گیا ہے) پھر بھی اس امر کو تسلیم کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ اُس کے فوائد کو اُس کے وہ نقصانات ختم کر دیتے ہیں جو دور دراز بیرونی مقبوضات کے طریقے کا لازمی نتیجہ ہیں۔"

"برنیر (Bernier) کے زمانے سے لے کر دیوانی حاصل کرنے کے زمانے تک ملنے والی تمام معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی وہ داخلی تجارت خاصی بڑی تھی جو بنگال اور ہندوستان کے بالائی حصوں، خلیج فلپائن، خلیج فارس اور ساحل مالابار کے درمیان ہوتی تھی۔ بدیسی یورپی کمپنیوں کے زرِ نقد اور اشیا کے تبادلے میں اُن ذریعوں سے حاصل کیا ہوا زرِ نقد و اشیا دی جاتی تھیں اور مشرق سے افیم کے تبادلہ میں سونا آتا تھا۔"

لیکن 1765ء سے صورت حال اُس کے برعکس ہو گئی ہے۔ کمپنی کی تجارت سے کوئی ہم قیمت معاوضہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بدیسی کمپنیاں زرِ نقد بہت کم درآمد کرتی ہیں نہ وہ ہندوستان کے دوسرے حصوں سے قابلِ لحاظ مقدار میں بنگال لایا جاتا ہے۔"

"بحیثیت مجموعی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جب سے کمپنی کو دیوانی کے اختیارات حاصل ہوئے ہیں ملک کا موجودہ زرِ نقد بہت کم ہو گیا ہے، درآمد کے وہ پرانے راستے بڑی حد تک

بند ہو گئے ہیں جن سے باہر جانے والے روپے کی کمی کو گزشتہ زمانے میں پورا کر لیا جاتا تھا اور چین، مدراس اور بمبئی کو روپیہ بھیجنے کی ضرورت اور وہ رقم جو یورپی لوگ انگلستان بھیجتے ہیں ملک کی چاندی کو برابر کم کرتی رہے گی۔"[1]

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مسٹر شور نے خاص طور سے چاندی کے ذخیرے میں کمی ہونے کا ذکر لیا ہے۔ اڈم اسمتھ کے زمانے سے پہلے بیش قیمت دھاتوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ملک کی دولت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن جس چیز میں واقعی وہ کمی واقع ہو رہی تھی جس کی مسٹر شور نے زوردار الفاظ میں تشریح کی تھی وہ دولت، پیداوار اور غذائی اجناس تھیں۔

مسٹر شور نے بنگال کے بندوبست کے تین طریقوں پر بحث کی یعنی کسانوں کے ساتھ بندوبست ٹھیکداروں کے ساتھ بندوبست اور زمینداروں کے ساتھ بندوبست اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صرف زمینداروں کے ساتھ بندوبست کرنا اچھے نظم و نسق اور ملک کی ترقی کے لیے کارگر ہوگا

"ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ وہ زمین جو زمینداروں کو دی جانے والی ہے اچھی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک اس قسم کے اقدام نہ کیے جائیں جس سے زمین کی قیمت بڑھے صرف زمینداروں کے حقوق کو تسلیم کر لینے سے ملک ترقی نہیں کر سکے گا۔ ایک ایسی حکومت کے مطالبات، جیسی کہ ہماری حکومت ہے، مقامی حکمرانوں کے محاصل کے مقابلے میں زیادہ معتدل ہونے چاہئیں۔ اپنے دائمی مقبوضات کی قیمت کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اپنے مطالبات کا تعین کرنا چاہیے۔ ہماری اپنی حکومت سے آدھی دنیا کے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی حکومت پر ضروری اختیارات کو برقرار رکھتے ہوئے تمام قابل عمل پابندیاں عائد کی جانی چاہئیں اور مقامی لوگوں کے املاک کو حرص اور من مانے اختیارات کے تلوّن سے محفوظ رکھنا چاہیے۔"[2]

ریاست کا مطالبہ حقیقی لگان کا $\frac{9}{10}$ مقرر کیا گیا۔ انھیں توقع تھی کہ زمیندار اپنی زمینداریوں کو ترقی دے کر $\frac{1}{10}$ کے چھوٹے سے حصے کو رفتہ رفتہ بڑھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

"اگر ہماری حکومت چاہتی ہے کہ اس کی رعایا زمینداری کی آمدنی سے خوش حال ہو تو اُسے زمینداری کی آمدنی کے زیادہ سے زیادہ $\frac{9}{10}$ حصے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ فوری منافع و خرچ کی منہائی

1۔ پیراگراف 131، 132، 135، 136 اور 140

2۔ پیراگراف 264

کے بعد جو مجموعی پیداوار زمیندار کو حاصل ہوتی ہے اُس کا $\frac{9}{10}$ حصّہ لیا جائے مجھے اُمید ہے کہ اپنی زمینوں کو ترقی دے کر اور کسانوں کی ہمت افزائی کر کے زمیندار رفتہ رفتہ اپنے منافع کے تناسب میں اضافہ کر لیں گے۔[1]

آگے چل کر مسٹر شور نے بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا کہ اُس کی نظر میں بنگال کے زمینداروں کے حقوق کیا ہیں۔

"میں زمینداروں کو زمین کا مالک سمجھتا ہوں جس کی ملکیت انھیں اُن کے مذہبی قوانین کے طابق وراثت میں ملی ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جائز وارثوں کی صورت میں حکومت نہ تو انھیں وراثت سے محروم رکھ سکتی ہے نہ اُس میں کوئی تبدیلی کر سکتی ہے۔ زمینداری کو بیع یا رہن کرنے کا حق اُن کا بنیادی حق ہے اور ہمارے دیوانی حاصل کرنے سے پہلے بھی زمیندار اپنے اس حق کو استعمال کرتے تھے۔"

"مطلق العنان حکمراں زمینداروں کے حقوق چھین لینے کا دعویٰ کر سکتے تھے لیکن وہ بھی علی الاعلان اُن میں کمی نہیں کر سکتے تھے۔ عام طور سے عملاً وہ اُن کی (زمینداروں کی) حمایت کیا کرتے تھے۔ اکبر کے زمانہ حکومت میں بنگال میں زمینداروں کی بڑی تعداد تھی جو خاصے دولت مند تھے۔ جب اُس کے اور اُس کے جانشینوں کے زمانے میں بنگال کا نظم و نسق جعفر خاں کے سپرد کیا گیا تو اُس وقت بھی زمیندار موجود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے علاقوں میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ جب انگریزوں نے دیوانی حاصل کی تو خاص خاص زمینداروں نے دولت و وقار کا مظاہرہ کیا۔"[2]

یہ زمینداروں کی روداد تھی۔ کسانوں کے متعلق بھی مسٹر شور نے اتنے ہی زوردار الفاظ استعمال کیے۔

بنگال کے ہر ضلع میں جہاں جبری وصولی نے تمام قاعدوں ضابطوں کو ختم نہیں کر دیا ہے۔ زمین کا لگان ایک معینہ شرح کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے جس کو رنریک کہتے ہیں۔ بعض ضلعوں میں ہر گانو کی شرح مختلف ہوتی ہے۔ اس شرح کی بنیاد زمین کی پیداوار ہوتی ہے جو فی بیگہ (ایک ایکڑ کا تہائی) پر تا پھیلا کر لگائی جاتی ہے۔ کچھ زمینوں میں ہر سال دو مختلف فصلیں بوئی جاتی ہیں اور کچھ میں تین فصلیں جن زمینوں میں زیادہ منافع بخش فصلیں مثلاً شہتوت کے درخت، پان، تمباکو اور گنا بوئے جاتے ہیں اُن کی قیمت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔"

"خود کاشت آسامی یا ایسے اسامیوں کا پٹہ جو اُسی گانو میں کاشت کرتے ہیں جہاں وہ رہتے ہیں عام طور سے غیر معینہ مدت کے لیے ہوتا ہے اور اُس میں تحریر ہوتا ہے کہ وہ زمین پر قابض رہ سکتے ہیں

1۔ پیراگراف 355

2۔ پیراگراف 370۔ 382

اگر سال بہ سال لگان ادا کرتے رہیں۔ اس طریقہ نے حق دخیل کاری کو جنم دیا۔"

"پائے کاشت آسامی یا ایسے آسامی جو اُن گانوؤں کی زمین جوتتے ہیں جہاں وہ نہیں رہتے ہیں غیر واضح پٹوں پر زمین حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے پٹوں میں عام طور سے مدت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اگر پٹے کی شرائط اُن کو منظور نہیں ہوتی ہیں تو وہ کہیں اور اپنے لیے کھیت تلاش کر لیتے ہیں"۔[1]

روداد کے آخر میں مسٹر شور نے اپنی تجویزوں کا لُب لباب پیش کیا۔

"آئندہ بندوبست کے لیے میری تجویزوں کی بنیاد دو اُصول ہیں۔"

"آمدنی کی حد تک حکومت کا تحفظ کیا جائے اور اُس کی رعایا کا بھی تحفظ کیا جائے۔"

"پہلا مقصد زمین داروں یا مالکان اراضی سے بندوبست استمراری کرنے سے پورا ہو سکتا ہے۔ اُن کی زمینداری حکومت کے تحفظ کی ضامن ہو گی۔"

"دوسرا مقصد پورا کرنے کے لیے ہمیں جہاں تک ممکن ہو ایسا زیادہ سے زیادہ محصول عائد کرنا چاہیے جس کو سب تسلیم کرلیں۔ کس شخص کو کتنا محصول ادا کرنا پڑیگا اس کے متعلق اُسے معلوم ہونا چاہیے من مانی کارروائی کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ محصول ادا کرنے والے کو اور تمام دوسرے لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اُسے کب، کس طرح اور کتنا محصول ادا کرنا ہو گا۔

"دس سال کے لیے بندوبست کیا جائے لیکن بندوبست کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ آئندہ اس کو دائمی بندوبست کی شکل دی جائے گی۔"[2]

مندرجہ بالا عبارت مسٹر شور کی تفصیلی روداد کی محض تلخیص ہے جس میں اُس نے بندوبست استمراری کی حمایت کی تھی۔ اس کی وکالت پہلے فلپ فرانسس بھی کر چکا تھا۔ مسٹر شور نے اُسی سال ایک اور روداد بھی پیش کی جس میں اُنھوں نے کہا کہ زمینداروں کو یہ اطلاع نہ دی جائے کہ دس سالہ بندوبست کو آخر میں دائمی بندوبست میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ لارڈ کارنوالس نے اس کی مخالفت کی۔ اُس کا خیال تھا کہ اس کی بنا پر لوگ حکومت کی پالیسی کو غیر یقینی سمجھنے لگیں گے۔ اس سلسلے میں لارڈ کارنوالس نے کچھ اتنی واضح، مربوط اور زوردار باتیں کہیں کہ اس مختصر بیان میں بھی اُن کو شامل کرنا ضروری ہے

1۔ پیراگراف 391, 406, 407

2۔ پیراگراف 457, 458, 459, 460, 462

"مسٹر شور نے گزشتہ جون کی روداد میں نہایت قابلیت کے ساتھ اور میرے خیال میں نہایت کامیابی کے ساتھ زمینوں پر زمینداروں کے مالکانہ حقوق کی موافقت میں دلیلیں پیش کیں۔ لیکن اس وقت ہونے والے بندوبست کی دائمی حیثیت اگر ختم کردی جائے تو زمینداروں کو اُن کی زوردار دلیلوں سے کیا فائدہ ہوگا جن کے حقوق کے لیے انھوں نے کہا ہے ۔۔۔۔"

"اگر زمین کا زمیندار جو اُس کا جائز مالک ہے خود دس کے لیے ٹھیکیدار بن جائے اور وہ مدّت گزرنے کے بعد لاعلمی یا حرص کی بنا پر اُس سے نئے لگان کا مطالبہ کیا جاسکے تو اُس سے نہ صرف ترقی بلکہ زمین کو بربادی سے بچانے کی توقع بھی بیجا ہوگی۔

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں کمپنی کے علاقے کا ایک تہائی حصّہ جنگل ہے جس میں صرف جنگلی جانور رہتے ہیں۔ کیا دس سال کا ٹھیکہ کسی مالک کو جنگل صاف کرنے اور کسانوں کو اُن زمینوں پر کاشت کرنے کے لیے آمادہ کرنے پر تیار کرسکتا ہے جب کہ اُسے معلوم ہے کہ وہ مدّت ختم ہونے کے بعد زیرِ کاشت آنے والی زمین پر یا تو حسب حکم محصول ادا کرنے پر اُسے مجبور ہونا پڑیگا یا اپنی اُس محنت کے پھل سے ہاتھ دھونا ہوگا جس کا اُس وقت تک اُسے معاوضہ نہیں مل پایا ہوگا۔"

"میں یہ کہنے پر مجبور ہوں اور مجھے اس کا یقین ہے کہ اُن صوبوں میں اگر صرف دس سال کے لیے ٹھیکہ دیا گیا تو دس سال کی مدّت ختم ہونے کے بعد وہ علاقے تباہ و برباد ہوچکے ہوں گے۔"[1]

بعد میں لکھی جانے والی ایک روداد میں لارڈ کارنوالس نے ایک دفعہ پھر اپنے مدبرانہ خیالات پیش کیے۔

"اگر ایسے قانون بنائے جاسکیں جن کی رو سے وہ (زمیندار) اپنی محنت اور زرخیزی کے پھل پاسکیں اور اُس کے ساتھ انھیں یہ بھی معلوم ہوجائے کہ کاہلی اور فضول خرچی کے نتائج کیا ہوں گے تو وہ یا تو اس بات پر مجبور ہوں گے کہ اپنے کام کی دیکھ بھال خود کریں یا اُن کی حاجت مندی انھیں مجبور کرے گی کہ وہ اپنی زمینیں دوسرے لوگوں کو فروخت کردیں جو اُن میں کاشت کریں گے اور انھیں ترقی دیں گے۔ میرے خیال میں مالکانِ اراضی کو جزرس زمیندار اور مفادِ عامّہ کے سمجھدار متوّلی بنانے کا یہ واحد موثر طریقہ ہے جس پر یہ حکومت یا کوئی دوسری حکومت کاربند ہوسکتی ہے۔

"معلومات حاصل کرنے میں بیس سال لگ گئے۔ 1769ء میں نگراں مقرر کیے گئے تھے،

1۔ لارڈ کارنوالس کی روداد مورخہ 18 ستمبر 1789ء

1779ء میں صوبائی کونسلوں کا قیام عمل میں آیا تھا، 1772ء میں گشتی کمیٹی کو پریزیڈنسی کے تمام اختیارات سونپ کر بندوبست کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، 1776ء میں امیں مقرر کیے گئے تاکہ وہ فردیگان تیار کر سکیں، 1781ء میں مال کی صوبائی کونسلیں موقوف کردی گئیں اور مختلف اضلاع میں کلکٹر بھیجے گئے اور کلکتہ میں قایم ہونے والی کمیٹی آف ریونیو کو حکومت کی نگرانی میں جنرل کمیٹی اور مال گزاری کے انتظام کے اختیارات دے دیے گئے۔ اپنے پیش رؤں کی طرح ہم نے بھی معلومات حاصل کرنے سے ابتدائی اور تین سال سے ہم اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر اُس مسئلے کے متعلق جس کو اہم سمجھا گیا، کلکٹروں نے ضخیم رپورٹیں تیار کرکے بھیجی ہیں۔"

"مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر ملک سے جو دولت باہر جارہی ہے، اور جس میں اُس دولت کا اضافہ ہو جاتا ہے جو نجی طور سے لوگ ملک کے باہر بھیج رہے ہیں، اُس کے نتائج پچھلے کئی سال سے محسوس کیے جارہے تھے اور اب بھی محسوس کیے جارہے ہیں۔ اُس کی وجہ سے ملک کا موجودہ زرِ نقد کم ہو رہا ہے جس نے زراعت اور ملک کی عام تجارت کو بے جان بنا دیا ہے۔"

"اس کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے انتظامی اُصولوں میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں تاکہ اس ملک کی خوش حالی بحال کی جاسکے۔ اور اس کو اس قابل بنایا جاسکے کہ دنیا کے اُس حصے میں وہ برطانوی مفاد کی حمایت کرتا رہے۔"

"اس لیے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن خرابیوں کا تدارک کریں جو مفادِ عامّہ کو مجروح کر رہی ہیں، معینہ شرح پر زمین کو دوامی پٹے پر اٹھا کر ہم اپنی رعایا کو ہندوستان کے سب سے زیادہ خوش نصیب لوگ بنا دیں گے۔"[1]

1791ء میں حکومت نے دس سال کے بندوبست کے متعلق ضابطوں کا ایک ترمیم شدہ اور مکمل مجموعہ نافذ کیا اور 1793ء میں بنگال کے ہر ضلع میں بندوبست مکمل ہو گیا۔ 91-1790 میں بنگال، بہار اور اُڑیسہ کے صوبوں سے وصول ہونے والی مال گزاری کی مجموعی رقم 2,68,00,989 روپیہ تھی۔[2] یہ رقم صدی کے ابتدائی زمانے میں جعفر خاں اور شجاع خاں کی تشخیص کردہ مال گزاری کی رقم کی قریب قریب دگنی تھی، میر جعفر کے زمانے حکومت کے آخری سال میں مہاراجہ نند کمار نے جو مال گزاری کی رقم تشخیص

1۔ لارڈ کارنوالس کی روداد مورخہ 3 فروری 1790ء

2۔ پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 19

کی تھی یہ اُس کی تنگنی تھی اور کمپنی کی دیوانی کے پہلے سال میں محمد رضاخاں نے انگریزوں کی نگرانی میں جو رقم وصول کی تھی اُس کی قریب قریب دگنی تھی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تشخیص زیادہ سے زیادہ سختی کے ساتھ کی گئی تھی۔ اس کی شرح کو اتنا اونچا اس وجہ سے کیا جا سکا کہ اس امر کا اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہ تشخیص قطعی اور دوامی ہے۔

ڈائریکٹروں نے اپنے مراسلے مورخہ 29 ستمبر 1792ء میں اس کام پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بندوبست استمراری کو اپنی منظوری دے دی۔ اس مراسلے کے موصول ہونے کے بعد لارڈ کارنوالس نے 22 مارچ 1793ء کو اعلان کیا کہ جو بندوبست ابھی ختم ہوا ہے یا کہیں کہیں جاری ہے اُس کی حیثیت دائمی ہے۔ اس اعلان کی پہلی تین دفعات مندرجہ ذیل تھیں۔

دفعہ 1 "بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دس سالہ بندوبست کے متعلق جو ابتدائی ضابطے بالترتیب 18 ستمبر 1789ء، 25 نومبر 1789ء اور 10 فروری 1790ء کو منظور کیے گئے تھے اُن میں اراضی کے اُن مالکان کو مطلع کیا گیا تھا جن سے یا جن کی طرف سے بندوبست کیا جانے والا تھا کہ اُن ضابطوں کے تحت جو مال گزاری تشخیص کی جائے گی وہ دس سال کی مدت گزر جانے کے بعد بھی برقرار رہے گی۔ اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی بشرطیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے عزت مآب کورٹ آف ڈائریکٹرز کی منظوری انھیں حاصل ہو جائے۔ بصورت دیگر اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔"

دفعہ 2 "مارکوئس کارنوالس، نائٹ آف دی موسٹ نوبل آرڈر آف دی گارٹر (Knight of the most Noble order of the Garter) گورنر جنرل ان کونسل بنگال، بہار اور اڑیسہ کے تمام زمینداروں، آزاد تعلقداروں اور اراضی کے دوسرے حقیقی مالکوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے عزت مآب کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اُسے یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ جو مال گزاری مذکورہ بالا ضابطوں کے تحت اُن کی زمینوں پر تشخیص ہوتی ہے یا آئندہ تشخیص ہوگی اُس کو دائمی حیثیت دی جاتی ہے۔"

دفعہ 3 "چنانچہ گورنر جنرل ان کونسل اُن زمینداروں، آزاد تعلقداروں اور اراضی کے دوسرے حقیقی مالکوں کو، جن سے یا جن کی طرف سے مذکورہ بالا ضابطوں کے تحت بندوبست کیا گیا ہے، آگاہ کرتا ہے کہ بندوبست کی مدت ختم ہونے کے بعد اُس مال گزاری میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی جس کی ادائیگی کی وہ ذمہ داری قبول کر چکے ہیں۔ انھیں اُن کے وارثوں کو اور اُن کے جائز جانشینوں کو اس امر کی اجازت ہوگی کہ وہ اس شرح مال گزاری کے ساتھ اپنی زمینداریوں پر

ہمیشہ قابض رہیں۔''[1]

1793ء کا ریگولیشن نمبر 1 منظور ہو گیا، جس کے تحت بندوبست استمراری کیا گیا۔ انگریزوں نے ڈیڑھ صدی کے زمانہ حکومت میں اُن کا یہ واحد کام تھا جس نے نہایت موثر انداز سے ہندوستانیوں کی معاشی خوش حالی کا تحفظ کیا۔ یہ ایسا کام تھا جو متمدن قوموں کی جدید پالیسیوں سے مطابقت رکھتا تھا یعنی ریاست کے غیر یقینی اور بڑھتے ہوئے مطالبوں سے صنعتوں کو مفلوج کرنے کے بجائے لوگوں کو اس کا موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنی صنعتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پچھلے سو سال میں بنگال میں زراعت کی بڑی توسیع ہوئی ہے اور مال گزاری جو 1793ء میں لگان کے نوے فی صدی کے حساب سے مقرر کی گئی تھی اس وقت زمیندار کو حاصل ہونے والے لگان سے اٹھائیس فی صدی کا تناسب رکھتی ہے۔ سڑکوں اور مفاد عامہ کے دوسرے کاموں کے لیے کچھ نئے محاصل عائد کیے گیے ہیں جو لگان کی آمدنی کے ½6 فی صدی ہوتے ہیں۔

1793ء کے بعد سے دائمی بندوبست والے بنگال میں ایسا کوئی قحط نہیں پڑا جس میں بڑا جانی نقصان ہوا ہو۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مال گزاری غیر یقینی اور زیادہ ہے اور زراعت کو ترقی دینے اور روپیہ پس انداز کرنے کے لیے کوئی محرکات نہیں ہیں، اب بھی لاکھوں بلکہ کبھی کبھی کروڑوں انسان قحط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر لوگوں کی خوشحالی اور مسرت کو سمجھ داری اور کامیابی کا پیمانہ سمجھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ کارنوالس کا 1793ء کا بندوبست استمراری برطانوی قوم کا ہندوستان میں سب سے کامیاب اقدام تھا۔

بنگال میں مال گزاری کے بندوبست استمراری کے بیان کو ختم کرنے سے پہلے ہم انگلستان کے محاصل اراضی کے بندوبست سے اُس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، جو بندوبست استمراری کے پانچ سال بعد یعنی 1798ء میں عمل میں آیا۔ ولیم سوم کا محصول املاک شروع میں ذاتی جائداد اور منصب پر عائد کیا گیا تھا۔ بعد کے زمانے میں جب ذاتی جائداد محاصل سے بری قرار دے دی گئی تو اُس سالانہ محصول اراضی کا نام دیا گیا۔ اسپین کی جنگ وراثت کے زمانے میں اس کی شرح بڑھا کر چار شلنگ فی پونڈ یعنی لگان کا بیس فی صدی کر دی گئی تھی۔ 1713ء کے معاہدہ یوٹریکٹ (Utrecht) کے بعد اس کو گھٹا کر دو شلنگ سے ایک شلنگ فی پونڈ یعنی لگان کے بیس فی صدی سے پانچ فی صدی تک اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔

---

1 پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 21

بنگال کے بندوبست استمراری کے پانچ سال بعد عظیم وزیر ولیم پٹ نے انگلستان کے مختلف حصول میں، جن کا ذکر ایکٹ میں کر دیا گیا تھا، محصول اراضی کو دائمی حیثیت دے دی۔ اس ایکٹ کی رو سے مالکان اراضی کو حق دیا گیا تھا کہ وہ یکمشت رقم ادا کر کے محصول سے جائداد فک کرالیں اب تک کی محصول کی 13,00,000 پونڈ کی رقم ادا کی جا چکی ہے اور 10,00,000 پونڈ واجب الادا ہے۔ اس کی اراضی پر ایک معینہ بار سمجھا جاتا ہے جس کے پیش نظر اُس کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔[1]

ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے محصول اراضی کے دائمی بندوبست کو کچھ لوگ سمجھ داری سے تعبیر نہ کریں لیکن بنگال میں کارنوالس کے بندوبست استمراری کے متعلق اس قسم کے شکوک کی گنجائش نہیں انگلستان کے بندوبست سے صرف مالکان اراضی کو فائدہ پہنچا۔ لیکن بنگال کے بندوبست سے تمام زرعی طبقے کو فائدہ ہوا۔ سب کسان اس سے مستفید ہوئے اور اس کی وجہ سے زیادہ خوش حال ہو گئے اور محنت و جفاکشی سے کام کرنے لگے۔ انگلستان کے بندوبست نے قومی آمدنی کے بہت سے ذرائع میں سے ایک پر محصول کی حد قایم کی۔ بنگال کے بندوبست نے زراعت کا تحفظ کیا جو پوری قوم کی گزر بسر کا قریب قریب واحد ذریعہ ہے۔ انگلستان میں بندوبست نے ریاست کو اُس بڑے محصول اراضی سے محروم کر دیا جو قوم کے مفاد میں ملک کے اندر خرچ کیا جاتا۔ بنگال کے بندوبست نے ریاست کو ملک کے باہر زیادہ دولت لے جانے سے روک دیا۔ انگلستان میں اس نے مالکان اراضی کو مزید محصول سے بچایا۔ بنگال کے بندوبست نے قوم کو خطرناک اور تباہ کن قحطوں سے محفوظ رکھا۔

1۔ اسٹیفن ڈول، History of Taxation and Taxes in England = 1884ء، جلد 3 صفحات 97-101

باب 6

مدراس میں محاصل کے ٹھیکے (1763ء لغایت 1785ء)

پچھلے باب میں ہم نے 1757ء سے 1793ء تک بنگال کی معاشی تاریخ پیش کی۔ اب ہم مدراس کے حالات کا جائزہ لیں گے جہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہونے والی طویل جنگیں 1763ء کے معاہدہ پیرس کے ذریعہ ختم ہوئیں۔

ان جنگوں کی روداد اکثر سنائی گئی ہے۔ جنوبی ہند پر قبضہ کرنے کے لیے یہ نہایت اہم جدوجہد تھی۔ یہ ڈوپلے اور رابرٹ کلایو کے درمیان مقابلہ تھا۔ ڈوپلے نے فرانسیسی سلطنت کی تعمیر کا کام شروع کیا اور کلایو نے اس نامکمل تعمیر کو مسمار کر دیا۔ کچھ مدت بعد وطن پرستی کے جذبے سے سرشار باصلاحیت بُسی (Bussy) اور جذباتی لیلی (Lally) نے مشرق میں فرانسیسی طاقت کا تحفظ کرنے کے لیے ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کی لیکن آئر کوٹ نے آخر میں اُس کو ختم کر دیا۔ معاہدہ پیرس نے انگلستان کی کامیابی کو تسلیم کر لیا۔ اُس کے بعد ہندوستان میں فرانس کبھی انگلستان کا رقیب نہ بن سکا۔

ان جنگوں کی روداد دو دفعہ سنائی جا چکی ہے۔ اب ہم لوگوں کی معاشی حالت کا جائزہ لیں گے۔ ہندوستان کی تاریخ محض انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی جنگوں کی تاریخ نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کے لوگوں یعنی اُن کی مادی اور روحانی حالت، اُن کی تجارت، اُن کی صنعت اور اُن کی زراعت کی تاریخ ہے۔ چونکہ لوگوں کی اس حقیقی تاریخ کی طرف کم توجہ کی گئی ہے اس لیے ہم موجودہ کتاب میں صرف اسی سبق آموز موضوع کا جائزہ لیں گے اور جنگوں کی ڈرامائی کہانی سنانے کا کام دوسرے ذہین مصنفین کے لیے چھوڑ دیں گے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی بیس سالہ جدوجہد 1763ء میں ختم ہوئی۔

پانڈی چیری اور کچھ دوسرے مقامات کے تجارتی مراکز فرانس کو واپس کردیے گئے لیکن جنوبی ہند میں انگریزوں کو بالادستی حاصل ہوگئی۔ انگریزوں کا ایک آوردہ محمد علی کرناٹک کا نواب بنا دیا گیا۔ مدراس کے اس پاس کے علاقے پر اور بنگال تک پھیلے ہوئے مشرقی ساحلی علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

کرناٹک کے نواب محمد علی کا کردار اُس کے ہم عصر بنگال کے نواب میر قاسم کے کردار کے برعکس تھا۔ میر قاسم ایک مستقل مزاج انسان اور سخت گیر حاکم تھا۔ محمد علی ایک کمزور انسان اور آسائش پسند حکمراں تھا۔ میر قاسم نے اپنا دارلسلطنت منگیر کو تبدیل کر دیا تاکہ انگریزوں کے اثر سے دور رہ کر اپنی حکومت کا انتظام کرے۔ محمد علی نے اپنے دار السلطنت ارکاٹ کو خیر باد کہہ دیا۔ تاکہ مدراس کے برطانوی شہر میں آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ میر قاسم انتہائی جزرس تھا اور تخت نشینی کے دو سال کے اندر اُس نے برطانیہ کے مالی مطالبات پورے کر دیئے۔ محمد علی کمپنی کے مالی مطالبات کبھی پورے نہیں کر سکا اور روز بروز زیادہ مقروض ہوتا چلا گیا۔ میر قاسم نے بنگال کی داخلی تجارت اپنی رعایا کے ہاتھوں میں رکھنے کے لیے انگریزوں سے لڑائی مول لی۔ محمد علی نے اپنی مال گزاری انگریز قرض خواہوں کے حوالے کر دی یہاں تک کہ اُس کے تمام علاقے قرض خواہوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ میر قاسم اپنی سلطنت چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور غریب الوطنی کی موت مرا۔ محمد علی نے غلامی، آسائش اور قرض کی شرمناک زندگی گزاری اور لمبی عمر پائی۔ انگریزوں کی مشرقی سلطنت کی اسکیم میں ایک طاقت ور حکمراں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک کمزور حکمراں کو اس کی اجازت تھی کہ وہ زندہ رہے، قرض لیتا رہے اور اپنی سلطنت کی آمدنی میں سے اُس کا سود ادا کرتا رہے۔

اس کمزور حکمراں کے زمانہ حکومت میں کمپنی نے آسانی سے اپنی طاقت اور اثر میں اضافہ کر لیا کمپنی 1765ء میں جس طرح بنگال کی دیوانی قبول کر چکی تھی ویسے اُس نے کرناٹک کی دیوانی قبول نہیں کی بلکہ محمد علی نام نہاد دیوان یا مہتمم مال اور نظام یا فوجی گورنر رہا لیکن اصل طاقت کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کا فوجی دفاع کمپنی کی ذمہ داری تھی اور نواب کی آمدنی کا ایک حصہ اس مقصد کے لیے وقف تھا۔ جنگوں کے ساتھ کمپنی کے مطالبات میں اضافہ ہونے لگا اور نواب نے کمپنی کے ملازمین سے روپیہ قرض لے کر کمپنی کے مطالبات پورے کرنے کا عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا۔

زیادہ اہم اور خطرناک وہ ضمانت تھی جو نواب نے نجی قرضوں کے سلسلے میں پیش کی۔ یا تو اُس کے پاس پس انداز کیا ہوا روپیہ تھا نہیں یا وہ اُس کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا بہر حال اُس نے اپنے علاقوں کی آمدنی اپنے نجی قرض خواہوں کے سپرد کر دی تھی۔ کرناٹک کے کسان نواب

کے ملازمین کی حکومت سے نکل کر انگریز مہاجنوں کی حکومت میں آگئے۔ اُن کی فصلوں پر انگریز قرض خواہوں کو ناقابل انتقال حقوق حاصل ہو گئے۔ نواب کے ملازمین جو روپیہ وصول کرتے تھے اور جس کی وصولی میں عام طور سے جبر اور زدوکوب سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ کمپنی کے انگریز ملازمین کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ انگلستان بھیجا جا سکے۔ تمام کرناٹک کا ایسا حال تھا جیسے کسی پھل کا گودا نکال لیا جائے اور صرف چھلکا باقی رہ جائے۔ جنوبی ہند کے کھیت اور گاؤں ایک وسیع کھیت میں تبدیل ہو گئے تھے جن کو جوتنے والے جوتتے تھے اور مزدور اُن میں خون پسینہ ایک کرتے تھے تاکہ اُن کی پیداوار کی قیمت ہر سال یورپ بھیجی جا سکے

ملک اور لوگوں کو دوہرا نقصان پہنچایا گیا۔ نواب کا وصولیابی کا طریقہ بھی سخت تھا مگر اُس میں لچک تھی۔ اُس کا مطالبہ سال بہ سال پیداوار کے مطابق ہوتا تھا۔ جب اُس کے قرض خواہ منظر عام پر آئے تو نواب کے سخت طریقوں میں برطانوی طریقہ کار کی سختی کا اضافہ ہو گیا۔ نواب کے قرض خواہوں کے مطالبات سختی کے ساتھ پورے کیے جاتے تھے اور کسانوں پر ایسا بار پڑنے لگا جس کے وہ عادی نہیں تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ جب تک مال گزاری کا روپیہ نواب کے ہاتھ میں آتا رہا وہ ملک میں خرچ کیا جاتا تھا اور کسی نہ کسی صورت میں لوگوں کو واپس ہو جاتا تھا۔ لیکن جب اُن ضلعوں کی آمدنی انگریز قرض خواہوں کے ہاتھوں میں آنے لگی، جو اُن کے سپرد کر دیے گئے تھے، تو وہ ملک کے باہر بھیجی جانے لگی۔ ملک غریب ہونے لگا اور صنعت و تجارت تباہ ہونے لگی۔

اُن گواہوں کے بیانات اس بات کی شہادت میں پیش کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے 1782ء میں مقرر ہونے والی ہاؤس آف کامنز کی اُس سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دی جس کے سپرد ہندوستان کے عدالتی نظام کی تحقیقات کا کام کیا گیا تھا۔

"مسٹر جارج اسمتھ سے، جو تعمیل حکم میں حاضر ہوا تھا، پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں کتنی مدت، کہاں اور کس حیثیت سے رہا؟ اُس نے جواب میں کہا کہ وہ 1764ء میں ہندوستان آیا اور 1767ء سے اکتوبر 1779ء تک مدراس میں رہا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ جب پہلے پہل مدراس کے متعلق واقفیت حاصل کی اُس وقت وہاں تجارت کیسی تھی؟ اُس نے کہا کہ تجارت پھل پھول رہی تھی اور مدراس کا شمار ہندوستان کی بڑی منڈیوں میں ہوتا تھا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ جب وہ مدراس سے رخصت ہوا اُس وقت تجارت کا کیا حال تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ اُس کے رخصت ہوتے وقت تجارت نہ ہونے کے برابر تھی۔ صرف ایک جہاز وہاں تھا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ جس وقت وہ پہلی دفعہ وہاں گیا تھا تو کرناٹک اور ملک کے دوسرے حصوں میں تجارت اور زراعت کی کیفیت کیا تھی؟ اُس نے جواب دیا

کہ اُس وقت اُس کو معلوم ہوا تھا کہ کرناٹک کی زراعت بڑی اچھی حالت میں تھی اور آبادی گنجان تھی اس لیے وہاں تجارتی اشیا کی بڑی طلب رہا کرتی تھی۔ اُس سے پوچھا گیا کہ جس وقت وہ مدراس سے رخصت ہوا اُس وقت کرناٹک کی آبادی، زراعت اور تجارت کی کیا حالت تھی؟ اُس نے کہا زراعت تنزل پذیر تھی، آبادی گھٹ رہی تھی اور تجارت بہت کم ہو گئی تھی۔"[1]

کمپنی کے ملازمین جن پر مدراس کونسل مشتمل تھی نواب کو قرض دیکر بڑی دولت کما رہے تھے، اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کو اُن کی کارروائیوں کی اطلاع مل سکے۔ لیکن کورٹ آف ڈائریکٹرز کے حکم کی تعمیل میں انھوں نے 1767ء میں اپنے تمام قرضوں کو ایک قرض میں تبدیل کر دیا تھا جس کا سود دس فی صدی کی مناسب شرح سے لگایا جاتا تھا۔ وہ بار بار یہ اُمید ظاہر کیا کرتے تھے کہ نواب اپنا قرض ادا کر دے گا۔ لیکن یہ بات نہ اُن کے مفاد میں تھی اور نہ کمزور اور ناکارہ نواب کے۔ کہ قرض کا لین دین ختم ہو جائے اور اس لیے وہ کبھی ختم نہ ہو سکا۔ جب اس لین دین کا باقاعدہ حساب 1769ء میں ڈائریکٹروں کے علم میں آیا تو اُنھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

"آپ کو شرم آنی چاہیے کہ یہ تمام لین دین ہم سے چھپایا گیا۔ ہمیں شبہ ہے کہ محمد علی کی توسیع کے لیے آپ نے جو تجویز پیش کی ہے اُس کی وجہ یہ قرض بھی ہے۔ بہرحال اُس کی وجہ قرض ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ نے واقعات کو ہم سے مخفی رکھ کر اپنے قرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے۔"[2]

"جب ہم نے اُن کو حکم دیا تھا کہ پچھلے بیس سال تک جنگ میں نواب کی مدد کرنے پر جو رقم صرف ہوئی اُس سے وصول کی جائے تو ہمارے ملازموں نے اس قرض کی ادائیگی کو نظر انداز کیسے کیا یا اپنے مفاد کو اس قرض کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت کیوں دی؟ اور اپنے اس فعل کو فرض اور وفاداری کے مطابق کیسے ٹھہرایا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اُن کی یہ جُرأت کیسے ہوئی کہ نواب کی اُس مال گزاری کو وصول کرنے کے لیے جو اُن کے پاس رہن ہے کمپنی کی طاقت، اثر اور اقتدار سے کام لیں؟"[3]

---

1 ۔ نویں رپورٹ، 1783ء ضمیمہ، صفحہ 120

2 ۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کا خط صدر اور کونسل مقیم فورٹ سینٹ جارج کے نام مورخہ 17 مارچ 1769ء

3 ۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کا خط فورٹ سینٹ جارج کی سلیکٹ کمیٹی کے نام مورخہ 17 مارچ 1769ء۔ قاری دیکھیں گے کہ ڈائریکٹروں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہونے والی بیس سالہ جنگ کو جو ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی تھی۔ نواب کی جنگ کہا ہے اور اُس کے خرچ کا مطالبہ نواب سے کرتے ہیں۔

"مذکورہ بالا گورنر اور کونسل نے اعتماد کا خون کرتے ہوئے کمپنی کے مفادات پر لوگوں کے نجی مفادات کو ترجیح دی اور نواب کے انفرادی بڑے بڑے قرضوں کی وصولیابی کے لیے کچھ زرخیز اضلاع کی مال گزاری وصول کرنے کا حق قرض خواہوں کو دے دیا حالانکہ یہ مال گزاری کمپنی کے اُس قرض کی وصولیابی کے لیے استعمال ہونی چاہیے تھی جو نواب کی طرف واجب الادا ہے۔ یہ طریقہ کار اس وجہ سے اور نامناسب ہوگیا ہے کہ وہ مال گزاری بڑی حد تک کمپنی کے تحفظ کی وجہ سے وصول ہوتی ہے۔ مال گزاری کے اس غلط استعمال کی وجہ سے اُن بھاری رقموں کی ادائیگی التوا میں پڑگئی جو نواب کی طرف واجب الادا ہیں حالانکہ کرناٹک کے تحفظ کے زیادہ اخراجات کمپنی کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔" 1

وارن ہیسٹنگز، جس نے بنگال کی داخلی تجارت پر کمپنی کے ملازمین کے اجارہ داری کے مطالبے کی مخالفت کی تھی، اب مدراس کونسل کا رکن تھا۔ اُس نے ایمانداری کے ساتھ کوشش کی کہ ارکاٹ کے نواب نے کمپنی کے ملازمین کو مال گزاری وصول کرنے کا جو حق دیا تھا وہ منسوخ کر دیا جائے۔ ایک واضح اور زوردار خط میں جو اُس کی طرز نگارش کی آئینہ داری کرتا تھا اور جس پر اُس اور مدراس کونسل کے تین دوسرے اراکین کے دستخط تھے، اُس نے تفصیل سے بتایا کہ ڈائریکٹروں کے خطوط موصول ہونے کے بعد کیا کارروائی کی گئی۔

"ہمارا خیال ہے کہ آپ کے احکام کی غایت و غرض مندرجہ ذیل ہے۔ ہرگاہ کہ نواب نے اپنے دستخط و مہر کے ساتھ کرناٹک کے ایک حصّے کی مال گزاری وصول کرنے کا حق کچھ لوگوں کو دے دیا ہے تاکہ وہ اُس سے کمپنی کے بجائے اپنے نجی قرضوں کی ادائیگی کا انتظام کر سکیں اور ہرگاہ کہ آپ اس امر کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں کہ نواب کو یا آپ کے ملازموں کو اس قسم کا آزاد حق حاصل ہو اور ہمیں حکم دیتے ہیں کہ دستاویز تفویض کی رو سے اُنھیں جو حقوق حاصل ہو گئے ہیں وہ منسوخ کیے جائیں، اس پر عمل کرنے کے بعد آپ کے حکم کے مطابق ہم نواب کو مطلع کریں کہ اُس کو پہلے کمپنی کا قرض ادا کرنا چاہیے۔ کمپنی کا قرض ادا ہو جانے کے بعد ہمیں اس امر کی اجازت ہے کہ ہم کمپنی کے اختیارات کو کام میں لاکر ایسے اقدام کریں جن کی بنا پر نواب کے انفرادی قرضوں کی ادائیگی کی تدبیر ہو سکے۔

"صدر اور مسٹر ڈیو پرے (Mr. Du Pre) باضابطہ طور سے دستاویز تفویض کے تحت حاصل

1۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کا مراسلہ نگرانی کرنے والے کمشنروں کے نام مورخہ 23 مارچ 1775ء۔ کورٹ کی نظر میں مال گزاری وصول کرنے کا حق "غیر فطری" اس لیے نہیں تھا کہ اس سے ملک تباہ ہو رہا تھا بلکہ اس لیے تھا کہ اس کی وجہ سے نواب کی طرف سے کمپنی کے قرض کی ادائیگی کا امکان معرض التوا میں پڑ گیا تھا۔

ہونے والے حقوق سے دست بردار ہو گئے ہیں اور اپنے قرضوں کی وصولی کے لیے خود کو کمپنی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ کے احکام کی مشتہری کے بعد اور کچھ لوگوں نے بھی اُن کی پیروی کی ہے۔ لیکن چونکہ بہت سے لوگوں نے ہماری تجویز کے مطابق خود کو کمپنی کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے ہم نے یہ سمجھا کہ مطالبے کو بالجبر تسلیم کروانے سے گریز کیا جائے۔"[1]

اسی سال ایک اور خط میں وارن ہیسٹنگز نے اشارہ کیا تھا کہ نواب نے 'جو اپنے نجی قرض خواہوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے' انگلستان میں کمپنی کے خلاف اثر و رسوخ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔

"کچھ مدت پہلے تک نواب کورٹ آف ڈائریکٹرز پر اعتماد رکھتا تھا اور انھیں کمپنی سمجھا کرتا تھا۔ اب کچھ گمراہ کرنے والوں نے اُسے سمجھا دیا ہے کہ دوسرے مفادات اُس کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اُسے یقین دلایا گیا ہے کہ اُس کے نجی قرض خواہ اتنی طاقت و رسوخ رکھتے ہیں کہ وہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی تجاویز کو مسترد کر سکتے ہیں۔ سب سے بری بات یہ ہے کہ اس نے اس رائے کا اثر قبول کیا ہے کہ پارلیمنٹ اور ملک معظم کمپنی کے مقابلے میں اس کی حمایت کریں گے۔"[2]

نواب کی اطلاعات غلط نہیں تھیں۔ اُس کے قرض خواہوں نے جو تفویض کیے ہوئے اضلاع کے لگان سے بڑی دولت حاصل کر چکے تھے جلد ضرورت کے مطابق بڑی تعداد میں ووٹ حاصل کر لیے اور کورٹ آف ڈائریکٹرز پر قابض ہو گئے اور جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے اُن کے تمام مطالبات بغیر کسی تحقیقات کے تسلیم کر لیے گئے۔

اس دوران نواب نے اپنے قرض خواہوں کو اضلاع تفویض کر کے اپنی سلطنت کے وسائل ختم کر دیئے تھے اور تنجور کے راجہ کی آسودہ حال ریاست کی طرف چشم طمع اُٹھانے لگا تھا۔ 1769ء میں حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اُس کی رو سے تنجور کے راجہ کو انگریزوں کا حلیف تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس "دوست" کی دولت نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کے دل میں بھی لالچ پیدا کر دیا تھا اور انھوں نے محمد علی کی اس تجویز کو اچھے کانوں سے سُنا کہ کمپنی کا قرض ادا کرنے کے لیے تنجور کی دولت پر قبضہ کیا جائے۔

1۔ فورٹ سینٹ جارج کی سلیکٹ کمیٹی کا مراسلہ ڈائریکٹروں کے نام مورخہ 31 جنوری 1770ء

2۔ ایضاً، مورخہ 6 اپریل 1770ء

ڈائریکٹروں نے لکھا تھا "ہمارے خیال میں یہ بات بہت نامناسب ہے کہ تنجور کا راجہ ملک کے ایسے زرخیز حصے پر قابض رہے جو ایک فوج کو برقرار رکھنے کے ذرائع مہیا کر سکتا ہے اور کرناٹک کے دفاع میں کوئی حصہ نہ لے . . . . اس لیے ہم آپ کو ہدایت کرتے ہیں کہ آپ نواب کے مطالبوں کی موثر طریقے سے حمایت کریں۔ اگر راجہ جنگ کے اخراجات میں حصہ رسدی شریک ہونے سے انکار کرے تو آپ اس قسم کے اقدام کیجیے جنھیں نواب انصاف پر مبنی اور اپنی حکومت کے شایان شان سمجھے۔ مندرجہ بالا حکم کی تعمیل میں راجہ سے جو رقم وصول کی جائے وہ نواب پر کمپنی کے قرض کو ادا کرنے کے لیے استعمال کی جائے۔ اگر اس کے بعد کوئی روپیہ بچے تو اُس سے نواب کے انفرادی قرض خواہوں کے مطالبات پورے کیے جائیں۔"[1]

یہ ایک اشارہ تھا جس پر عمل کیا گیا۔ 1771ء میں تنجور کا محاصرہ کر لیا گیا اور راجہ نے 4,00,000 پونڈ ادا کر کے خود کو بچایا۔ اس سے نواب کی حرص اور بڑھ گئی۔ اُس نے اپنے دوست انگریزوں کو اس خیال پر آسانی سے متفق کر لیا کہ "صوبے کے بیچ میں اس قسم کی طاقت کی موجودگی خطرناک ہے۔" تنجور کا ایک دفعہ پھر محاصرہ کر لیا گیا۔ اور 16 ستمبر 1773ء کو اُس پر قبضہ کر لیا گیا۔ بدقسمت راجہ اور اُس کے خاندان کے اراکین قلعہ میں گرفتار کر لیے گئے اور اُس کی ریاست نواب کو منتقل کر دی گئی۔

نواب کی حکومت میں آنے کے کچھ سال کے اندر بدنظمی نے تنجور کی ریاست کو اتنا برباد کر دیا کہ اُس کی مثال نہیں ملتی۔ محمد علی نے اس کو ایک دشمن اور مفتوحہ ملک سمجھا اور لوگوں سے زیادہ روپیہ وصول کیا، اُس کی مال گزاری اپنے قرض خواہوں کے سپرد کر دی اور اُس کی تجارت اور صنعتوں کو تباہ کر ڈالا۔ کچھ برسوں میں تنجور جو جنوبی ہند کا چمن تھا مشرقی ساحل کے سب سے زیادہ ویران علاقے میں تبدیل ہو گیا۔

مسٹر پیٹری (Mr. Petrie) نے 1782ء میں خفیہ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا "اس سے پہلے کہ میں تنجور کے موجودہ حالات کا ذکر کروں یہ ضروری ہے کہ میں کمیٹی کو بتا دوں کہ کچھ سال پہلے تک وہ صوبہ ہندوستان کا سب سے زیادہ پھلتا پھولتا صوبہ تھا۔ اُس کی زراعت کو فروغ ہو رہا تھا اور اس کی آبادی بڑھ رہی تھی۔ مجھے سب سے پہلے 1768ء میں اُس ملک کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اُس وقت اُس کی حالت آج کی حالت سے بہت مختلف تھی۔ پہلے تنجور داخلی اور بدیسی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں بمبئی اور سورت سے کپاس، بنگال سے خام ریشم اور ریشمی کپڑا اور سماترا، ملاکا اور مشرقی جزائر سے شکر، گرم مسالا وغیرہ درآمد کیا جاتا تھا۔ پیگو سے سونا، گھوڑے، ہاتھی اور لکڑی کے شہتیر آتے تھے اور چین سے مختلف

1۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کا خط فورٹ سینٹ جارج کی سیکٹ کمیٹی کے نام مورخہ 17 مارچ 1769ء

اشیا درآمد ہوتی تھیں۔ تنجور کے ذریعہ حیدرعلی کی سلطنت کے بڑے حصے کو اور مرہٹوں کی سلطنت کے شمال مغربی حصوں کو بہت سی یورپی اشیا مہیا ہوتی تھیں اور بنگال سے مختلف قسم کے ریشمی کپڑے آتے تھے جن کو ہندوستان کے لوگ عام طور سے لباس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تنجور سے ململ، چھینٹ، رومال، دھاری دار کپڑا، کئی قسم کا لٹھا اور ایک خاص قسم کا چھپا ہوا موٹا کپڑا برآمد کیا جاتا تھا۔ آخری قسم کا کپڑا ڈچ اور ڈین لوگوں کے لیے بڑی کاروباری اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ افریقہ، مغربی ہند اور جنوبی امریکہ کی منڈیوں میں اس کی بڑی مانگ تھی۔ تنجور سے زیادہ شاید ہی کسی ملک کو قدرتی فائدے حاصل ہوں۔ اس کی زمین زرخیز ہے۔ دو بڑے دریاؤں کاویری اور کیلیروں کے پانی سے وہ سیراب ہوتی ہے۔ پانی کے ذخیروں، نالیوں اور نہروں کے ذریعے پانی اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ہر کھیت کی آب پاشی کی وجہ سے تنجور انتہائی زرخیز ہو گیا ہے۔ ملک کے مناظر میں حسین تنوع ہے۔ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کے مقابلے میں اس کے مناظر انگلستان سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ تنجور کی یہ حالت کچھ سال پہلے تک تھی۔ لیکن یہ اتنی جلدی تباہ ہوا ہے کہ بہت سے ضلعوں میں اسکی گذشتہ دولت کا نشان بھی مشکل سے مل سکے گا۔ ۔ ۔ ۔ "میں نے سنا ہے کہ اس زمانے میں (1771ء) صنعتیں ترقی کر رہی تھیں، ملک آباد تھا، زراعت اچھی حالت میں تھی اور وہاں کے لوگ جفاکش اور دولت مند تھے۔ لیکن 1771ء کے بعد جب پہلا محاصرہ ہوا تھا، راجہ کی بحالی تک کی مدت میں وہاں دو جنگیں ہوئیں اور حکومت میں تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے تجارت، صنعتوں اور زراعت کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا سکی اور وہاں کے ہزاروں باشندے زیادہ محفوظ مقام پر بود و باش اختیار کرنے کے ارادے سے وہاں سے چلے گئے۔"[1]

مدراس کے نئے گورنر کی تقرری کا وقت آگیا تھا۔ فرانسیسیوں سے جنگ کے زمانے میں مسٹر پیگٹ (Mr. Pigot) مدراس کا گورنر تھا۔ وہ 1763ء میں انگلستان واپس چلا گیا تھا۔ وہاں اس کو سر کے خطاب سے نوازا گیا اور آئرلینڈ کا لارڈ بنا دیا گیا۔ صوبے کے نظم و نسق میں اصلاحات کرنے کی غرض سے اس کو 1775ء میں دوبارہ مدراس کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ ڈائریکٹروں نے تنجور پر محمد علی کے قبضے کو زیادہ پسند نہیں کیا تھا اور ان کے حکم کی تعمیل میں لارڈ پیگٹ نے راجہ کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ محمد علی نے راجہ کی بحالی کو روکنے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کیا۔ لیکن لارڈ پیگٹ اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

1۔ خفیہ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1782ء، ضمیمہ نمبر 22۔

30 مارچ 1776ء کو راجہ ایک دفعہ پھر گدی پر بٹھا دیا گیا۔

اُس کے بعد گورنر کی دشواریوں کا آغاز ہوا۔ نواب کے متعدد قرض خواہوں میں ایک شخص پال بین فیلڈ (Paul Benfield) بھی شامل تھا جس نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ وہ 1763ء میں کمپنی کے سول ماہر تعمیرات کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ لیکن سود کے ذریعے اپنی قسمت بنانے میں اُس نے زیادہ کامیابی حاصل کی تھی۔ جب تنجور کا راجہ دوبارہ گدی پر بٹھایا گیا تو بین فیلڈ نے دعوٰی کیا کہ 162,000 پونڈ کی حد تک جو اُس نے نواب کو قرض دیے تھے، اُسے تنجور کی مال گزاری وصول کرنے کا حق حاصل ہے اور اُس کے انفرادی قرضوں کی حد تک جن کی مجموعی رقم 72,000 پونڈ ہوتی تھی اُسے استادہ فصلوں کو اپنے قبضے میں لینے کا حق حاصل ہے۔ یہ حادثہ اُس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ حالانکہ بین فیلڈ اُس وقت بھی کمپنی کا ایک کم حیثیت ملازم تھا جس کو کچھ سو پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی تھی لیکن اُس کے پاس مدراس کے بہترین گھوڑے اور گاڑیاں تھیں اور اُس کا دعوٰی تھا کہ نواب کی طرف اُس کی ایک بڑی رقم واجب الادا ہے۔ اُس کے مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے ایک دولت مند ریاست کی مال گزاری اور ایک زراعت پیشہ قوم کی فصلیں رہن سمجھی جاتی تھیں۔

لارڈ پیگٹ نے بین فیلڈ کے مطالبات بورڈ کے سامنے پیش کر دیے۔ بین فیلڈ دستاویزات پیش نہ کرسکا لیکن اُس نے کہا کہ نواب قرض کو تسلیم کرے گا۔ بورڈ نے اکثریت کی رائے سے فیصلہ کیا کہ افراد کے خلاف بین فیلڈ کے مطالبات ثابت نہیں ہیں اور نواب کو اس امر کا حق حاصل نہیں کہ وہ تنجور کی مال گزاری کسی کو تفویض کرسکے۔ بین فیلڈ اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوا۔ اُس کے لوگوں سے مراسم بھی تھے اور وہ وسائل بھی رکھتا تھا۔ اُس کے مطالبات ایک دفعہ پھر کونسل کے سامنے پیش ہوئے اور تسلیم کرلیے گئے۔ اراکین کی اکثریت لارڈ پیگٹ کی اس تجویز سے مطمئن نہیں تھی کہ رسل (Russel) کو تنجور کا ریزیڈنٹ مقرر کیا جائے۔ اس عہدے کے لیے کرنل اسٹورٹ (Colonel Stuart) کا انتخاب کیا گیا جس نے غالباً وعدہ کیا تھا کہ تنجور کا انتظام قرض خواہوں کے مفاد میں کیا جائے گا۔ لارڈ پیگٹ اکثریت کے فیصلے میں مزاحم ہوا اور 24 اگست 1776ء کو کرنل اسٹورٹ نے اُس کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔

"کرنل اسٹورٹ نے رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا۔ اُس کے بعد میں نے اُس کو کمپنی کے چمن گھر میں عشائیہ کے لیے مدعو کیا۔ شام کے سات اور آٹھ بجے کے درمیان میں کرنل اسٹورٹ کے ہمراہ قلعہ سے گھوڑا گاڑی کی طرف گیا۔ دونوں پلوں کے درمیانی جزیرے پر میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لیفٹنٹ کرنل

اڈنگٹن (Lietenant Colonel Edington) اڈجوٹنٹ جنرل (Adjutant General)

جنوب کی طرف سے سڑک کو کاٹتے ہوئے گھوڑے گاڑی کی طرف بھاگتے آرہے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں میں نے گھوڑوں کی راس کھینچی۔ جب اڈنگٹن گھوڑے کے سامنے آگیا تو اُس نے ننگی تلوار لہرائی اور چیخا "سپاہی"۔ اس پر سپاہیوں کا ایک دستہ درختوں کے پیچھے سے نکلا اور کیپٹن لائی ساٹ (Captain Lysaught) جس کے ہاتھوں میں پستول تھا گھوڑا گاڑی کے قریب آیا۔ اور مجھ سے کہا "آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے" ۔ ۔ ۔ اُس کے بعد کیپٹن لائی ساٹ نے مجھے مسٹر بین فیلڈ کی گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا۔"[1]

کورٹ آف ڈائریکٹرز کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ سخت پریشان ہوئے لیکن اُن میں اختلاف رائے تھا۔ اُنھوں نے لارڈ پیگٹ کی رہائی کا حکم دیا لیکن اُسی کے ساتھ اُنھوں اُس کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ انگلستان واپس آجائے۔ اس سے پہلے کہ یہ احکام ہندوستان پہنچیں لارڈ پیگٹ عزت اور بے عزتی کے حدود سے گزر چکا تھا۔ نظربندی کے دوران 1777ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ 1778ء میں سر ٹامس رمبولڈ (Sir Thomas Rumbold) مدراس کا گورنر مقرر ہوا۔

نواب کے قرض خواہ جن کی وجہ سے 1776ء کا انقلاب رونما ہوا تھا۔ اپنے مفادات کے معاملے میں چوکس تھے۔ اس سے پہلے ہم نے 1767ء کے پہلے قرض کا ذکر کیا ہے۔ 1777ء میں دوسرا قرض لیا گیا۔ نواب کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے غیر ضروری رسالے کو برطرف کردے۔ لیکن اُن کی ادائیگی کرنے کے لیے اُس کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ ٹیلر (Taylor)، میجنڈی (Majendie) اور کال (Call) نے 1,60,000 پونڈ قرض دینے پر آمادگی ظاہر کی بشرطیکہ کمپنی قرض دینے کی اجازت دے دے۔ اُنھیں اجازت دے دی گئی مال گزاری وصول کرنے کا حق انھیں دے دیا گیا۔ دو سال بعد نواب کے مینیجر نے اُس سے شکایت کی "حضور کے حکم سے اُن اضلاع کی تمام تر مال گزاری، یوروپین لوگوں کو دی جانے والی تنخواہوں کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔ مسٹر ٹیلر کے گماشتے تنخواہ وصول کرنے کے لیے وہاں موجود ہوتے ہیں اور چونکہ وہ وصول ہونے والی تمام تر مال گزاری حاصل کر لیتے ہیں حضور کی فوج کو سات یا آٹھ مہینے کی واجب الادا تنخواہ نہیں دی جاسکی ہے۔"

دو ملین پونڈ سے زیادہ رقم کا ایک تیسرا قرض بھی اسی سال یعنی 1777ء میں لیا گیا۔ جب سر ٹامس رمبولڈ مدراس پہنچا تو اُس نے غصّے کے ساتھ، جو حق بجانب تھا، اس نئے قرض کے متعلق لکھا:-

---

1- لارڈ پیگٹ، Narrative of the Revolution in the Government of Madras مورخہ 11 ستمبر 1776ء، صفحہ 11 وغیرہ۔

"یہاں پہنچ کر مجھے اُس وقت ناقابل بیان تعجب ہوا جب مجھے یہ بتایا گیا کہ چار لاکھ پگوڈا (اُس زمانے کا سکّہ) کے علاوہ اور نواب کے پُرانے قرض خواہوں کے قرضوں اور اس رقم کے علاوہ جو کمپنی کو واجب الادا ہے اُس نے تریسٹھ لاکھ پگوڈا کی بھاری رقم کا قرض اور لے لیا ہے۔ میں بڑے خوف کے عالم میں ان حالات سے آپ کو مطلع کر رہا ہوں۔ قرض خواہ زیادہ تر کمپنی کے ملازم ہیں جس کی وجہ سے کمپنی کے لیے کام کرنا مشکل اور تکلیف دہ ہو گیا ہے۔"[1]

کرناٹک کے ان تکلیف دہ حالات سے نظر ہٹا کر ٹامس رمبولڈ نے اپنی توجہ شمالی سرکاروں پر مرکوز کی جو شمال کی طرف پھیلا ہوا ساحلی علاقہ تھا۔ اور انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ یہ علاقہ زمینداروں میں بٹا ہوا تھا جو موروثی مالکان اراضی بھی تھے اور اپنی زمینداریوں کے حکمران بھی تھے۔ کمپنی کے نظم و نسق میں ان زمینداروں کے ساتھ سختی برتی گئی اور اُن کی زمینداریاں تباہ ہو گئیں اُن کی گذشتہ خوش حالی اور اُس وقت کی تباہی کی شہادت خود سر ٹامس نے پیش کی ہے۔

"ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کے دامن پر یہ داغ ہمیشہ رہے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی پالیسی یہ ہے کہ ہر باعزت ہندوستانی کو اُس کے علاقے سے نکال باہر کیا جائے۔ کوئی ایسا شخص جس نے بنگال اور سرکاروں کی خوش حالی کو موجودہ تباہی اور بربادی میں تبدیل ہوتے دیکھا ہو قوم کو بتائے، جن کا نام اور عزت اس سوال سے وابستہ ہے، کہ وہ حکمراں، سردار اور متمول مالکان اراضی کہاں گئے جو ایک زمانے میں یہاں بکثرت پائے جاتے تھے؟ ------

"کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ادھر کچھ دنوں سے جو زبان استعمال کرنا شروع کی ہے اُس سے لوگ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس ملک پر کمپنی نہ صرف حکمرانی کے حقوق حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی ہے بلکہ وہ زمین کی بلا شرکت غیرے مالک بھی ہو گئی ہے۔ طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے زمیندار یک لخت ٹھیکیداروں یا کمپنی کے اراضی کے لگان داروں اور مزدوروں میں تبدیل ہو گئے ہیں حالانکہ وہ اراضی کے حقیقی اور واحد مالک ہیں جو انھوں نے اپنے سلسلۂ اسلاف سے وراثت میں پائی ہے جس کو یورپ کے لوگ مبالغہ آمیز سمجھیں گے۔ یہ سردار مغل حملہ آوروں کو لگان نہیں بلکہ خراج دیا کرتے تھے (جو ان کے ملک کو پوری طرح کبھی محکوم نہیں بنا سکے) جو اُن کو دیرینہ خود مختاری کا فدیہ ہوا کرتا تھا جائداد پر قبضہ رکھنے اور حقوق، رواج اور عادت کو برقرار رکھنے کی یہ قیمت تھی۔ اس کی تشخیص میں ہمیشہ اعتدال سے کام لیا جاتا تھا اور خانہ داری

1۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے نام خط مورخہ 15 مارچ 1778ء

کے اُن بڑے بڑے اخراجات کا خیال رکھا جاتا تھا جو ملک کی رائے عامہ کی بنا پر اُن کے لیے ضروری ہوتے تھے جو باوقار سمجھے جاتے تھے اور نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ صوبہ (مغل اعظم کا وائسرائے) زمینداروں کی وصولیابی میں مداخلت کے بغیر اُن سے معاملات طے کر لیتا تھا۔ اگر سرکاروں کا علاقہ کمپنی کے پاس آجانے کے بعد بھی یہ طریقہ جاری رہتا تو فریقین کے لیے بہتر ہوتا' ملک ترقی کرتا اور اپنے باج گزاروں کی خوش حالی سے کمپنی بھی پھلتی پھولتی"۔[1]

یہ تجویز کیا گیا کہ ایک گشتی کمیٹی مقرر کی جائے جو مقامی تحقیقات کے بعد فیصلہ کرے کہ شمالی سرکاروں کے زمینداروں سے کتنی مال گزاری وصول کی جائے۔ سر ٹامس رمبولڈ نے اس کمیٹی کو عارضی طور سے موقوف کر دیا اور زمینداروں کو مدراس آنے کا حکم دیا۔ اس سے اُن میں ہیجانی پیدا ہو گئی لیکن اُن اُنتیس زمینداروں میں جنھیں مدراس طلب کیا گیا تھا اٹھارہ نے تعمیل حکم کی۔ پانچ سال کے لیے بندوبست کیا گیا۔[2] "جب سے سرکاروں کا علاقہ زیرنگیں آیا ہے۔ اُس وقت سے مختلف اوقات میں کیے جانے والے اضافوں کی مجموعی تعداد پرانی مال گزاری پر 50 فی صدی کے اضافے سے کچھ زیادہ ہے"۔

لیکن ڈائریکٹر اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ گشتی کمیٹی اس سے بہتر نتائج دکھا سکتی تھی۔ اُنھوں نے سر ٹامس رمبولڈ پر الزام لگایا کہ اُس نے کمیٹی کو موقوف کر کے عدول حکمی کی اور زمینداروں کو مدراس طلب کر کے اُن کے ساتھ زیادتی کی۔ اُنھوں نے اُس پر مزید الزام لگایا کہ اُس کا دامن صاف نہیں ہے اور دو سال کے اندر اُس نے 1,64,000 پونڈ یورپ بھیجے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے جنوری 1781ء میں اُسے کمپنی کی ملازمت سے برطرف کر دیا۔

مدراس کے گورنر کی حیثیت سے لارڈ مکارٹنی (Lord Macartney) کا تقرر ہوا جو نہایت شائستہ اور اعتدال پسند انسان تھا اور سیاسی تجربہ اور صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ جون 1781ء میں مدراس آیا۔ صوبے کی حالت انتہائی زبوں اور خراب ہو چکی تھی۔ ایک طویل مدت کی بد انتظامی میں میسور کے حکمراں حیدر علی کے ساتھ ایک بڑی جنگ کی صعوبتوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کے رسالے نے ملک کو

1۔ An Answer to the charges exhibited against Sir thomas Rumbold. خود نوشت' صفحات 19 اور 22۔

2۔ صفحہ 32. مثلاً پداپور کا زمیندار فصلوں کے زمانے میں 37,000 پونڈ ادا کرتا تھا لیکن سر ٹامس رمبولڈ نے مال گزاری میں اضافہ کر کے اُسے 56,000 پونڈ کر دیا۔ ایک چھوٹی سی غریب زمینداری کے علاوہ اس قسم کے اضافے تمام زمینداریوں میں کیے گئے۔

تاراج کر ڈالا تھا، مدراس کے چاروں طرف میلوں تک بربادی اور تباہی پھیلادی تھی اور کرناٹک کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگلوں کی طرف بھاگ گئے۔ کھیت بنجر ہوگئے اور گانو کے گانو جلاکر خاکستر کر دیے گئے۔ خطرات کے بعد خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ مدراس کی کونسل اس ہیبت ناک دشمن کا مقابلہ کرنے کے منصوبے بنانے میں تذبذب سے کام لے رہی تھی۔

ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس جنگ کے واقعات بیان کریں۔ وارن ہیسٹنگز نے جواب گورنر جنرل ہوگیا تھا آزمودہ سالار سر آئر کوٹ کو بھیجا تاکہ وہ ایک دفعہ پھر جنوبی ہند کا تحفظ کرے۔ سر آئر کی حیدر علی سے چار لڑائیاں ہوئیں۔ حیدر علی پیچھے ہٹ گیا مگر اُس کی طاقت ختم نہیں ہوئی۔ ستمبر 1782ء میں سر آئر کوٹ مدراس سے بنگال کے لیے روانہ ہوگیا اور دسمبر 1782ء میں حیدر علی کا انتقال ہوگیا۔ 1783ء میں اُس کے بیٹے ٹیپو سلطان کے ساتھ صلح ہوگئی۔

ان واقعات کی بنا پر اور لوگوں کی تباہی کی بنا پر بھی 1783ء میں مدراس میں خطرناک قحط پڑا جس سے ایک بڑا علاقہ متاثر ہوا۔ کمپنی کو وصول ہونے والی مال گزاری عام طور سے بچت ظاہر کیا کرتی تھی لیکن اُن کی "سرمایہ کاری" یعنی مال گزاری کے روپے سے یورپ بھیجنے کے لیے اشیا اور تجارتی مال کی خرید اس بچت کو خسارے میں تبدیل کر دیا کرتی تھی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار[1] سرکاری دستاویزات سے حاصل کیے گئے ہیں

مدراس پریزیڈنسی کے بارہ سال کے آمد و خرچ کا نقشہ

سال	مجموعی خالص آمدنی	کمپنی کا ادا کیا ہوا سول اور فوجی مجموعی خرچ	بچت	خسارہ
مئی ۔۔ اپریل	پونڈ	پونڈ	پونڈ	پونڈ
1767ء ۔۔ 1768ء	3,81,330	4,89,012	- - - -	1,07,682
1768ء ۔۔ 1769ء	3,69,720	6,91,471	-- - -	3,21,751
1769ء ۔۔ 1770ء	5,00,110	4,67,492	36,618	- - - - -
1770ء ۔۔ 1771ء	5,62,359	4,34,393	1,27,960	- - - - -

1۔ خفیہ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1782ء، صفحات 672 اور 674۔

1771ء سے 1772ء	5,58,860	4,07,446	1,51,414	-----
1772ء سے 1773ء	5,29,233	3,09,138	2,20,095	----
1773ء سے 1774ء	5,24,762	4,07,144	1,17,618	----
1774ء سے 1775ء	5,03,629	4,54,589	49,040	----
1775ء سے 1776ء	5,14,591	3,45,867	1,68,724	----
1776ء سے 1777ء	5,63,349	5,33,182	30,167	----
1777ء سے 1778ء	2,83,198	4,85,830	----	2,02,632
1778ء سے 1779ء	4,94,208	8,03,924	----	3,09,716
کل میزان	57,85,349	58,29,488	8,97,642	9,41,[illegible]81

بچت ہو یا خسارہ "سرمایہ کاری" جاری رہتی تھی۔ اس زمانے میں یورپ بھیجے جانے والے مال کی اصلی قیمت یا قیمت خرید دو ملین پونڈ ہوتی تھی۔

لیکن کمپنی کی جبری وصولی سے دس گنا زیادہ وصولی وہ انگریز قرض خواہ کیا کرتے تھے جن کو مال گزاری وصول کرنے کا حق تفویض کر دیا گیا تھا۔ قطعی فیصلے کے لیے یہ معاملہ ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا گیا مگر ایوان میں قرض خواہوں کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ تمام قیاسی مطالبے چاہے وہ جائز تھے یا ناجائز بغیر کسی تحقیقات کے تسلیم کر لیے گئے۔

پال بین فیلڈ نے جو سب سے بڑا اور کامیاب ترین قرض خواہ تھا ہندوستان سے حاصل کی ہوئی مجموعی دولت استعمال کر کے انگلستان کے پارلیمانی حلقوں میں اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ اُس نے بشمول خود پارلیمنٹ کے آٹھ اراکین منتخب کرائے۔ وہ اتنا با اثر اور طاقت ور انسان تھا کہ وزارت اُس کی ناراضگی کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی۔" ارکاٹ کے نواب کے جائز یا ناجائز آدردوں اور قرض خواہوں نے وسیع پارلیمانی مفاد سے اتنا ناجائز فائدہ اُٹھایا کہ ۔ ۔ ۔ 1784ء کی وزارت نے فیصلہ کیا کہ اُن کے مطالبات غلط ہوں یا صحیح مگر سب کی ادائگی ہونی چاہیے۔"[1]

1۔ مل کی 'History of India' جلد 6' باب 1۔

برطانوی ہند کے مورخ نے جس کی کتاب سے مندرجہ بالا اقتباس لیا گیا ہے آگے چل کر اڈمنڈ برک کی اُس یادگار تقریر[1] کا اقتباس دیا ہے جس میں اُس نے برطانیہ کی پارلیمانی تاریخ کے اس بدترین واقعہ کی مذمت کی تھی۔

"پال بین فیلڈ ایک عظیم پارلیمانی مُصلح ہے۔ اُس نے سلطنت کے کس حصے کس شہر کس ضلع کس تحصیل میں کام نہیں کیا ہے اور سلطنت کی کس کرسی عدالت کو زینت نہیں بخشی ہے۔ آئندہ ہونے والی اصلاحات کے لیے ایک منظم جماعت تیار کرنے کے سلسلے میں اس عوام دوست سود خور نے ہندوستان کو سہولت پہنچانے کے کارِ خیر کے ساتھ اپنے وطن کے فرسودہ آئین کو بھی یاد رکھا۔ اپنے وطن کی خاطر اُس نے اس ایوان کو آراستہ کرنے کے پیشے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس کام کے لیے اُس نے پُرانا مُشجّر استعمال نہیں کیا جس کا رنگ اُڑ چکا ہو اور جو دوسرے ایوانوں کو آراستہ یا بدنام کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو بلکہ جدید اخلاق کے زندہ نمونوں سے اُسے سجا دیا پال بین فیلڈ نے بشمول خود پچھلی پارلیمنٹ کے آٹھ اراکین منتخب کرائے۔ موجودہ پارلیمنٹ کی رگوں میں اُس نے نہ جانے کتنا پاک وصاف خون دوڑایا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"آپ کے وزیر کے لیے یہ ناکارہ پُرانا کھلاڑی (بین فیلڈ کا ایجنٹ) لندن کے مقابلے کے گرد آلود میدان میں داخل ہونے کو تیار ہو گیا۔ شاید آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ اس کارِ خیر کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا کہ ایک قسم کا عوامی دفتر یا محاسب خانہ کھولا جائے جہاں گذشتہ عام انتخابات کا سارا کام ہو۔ یہ کام بین فیلڈ کے ایجنٹ اور وکیل کے سپرد تھا۔ یہ کام ہندوستانی اصولوں کے تحت اور ایک ہندوستانی مفاد کے تحفظ کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ نفرت و ملامت کا سنہرا ساغر تھا۔ ۔ ۔ ۔ جو بہت سے لوگوں نے اور ملک کے طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے بہت سے اشخاص نے قطرہ قطرہ پی لیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس بے اعتدالی کا نتیجہ نہیں بھگتنا ہوگا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کھلی ہوئی شراب نوشی اور قومی بدکاری کی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا؟ یہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ انتخابات کے مہتمم کے مالک کا نقصان پورا کرنا ہوگا۔ چنانچہ بین فیلڈ اور اُس کے ہم نواؤں کے مطالبات کو ہر تحقیقات پر ترجیح دینی ہوگی۔"

یہ سنہرا ساغر تو انگلستان کے لوگوں اور طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے اشخاص نے پیا

---

1 ارکاٹ کے نواب کے متعلق ہونے والی بحث میں برک کی تقریر۔

اور اُس کی قیمت کا مطالبہ ہندوستان سے کیا گیا۔ چونکہ ادائیگی کرناٹک کے کسانوں کو کرنی تھی اس لیے بین فیلڈ کے مطالبات کی تفتیش نہیں کی گئی۔ بغیر تحقیقات کے ان مطالبوں کو تسلیم کرنے کی وجہ سے حالات زیادہ خراب ہو گئے۔ بہت سے برطانوی سود خور کرناٹک آ گئے۔ تاکہ اسی طرح وہ بھی جلد دولت کما لیں۔ نواب کے خلاف 2,03,90,570 پونڈ کے نئے مطالبے پیش کیے گئے اور ان مطالبوں کا فیصلہ کرنے کے لیے کمشنروں کی تقرری عمل میں آئی۔ اس دوران لارڈ ویلزلی نے کرناٹک پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ برطانوی علاقہ بن چکا تھا۔ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لیے جاتے تو نواب کے بجائے کمپنی کو رقم ادا کرنی ہوتی۔ اس لیے تحقیقات کی گئی۔ تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف 13,46,796 پونڈ کی رقم تسلیم کی گئی بقیہ قرض جس کی مجموعی رقم اُنیس ملین پونڈ تھی ناجائز اور نامناسب قرار دیا گیا۔

باب 7

مدراس کے پرانے اور نئے مقبوضہ علاقے (1785ء تا 1807ء)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ پٹ کا انڈیا بل 1784ء میں قانون بن گیا۔ اُس وقت تک مدراس کے صوبے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقبوضہ علاقہ شہر مدراس کے نواح اور ساحل کے ساتھ ساتھ ایک لمبی پٹی تک محدود تھا۔ جس کو شمالی سرکاریں کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مدراس کے ابتدائی بندوبست انہی سرکاروں یا ریاستوں میں کیے گئے۔

1765ء میں جب کلائیو نے کمپنی کے لیے بنگال کی دیوانی حاصل کی تو اُس نے مغل شہنشاہ سے ان چار ریاستوں کی معافی بھی حاصل کرلی۔ جن میں سیکاکول، راجہ مندری، ایلور اور کنڈاپلی کی ریاستیں شامل تھیں۔ کچھ دن تو وہاں کا انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا اُس کے بعد 1769ء میں اس پر صوبائی سربراہوں اور کونسلوں کو اختیار حاصل ہوگیا اور اُس کے انتظام کا طریقہ بنگال کے اضلاع کے مماثل ہوگیا۔

1775ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ہدایت جاری کی کہ ایک گشتی کمیٹی مقرر کی جائے، جو شمالی سرکاروں کی ریاستوں کے متعلق تحقیقات کرے تاکہ اُن کی آبادی، پیداوار اور صنعتوں کی حالت کے تعلق سے معلومات حاصل کی جاسکیں۔ اس کے علاوہ ریاستوں کی مجموعی مال گزاری اور زمینداروں اور کاشت کاروں کے رواجی حقوق کی بھی تفتیش کی جاسکے[1] کورٹ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ایک طرف تو زمینداروں کی سالانہ آمدنی متاثر نہ ہو اور دوسری طرف کاشت کاروں کو

1۔ خفیہ کمیٹی کی دوسری رپورٹ 1782ء ضمیمہ 5۔

ناجائز وصولیابی سے محفوظ رکھا جائے۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ سرکاروں میں اُن ضابطوں کو نافذ کیا جاسکتا تھا یا نہیں جن کا نفاذ بنگال میں ہوچکا تھا چنانچہ ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا لیکن جیسا کہ پچھلے باب میں کہا جا چکا ہے سر تامس رمبولڈ نے 1778ء میں اُسے موقوف کردیا۔ 1783ء میں اُس کی تجدید عمل میں آئی اور 1788ء تک وہ تحقیقات کا کام کرتی رہی۔

اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی اُس سے ظاہر ہوا کہ شمالی سرکاروں میں اراضی زیادہ تر زمینداروں کے قبضے میں تھی۔ پہاڑی علاقے کے زمیندار، جو اڑیسہ کی سلطنت کے راجوں کی اولاد تھے، اپنی ریاستوں کے قریب قریب آزاد حکمران تھے اور مسلمانوں کی حکومت کو صرف مقررہ خراج ادا کیا کرتے تھے۔ میدانی علاقے کے زمینداروں پر حکومت کو نسبتاً زیادہ اختیار حاصل تھا۔ لیکن انھیں بھی اس امر کی اجازت تھی کہ جب تک وہ حکومت کو مقررہ مال گزاری ادا کرتے رہیں اپنی زمینداریوں کا لگان اپنے استعمال میں لاسکتے تھے۔

ان زمینداریوں کے علاوہ کچھ زمین حکومت کے صرف خاص کے لیے وقف تھی جو حویلی کی زمین کہلاتی تھی۔ یہ ایسے علاقے تھے جو بڑے شہروں کے نواح میں واقع تھے اور مسلمان حکمرانوں کی چھاؤنیوں اور سول عملے کو رسد مہیا کرتے تھے۔ "برطانوی حکومت قایم ہونے کے بعد اُن کے لیے حویلی کی زمینوں کے لیے بجا طور سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ زمین کے ایسے قطعے ہیں جو زمینداروں کے بجائے حکومت کے ہاتھ میں تھے اور اُن میں حکومت کو حق حاصل ہے کہ کسانوں کو مال گزاری وصول کرنے کا جو طریقہ مناسب سمجھے وہ رائج کرے۔" جس طریقے پر واقعی عمل کیا گیا وہ سمجھداری پر مبنی نہیں تھا۔ حویلی کی زمین ایجنٹوں یا بڑے بڑے سٹے بازوں کو ٹھیکے پر دے دی گئیں اور اس طرح اُنھیں "لوگوں پر انتہائی مظالم کرنے کے مواقع"[1] فراہم کردیے گئے۔

زمینداری کے علاقوں اور حویلی کے علاقوں میں پُرانے وقتوں سے گانو پنچایت کا طریقہ رائج تھا۔ یہ گانو کی حکومت خود اختیاری کا ایک سیدھا سادہ طریقہ تھا جو زمینداروں اور حکومت کے مظالم سے کسانوں کو محفوظ رکھتا تھا۔ یہ قدیم ادارہ۔ جو منو کے زمانے میں بھی قدیم تھا ــــ خاندانوں کی تباہی اور حکومتوں کے زوال کے باوجود برقرار رہا تھا، جنگ کے دوران بھی گانوں میں امن و امان برقرار رکھتا تھا اور اٹھارویں صدی میں کمپنی کے ملازموں کو ایک عجیب وغریب اور نفیس ادارہ معلوم ہوا تھا۔

1۔ پانچویں رپورٹ 1812ء، صفحہ 83۔

"جغرافیائی اعتبار سے ایک گانو چند سو یا چند ہزار ایکڑ قابل زراعت یا بنجر اراضی کا ایک قطعہ ہوتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے یہ ایک بلدیہ یا شہر کے مماثل ہوتا ہے۔ اس کے حکام اور ملازمین کا عملہ مندرجہ ذیل پر مشتمل ہوتا ہے۔ پٹیل یا آبادی کا سربراہ جو گانو کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔ لوگوں کے جھگڑے چکاتا ہے، انتظام پر نظر رکھتا ہے اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے اپنے گانو کی مال گزاری وصول کرتا ہے۔ اپنے ذاتی اثر، حالات کے متعلق تفصیلی واقفیت اور لوگوں سے دلچسپی کی بنا پر وہ اس فرض کی ادائگی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ کرنم جو کاشت کا حساب رکھتا ہے اور خسرہ تیار کرتا ہے۔ ان کے علاوہ ٹالیار اور ٹوٹی بھی ہوتے ہیں۔ ٹالیار کے فرائض اور دائرہ عمل وسیع ہوتا ہے۔ وہ جرائم کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے اور ایک گانو سے دوسرے گانو جانے والے مسافروں کا تحفظ کرتا ہے اور انھیں حفاظت سے اُن کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ ٹوٹی کا دائرہ عمل گانو تک محدود ہوتا ہے۔ من جملہ دیگر فرائض اس کو فصلوں کی نگہداشت اور اُن کی پڑتال میں مدد دینے کے فرائض بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ سرحد کا نگران جو گانو کی سرحدوں کو بحال رکھتا ہے اور نزاع کی صورت میں اُن کے متعلق شہادت دیتا ہے۔ تالابوں اور نالیوں کا نگراں آب پاشی کے لیے پانی تقسیم کرتا ہے۔ برہمن گانو کے مذہبی رسوم ادا کرتا ہے۔ مدرّس گانو کے بچّوں کو زمین پر لکھنا اور پڑھنا سکھایا کرتا ہے۔ جوتشی فصل بونے اور کاٹنے کے لیے شبھ گھڑی کا اعلان کیا کرتا ہے۔ لوہار اور بڑھئی زراعت کے اوزار اور کسانوں کے گھر بناتے ہیں۔ کمہار، دھوبی اور نائی اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ گلّے بان جانوروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ گانو میں ایک دیدبھی ہوتا ہے۔ پُتر یا خوشی کے موقعوں پر حاضری دیتی ہے۔ گایک اور شاعر بھی ہوتے ہیں۔ گانو کا عملہ ان حکام اور ملازمین پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن ملک کے کچھ حصّوں میں عملے میں اتنے زیادہ لوگ نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی ایک ہی شخص کو کئی فرائض اور کئی کام انجام دینے ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ گانو کا یہ عملہ مندرجہ بالا افراد سے کہیں زیادہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

"اس ملک کے لوگ مدتوں سے اس قسم کی سیدھی سادھی شہری حکومت کے عادی رہے ہیں۔ گانو کی سرحد شاید ہی کبھی بدلتی ہو۔ حالانکہ کبھی کبھی گانوؤں کو خود نقصان اُٹھانا پڑا ہے بلکہ جنگلوں، قحطوں اور وباؤں نے انھیں ویران بھی کر دیا ہے۔ لیکن گانو کا نام، اُس کا رقبہ، اُس کے مفادات بلکہ اس کے خاندان بھی مدتوں برقرار رہے ہیں۔ وہاں کے لوگ سلطنت کے ٹکڑے ہونے اور تقسیم ہونے کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ جب تک گانو کی سالمیت برقرار رہتی ہے انھیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کس حکومت کو منتقل کر دیا گیا ہے یا کس حکمران کے حصّے میں آیا ہے۔ اس کی

داخلی معیشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پٹیل اُن کا سربراہ رہتا ہے اور گانو کے جج مجسٹریٹ اور مال گزاری یا لگان وصول کنندہ کے فرائض ادا کرتا رہتا ہے۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے زمانہ قدیم کی پُراسرار ہندو حکومتوں کے دور کے بجائے اٹھارویں صدی کے ہندوستانی گانوؤں کی حکومت خود اختیاری کے دستور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کا حال منو کی طرح کی پُرانی کی کتابوں سے نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے اپنے مشاہدے اور تحقیق کی بنا پر سرکاری دستاویزات میں درج کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عظیم زراعت پیشہ لوگ کس طرح ہزاروں سال تک اپنی چھوٹی چھوٹی جمہوریوں میں کاشت کرتے رہے اور ضرورت کی اشیا بناتے رہے جبکہ حکمرانوں کے خاندان بدلتے رہے اور سلطنتوں کا عروج و زوال ہوتا رہا۔ یہ اچھا ہوتا اگر ہندوستان کے برطانوی حکام اُن قدیم اداروں کی اصلاح کرتے، انھیں فروغ دیتے اور برقرار رکھتے اور اس طرح لوگوں کی تنظیموں کے ذریعے حکومت کرتے۔ انگریزی راج کی ابتدا سے دو اسباب کی بنا پر گانو کی قدیم پنچائتیں کمزور ہونے لگی تھیں۔ مال گزاری میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی شدید خواہش نے حکام کو اس پر آمادہ کر دیا کہ کسانوں سے انفرادی طور پر شرائط طے کیے جائیں۔[2] اُن کی دوسری نامناسب خواہش یہ تھی کہ عدلیہ اور انتظامیہ میں مرکزیت پیدا کی جائے اور انھیں اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے جس کی بنا پر جدید حکمرانوں نے گانوؤں کے اُن کرمچاریوں کو برطرف کر دیا جنھیں اُس وقت تک اپنے اپنے گانو کی حد تک اختیارات حاصل رہے تھے۔ سرگرمیوں کی موقوفی کے بعد گانو میں پنچائتوں کا تیزی کے ساتھ زوال ہونے لگا۔ اس زمانے کا ہندوستانی نظم و نسق حالانکہ کئی اعتبار سے پچھلے زمانے کی حکومتوں سے زیادہ منظم ہے پھر بھی اس میں یہ ستم ہے کہ مطلق العنانیت کو زیادہ دخل ہے اور لوگوں کے تعاون پر اس کا انحصار بہت کم ہے۔

ہمیں پھر سے شمالی سرکاروں کی زمینوں کے انتظام کے بیان کی طرف واپس آنا چاہیے۔ 1778ء تک زمینداروں کے ساتھ ان کا بندوبست سال بہ سال ہوتا تھا لیکن جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے 1778ء میں سر ٹامس رمبولڈ نے پانچ سال کے لیے بندوبست کیا۔ 1783ء میں سال بہ

1۔ پانچویں رپورٹ 1812ء، صفحہ 85

2۔ اگلے باب میں اُس دلچسپ بحث کا حوالہ دیا گیا ہے جو گاؤں پنچایت کے طریقے کو جاری رکھنے کے سلسلے میں سر ٹامس منرو اور بورڈ آف ریونیو کے درمیان ہوئی تھی۔

سال بندوبست کا ظالمانہ طریقہ پھر شروع کر دیا گیا جو 1786ء تک جاری رہا۔ بورڈ آف ریونیو نے اضافہ شدہ مطالبہ مال گزاری کے ساتھ 1786ء میں تین سال کے لیے بندوبست کیا۔ 1789ء میں تین سال کے لیے بندوبست کیا گیا مگر بعد میں اُس کی مدت بڑھا کر پانچ سال کر دی گئی۔ اس بندوبست میں زمینداروں کی مجموعی یافت کی دو تہائی مال گزاری تشخیص کی گئی۔ نئی سرکار یا گنتور کی ریاست کا بندوبست بھی انہی شرائط پر کیا گیا۔ یہ ریاست 1788ء میں کمپنی کے قبضے میں آئی تھی۔

لارڈ ہوبرٹ (Lord Hobart) نے جو 1794ء میں مدراس کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ ایک اہم اصلاح کی۔ اُس نے کمپنی کے سرداروں اور کونسلوں کو موقوف کر دیا اور ضلعوں میں کلکٹر مقرر کر دیے جو بورڈ آف ریونیو کی نگرانی میں مال گزاری کا انتظام کرتے تھے۔ زمینداری کی زمینوں کا بندوبست پرانے اصولوں کے مطابق ہوتا رہا۔ لارڈ ہوبرٹ کی جگہ لارڈ کلایو مقرر کیا گیا جو پلاسی کی جنگ کے فاتح کا بیٹا تھا۔ لارڈ کلایو کے زمانے میں مال گزاری کا بندوبست استمراری، جو 1793ء میں بنگال میں کیا جا چکا تھا، 1802ء اور 1805ء کی درمیانی مدت میں شمالی سرکاروں میں بھی کیا گیا۔ مال گزاری کے مطالبے کے تعین میں کسانوں سے وصول ہونے والی مجموعی رقم کے دو تہائی کے اصول پر عمل کیا گیا تھا۔[1]

شمالی سرکاروں کی حویلی کی زمینوں کی تاریخ قدرے مختلف ہے۔ 1787ء میں پہلی بار کلکٹر مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے حویلی کی زمینوں سے مال گزاری وصول کرنے کے دو طریقے اختیار کیے۔ کچھ مقامات پر تو انھوں نے براہ راست کسانوں سے جنس کی صورت میں مال گزاری وصول کی یعنی اُن کی پیداوار کا ایک حصہ سرکاری مال گزاری کے طور پر اُن سے حاصل کر لیا گیا۔ کہیں کہیں انھوں نے مقررہ رقم کے عوض زمین ٹھیکے پر دے دی۔ عام طور سے کلکٹر گانو کے سربراہ یا مکھیا کے ساتھ تصفیہ کر لیتے تھے اور مکھیا تمام کسانوں کے ساتھ علاحدہ علاحدہ چکوتا کرتا تھا۔[2] 1794ء میں جب کمپنی کے سردار اور کونسلیں موقوف کر دی گئیں اور بورڈ آف ریونیو کی نگرانی میں کلکٹروں پر بندوبست کی ذمہ داری عائد کر دی گئی اور 1802ء اور 1804ء کی درمیانی مدت میں جب زمینداری کی زمینوں کا استمراری بندوبست ہو گیا تو حویلی کی زمینوں کو ایسے مناسب چکوں میں بانٹ دیا گیا جن کی سالانہ مال گزاری ایک ہزار سے پانچ ہزار پگوڈا تک ہو اور انھیں دائمی زمینداریوں کی صورت میں نیلام کر دیا گیا۔[3] اسی زمانے میں مدراس

1۔ پانچویں رپورٹ 1812ء صفحہ 114

2۔ پانچویں رپورٹ 1812ء صفحہ 93 اور 98

3۔ ایضاً، صفحہ 113

کے اطراف کی جاگیری زمینوں کا بھی دائمی بندوبست کر دیا گیا۔

مدراس میں کمپنی کے پُرانے مقبوضات یعنی مدراس کے اطراف کے علاقوں اور شمالی سرکاروں میں 1765ء اور 1805ء کی درمیانی مدّت میں ہونے والے اراضی کے بندوبست کی تاریخ یہ ہے۔ لیکن اس دوران کچھ اور علاقے کمپنی کے قبضے میں آچکے تھے۔ اب ہمیں ان نئے علاقوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

ٹیپو سلطان کے ساتھ لارڈ کارنوالس کی جنگ 1792ء کی صُلح نامہ سرنگا پٹم کے ساتھ ختم ہوگئی اور انگریزوں کو سےلم اور کرشناگیری کے اضلاع حاصل ہوگئے۔ جن پر بارہ محل مشتمل تھا۔ 1799ء میں لارڈ ویلزلی کی ٹیپو سلطان سے آخری جنگ ہوئی اور کنارا، کوئیمبٹور بالاگھاٹ اور دوسرے علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ 1799ء میں لارڈ ویلزلی نے تنجور پر قبضہ کرلیا اور 1800ء میں کرشنا اور تنگبھدرا کے درمیان کا سب علاقہ دکن کے نظام سے حاصل کرلیا۔ لارڈ ویلزلی نے ارکاٹ کے نواب کا وظیفہ مقرر کر دیا اور کرناٹک کا تمام علاقہ کمپنی کے ہاتھ میں آگیا۔ اس طرح 1792ء اور 1802ء کی درمیانی دس سالہ مدّت میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اُس بڑے علاقے کا زرخیز ترین حصّہ اپنے قبضے میں کرلیا جو اب صوبہ مدراس کہلاتا ہے۔ اس نئے علاقے پر قبضہ ہونے کے ساتھ بندوبست کا ایک نیا طریقہ وجود میں آیا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1792ء میں بارہ محل کے اضلاع پر قبضہ کیا تو لارڈ کارنوالس نے اُن کا انتظام کیپٹن ریڈ (Captain Read) اور تین دوسرے فوجی افسروں کے سپرد کر دیا جو اُس زمانے کے سول افسروں کے مقابلے میں وہاں کے لوگوں کی زبانوں سے اور رسوم سے زیادہ واقف تھے۔ کیپٹن ریڈ نے جس اصول کی بنا پر انفرادی کسانوں سے بندوبست کیا تھا وہ وہی اصول تھا جس کو اُس کے نائب ٹامس منرو نے کچھ مدّت بعد ترقی دی اور صوبے کے دوسرے حصّوں میں بندوبست کی بنیاد بنایا۔ ٹامس منرو بعد میں مدراس کے گورنر سر ٹامس منرو کے نام سے مشہور ہوا۔ جس طرح بنگال کے زمینداری بندوبست سے لارڈ کارنوالس کا نام منسلک ہے اُسی طرح مدراس کے رعیت داری بندوبست سے سر ٹامس منرو کا نام منسلک ہے۔

ٹامس منرو 1780ء میں جب مدراس پہنچا تو وہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ اُس نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف جنگوں میں حصّہ لیا۔ کچھ مدّت بعد اُس نے مرہٹوں کی جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور پارلیمنٹ نے اُس کی جرأت، قابلیت اور کامیابی کی تعریف کی۔ لیکن ہندوستان میں منرو کو ایک کامیاب سپاہی کی حیثیت سے یاد نہیں کیا جاتا ہے۔ وہ کمپنی کے اُن تھوڑے سے

ملازموں میں سے تھا جنھوں نے لوگوں کی خوش حالی میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ چنانچہ جس طرح کارنواس کو آج تک بنگال میں یاد کیا جاتا ہے اور الفنسٹن کو بمبئی میں یاد کیا جاتا ہے' اُس کو مدراس کے لوگ جذبہ احسان مندی کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

کیپٹن ریڈ کی ماتحتی میں اُس نے بارہ محل کے اضلاع میں بندوبست کا کام کیا۔ اُس نے کمپنی کے انتظامی طریقوں کی خرابیوں کو سمجھ لیا اور اُس کی ہمدردانہ بصیرت نے اُن کا علاج تجویز کردیا۔

کرناٹک کے متعلق اُس نے لکھا تھا "نواب کی مال گزاری کا بڑا حصہ تین فی صدی اور چار فی صدی ماہانہ کی شرح سے مدراس کے ایجنٹ اُس کو بھیجتے ہیں۔ کرناٹک کے کچھ حصّوں میں لگان کا تعین بوئے جانے والے غلّے کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ مختلف غلّوں پر مختلف لگان لگایا جاتا ہے دوسری جگہوں پر لگان جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن ہر حال میں پٹا سال بہ سال کیا جاتا ہے۔ جہاں لگان فصلوں کی مناسبت سے لگایا جاتا ہے وہاں ہر سال زمین کی پرتال ہوتی ہے پیمائش کرنے والوں کی رپورٹوں کا دارومدار اُس رشوت پر ہوتا ہے جو اُنھیں دی جاتی ہے اور اس طرح کسانوں اور حکومت دونوں کو ہزاروں دھوکے دیے جاتے ہیں۔ جہاں لگان جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔ وہاں یا تو زمین کی پیداوار کسان کے سر تھوپی جاتی ہے اور اُس کی قیمت حقیقی قیمت سے زیادہ وصول کی جاتی ہے یا منڈی کا ایک بھاؤ مقرر کردیا جاتا ہے۔ اور جب تک سرکاری غلّہ فروخت نہ ہوجائے کسی کو اُس سے کم قیمت پر فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ناقص انتظام جلد ملک کو تباہ کردے گا۔"

اسی طرح اُس نے برطانوی علاقے کے متعلق لکھا تھا "کچھ دن پہلے ریونیو بورڈ نے کلکٹروں کی تنخواہوں میں اضافے کی درخواست کی تھی لیکن حکومت نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اُن کی درخواست مسترد کردی۔ حکومت کا یہ فعل حقیقی پالیسی اور انسانی فطرت دونوں سے عدم واقفیت ظاہر کرتا ہے۔ اگر لوگوں کو ایسے حالات میں رکھ دیا جائے کہ وہ اپنی مقررہ یافت کی بنا پر فارغ البالی کی زندگی نہ گزار سکیں لیکن وہ دوسروں کو لوٹ کر فارغ البال ہوسکیں اور اس راز کے کھلنے کا بھی خطرہ نہ ہو' تو اُن لوگوں کی تعداد جو اس سلسلے میں پس وپیش کریں کہ اُنھیں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیے اتنی کم ہوگی کہ وہ آسانی سے نظر انداز کی جاسکتی ہے۔ یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ کلکٹر جو اپنی تنخواہوں سے زیادہ خرچ کرتے ہیں کچھ مدت میں بھاری دولت بھی جمع کرلیتے ہیں۔ اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ جہاں لگان رقم کی صورت میں وصول ہوتا ہے وہاں وہ لوگ حکومت کو کسی

فرد لگان پیش کرتے ہیں جس میں کم لگان درج ہوتا ہے۔ جہاں لگان جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے وہاں وہ یا تو زمین کی پیداوار کم دکھاتے ہیں یا اُس کی قیمت فروخت۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کلکٹر چونکہ تعلیم یافتہ اور نیک سیرت ہوتے ہیں اس لیے وہ ایسی رکیک حرکتیں نہیں کر سکتے ہیں۔ واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔"[1]

1798ء تک بارہ محل اضلاع کے نئے مقبوضات میں رعیت داری بندوبست ختم ہو گیا تھا۔ "بارہ محل کی پیمائش مکمل ہو گئی ہے اور لگان کا تعین ہو چکا ہے - - - - چونکہ بارہ محل میں کسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے مال گزاری کے انتظام میں تفصیلات لازمی ہو گئی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ صرف توجہ کی ضرورت ہے۔ جہاں جہاں توجہ سے کام لیا گیا ہے وہاں یہ بات ملک اور کلکٹروں دونوں کے لیے آسان ہو گئی ہے کہ دس یا بارہ زمینداروں یا مالکان اراضی کی وساطت کے بجائے ساٹھ ہزار کسانوں سے براہ راست لگان وصول کیا جائے۔ ملک کے اُس حصّے کا لگان جو میری نگرانی میں تھا پچھلے سال 1,65,000 پگوڈا تھا۔ یہ لگان بیس ہزار کسانوں سے سال کے اندر وصول کر لیا گیا۔ نہ اس میں کوئی دشواری ہوئی نہ کچھ باقی رہا۔"[2]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ان علاقوں کے لیے جہاں موروثی زمیندار نہیں تھے۔ ٹامس منرو رعیت داری طریقے کو ترجیح دینے لگا تھا۔ بنگال شمالی سرکاروں کی طرح کے علاقوں میں جہاں زمین بڑے مالکان اراضی کے قبضوں میں تھیں حکومت نے اُس طریقے کو بحال رکھا تھا اور زمینداروں کے ساتھ بندوبست کر لیا تھا۔ دوسرے علاقوں میں جہاں یہ طریقہ رائج تھا کہ کسان براہ راست ریاست کو مال گزاری ادا کرتے تھے منرو نے اُس طریقے کو بحال رکھا اور براہ راست کسانوں کے ساتھ بندوبست کیا۔ لوگوں کی خوش حالی اور زراعت کی ترقی کے لیے یہ ضروری تھا کہ دونوں حالتوں میں حکومت کے مطالبے کو کسی نہ کسی حد تک دائمی قرار دیا جائے۔ لارڈ کارنوالس نے بنگال کی حد تک اُس کو دائمی قرار دے دیا۔ مدراس کے لیے ٹامس منرو بھی اس کو دائمی قرار دینا چاہتا تھا اور اُس نے اُس کی سفارش بھی کی لیکن اس میں اُسے کامیابی نہیں ہو سکی۔ جنوبی ہند کی اراضی کے بندوبست میں یہ خطرناک سقم باقی رہا۔

1۔ مراسلہ مورخہ 31 جنوری 1795ء

2۔ مراسلہ مورخہ 21 ستمبر 1798ء

بارہ محل سے منرو کا تبادلہ کنارا ہو گیا۔ وہاں اُس نے ایک سال کی مدت میں حسبِ معمول قابلیت اور کامیابی کے ساتھ بندوبست کا کام ختم کر دیا۔ بندوبست زمینداروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اُس نے 1800ء میں لکھا تھا "چونکہ میرے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ میں ملک کی حقیقی مال گزاری کی تحقیقات کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اس لیے میں یہاں آیا تھا۔ اگر میں اس کام کو انجام دینے سے انکار کرتا تو میرے متعلق سمجھا جاتا کہ میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ اب جب کہ میں یہ کام کر چکا ہوں اور سوائے اُن حالتوں کے جب حملوں کی بنا پر وصولی میں خلل پڑا' مال گزاری اُسی طرح باقاعدگی سے وصول ہو رہی ہے جس طرح بارہ محل میں ہوتی ہے' بلکہ یہاں کی وصولی اُس سے بھی بہتر ہے' اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام ختم ہو گیا۔"[1]

"میں نے بندوبست مالکان اراضی سے کیا اور جہاں کوئی مالک اراضی نہیں تھا وہاں اُس شخص سے کیا جس کا زمین پر قبضہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ پیداوار کے حسابات دونوں فریقوں کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اس لیے پیداوار کا صحیح تعین ممکن ہو سکا۔ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جس میں سرکار کا حصہ ایک تہائی سے زیادہ رکھا گیا ہو۔ بہت سی صورتوں میں تو وہ مجموعی پیداوار کا $\frac{1}{5}$ یا $\frac{1}{6}$ بھی نہیں تھا بلکہ کچھ صورتوں میں $\frac{1}{10}$ سے بھی کم تھا۔"[2]

جب نظام نے 1800ء میں کرشنا اور تمبھدرا کے درمیان کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا تو وہاں کے بندوبست کے لیے ٹامس منرو کا انتخاب کیا گیا جو بارہ محل اور کنارا میں بندوبست کر چکا تھا۔ چنانچہ ٹامس منرو کے سول انتظام کا تیسرا میدان وہ ضلعے تھے جو کمپنی کے حوالے کیے گئے اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ منرو نے اس نئے میدان میں بھی اپنی خدا داد قابلیت اور واقفیت کی بنا پر اپنا فرض پورا کیا۔ حکام مال کے بڑھتے ہوئے مطالبے اُس کی راہ میں حائل ہوئے اور وہ لوگوں کے ساتھ اتنی نرمی کا برتاؤ نہیں کر سکا جتنا کہ اُس کی انصاف پسندی کا تقاضہ تھا۔ اُس نے اتنی صفائی کے ساتھ اس کو تسلیم کیا ہے کہ اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے "اگر مجھے یقین ہوتا کہ ایک بورڈ آف ریونیو کے بعد دوسرا بورڈ اور حکومت شرح میں رفتہ رفتہ اضافے کی حمایت کرے گی' جس کی سفارش کی گئی ہے' تو بلاشبہ میں اس پر قائم رہتا۔ لیکن قرائن سے

1۔ مراسلہ مورخہ 13 جولائی 1800ء

2۔ مراسلہ مورخہ 8 اکتوبر 1800ء

معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ حکام کی یہ خواہش کہ ملک کی یا کم از کم سرکار کی آمدنی اُن کے زمانے میں فروغ پاتی رہے مجھے اس پر مجبور کر دے گی کہ میں تیزی کے ساتھ قدم بڑھاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے کہ عمر کے ساتھ میرے اعصاب کمزور ہوتے جائیں اور میں مذمت و ملامت سے ڈرنے لگوں۔ اگر میں اپنے بعد آنے والے کو اس کا موقع دوں کہ وہ مال گزاری میں اضافہ کر سکے تو یہ کہا جائے گا کہ میں نے لوگوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ حکومت کو دھوکہ دے سکیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی میرا یہ ارادہ نہیں کہ حالات کو شدت پکڑنے دوں حالانکہ روپے کی سرکاری ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے میں کسانوں پر ضرورت سے زیادہ سختی بھی کروں گا۔"[1]

منرو نے جس وقت یہ لکھا تھا اُس وقت اُس کے ذہن میں اُس کے دوست گ۔۔۔۔ کا انجام تھا جس کو ملازمت سے اس بنا پر علاحدہ کیا جانے والا تھا کہ کرناٹک میں مال گزاری کی جو تشخیص کی تھی اُس کو بورڈ بہت کم سمجھتا تھا۔ اپنے حکام مال پر اس قسم کے بیجا دباؤ ڈال کر کمپنی کی حکومت نے نئے مقبوضات میں مال گزاری کی شرح اتنی زیادہ بڑھا دی کہ وہ اُن علاقوں کے کسانوں کے لیے ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہو گئی۔

"کہا جاتا ہے کہ بورڈ کا خیال ہے کہ اُس نے کرناٹک کے بندوبست میں جلدی سے کام لیا شرح مال گزاری بہت نیچی رکھی اور اپنے پرانے دوست لکشمن راؤ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا۔ گ۔۔۔ کا کہنا ہے اُس نے عمداً شرح مال گزاری نیچی رکھی تھی تاکہ وہ اُس میں آئندہ آسانی سے اضافہ کر سکے اگر اس برطرف کر دیا گیا تو مجھے بڑی تکلیف ہوگی۔ اس کی وجہ صرف اتنی نہیں کہ وہ میرا پرانا دوست ہے اور مجھے اُس کا خیال ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت تک ایک افسر مال کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اُس کی شادی نے اُس کو قریب قریب قلاش کر دیا ہے۔ میں اس بات کو ظلم سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شخص کو فیصلہ کرنے میں غلطی کی بنا پر برطرف کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے اس کے لیے فہمائش کافی تھی۔ آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اُس کی غلطی انصاف پر مبنی تھی"۔[2]

سات سال تک اُن ضلعوں کا انتظام کرنے کے بعد جو کمپنی نے حاصل کر لیے تھے منرو 1807ء میں ہندوستان سے رخصت ہو گیا تاکہ کچھ آرام کر سکے جس کی اُس کو ضرورت تھی۔ حکام بالا اس

1۔ خط مورخہ 5 ستمبر 1802ء

2۔ خط مورخہ 28 ستمبر 1802ء

سے خوش تھے کہ اُس نے سات سال کی مدت میں مال گزاری کی رقم رفتہ رفتہ بڑھا کر 4,02,637 پاؤنڈ سے 6,06,909 پاؤنڈ کر دی تھی یعنی اُس میں پچاس فی صدی کا اضافہ کر دیا تھا۔[1] کمپنی اس قسم کے نتائج کی روشنی میں اپنے ملازمین کے کام کے متعلق اظہار رائے کیا کرتی تھی۔

اس دوران دوسرے اضلاع کا بندوبست دوسرے حکام نے کیا تھا۔ 1792ء میں مالابار پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا اور وہ وقتی طور سے بمبئی پریزیڈنسی میں شامل کر دیا گیا۔ بمبئی کی حکومت مالابار کے راجوں اور نائر سرداروں سے دو ایک ایک سال کے بندوبست کیے، جس کے بعد پانچ سال کے لیے بندوبست کیا گیا۔ جب راجہ اور نائر سردار وقت پر ادائیگی نہ کر سکے تو اُن کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا اور اُس پر انھوں نے بغاوت کر دی۔ چونکہ بمبئی کی حکومت کا انتظام کامیاب نہیں ہو سکا تھا اس لیے 1809ء میں مالابار کو مدراس پریزیڈنسی میں شامل کر دیا گیا۔ لارڈ کلایو نے، جو اُس وقت مدراس کا گورنر تھا، اُس علاقے کے انتظام کے لیے ایک اعلا اور کچھ نائب کلکٹر مقرر کیے۔ جزوی طور سے زمینداروں کے ساتھ اور جزوی طور سے کسانوں کے ساتھ بندوبست کیے گئے۔ لیکن مال گزاری کے انتظام کے لیے عام طور سے رعیت داری طریقہ اختیار کیا گیا جس کو حکام پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔[2] اس طرح وہ موروثی راجہ اور نائر سردار جو انگریزی راج سے پہلے مالابار میں زمینوں کے مالک تھے رفتہ رفتہ بے دخل ہوتے گئے اور آخر میں ختم ہو گئے۔ تدبّر کا تقاضہ تھا کہ پُرانے حالات باقی رہتے اور راجاؤں اور نائر سرداروں کو برطانوی حکومت کی وفادار رعایا اور لوگوں کے رہنماؤں میں تبدیل کر دیا جاتا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کمپنی کی حکومت کی پالیسی اس خواہش کے تابع ہو گئی کہ کسانوں سے فوراً بندوبست کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کی جا سکے۔

لارڈ ویلزلی نے 1799ء میں تنجور پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس ریاست کے کسان راجہ کو لگان کسانوں کے سربراہوں کی معرفت ادا کرتے تھے جو پٹک دار کہلاتے تھے۔ ایک پٹک دار کے حلقے میں ایک سے لے کر 128 گاؤں تک شامل ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر پٹک دار قریب قریب زمیندار ہوا کرتے تھے۔ برطانوی حکومت نے پٹک داروں کو موقوف کر دیا۔ 1804ء میں رعیت داری طریقہ رائج کر دیا اور زمین کی پرتال کے بجائے کئی برسوں کی پیداوار کا پرتا نکال کر اُس کی بنیاد

1۔ پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 124

2۔ پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحات 124 ـ 127

پر مال گزاری مقرر کردی۔[1]

1792ء میں نواب اور لارڈ کارنوالس کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی رو سے پہلے پہل کرناٹک کا نظم و نسق ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کر دیا گیا تھا لیکن قطعی منتقلی 1801ء میں عمل میں آئی جب لارڈ ویلزلی نے کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔ اس علاقے کا بڑا حصہ مدتوں سے، بلکہ کچھ صورتوں میں صدیوں سے، مقامی فوجی سرداروں کے زیرِ نگیں تھا جو پولی گر کہلاتے تھے۔

پولی گر "گانو کے مکھیا یا دوسری نوعیت کے عوامی کارکن ہوا کرتے تھے۔ دکن میں ہونے والے حکومتوں کے انقلاب کے دوران اُن کی حالت میں تبدیلی آئی اور وہ فوجی حکمراں بن گئے۔ یہ انقلابات اختیارات حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوئے تھے اور انھوں نے جزیرہ نما کے جنوبی حصوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ اُن میں سے جو سندیں پیش بھی کر سکتے تھے اُن کی سندوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کن شرائط پر اُنھیں پولم یا جاگیریں عطا کی گئی تھیں لیکن اُن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شہنشاہ کے تابعدار اور کرناٹک کے صوبیداروں کے اطاعت گزار تھے جن کو وہ خراج ادا کرتے تھے اور طلبی کی صورت میں اپنی جاگیروں کی تناسب سے فوجی دستوں کے ساتھ صوبیداروں کی چھاؤنی میں حاضری دینا اُن کا فرض تھا۔"

وارن ہیسٹنگز کے زمانے سے پولی گروں کی حالت کے متعلق بڑی خط و کتابت ہوتی رہی تھی کرناٹک کے نواب نے بار بار اپنے انگریز دوستوں سے مدد مانگی تھی تاکہ ان مقامی سرداروں کو ختم کر کے لوگوں پر اختیار حاصل کر لیا جائے۔ لیکن بورڈ آف ڈائریکٹرز پولی گروں کے خلاف نواب کی مدد کرنے اور برطانوی فوج کو استعمال کرنے کے ناخوش گوار فعل پر تشویش کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس نے صاف صاف حکم دیا تھا کہ "مقامی حکمراں جو پولی گر کہلاتے ہیں ختم نہ کیے جائیں۔" اُن کے خیال میں یہ انسانیت سوز عمل ہوگا کہ اُن کا (پولی گروں کا) ایسا خطرناک انجام ہو۔" اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ نواب کی حکومت بھی " اعتدال سے کام نہیں لیتی ہے" اور " مال گزاری وصول کرنے کے لیے ظلم توڑے جاتے ہیں۔" حالانکہ وہ جانتے تھے کہ کرناٹک کے لوگوں کو بہت سے دکھ جھیلنے پڑ رہے تھے پھر بھی اُن کا خیال تھا کہ کرناٹک کے نواب کے مظالم "سب سے زیادہ ہیں۔"[2]

1۔ پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 127

2۔ پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 143

کرناٹک کے نواب کے ساتھ 1792ء میں کارنوالس کا معاہدہ ہو جانے کے بعد ڈائریکٹروں نے اپنے مراسلے مورخہ 10 جون 1795ء میں اُس معاہدے کے شرائط پر تفصیلی بحث کی۔ اس کے بعد ہندوستان میں تبادلۂ خیال ہوا اور 1797ء میں مدراس کے گورنر لارڈ ہوبرٹ نے ایک روداد تیار کی جس میں پولی گروں کو حکومت برطانیہ کے تابعدار باج گزار اور کارآمد رعایا بنانے کے متعلق کچھ تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ ڈائریکٹروں نے اس کے جواب میں 5 جون 1799ء کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اُس نے اس امر پر زور دیا کہ پولی گروں کی فوجی طاقت بالکل ختم کردی جائے اور جتنا خراج پہلے وہ ادا کرتے تھے اُس سے زیادہ اُن سے طلب کیا جائے۔

اس مراسلے کی بنیاد پر مدراس کے حکام انصاف اور معقولیت کے حدود سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے 1799ء اور 1800ء میں بندوبست کیا جس کی بنا پر انھوں نے پولی گروں کی اُن تمام زمینوں پر قبضہ و دخل حاصل کرلیا جو اُن کے گانوؤں کے رقبوں کے باہر تھیں اور اُن سے ایسی مال گزاری کا مطالبہ کیا جو پچھلی مال گزاری سے 117 فی صدی سے زیادہ تھی۔ جنوبی پولی گروں میں شورش پھوٹ پڑی۔ بغاوت جلدی ہی فرو کردی گئی۔ باغیوں سے اُن کی جاگیریں چھین لی گئیں۔ اور کچھ لوگوں کو موت کی سزا بھی دی گئی۔ مال گزاری سے متعلق یہ اعلان کیا گیا کہ کئی سال تک اُس میں اضافہ ہوتا رہے گا اور اُس کے بعد مجموعی یافت کی دو تہائی کے برابر مال گزاری مقرر کردی جائے گی اور اس میں کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی۔ آخر کار 1803ء میں اُن چودہ جاگیروں میں دائمی بندوبست کردیا گیا جو اُس وقت تک جنوبی پولی گروں کے قبضہ میں تھیں۔ جو مال گزاری مقرر کی گئی وہ 1799ء اور 1800ء کے بہت بڑے مطالبوں کے مقابلے میں کم تھی۔ لگان کی مجموعی یافت کی اکتالیس سے لے کر اکیاون فی صدی تک مال گزاری مقرر کی گئی تھی۔ یہ جاگیریں ٹینی ویلی کے ضلع میں واقع تھیں۔ اسی قسم کا بندوبست سیواگنگا اور رام ناد کے پولی گروں کے ساتھ بھی کیا گیا۔[1]

1802ء میں مغربی پولی گروں کے ساتھ بھی استمراری بندوبست کیا گیا لیکن چتور کے پولی گروں کے ساتھ، جو کرناٹک پر قبضہ ہو جانے کے بعد برطانیہ کے زیرنگیں آگئے تھے، زیادہ بُرا برتاؤ ہوا۔ انھوں نے انگریزوں کے مطالبوں کی مزاحمت کی اور اُن میں سے زیادہ تر اپنے قلعوں سے نکال دیے گئے جنھوں نے جنگلوں میں امان لی۔ چند کے علاوہ چتور کے تمام پولی گروں کی جاگیروں پر قبضہ کرلیا گیا اور

1۔ پانچویں رپورٹ 1812ء، صفحات 146-147

براہ راست کسانوں کے ساتھ بندوبست کر لیا گیا۔

ایک صدی گزر جانے کے بعد جب اُن کارروائیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو سختی سے کام لینے کی اُس پالیسی پر افسوس ہوتا ہے جس نے کرناٹک کے پولی گروں کو ختم کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کا فیصلہ درست تھا کہ پولی گروں سے فوجی طاقت چھین لی جائے۔ نظم ونسق کے جدید طریقے کے تحت فوجی طاقت صرف ریاست کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ لیکن یہ پالیسی نہ انصاف پر مبنی تھی اور نہ معقولیت پر کہ گانووں کے باہر کی جاگیروں سے انھیں محروم کر دیا جائے، مال گزاری میں یک لخت اور بہت زیادہ اضافہ کیا جائے یا شورش کی سزا کے طور پر انھیں ختم کر دیا جائے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کی پریشان کن جنگوں کے زمانے میں انھوں نے اپنی جاگیروں میں کسی نہ کسی حد تک امن قایم رکھا تھا۔ انھوں نے اُس وقت بنکروں اور دست کاروں کا تحفظ کیا تھا اور کسانوں کی حمایت کی تھی جب ملک میں کوئی آئینی حکومت نہیں تھی۔ انھوں نے جنوبی ہند میں آب پاشی کے لیے بڑی بڑی نہریں بنائی تھیں اور بند تعمیر کیے تھے۔ کرناٹک کی ابتدائی جنگوں میں جب فرانسیسیوں نے مدراس پر قبضہ کر لیا تھا تو انھوں نے انگریزوں کو امان دی تھی۔ اگر پولی گر شورش پسند اور ظالم تھے بھی تو یہ خرابی اس قسم کی تھی جو سترھویں اور اٹھارویں صدی کے تمام ایشیائی اور یورپی حکمرانوں اور سرداروں میں پائی جاتی تھی۔ تدبر کا تقاضہ یہ تھا کہ "پولی گروں کو ختم کرنے" کی کوشش کے بجائے اُن کی خرابیوں کو دور کرنے اور اُن میں نظم وضبط پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ایک حکومت کے لیے یہ سمجھ داری کی پالیسی نہیں ہوتی ہے کہ کسی ملک کے اداروں کو تبدیل کر دے۔ کسی بدیسی حکومت کی یہ پالیسی انسانیت سوز ہے کہ وہ ملک کے ایک طبقے کو ختم کر دے اور اُس کے حقوق ملکیت چھین کر اور کسانوں کے ساتھ براہ راست بندوبست کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔

بنگال میں لارڈ کارنوالس کی پالیسی کے مقابلے میں مدراس میں لارڈ ویلزلی کی حکومت کی پالیسی بنیادی طور سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ بنگال میں لارڈ کارنوالس نے دیکھا کہ کسان موروثی زمینداروں کے ماتحت ہیں۔ اُس نے زمینداری کو تقویت پہنچائی اور اس ادارے کو دائمی حیثیت دے دی۔ لارڈ ویلزلی کی حکومت کے زمانے میں کرناٹک کا بڑا حصّہ پولی گروں کے زیر اقتدار تھا۔ اُس نے پولی گروں کو قریب قریب ختم کر دیا تاکہ وہاں کے لوگ براہ راست حکومت کے زیر اختیار آجائیں۔ لارڈ کارنوالس نے ایک دیرینہ ادارے کا احترام کیا اور اس طرح بنگال میں ایک بڑے خوش حال اور مطمئن متوسط طبقے کو برقرار رکھا۔ لارڈ ویلزلی کی پالیسی نے مدراس کو اس قسم کے طبقے سے محروم کر دیا۔ ایک صدی کی برطانوی حکومت

کے بعد بھی اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ مدراس میں کوئی طاقت ور' با اثر اور خوش حال متوسط طبقہ نہیں ہے جو بدیسی حکومت اور کسانوں کے درمیانی قدرتی رشتہ اتحاد کا کام دے سکے۔

مدراس میں لارڈ ویلزلی کی حکومت کی پالیسی انقلاب فرانس کی پالیسی کے مماثل تھی جس کے تحت کچھ سال پہلے فرانس کے مقامی جاگیر داروں کے حقوق ضبط کر لیے گئے تھے۔ پھر بھی فرانسیسی جاگیرداروں کا نقصان فرانسیسی قوم کے مفاد میں تھا۔ مدراس میں پولی گروں کے نقصان سے ایک بدیسی تجارتی کمپنی کو فائدہ پہنچا۔ پولی گر اپنے علاقوں کے لوگوں سے جو لگان وصول کرتے تھے وہ لوگوں کے درمیان خرچ کیا جاتا تھا' مختلف ذریعوں سے اُنھیں واپس مل جاتا تھا اور اُس سے اُن کی تجارت اور صنعتیں بار آور ہوتی تھیں پولی گروں کے قریب قریب ختم ہو جانے کے بعد کمپنی کو جو مال گزاری کی رقم حاصل ہوتی تھی وہ انتظامی اخراجات کی منہائی کے بعد بدیسی تاجروں کے منافع کے طور پر ملک کے باہر چلی جاتی تھی۔ کمپنی کے ایک لائق ترین ڈائریکٹر نے کہا تھا "اس بات کو نہ چھپایا جا سکتا ہے اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس طریقے (رعیت داری طریقے) کا مقصد یہ ہے کہ حکومت وہ زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرے۔ جو زمین لگان کی صورت میں دے سکتی ہے۔"[1]

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں مدراس میں 1807ء تک بندوبست کی اجمالی مگر مربوط روداد پیش کی ہے۔ ہم نے شمالی سرکاروں میں مال گزاری کے انتظام کا جائزہ لیا ہے جہاں آخر میں 1802ء اور 1805ء کی درمیانی مدت میں بندوبست استمراری کیا گیا۔ ہم نے بارہ محل' کنارا اور دوسرے حاصل ہونے والے اضلاع میں ٹامس منرو کے بندوبست کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے مالابار اور تنجور میں ہونے والی کارروائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم نے کرناٹک میں ہونے والی کارروائیوں کا حوالہ دیا ہے جن کا اختتام بقیہ پولی گروں کے ساتھ بندوبست استمراری کی صورت میں ہوا جب کہ صوبے کے بڑے حصّے میں بندوبست براہ راست کسانوں کے ساتھ کیا گیا۔

ان بندوبستوں کا نتیجہ ملحقہ فہرست سے پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔[2] جہاں بندوبست استمراری ہوا۔

مدراس کے اطراف کی جاگیریں	1801-2ء
شمالی سرکاریں	1802ء — 1805ء
سے لم	1802ء 1803ء

1۔ ہنری سینٹ جان ملکم' Memorials of Indian Government' لندن' 1853ء' صفحہ 113

2۔ پانچویں رپورٹ 1812ء صفحہ 163

مغربی پولی گروں کی جاگیریں چتور کے پولی گروں کی جاگیریں جنوبی پولی گروں کی جاگیریں	1802-3ء
رام ناد	1803-4ء
کرشنا گیری	1804-5ء
ڈنڈی گل	1804-5ء
تر یونڈا پورم جاگیر کے گاؤں	1806-7ء

جہاں بندوبست استمراری نہیں ہوا۔

میسور: مالا بار، کنارا، کوئمبٹور، حاصل کیے ہوئے اضلاع، بالا گھاٹ

کرناٹک: پال ناد، نلور اور اونگول، ارکاٹ، ساتی داد، ترچناپلی، مدورا، ٹنی ویلی

مندرجہ بالا عبارت سے یہ ظاہر ہوگا کہ مدراس کے زمینداروں، پولی گروں اور دوسرے سربراہوں سے بندوبست کو ناپسند کیا گیا اور کسانوں کے ساتھ براہ راست بندوبست مناسب سمجھا گیا۔ صوبے کے لیے رعیت دار طریقے کو قطعی منظور کرنے کی کہانی اگلے دو ابواب میں بیان کی جائے گی۔

باب 8

گانو پنچایتیں یا انفرادی لگان دار ۔ مدراس میں ہونے والا ایک مباحثہ 1807ء تا 1820ء

پچھلے باب کے آخر میں جو نقشہ دیا گیا ہے اس کو دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ 1807ء میں مدراس کے کون سے اضلاع میں بندوبست استمراری مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ ان ضلعوں میں جہاں بندوبست استمراری مکمل نہیں ہوا تھا کون سا دیرپا انتظام رائج کیا جائے۔

کیا ان ضلعوں میں زمینداری کو رواج دیا جائے اور اُس قسم کا بندوبست استمراری کیا جائے جیسا لارڈ کارنوالس نے بنگال میں کیا تھا؟

کیا رعیت داری کا طریقہ رائج کیا جائے اور اس کے مطابق بندوبست استمراری کیا جائے جس کی سفارش ٹامس منرو نے کی تھی؟

یا موضع داری طریقہ رائج کیا جائے یعنی مال گزاری گانو پنچایت سے وصول کی جائے جس کی سفارش مدراس کے بورڈ آف ریونیو نے کی تھی اور اس کے مطابق بندوبست استمراری کیا جائے۔

ہندوستان کی معاشی تاریخ کا سب سے دلچسپ باب وہ تھا جس میں اس اہم سوال پر بحث کی گئی۔

1807ء میں یورپ واپس ہونے سے قبل اور حاصل ہونے والے اضلاع میں سات سال تک سخت محنت کرنے کے بعد، ٹامس منرو نے اپنی مشہور رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ ان اضلاع میں رعیت داری بندوبست استمراری رائج کیا جائے۔ اس نے مالگزاری کی بہت اونچی شرح مقرر کی تھی یعنی مجموعی پیداوار کی 45 فی صدی اور ساتھ ہی یہ بھی سفارش کی کہ اس مالگزاری میں ایک چوتھائی کی کمی کر کے اس شرح تشخیص کو دائمی حیثیت دے دی جائے۔

"چونکہ جائیداد آراضی کو تباہ کیے بغیر جو زیادہ سے زیادہ مالگزاری تشخیص کی جا سکتی ہے وہ پیداوار کی ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس سے قبل کہ

وہ لوگ بغیر خسارہ اٹھائے سرکاروں کی زمینوں پر قبضہ کریں جو خود کاشتکار نہیں ہیں، مالگزاری کو کم کر کے پیداوار کی ایک تہائی کر دینا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک مالگزاری کو کم کر کے اس سطح تک نہیں لایا جائے گا اس وقت تک زمین پر تمام طبقوں کے لوگ نہ قبضہ کریں گے اور نہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت بن سکے گی۔ ایسی صورت میں وہ بندوبست استمراری بھی نہیں ہو سکے گا جس سے لوگوں کو فائدہ ہو اور سرکاری آمدنی میں اضافہ ہو۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ جب حاصل ہونے والے اضلاع میں بندوبست استمراری کیا جائے تو حکومت کی مالگزاری مجموعی پیداوار کی قریب قریب ایک تہائی ہونی چاہیے۔ موجودہ شرح 45 فی صدی ہے۔ اس کو مجوزہ سطح تک لانے کے لیے 25 فی صدی کی چھوٹ دینی ہوگی جیسا کہ مندرجہ ذیل مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

مجموعی پیداوار	100
موجودہ شرح کے مطابق حکومت کا حصہ	45
تشخیص شدہ رقم کی 25 فی صدی کی چھوٹ	11

اب میں یہ بتاؤں گا کہ میرے خیال کے مطابق حاصل ہونے والے اضلاع میں استمراری رعیت داری بندوبست کس طرح کیا جائے۔

1۔ " رعیت واری بندوبست کیا جائے گا۔"

2۔ " مالگزاری کی رقم ہر سال زیر کاشت رقبے کی مناسبت سے بڑھتی یا گھٹتی رہے گی۔"

3۔ " پڑتال کے بعد شرح تشخیص کرتے وقت ہر زمین کو 25 فی صدی کی چھوٹ دی جائے گی۔"

4۔ " ایسی تمام زمینوں پر جن کی آبپاشی کنوؤں سے یا کسی مشینی طریقے سے دریاؤں یا نالوں کا پانی اوپر پہنچا کر کی جائے گی انھیں 8 فی صدی کی مزید چھوٹ یا 33 فی صدی کی مجموعی چھوٹ دی جائے گی بشرطیکہ کسان کنوؤں اور بندوں کی مرمّت اپنے خرچ سے کریں۔ اسی قسم چھوٹ ان حالتوں میں بھی دی جائے گی جہاں آبپاشی چھوٹے چھوٹے تالابوں سے کی جائے اور کسان ان کی مرمت کے اخراجات برداشت کرنے پر آمادگی ظاہر کریں۔"

5۔ " کسان کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ ہر سال کے آخر میں اگر وہ چاہے تو اپنے حالات کے پیش نظر اپنی زمین کے کچھ حصے سے دست بردار ہو جائے یا زیادہ زمین حاصل کرلے۔

لیکن زمین سے دست بردار ہونے یا نئی زمین حاصل کرنے کی صورت میں اسے انتخاب کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ دونوں صورتوں میں اس کو اچھی اور خراب زمین کا متناسب حصہ رد یا قبول کرنا ہوگا۔"

6 "ہر کسان جب تک زمین کا لگان ادا کرتا رہے اُس زمین کا قطعی مالک سمجھا جائے گا۔ اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ شِکمی کو اپنی زمین اٹھائے اور حسب مرضی لگان مقرر کرے یا حسب خواہش زمین کو فروخت کر سکے۔"

7۔ "فصلوں کے خراب ہونے کی صورت میں یا دوسرے حادثوں کی صورت میں معمولاً لگان میں چھوٹ نہیں دی جائے گی۔ اگر فصلیں اتنی خراب ہو جائیں کہ نادہندوں کی زمین یا دوسری جائیداد سے بقایا نہ وصول کیا جا سکے تو اس گانو کے بقیہ کسانوں سے، جہاں وہ رہتے ہیں، بقایا کی بقدر دس فی صدی رقم بطور مزید لگان کے وصول کی جائے گی۔ اس سے زیادہ رقم وصول نہیں کی جائے گی۔"

8 "تمام غیر مزروعہ آراضی حکومت کی ملکیت ہو گی۔ اس کے زیر کاشت آنے کی صورت میں اس کا لگان یا زیر کاشت آنے والے حصے کا لگان سرکاری آمدنی کا جزء بن جائے گا۔"

9۔ "گھروں، دوکانوں اور پیٹھوں پر لگائے جانے والے محصول اور ہر قسم کی ڈیوٹی اور لائسنس کی رقم تمام کی تمام حکومت کی ہوگی جس کسان کی زمین پر مکان یا دوکان بنے گی وہ اس سے زیادہ لگان کا حقدار نہیں ہوگا جتنا کہ پیمائش کے بعد اس زمین کا لگان مقرر ہوتا جس پر مکان دار یا دوکاندار نے قبضہ کیا ہے۔"

10۔ "ان تالابوں کی مرمت سرکاری خرچ سے کی جائے گی جو کسی خاص چھوٹ یا معافی کی بنا پر ذاتی ملکیت نہ قرار دیے گئے ہوں۔"

11۔ "تقاوی رفتہ رفتہ ختم کر دی جائے گی۔"

12۔ "پٹیل، کرنم اور گانو کے دوسرے کارکن حسب معمول کلکٹر کی ماتحتی میں رہیں گے۔"

13۔ "نجی قرض خواہ جو کسانوں کی جائیداد کی قرقی کرائیں گے وہ حکومت کو ان کسانوں کا واجب الوصول لگان ادا کریں گے اور قرقی سے پہلے اس کی ضمانت دیں گے۔"[1]

---

[1] رپورٹ، مورخہ 15 اگست 1807ء۔

چونکہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رعیت داری بندوبست کے اُس منصوبے کو پوری طرح سمجھ لیا جائے جو اس کے معمار کے ذہن میں تھا اس لیے ہم نے یہ طویل اقتباس پیش کیا ہے۔ ٹامس منرو چاہتا تھا کہ ہر کسان سے انفرادی طور سے بندوبست کیا جائے اور اس کو دائمی شکل دی جائے۔ صرف ان صورتوں میں مالگزاری میں کمی یا زیادتی ہو جب زیر کاشت آراضی کے رقبے میں کمی یا زیادتی ہو۔

لارڈ ولیم بینٹنک کی بھی یہی رائے تھی جو لارڈ کلایو کے بعد 1803ء میں مدراس کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ اس نے 1805ء کی ایک روداد میں لکھا تھا کہ بنگال میں چونکہ موروثی زمیندار موجود تھے اس لیے زمینداری کا طریقہ وہاں کے لیے موزوں تھا لیکن یہ طریقہ مدراس کے ان حصوں کے لیے موزوں نہیں ہے جہاں زمیندار موجود نہیں ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ زمینداروں کو وجود میں لانا نہ حکومت کے مفاد میں ہے اور نہ تمام دوسرے لوگوں کے ...... مجھے بندوبست استمراری کے اصول سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مجھے تو وہ پسند ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کا رواج اس علاقے اور دنیا کے ہر علاقے میں ہونا چاہیے۔"

اسی سال لکھی جانے والی ایک اور روداد میں گورنر نے لکھا تھا۔

"اگر کسانوں کے ساتھ اصولوں کی بنا پر ہونے والا بندوبست، جس کا لازمی جزیہ ہے کہ کسان ایک سال تک اپنی محنت کے پھل پاتے رہیں، اس حد تک مفید ثابت ہوا ہے تو انہی اصولوں کی بنا پر ہونے والے بندوبست استمراری سے جس میں کسانوں کے فائدوں کی زیادہ رعایت رکھی جائے، بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔"[1]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ٹامس منرو اور لارڈ ولیم بینٹنک نے رعیت داری طریقے کی وکالت کی تو دونوں کے ذہنوں میں بندوبست استمراری کا خیال غالب تھا۔ ہندوستان چھوڑنے کے چھ سال بعد 1813ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے ٹامس منرو نے بیان دیا۔ کمیٹی کے مختلف سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس نے اپنے خیالات نہایت زوردار الفاظ میں اور نہایت وضاحت

---

[1] روداد مورخہ 29 اپریل اور 25 نومبر 1805ء۔

کے ساتھ پیش کیے۔

"کیا حاصل ہونے والے ضلعوں میں جن کے آپ کلکٹر تھے مالگزاری کا کوئی دائمی انتظام کیا گیا تھا؟"

"میرے ہندوستان سے روانہ ہونے کے وقت تک وہاں بندوبست استمراری نہیں کیا گیا تھا لیکن جائیداد سے مستفید ہونے کے لیے کسانوں کا تحفظ کر دیا گیا تھا۔ زمین کا لگان مقرر کر دیا گیا تھا اور یہ طے کر دیا گیا تھا کہ کسان اپنے کھیت پر دائمی طور سے قابض رہ سکتا ہے اگر وہ لگان ادا کرتا رہے۔ لگان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ہے؟"

"براہ کرم کمیٹی کو بتائیے کہ آپ کے نزدیک رعیت واری طریقے کا کیا مفہوم ہے؟"

"میں یہ بتاؤں گا کہ رعیت واری طریقے کا اصول کیا ہے؟ اس کی تفصیل میں بڑا وقت لگے گا۔ رعیت واری طریقے کا اصول یہ ہے کہ ملک کی تمام زمینوں پر تشخیص مالگزاری کی جائے۔ یہ تشخیص دوامی ہوتی ہے۔ ہر کسان کو، جو اس زمین کا مالک بھی ہوتا ہے جس پر وہ کاشت کرتا ہے اور قبضہ رکھتا ہے، اس امر کی اجازت ہوتی ہے کہ زمین پر جب تک چاہے قبضہ رکھے اور معینہ لگان ادا کرے۔ وہ ہمیشہ اس کے قبضے میں رہتی ہے اور اس پر مزید لگان نہیں لگایا جاتا ہے۔ اگر وہ غیر مزروعہ یا مزید زمین پر قبضہ کرتا ہے تو اس کو صرف اتنا لگان ادا کرنا ہوتا ہے جتنا اس زمین پر مقرر ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے لگان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔"

"کیا کمیٹی یہ سمجھے کہ جہاں تک دائمی حیثیت کا تعلق ہے رعیت واری طریقے میں اور بنگال کے بندوبست استمراری میں کوئی فرق نہیں ہے؟"

"جہاں تک دائمی حیثیت کا تعلق ہے ان دونوں طریقوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن رعیت واری طریقے میں حکومت کی مالگزاری میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب غیر مزروعہ زمین زیر کاشت آتی ہے۔"[1]

اگر زبان کا کوئی مفہوم ہوتا ہے تو یہ بات صاف ہے کہ رعیت واری بندوبست جو

---

[1] وہ شہادت جو تمام ایوان کی کمیٹی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی، 1813ء، صفحات 149، 171 اور 173-

منرو کرچکا تھا اور جو وہ مدراس کے دوسروں کے حصوں میں کرنا چاہتا اس شرط پر کیا گیا تھا کہ ہر کسان بغیر مزید لگان ادا کیے ہمیشہ اپنی زمین پر قابض رہے گا۔ صرف اس کا اطلاق نئی حاصل کی ہوئی زمین پر نہیں ہوگا۔ اگر الفاظ کے کوئی خاص معنی ہوتے ہیں تو یہ بات بھی صاف ہے کہ دائمی حیثیت کی حد تک کارنوالس کے زمینداری بندوبست اور منرو کے رعیت واری بندوبست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رعیت واری طریقے میں زیر کاشت آنے والی غیر مزروعہ زمین پر مزید لگان دینا ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں حکومت مدراس نے وہاں کے کسانوں کے اس حق کو نظرانداز کرنا شروع کردیا ہے کہ انھیں کسی مخصوص زمین کے لیے معینہ اور ناقابل ترمیم مالگزاری کا حق حاصل ہے جو منرو کے رعیت واری طریقے کا پہلا اصول تھا۔

ایک طرف تو دائمی زمینداری بندوبست کو غیر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور دائمی رعیت واری بندوبست کو منرو کی حمایت حاصل ہونے لگی، دوسری طرف مدراس کا بورڈ آف ریونیو ایک تیسرے طریقے کی وکالت کرنے لگا یعنی دائمی موضع واری بندوبست کا طریقہ یا ہر گاؤں پنچایت کے ساتھ بندوبست کا طریقہ۔ منرو کی 15 اگست 1807ء کی تجویز کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں معینہ مالگزاری میں 25 فی صدی کی چھوٹ کی حمایت کی گئی تھی، بورڈ آف ریونیو نے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی:-

29 "کرنل منرو کے منصوبے کا خاکہ یہ ہے۔ جس طرح اس کا اطلاق حاصل ہونے والے اضلاع پر ہوا اُسی طرح ان اضلاع پر بھی ہوسکتا ہے جہاں ابھی بندوبست نہیں ہوا ہے۔ اگر حکومت کی مصلحت اس امر کی اجازت دے کہ وہ موجودہ معیاری لگان میں 25 فی صدی کی، یا کم از کم 15 فی صدی کی، چھوٹ کی قربانی دے سکے تو ہم اس اقدام کو نہایت مناسب سمجھیں گے جس کا مقصد یہ ہوگا کہ درپردہ لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ کسانوں کی محنت کے پھل سے جتنا کم حصہ لیا جائے گا ان کی حالت اتنی ہی بہتر ہوگی۔

30۔ "اگر حکومت کی مصلحت اس قربانی کی اجازت نہ دے، اگر حکومت فوری طور سے ذاتی ملکیت نہ عطا کرسکے تو اسے یہ چاہیے کہ زمین میں اُس طرح کا ذاتی مفاد پیدا کردے جیسا ٹھیکیداری کے طریقے میں ہوتا تھا۔ اگر وہ مالک آراضی کے لگان کے ایک حصہ سے دستبردار

ہونے کو تیار نہیں ہے تو اسے ایک ہمدرد مالک آراضی کی حیثیت حاصل کرنی چاہیے۔"

31۔ " ان حالات میں مسٹر ہاگڈسن (Mr Hogdson) کی تجویز کے مطابق رعیت واری طریقے کے بجائے گانوے لگان وصول کرنے کے طریقے کو اگر رواج دیا جائے تو اس سے حکومت کی مالگزاری بھی محفوظ رہے گی اور ملک بھی خوش حال ہو جائے گا۔

38۔ " ہر گانو اپنے بارہ اگا گندیوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی دولت مشترکہ ہوتا ہے جس کا ایک مقدم، پٹیل، ریڈی یا مکھیا ہوتا ہے ہندوستان اس قسم کی دولتہائے مشترکہ کا مجموعہ ہے۔ جنگ کے دوران وہاں کے لوگ زیادہ تر اپنے مکھیا پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر گانو کی سالمیت برقرار رہے تو وہ سلطنتوں کی شکست و ریخت اور بٹوارے کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ انھیں اس کی فکر نہیں ہوتی ہے کہ سلطنت کس کو منتقل ہو گئی اور کون اس کا وارث بن گیا، ان کے داخلی انتظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ گانو کا مکھیا کلکٹر اور مجسٹریٹ کے فرائض ادا کرتا ہے اور سب سے بڑا کاشتکار ہوتا ہے۔

39 " منو کے زمانے سے لے کر آج تک بندوبست مکھیا کے ساتھ یا اس کی وساطت سے ہوتا رہا ہے۔ اگر مالگزاری کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ وہ ضرورت کے مطابق ہے اور مکھیا راضی ہو گیا تو اس کو اجازت دی جاتی تھی کہ وہ کسانوں کے ساتھ معاملہ طے کرے۔ اگر مالگزاری کم ہوتی تھی اور مکھیا اضافے کی حمایت نہیں کرتا تھا تو عملدار مکھیا کی موجودگی میں کسانوں سے شرائط طے کر لیتا تھا۔ اس طریقے کو وقت کی سند مل چکی ہے چونکہ اس کے تحت پورے کے پورے صوبوں میں زراعت فروغ پاتی رہی ہے اس لیے یہ سمجھا لیے جانا نہیں ہوگا کہ اس سے زراعت کی ترقی کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔"[1]

حکومت مدراس نے بورڈ آف ریونیو کو جواب دیتے ہوئے اس امر کی اجازت دی کہ بہت سے ایسے ضلعوں میں جہاں ابھی تک بندوبست نہیں ہوا ہے گانو کے ساتھ تین سال کے لیے بندوبست کر لیا جائے اور اس کو گانوؤں کے ہونے والے بندوبست استمراری کی تیاری کا اقدام سمجھا جائے۔[2] انھوں نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے نام اپنے خط میں

---

[1] مراسلہ مورخہ 25 اپریل 1808ء

[2] مراسلہ مورخہ 29 فروری 1812ء

تجویز پیش کی کہ تین سال کی مدّت کے بعد دس سال کے لیے بندوبست کیا جائے جس کو ڈائریکٹروں کی منظوری کی صورت میں دائمی حیثیت دے دی جائے۔[1]

بندوبست استمراری کے نام نے ڈائریکٹروں کو چونکا دیا اور انھوں نے بورڈ پر الزام لگایا کہ دس سالہ بندوبست بغیر اجازت سے کیا گیا ہے۔

"اُن تمام صوبوں میں جہاں اس مراسلے کے پہنچنے کی تاریخ تک بندوبست نہیں ہوا ہے رعیت واری طریقے کے اصول پر عمل کیا جائے۔ جہاں کسی دوسرے اصول کی بنا پر گانو کا لگان مقرر ہو چکا ہے وہاں یہ اعلان کیا جائے کہ وہ مدّت گزرنے کے بعد جن کے لیے پٹّے کیے گئے ہیں تمام پٹّے ختم سمجھے جائیں گے"۔[2]

ڈائریکٹروں کے اس فیصلے کے خلاف حکومت مدراس نے احتجاج کیا۔ "یہ کہ زراعت قومی دولت اور خوشحالی کی اساس سمجھی جاتی تھی۔ یہ کہ زراعت کی توسیع و ترقی کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ زمین کی جائیداد پر حکومت کے مطالبے کو محدود رکھا جائے۔ یہ کہ یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس قسم کے حدود عائد کرنے سے حکومت کو نقصان ہوگا اس لیے کہ اس کے بغیر زراعت کی توسیع و ترقی نہیں ہوسکتی تھی نہ ملک کے وسائل میں اضافہ ہوسکتا تھا۔۔۔۔۔۔ مندرجہ بالا باتیں درج کرنے سے پہلے ہم نے بندوبست استمراری پر محض ایک مالیاتی مسئلے کی حیثیت سے غور کرکے کہا تھا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ ایک اہم مسئلہ بھی ہے۔ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو زراعت کا کام کرتے ہیں حکومت کے استحکام سے گہری دلچسپی لینے لگیں"۔[3]

اگلے سال حکومت مدراس نے دائمی رعیت واری بندوبست کے بجائے دائمی گانو بندوبست کے لیے کورٹ آف ڈائریکٹرز سے ایک اور پرجوش اپیل کی۔

"اگر بندوبست استمراری کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی جائیداد کا خود انتظام کریں اور اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرکاری حکام کے بجائے وہ اپنی جائیداد کا انتظام بہتر

---

[1] مراسلہ مورخہ 29 فروری 1812ء۔

[2] مراسلہ مورخہ 16 دسمبر 1812ء

[3] مراسلہ مورخہ 5 مارچ 1813ء

کرسکیں گے تو یہ طریقہ (رعیت واری طریقہ) اس مقصد کو حاصل کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو سکے گا۔ کل کا کل انتظام ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گا جن کے ہاتھوں سے اس کو نکالنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس نظام میں، جس کا مقصد مالکان اراضی کے حقوق و مفادات کا تحفظ سمجھا جاتا ہے، وہ لوگ اس زمین میں حق ملکیت سے محروم ہو جائیں گے جو کسی خاص حادثے، سستی یا بدانتظامی کی وجہ سے ایک سال زمین نہیں جوت سکیں گے اور ایسی صورت میں ان کی زمین حکومت کے قبضے میں آجائے گی۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ زمین کی ملکیت میں مداخلت کی یہ مثال ان تمام کوششوں کے مقابلے میں بدترین ہے جو کسی بھی دوسرے نظام میں کی گئی ہوں.....

" وہ (کسان) جو زمین حاصل کرتا ہے یا جس زمین سے دست بردار ہوتا ہے اس کے لگان کی تشخیص کے لیے جو غلط پیمائش کی جاتی ہے اس کے خلاف اس کا کوئی تحفظ ممکن نہیں۔ اگر ظلم سے بچنے کے لیے وہ فیصلہ کر بھی لے کہ اپنے رقبے میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا پھر بھی زراعت کے کام کاج، آبپاشی کے ذرائع، تقاوی کی تقسیم، یا کسی حادثے کی صورت میں لگان میں چھوٹ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جنھیں اس کی جائداد میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اس کے احساسات سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ یقینی وہ صورت بہتر ثابت ہوگی کہ اعتماد اس پر کیا جائے جس کا ذاتی مفاد اس امر کا ضامن ہو کہ وہ سرکاری افسروں کی بیکار اور بے سمجھی بوجھی مدد کے بغیر اور ان کے مظالم اور حرص کے خطروں سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے ملک کو مرضی کے مطابق ترقی دیں۔ بہر حال ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کرنل منرو کا مجوزہ رعیت واری طریقہ ہمارے خیال میں کسی طرح مالگزاری کے بندوبست استمراری کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اس نظام میں مالگزاری اور زمین کی جائداد کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا اور لوگوں کو سرکاری افسروں کی اس قسم کی بے جا مداخلت برداشت کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے کوئی نجی کاروبار فروغ نہیں پا سکتا.......

" ہندوستان کی مالگزاری کے متعلق انگلستان میں جو خیال پایا جاتا ہے اور یہاں جو کچھ سوچا جاتا ہے اس میں بڑا فرق یہ ہے کہ انگلستان میں لوگ ڈرتے ہیں کہ ہندوستان کے

وسائل کے تعلق سے سرکاری مطالبہ خوشحالی کے ساتھ ساتھ شاید نہ بڑھ سکے۔
جب کہ یہاں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرکاری مطالبوں کی بنا پر ملک کی خوشحالی کم ہو گئی ہے اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ اگر انتظام میں فراخ دلی اور انصاف سے کام نہیں لیا گیا تو ملک کے وسائل میں تیزی کے ساتھ ترقی کی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور وہ کم ہونے لگیں گے اس میں مستثنیات کو دخل نہیں ہے۔ یہ اس قسم کے جذبات ہیں جن کو عزّت مآب کورٹ کے گوش گزار کرنے میں مبالغے کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم آپ کے فہم، آپ کی انصاف پسندی اور آپ کے انسان دوستی کے جذبات سے اپیل کرتے ہیں۔ اس کا جتنا تعلق آپ کی حکومت کے کامیاب نظم ونسق سے ہے اتنا ہی تعلق ایک وسیع ملک کی خوشحالی اور اس میں رہنے والے لاکھوں انسانوں کی فلاح ومسرّت سے بھی ہے۔ ہم جس ملک کا ذکر کر رہے ہیں وہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، داخلی شورش اور خارجی حملوں سے محفوظ ہے اور اس کو صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے وسائل کے تعلق سے سرکاری مطالبوں میں اعتدال سے کام لیا جائے تاکہ وہ دولت مند ہو جائے اور ترقی کرے۔ اگر آپ ان بڑے مقاصد کے حصول کا اس قربانی سے مقابلہ کریں جو آپ کو دینی ہوگی تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔[1]

چونکہ عدالتی اور انتظامی اصلاحوں پر زیادہ توجہ دی گئی اس لیے رعیت واری بندوبست اور موضع واری بندوبست کے مسئلوں کا فیصلہ وقتی طور سے ملتوی کر دیا گیا۔ ہندوستان میں ستائیس سال محنت سے کام کرنے کے بعد ٹامس منرو انگلستان میں سات سال گزار چکا تھا۔ اُس وقت اس کو عدالتی نظام پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے ایک کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے ایک دفعہ پھر ہندوستان بھیجا گیا اور وہ 16 ستمبر 1814ء کو مدراس پہنچا۔ اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا کہ اس نے عدالتی نظام کو سدھارنے میں کتنی جانفشانی سے کام لیا اور ہندوستان کے لوگوں کو محکمۂ انصاف میں کچھ ذمہ دار عہدے دلوانے کے لیے کس قدر کوشش کی۔ اُس نے مرہٹوں کے ساتھ جنگ کے دوران

---

[1] مراسلہ مورخہ 12 اگست 1814ء

ہندوستان کے لوگوں پر اعتماد کرکے کتنے کارہائے نمایاں انجام دیے اور میدانِ جنگ میں کتنی بہادری دکھائی ان موضوعات کا تعلق موجودہ کتاب سے نہیں ہے۔[1] جنگ ختم ہونے کے بعد منرو جنوری 1819ء میں پھر انگلستان واپس چلا گیا۔ اس کے بعد بندوبست کا مسئلہ زیرِ غور آیا۔

مدراس کا بورڈ آف ریونیو اب بھی موضع داری بندوبست کا حامی تھا اور 1818ء میں اس کے اراکین نے ایک ایسی تفصیلی اور یادگار روداد لکھی جیسی کہ ہندوستان میں اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھی۔

زمینداری طریقے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ مالگزاری جتنی آسانی اور باقاعدگی سے وصول کی گئی ہے اور ہندوستانی ملازمین مال کی بڑی خرابیوں سے جتنی پاک

---

[1] سر جان مالکم نے جو خود بھی ایک نمایاں حیثیت رکھنے والا سپاہی اور ہندوستان کے لوگوں کا دوست تھا، ٹامس منرو کے کام کے طریقے کی تعریف اپنے خط مورخہ 17 فروری 1818ء میں ان الفاظ میں کی ہے۔ "میں آپ کو ٹامس منرو صاحب کے ایک سرکاری خط کی نقل بھیج رہا ہوں جو سر ٹامس ہس لوپ (Sir Thomas Hislop) کو اطلاع دینے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اگر اس خط کا آپ پر بھی وہی اثر ہو جو مجھ پر ہوا تو میرا خیال ہے کہ یہ غیر معمولی انسان جتنا آگے بڑھے گا ہم لوگوں کو پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ہم لوگ غیر شریفانہ طریقے استعمال کرتے ہیں اور جوش اور ہمت کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں لیکن اس ڈرامے میں اس کا کردار کتنا مختلف ہے۔ دشمن کے ملک میں فوجی تحفظ کے بغیر (پانچ قابلِ برخاست دستوں کی حیثیت کیا تھی) اس نے ملک پر غلبہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا، اس فوج کو بھگا دینے کا تہیہ کیا جس کا اس پر قبضہ تھا اور وہ مالگزاری وصول کرنے کا فیصلہ کیا جو دشمن کو ادا ہوتی تھی۔ اس کے لیے اس نے مقامی لوگوں کو استعمال کیا جن کی مدد وہ بے قاعدہ پیدل فوج کر رہی تھی جس کو اس نے اس مقصد کے لیے آس پاس کے صوبوں سے طلب کیا تھا۔ اس کا منصوبہ جو آسان بھی تھا اور بڑا بھی تھا اس حد تک کامیاب ہوا جس حد تک کہ اس کی طرح کا ذہین انسان اس کی پیش بندی کر سکتا تھا۔ ملک اس کے ہاتھ میں جائز ترین طریقے سے آیا ہے یعنی مقامی لوگ اپنی انتہائی کوششوں سے خود اس کے زیرِ اقتدار آئے ہیں تاکہ اس کی حکومت سے مستفید ہو سکیں جو اس کے زیرِ انتظام دنیا کی بہترین حکومت ہے۔"

رہی ہے اور حکومت کو اس نے جس حد تک اپنے کلکٹروں اور نگرانی کرنے والے بورڈوں کے ذریعے وہ فرائض ادا کرنے سے محفوظ رکھا ہے جو سال بہ سال ہونے والے بندوبست کا جز ہوتے ہیں اور مالگزاری کی وصولیابی میں ہونے والے غبن اور بے ایمانی کے الزامات کی تفتیش سے جس قدر بچایا ہے..... وہ سرکاروں میں حکومت کے مطالبے کی ادائیگی کے لیے بے سود کوششوں سے زمینداروں اور پولی گروں کی نادہندگی اور حیلے حوالوں سے، فوج کی امداد اور زیادتی سے، جس کی ضرورت زمینداری اور پولم زمینوں سے سرکاری مطالبے وصول کرنے کے لیے اکثر پڑتی تھی اور ہر طرح کی اُن خرابیوں سے بہت مختلف ہے جو مقامی اداروں میں پہلے عام طور سے پائی جاتی تھیں اور جو اب بھی ان اضلاع میں پائی جاتی ہیں جہاں عارضی بندوبست بحال و برقرار ہے......

"پرانے زمینداروں اور پولی گروں کا شمار ملک کے طبقہ اشراف میں ہوتا تھا۔ حالانکہ جن حالات میں ان کی زمینداری کی ابتدا ہوئی وہ شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہیں پھر بھی لوگوں کے ساتھ ان کے رشتے زیادہ مصلحت اندیشی، فراغ دلی اور انصاف پسندی پر مبنی تھے۔ یہ اوصاف ان رشتوں کو توڑنے کے بجائے تقویت پہنچاتے تھے۔ ہم نے جس وقت سرکاروں پر قبضہ کیا تھا اگر اس وقت ہماری حکومت اتنی ہی طاقتور ہوتی جتنی کہ آئندہ حاصل ہونے والے اضلاع کی منتقلی کے وقت ہو گئی تھی تو حاصل ہونے والے اضلاع کے پولی گروں کی طرح کے پرانے زمینداروں کو ہم ان کی زمینوں سے غالباً بے دخل کر دیتے اور اس حالت کو پہنچا دیتے کہ انھیں وظیفہ خوار بن کر ہمارے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا لیکن جب ہم مقامی سرداروں کے ساتھ یہاں کے لوگوں کی محبت اور زمینداریوں کے تعلق سے مقامی جذبات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کی پالیسی ناسمجھی اور بے مروتی پر مبنی تھی۔"

رعیت واری طریقے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا "رعیت داری طریقے کی ابتدا بارہ محل اور سلیم کے اضلاع سے ہوئی جو 1792ء میں کمپنی کو منتقل ہوئے تھے یہ طریقہ سب سے پہلے کرنل ریڈ نے شروع کیا جو اس ملک پر قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ کرنل منرو، کرنل میک لوڈ اور کرنل گریہم، جو اس وقت لفٹنٹ تھے، کرنل ریڈ کے نائب تھے......

"آرکاٹ کے شمالی حصے میں یہ تمام ترجیحات (میراث داروں یا موروثی دخیل کاروں کے خصوصی حقوق) واپس لے لی گئیں اور سرکاری مالگزاری میں شامل کر دی گئیں۔ ہم چند الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ پیمائش کے بعد شرح تشخیص میں اتنا اضافہ کر دیا گیا کہ آراضی کے حقداران قبضہ کا تمام بقیہ لگان حکومت کی مالگزاری میں شامل کر لیا گیا۔ زمین جوتنے والے اور ریاست کے درمیان کسی درمیانی آدمی کو تسلیم نہیں کیا گیا.....

"واقعہ یہ ہے کہ تحصیلدار اور سرشتہ دار ہر سال رعیت داری بندوبست کیا کرتے تھے اور یہ بندوبست عام طور سے اُس وقت تک نہیں کیا جاتا تھا جب تک فصل جم نہیں جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ طریقہ تھا کہ اتنی زیادہ سے زیادہ مالگزاری لگائی جائے جتنی وصول کرنا ممکن ہو۔ اگر فصل اچھی ہوتی تھی تو پرتال پر مبنی شرح کے اندر رہتے ہوئے مطالبے کو اتنا بڑھا دیا جاتا تھا جتنا کسان ادا کرنے کی سکت رکھتا تھا۔ فصل خراب ہونے کی صورت میں بھی کسان کا آخری پیسہ وصول کر لیا جاتا تھا اور چھوٹ صرف اس صورت میں دی جاتی تھی جب کسان کسی طرح لگان نہیں ادا کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں سختی کے ساتھ تحقیقات کی گئیں۔ کلکٹروں کے ذرائع آمدنی کی تفتیش کے لیے نہ صرف ان کے متعدد ملازموں کو استعمال کیا گیا بلکہ ان کے پڑوسیوں پر تفتیش کی ذمہ داری ڈالی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ کلکٹر کی دولت کا ثبوت بہم نہ پہنچا پائے تو اُس کی خامیوں کے جواب دہ ہوں گے....

"وہ (کسان) اُن کھیتوں پر قبضہ کرنے کے لیے مجبور تھا جو حکام مال اس کو دیا کرتے تھے اور چاہے وہ ان میں کاشت کرے یا نہ کرے لیکن بقول مسٹر ٹھیکرے (Mr Thackeray) اسے ان میں سے ہر ایک کے لگان کا بار اٹھانا پڑتا تھا۔ بلیری کے کلکٹر چیپلن (Mr Chaplin) کے الفاظ میں، جو کرنل منرو کا قابل ترین سابق مددگار ہے اور اب بھی رعیت داری طریقے کا بڑا حامی ہے، رعیت واری طریقے میں یہ رواج تھا کہ "اس وقت کے ضابطوں کی خلاف ورزی کیے بغیر اختیارات سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا تھا تاکہ کسانوں کو ان کے حالات کے مطابق کاشت کرنے پر مجبور کیا جا سکے"۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے کے لیے "ان کو پابند کرنے اور سزا دینے کے اختیار سے" کام لیا جاتا تھا جس پر کلکٹر اور ان کے ہندوستانی ملازمین مال عمل کیا کرتے تھے۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ ان مظالم کی وجہ سے اگر کسان ان کھیتوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا جنھیں وہ

جوتا کرتا تھا تو کوشش کی جاتی کہ " بھگوڑے کا پیچھا کیا جائے، حسب خواہش اس پر لگان لگایا جائے اور اس کو ان فوائد سے محروم کر دیا جائے جو جائے اقامت کی تبدیلی سے اس کو حاصل ہو سکتے تھے۔"

"ہم دیکھتے ہیں کہ بیرونی فاتحوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے، جو ان کے قبضے میں آنے والے نئے ملک کے وسائل سے بے خبر تھا اور وہاں کے اصول لگان داری سے ناواقف تھا، اس وسیع علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد، جس میں بہت سی قومیں آباد تھیں جو رسم ورواج، زبان اور عادات میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں، ایک ایسا قدم اٹھایا جس کو یورپ کے متمدن ممالک میں بھی جنھیں اعداد وشمار پر مبنی ہر قسم کی معلومات حاصل ہیں اور جہاں حکومت اور لوگوں میں ہم آہنگی ہے، ہفت خواں سے تعبیر کیا جائے گا یا ناقابل عمل کہا جائے گا یعنی نہ صرف ہر صوبے، ضلع اور علاقے کا، نہ صرف ہر جاگیر اور زمینداری کا بلکہ اپنے علاقے کے ہر کھیت کا لگان مقرر کرنا چاہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مفروضہ ترقی کی خاطر انھوں نے بلا ارادہ پرانے رشتوں کو توڑ دیا یعنی اُن پرانے رسم ورواج کو ختم کر دیا جو ہر ہندو گانو کی جمہوریہ کو متحد رکھتے تھے اور ایک قسم کے زرعی قانون کے ذریعے انھوں نے اس زمین کو بانٹ دیا اور اس پر نئے لگان عائد کیے جو قدیم زمانے سے گانو پنچایت کی مشترک ملکیت تھی۔ یہ زمین نہ صرف حقوق یافتہ افراد (میراث داروں اور قدیمیوں) میں بانٹی گئی بلکہ کم حیثیت والے کسانوں میں بھی تقسیم کی گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے لاعلمی کی بنا پر ان رواجوں کی نفی کی اور اس طرح زمین پر ذاتی ملکیت کے حق کو ختم کر دیا۔ ایک عوامی ادارے سے اس کی زمین چھین لی اور اس کے عوض ایک شخص کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ کہا تو یہ گیا کہ ان کا مطالبہ ہر کھیت تک محدود ہے لیکن اس طرح کے حدود عائد کر کے، جو اصل میں اتنی رقم پر مشتمل ہوتے تھے کہ ان کی وصولی ممکن نہیں تھی، کسانوں پر من مانی لگان عائد کر دیا جاتا تھا اور پچھلے زمانے کی مسلمان حکومت کی طرح کسان کے ہاتھ میں ہل پکڑا دیا جاتا تھا اور کسان کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اس زمین کو جوتے جس پر مسلمہ طور سے زیادہ لگان لگایا جاتا تھا۔ اگر وہ بھاگ جاتا تو اس کو زبردستی واپس لایا جاتا تھا۔ وصولیابی فصل تیار ہونے تک ملتوی رکھی جاتی تھی اور اس کے بعد جو کچھ اسے حاصل ہوتا اس سے چھین لیا جاتا تھا۔ اس کے بیلوں اور بیج کے علاوہ اُس سے سب کچھ چھین جاتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ مجبور تھے کہ کسان کو بیل اور بیج مہیا کریں تاکہ وہ اپنے لیے نہیں ان کے لیے

کاشت کا تکلیف دہ کام جاری رکھ سکے۔"

منرو نے جس دائمی اور اعتدال پر مبنی تشخیص کی سفارش کی تھی اس کے بغیر رعیت واری طریقے میں کسان اس نوبت کو پہنچ گئے تھے۔ ان سے زیادہ زوردار الفاظ میں کسی "انسانی چڑیا گھر" کی تصویر پہلے کبھی نہیں پیش کی گئی تھی۔

آخر میں بورڈ نے موضع واری طریقے کے متعلق لکھا تھا "حالانکہ ہر ضلع میں اس طریقے نے یکساں کامیابی نہیں حاصل کی ہے پھر بھی جہاں (جیسے بلیری میں) اس نے کم سے کم کامیابی حاصل کی ہے وہاں کے کلکٹروں کی بھی یہ متفقہ رائے ہے کہ اس نے ملک کے زراعت پیشہ لوگوں کے حالات میں سدھار پیدا کیا ہے اور موضع واری بندوبست سے زیادہ فائدہ ان فریقوں کے بجائے جن سے بندوبست کیا گیا عام کسانوں کو پہنچا ہے۔ رعیت واری سردار قریب قریب ہر جگہ بہت کم ہو گئے ہیں اور اس کے بجائے کہ سرکردہ کسان اپنے سے کم حیثیت والے کسانوں پر مظالم توڑیں بہت سے کلکٹروں کو اس پر مجبور ہونا پڑا ہے کہ ان کے کم ہوتے ہوئے اقتدار کو اپنے تحصیلداروں سے سہارا دلوائیں۔ قریب قریب سب کی رپورٹوں میں یہی بات کہی گئی ہے اور یہ وہ نتیجہ ہے جس کو اس بات کے قطعی ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس طریقے نے ان لوگوں کے توقعات پورے کر دیے ہیں جنھوں نے اس کو شروع کیا تھا۔ کڑپا اور ارکاٹ کے شمالی حصے کی طرح جہاں جہاں یہ بندوبست کامیابی کے ساتھ ہو سکا ہے وہاں خوشحالی کی ایسی تصویر نظر آتی ہے جس کی نظیر اس پریسیڈنسی کے مالگزاری کی دستاویزات نہیں پیش کر سکتی ہیں[1]۔"

یہ آخری اپیل بھی بے سود ثابت ہوئی۔ رعیت واری بندوبست کا عظیم معمار، جواب سر ٹامس منرو کے۔ بی۔ سی (K.C.B.) کے نام سے جانا جاتا تھا، تیسری اور آخری دفعہ مدراس کے گورنر کی حیثیت سے ہندوستان واپس آیا۔ صرف ان علاقوں کو چھوڑ کر جہاں زمینداروں اور پولی گروں کے ساتھ زمینداری کا بندوبست ہو چکا تھا تمام صوبے کے لیے رعیت واری طریقہ منظور کر لیا گیا۔ اسی سال گزر جانے کے بعد جب ہم اس یادگار مباحثے پر غور کرتے ہیں تو ہندوستان کی تاریخ کا طالب علم دکھ کے ساتھ ان کے متعلق سوچتا ہے اور

---

[1] بورڈ کی روداد مورخہ 5 جنوری 1818ء۔

سر ٹامس منرو کے اعلیٰ ذاتی کردار کی تعریف اس احساس میں مانع نہیں ہے کہ اس تنازع میں بورڈ کا موقف درست تھا۔ ایک ذی فہم حکومت ملک کے ان قدیم اداروں کو فروغ دیتی ہے جو ترقی سے ہم آہنگ ہوں، اور اس طرح ان کی اصلاح کرتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں گانو کے داخلی معاملات کا انتظام تحصیلدار، سررشتہ دار اور پولیس والوں کے بجائے خود گانو والے زیادہ کامیابی کے ساتھ اور زیادہ اطمینان بخش انداز سے کر سکتے تھے۔ اس سے سب انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے کہ جہاں ممکن ہو وہاں لوگوں کے بڑے طبقوں کو اپنے معاملات کا انتظام خود کرنے دیا جائے۔ اگر منرو نے اپنے بندوبست کے ابتدائی زمانے میں بارہ محل، کنارہ اور حاصل ہونے والے اضلاع میں گانو پنچایتوں کو فعال صورت میں دیکھا ہوتا تو وہ خود اس طریقے کی زوردار حمایت کرتا۔ چونکہ وہ ان مقامات پر کسانوں سے راست بندوبست کر چکا تھا، حکومت مدراس اور ہاؤس آف کامنز کے سامنے اس کی وکالت کر چکا تھا، اور کمپنی کے ڈائرکٹروں سے صوبے کے اُن حصوں میں اس کو نافذ کرنے کی اجازت حاصل کر چکا تھا جہاں اس وقت تک بندوبست نہیں ہوا تھا اس لیے وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں نہ اپنی رائے بدل سکتا تھا اور نہ اس بات کو سمجھ سکتا تھا کہ اسے گانو پنچایتوں کی وساطت سے اس پسندیدہ نظام مالگزاری کو نافذ کرنا چاہیے جس کو 1812ء اور 1818ء کی درمیانی مدت میں بورڈ آف ریونیو نے رائج کیا تھا۔ مدراس کے گورنر کی حیثیت سے سر ٹامس منرو نے دیہی اداروں کو فروغ دینے کی ہر امکانی کوشش کی۔ اس نے پنچایتوں کی تنظیم کی اور انھیں عدالتی اختیارات دیے اور اس نے کوشش کی کہ ہندوستان کی گانو پنچایتیں اُسی طرح زندہ ادارے بنے رہیں جیسے کہ وہ گزشتہ زمانے میں تھے لیکن یہ کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ جب پرانے اداروں سے حقیقی اختیارات چھین لیے جاتے ہیں تو ظاہری اختیارات ان کو زندہ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ گانو کے لوگ، جنھیں چھوٹے چھوٹے مال کے افسر اور رشوت خور پولیس والے پریشان کیا کرتے تھے، حسب سابق ایک منظم جماعت کی حیثیت سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ انگریزی راج شروع ہونے کے بعد ہندوستان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں سے کچھ کی بنا پر ترقی اور سدھار ہوا ہے اور کچھ افسوسناک تھیں لیکن سب سے افسوسناک تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ وہ گانو پنچایتیں جنھوں نے دنیا کے دیگر ملکوں کے مقابلہ میں سب سے پہلے ہندوستان میں جنم لیا تھا صفحۂ ہستی سے

مٹ گئیں۔

موضع داری بند و بست جس کی وکالت بورڈ آف ریونیو نے کی تھی قطعی طور سے مسترد کر دیا گیا۔ یہ واقعہ جدید قاری کے لیے محض علمی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اہمیت اس واقعہ کی ہے کہ رعیت داری طریقہ بھی جس کی وکالت خود ٹامس منرو نے کی تھی پوری طور سے باقی نہ رہ سکا۔ ٹامس منرو نے 1807ء اور 1813ء میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا رعیت داری طریقے کا لازمی جز دائمی تشخیص ہے اور یہ کہ صرف غیر مزروعہ زمینوں کو چھوڑ کے رعیت داری بند و بست اسی طرح استمراری ہے جیسے بنگال کا زمینداری بند و بست۔ مدراس کے اُن تمام اضلاع میں جن کا بند و بست نہیں ہوا تھا 1820ء میں رعیت داری طریقہ رائج کیا گیا لیکن دائمی تشخیص کا اصول، جس کو 1862ء تک حکومت مدراس تسلیم کرتی رہی تھی، بعد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ریاست کا مطالبہ غیر یقینی ہے اور ہر نئے بند و بست کے وقت ایسے اسباب کی بنا پر اس میں تبدیلی کی جاتی ہے جنھیں لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ سے مدراس کی زراعت پیشہ آبادی دائمی تذبذب اور افلاس کا شکار رہا کرتی ہے۔

باب 9

(منرو اور مدراس کا رعیت واری بندوبست 1820ء - 1827ء)

سر ٹامس منرو مئی 1820ء میں صوبے کے گورنر کی حیثیت سے مدراس آیا اور اسی مہینے میں اعلان کر دیا گیا کہ رعیت واری طریقہ رائج کر دیا گیا ہے۔ غفلت اور کوتاہی کی صورت میں قرقی کی گئی یا زمین خریدی گئی بہر حال ہر امکانی کوشش کی گئی کہ زمینداریوں موتاہوں اور ایسی زمینوں کو جن پر دوسری نوعیت کا مالکانہ قبضہ تھا حاصل کر لیا جائے اور ان میں رعیت واری طریقہ رائج کر دیا جائے۔ گانو کے پٹّے تیزی کے ساتھ ختم کر دیے گئے۔ کلکٹروں کو ہدایت کی گئی کہ جہاں مشترک حق ملکیت پایا جائے اس کے ٹٹوارے کی ہمت افزائی کی جائے اور کسانوں سے علیحدہ علیحدہ پٹّا کیا جائے۔ تشخیص کی اونچی شرح کی رو سے ریاست کا مطالبہ کھیت کی پیداوار کا ½45 فی صدی یا 50 فی صدی یا 55 فی صدی مقرر کیا گیا تھا، یہ اقدام بے اندازہ تکلیفوں کا باعث تھا اس لیے سر ٹامس منرو کی حکومت نے جو دوسروں کی تکلیف کا لحاظ رکھتی تھی اس شرح میں کمی کر دی۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس باب میں مدراس کے ہر ضلع میں رعیت واری طریقہ رائج کیے جانے کی تاریخ کا جائزہ لیں۔ صوبے کی اُس زمانے کی ضخیم دستاویزات کے کچھ اقتباسات اس دور کی کارگزاریوں اور مدراس کے لوگوں کی معاشی حالت پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

نیلوّر

نیلوّر کے کلکٹر نے تجربے کے طور پر رعیت واری طریقہ رائج کرنے کے لیے کودُر کے گانو کا انتخاب کیا۔ اس سے پہلے 1818ء میں زمین کی پیمائش، درجہ بندی اور تشخیص کی گئی۔ بورڈ آف ریونیو کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تشخیص کس طرح کی گئی اور بعد میں اس میں کیا ترمیم کی گئی؟ سینچائی کی زمین: اس زمین پر اوسطاً 2 روپیہ فی کینڈی قیمت فروخت کے حساب سے ½37، ½34 روپے حاصل ہوتے ہیں جس میں سے معمول کے مطابق ½6 فی صدی یا ¼2،234 روپے منہا کیے جاتے ہیں اور اس طرح سرکار کی ریاست اور کسانوں کے درمیان

تقسیم کرنے کے لیے 139ر32 روپیہ باقی بچتا ہے۔"[1]

"کسانوں کو بیس روپے میں سے نو روپے یا صرف 45 فی صدی حصہ ملتا ہے اس کی مجموعی تعداد 62ر14 روپیہ ہوتی ہے اور سرکار کو حاصل ہونے والی رقم 667ر17 روپیہ ہے۔" بارانی زمین: "بارانی زمین اور باغات کی پیداوار کا تخمینہ بھی اسی قسم کے اصولوں کے مطابق لگایا جاتا ہے۔ اگر اس کی پیداوار کو 28 روپیہ فی کنیڈی کے حساب سے فروخت کیا جائے تو بارانی زمین پر حکومت کا حصہ 678 روپیہ اور باغات میں 205 روپیہ ہوتا ہے۔"

کسانوں نے کلکٹر کی لگائی ہوئی مفروضہ قیمت اور تخمینوں پر اعتراض کیا۔ کچھ چھوٹ دی گئی اور بورڈ اس نتیجے پر پہنچا کہ "کوڈر کی سالانہ مالگزاری کا تخمینہ تقریباً 600ر15 روپیہ ہوگا" دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئے نظام میں حکومت نے بطور مالگزاری گانو کی پیداوار کے نصف حصے کا مطالبہ کیا ہے۔[2]

ترچناپلی:

ترچناپلی کے کلکٹر نے تیرتاپور کے گانو کا انتخاب کیا۔ گانو کی پیمائش ہوئی اور زمین کی درجہ بندی کے بعد مالگزاری تشخیص کی گئی۔ رواج کے مطابق کی جانے والی منہائیوں کے بعد مجموعی پیداوار کا تخمینہ 816ر5 کُولم لگایا گیا۔[3]

"اس کو سرکار اور کسانوں کے درمیان رواج کے مطابق اگر 50 فی صدی کے حساب سے تقسیم کیا جائے تو سرکار کے حصے میں 2,908 کُولم آئیں گے۔ اگر کلکٹر کی سفارش کے مطابق اس کو پچھلے تین سال کی اوسط قیمت کے اعتبار سے روپے میں تبدیل کیا جائے تو اس کی مجموعی رقم 232ر3 روپے ہوگی۔"[4] کچھ مزید منہائی اور اضافے کے بعد مالگزاری 211ر3 روپے مقرر کی گئی۔ زمین کی پیداوار کا نصف حصہ زمین کے محصول کے طور پر عائد کیا گیا۔ یہ تباہ کن محصول تھا۔

---

[1] ان اقتباسات میں آنے، پائیاں ترک کر دی گئی ہیں۔

[2] بورڈ آف ریونیو کی روداد، مورخہ 17 ستمبر 1818ء

[3] کسر چھوڑ دی گئی ہے۔

[4] بورڈ آف ریونیو کی روداد، مورخہ 26 نومبر 1818ء

لیکن مدراس کا بورڈ اپنے مطالبے کو کم کرنے اور پیداوار کا ایک تہائی حصہ بنانے میں بھی سستی سے کام لے رہا تھا حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ اس کا مطالبہ اعتدال پر مبنی ہے۔ بورڈ نے کہا تھا، "حالانکہ مجموعی پیداوار کے ایک تہائی حصے کو، جس کی قیمت کا اندازہ لگانا ہوگا اور روپے کی صورت میں ادا کرنا ہوگا، ہم عام تشخیص کا معیار نہیں قرار دے سکتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے اعتدال کا راستہ اختیار کرنے میں کلکٹروں کی رہنمائی ہوگی۔"

کیمبٹور :

کیمبٹور کے ضلع میں ظالمانہ حد تک اونچی شرح تشخیص کی خرابی میں رشوت ستانی کی خرابی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ان خرابیوں کی تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ خزانچی کاسی چیٹی نے جب سے کام سنبھالا ہے "اُس نے ملک کے ہر آدمی اور ہر شے کو اپنی نجی تجارت میں فائدہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنے پر توجہ مرکوز کردی ہے۔" مسٹر گیرو (Mr Garrow)، ضلع کلکٹر کے متعلق شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ بھی رشوت لیتا ہے اور کورٹ آف ڈائرکٹرز نے 1821ء میں سر ٹامس منرو کو جو اس وقت مدراس کا گورنر تھا اس کے متعلق ایک تحریر بھیجی تھی۔

"یہ خرابیاں خود بھی اہم ہیں لیکن جب ہم سوچتے ہیں کہ وہ ہمارے اداروں میں پیدا ہونے والے نقائص کی گواہ ہیں تو اس سے اور زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے پاس اس یقین کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ کیمبٹور میں ہوا ہے وہ دوسرے اضلاع میں نہ ہوا ہوگا۔ ایک کلکٹر کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ بورڈ آف ریونیو کا اعتماد حاصل کرکے ایک دغاباز ہندوستانی کے جرم میں شریک ہوجائے یا اس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے اور پورے علاقے کو اس کی بدانتظامی کا شکار بنادے یعنی ایسے لوگوں کے جال میں پھنسے جو حکومت کے اختیارات استعمال کریں۔ اگر کلکٹر کی کمزوری یا اس کی رشوت ستانی کے وہ نتائج ہوں جو کیمبٹور میں دیکھنے میں آئے جن کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی جائیداد اور سرکاری مالگزاری حکومت کے ادنیٰ ملازموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی اور اس قسم کے واقعات اگر ان لوگوں کو متوجہ نہ کرسکیں جنھیں حکومت کے کاموں کی نگہداشت اور خرابیوں کو دور کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے تو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ خرابی بڑے پیمانے پر موجود ہے اور زیادہ موثر حفاظتی اقدام ضروری ہیں۔ مسٹر گیرو کا انتقال ہوجانے کی وجہ سے

اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے کہ انھیں ملازمت میں بحال رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کیا جائے پھر بھی ان کے جرائم کی نوعیتوں اور سنگینی پر غور کرنا ضروری ہے۔ بہرحال یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ کسی حاکم کے تحت اگر اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی طویل مدت تک خرابیاں موجود رہیں اور ان سے ان کے ماتحت بڑے بڑے فائدے حاصل کریں اور وہ خرابیاں اس قسم کی ہوں کہ تھوڑی سی نگرانی سے ان کا تدارک کیا جا سکے تو اس کو کسی نہ کسی حد تک اس امر کی شہادت سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خود اُس جرائم میں شریک تھا۔[1]

دوسرے سال بورڈ آف ریونیو نے ایک اور خط لکھا تھا جس میں غلط پردیے کی بنا پر ہونے والے مظالم کے علاوہ کیمبٹور کی ضرورت سے زیادہ اونچی شرح تشخیص کی تفصیلات پیش کی تھیں۔

"رواج کے مطابق تمام قابل زراعت زمینوں پر، جس میں باغات شامل نہیں ہوتے ہیں، ایک لگان عائد کیا جاتا ہے جس کو پورا لگان کہتے ہیں۔ یہ لگان تمام قابل زراعت آراضی پر لگایا جاتا ہے چاہے وہ مزروعہ ہو یا غیر مزروعہ۔ پورے لگان کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی حصہ اس زمین سے بطور لگان وصول کیا جاتا ہے جس پر گھاس ہوتی ہے اور پورے لگان سے کچھ زیادہ باغ پر لگایا جاتا ہے۔۔۔۔۔

"اس نے (مسٹر سولیون (Mr Sullivan) نے جو کلکٹر تھا) اپنے مراسلے مورخہ 7 ستمبر 1816ء میں لکھا ہے" جب کوئی کسان دو سال تک زمین پر قابض رہتا ہے اور اس کا لگان ادا کیا کرتا ہے تو اُس کو زمین کا مالک سمجھا جاتا ہے اور جب تک وہ لگان ادا کرنے کے قابل رہتا ہے اس کو اس لگان کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ حکومت اس کے (کسان کے) مفاد کے بجائے خود اپنے مفاد میں اس کی ملکیت کا فیصلہ کرتی ہے تاکہ لگان کی ایک مقررہ رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری اس پر ڈال دی جائے"۔۔۔۔۔

"جس زمین کی آبپاشی کنوئیں کے پانی سے کی جا رہی ہو یا جس میں باغ لگے ہوں ان پر لگائے جانے والے مزید محصول کے متعلق کلکٹر نے بجا طور سے کہا ہے کہ یہ محصول زمین کی

---

[1] مدراس کے گورنر ان کاؤنسل کے نام بورڈ آف ریونیو کا خط بابت مالگزاری مورخہ 31 اکتوبر 1821ء

ترقی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے اس علاقے میں زمین کو ترقی دینے کا سب سے بڑا ذریعہ کنوئیں تعمیر کرنا ہے۔ کنواں، ایک کھیت کی آبپاشی کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس کو ان موسمی حادثات سے محفوظ رکھتا ہے جو ہندوستان میں کئی صورتوں میں پیش آتے ہیں اور کبھی کبھی انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کنوئیں تعمیر کرنے کی ہمّت افزائی کی جائے۔ ہمّت افزائی کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنی محنت کا پھل حاصل کر سکیں۔ کلکٹر کا کہنا ہے کہ لوگ کنوئیں تو تعمیر کرنا چاہتے ہیں لیکن اضافہ محصول سے ڈرتے ہیں[1]۔"

اونچی شرح تشخیص کی شکایتوں سے اس زمانے کی خط و کتابت بھری ہوئی ہے۔ ڈائرکٹرز نے اگرچہ مسٹر گیروے کے جرائم کی مذمت تو زوردار الفاظ میں کی لیکن اپنی غلطیوں کی نہ تو وضاحت کی اور نہ اُن کے تدارک میں مستعدی دکھائی۔ مندرجہ بالا خط کے صرف تین ہفتے بعد انھوں نے ایک اور خط لکھا جس میں کہا گیا تھا۔

"اس نے (ترچناپلی کے کلکٹر نے) مزید لکھا ہے "افلاس اور تکلیف کے وہ تمام مظاہر جو خون نچوڑنے کا لازمی نتیجہ ہوا کرتے ہیں ترچناپلی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ زمینی جائداد کی قیمتوں میں ہونے والی کمی یہ ظاہر کرتی ہے کہ زراعت کی ترقی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں، میراث دار جو کچھ مدّت پہلے ہزاروں کانی زمین پر کاشت کرتے تھے اب صرف چند سو پر قابض ہیں۔ اگر شرح تشخیص میں تبدیلی نہیں کی گئی یا بقایا لگان کی وصولیابی نہیں روکی گئی تو امسال یا اگلے سال یہ زمین بھی فروخت ہو جائے گی۔ میں خاص طور سے بورڈ کو اس امر کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ موجودہ شرح تشخیص کو برقرار و بحال رکھنا کسی طرح ممکن نہیں ہو سکے گا"

"موجودہ اہم خرابیوں کا تدارک کرنے کے لیے آپ نے (حکومت مدراس نے) یہ مناسب سمجھا کہ پٹّوں کی تنسیخ کے بجائے اُس حد تک لگان میں چھوٹ دی جائے جتنی کہ مخصوص حالات میں کلکٹر کو ضروری معلوم ہو۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سالانہ بندوبست کے مترادف ہے۔

---

[1] مدراس کو مالگزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائرکٹرز کا مراسلہ مورخہ 2 جنوری 1822ء

آپ کو اس سلسلے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ سالانہ بندوبست کے مضر اثرات تو وجود میں آجائیں لیکن اُس کا صحت مند پہلو معدوم ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ حالتوں میں آپ کو لگان دار پر بہت زیادہ بوجھ ڈالنا ہوگا اور دوسری صورتوں میں حکومت کے مفاد کو قربان کرنا ہوگا۔ اس کا پیمانہ کلکٹر کا جوش یا اس کی انسانیت اور اس کی بے توجہی یا اُس کی سختی ہوگی[1]۔

یہ الفاظ دیگر شرح تشخیص ناقابل برداشت حد تک اونچی رکھی تھی اور کسانوں سے سال بہ سال اتنی رقم وصول کرنی تھی جتنی وہ ادا کر سکتے تھے اور ڈائریکٹر اس کو لوگوں کے حالات میں سدھار کے مترادف سمجھتے تھے۔

تنجور:

ایک زمانے میں پھولتی پھلتی ریاست تنجور کی کہانی بھی اسی قسم کی ہے۔ "تنجور کا پٹے داری بندوبست 1229ف (1820ء) میں ختم ہوگیا۔ چونکہ پیداوار کی قیمت کم ہوگئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ بھی کم رہے گی اس لیے رقم کی شرح تشخیص مطلوبہ شرح سے زیادہ ہو گئی تھی اور چھوٹ کی ضرورت کے متعلق کافی شہادت موجود تھی ......

"ہمیں یقین ہے کہ یہ امر عین مصلحت کے مطابق تھا کہ آپ (حکومت مدراس) رقم کی صورت میں مالگزاری مقرر کرنے کے اصول پر سختی سے قائم رہے حالانکہ لوگ تقسیم پیداوار کے پرانے طریقے کی طرف مائل تھے......"

"اس قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ نے جو اصول بنایا ہے وہ ہماری رائے میں مناسب ہے" یعنی یہ کہ شرح لگان میں اس وقت تک اضافہ نہ کیا جائے جب تک کے غلے کی قیمت میں دس فی صدی کا اضافہ نہ ہو جائے لیکن غلے کی قیمت میں بقدر پانچ فیصدی کمی ہونے کی صورت میں چھوٹ دی جائے۔ شرح میں کمی یا زیادتی قیمت کی تبدیلی کی مناسبت سے کی جائے[2]۔

---

[1] مدراس کو مالگزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کا مراسلہ مورخہ 12 دسمبر 1821ء
[2] مدراس کو مالگزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کا مراسلہ مورخہ 18 اگست 1824ء

آرکاٹ :

آرکاٹ سے بھی اسی قسم کی دکھ بھری کہانی سننے کو ملتی ہے۔

"کلکٹر کی سفارش پر بورڈ نے ایک اور تجویز پیش کی اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے "سختی کے ساتھ اس پر زور دیا" یعنی یہ کہ شرح لگان میں کمی کی مانگ۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر ہم خاص طور سے توجہ دیا کرتے ہیں۔ کلکٹر اور بورڈ آف ریونیو ہماری شرح تشخیص سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شرح تشخیص "اتنی اونچی ہے کہ کوئی بھی تباہ حال ملک اس کو بمشکل ہی برداشت کر سکتا ہے"۔ انھیں یقین ہے کہ اس کو وصول تو کیا جا سکے گا۔ لیکن اس شرح لگان کے ساتھ ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ ملک کو ترقی کے قابل بنانے کے لیے سات سے دس فی صدی کی چھوٹ کی تجویز کی گئی۔

"اس پر آپ نے (حکومت مدراس نے) ضرورت سے زیادہ اونچی شرح لگان کی برائیوں کے متعلق سختی سے اپنی رائے ظاہر کی ہے اور آپ نے مزید کہا ہے کہ آرکاٹ کے شمالی حصے میں لگان کی شرح کم کرنے کے تمام تر اسباب دوسرے اضلاع میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بلکہ آپ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس قسم کے حالات ملک کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں اور آپ نے عام کمی کی سفارش کی ہے۔ آپ کا تجویز کردہ معیار یہ ہے کہ مجموعی پیداوار کا ایک تہائی حکومت کا حصہ ہونا چاہیے.......

"ہمیں اس میں شک ہے کہ ایک تہائی یا پیداوار کے کسی دوسرے متناسب حصے کو شرح لگان کا لازمی معیار قرار دیا جانا ضروری ہے"[1]

یہ اقتباسات کافی ہیں۔ ان سے ہر پڑھنے والے پر یہ واضح ہو جائے گا کہ انیسویں صدی کے پہلے ربع میں جنوبی ہند کے لوگوں کو مقامی افسروں کی سختیوں اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کی حرص کی بنا پر کتنے افلاس اور دکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سر ٹامس کو داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے سات سالہ دور حکومت میں لگان میں تخفیف کی لگاتار کوشش کرتا رہا اور پورے صوبے میں لگان کو کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے خود اپنے واضح اور زوردار اسلوب تحریر میں اپنے

1۔ مدراس کو مالگزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کا مراسلہ مورخہ 12 دسمبر 1821ء

مقاصد اور کوششوں کی داستان اس روداد میں سنائی ہے جو 31 دسمبر 1824ء کو لکھی گئی تھی ۔ غالباً یہ سب سے زیادہ پرمغز اور مدبرانہ روداد ہے جو لارڈ کارنوالس کے بعد ہندوستان میں لکھی گئی ۔ یہ ایک طویل دستاویز ہے جو ایسٹ انڈیا کاغذات کے تیس صفحات پر مشتمل ہے[1]۔"

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس بیش بہا دستاویز کا پورا خلاصہ پیش کر سکیں اس لیے ہم روداد کے صرف ان حصوں کے اقتباسات پیش کریں گے جن کا تعلق لوگوں کی حالت سے ہے۔

زمین کا معینہ اور واجبی لگان

زمین کی حالت کو بہتر اور اس کو قابل فروخت بنانے کے لیے، کسانوں کی ہمت افزائی کرنے اور اس غرض سے کہ وہ زمین کو دائمی جائداد سمجھیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ شرح لگان موجودہ شرح کے مقابلے میں معینہ اور واجبی ہو مزید یہ کہ اس کی ایسی وضاحت کر دی جائے کہ لاعلمی یا حرص کی بنا پر اس میں اضافہ نہ کیا جا سکے .....“

” اصل مالک کسان ہے ۔ جو زمین بادشاہ کی ملکیت نہیں ہے وہ کسان کی ملکیت ہے مختلف جگہوں پر مختلف اوقات میں سرکاری مالگزاری کے مطالبے کی کمی یا زیادتی کا اثر کسان کے حصے پر پڑتا ہے ۔ چاہے اس کے پاس صرف لاگت کا منافع بچے یا مالک آراضی کے لگان کی صورت میں تھوڑی سی بچت ہو جائے، بہر حال حقیقی مالک وہی ہے اور بادشاہ مالگزاری کے طور پر جس چیز کا مطالبہ نہیں کرتا ہے وہ کسان کی ملکیت ہے ......“

” زمین کے بیش قیمت جائداد بن جانے کے راستے میں جو چیز حائل ہے وہ شرح لگان ہے جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اضافہ ہوتا رہے گا ۔ جہاں لگان کم سے کم ہے وہاں بھی یہ خیال کہ اس میں کسی وقت اضافہ کیا جا سکتا ہے زمین کو وہ حیثیت حاصل نہیں کرنے دیتا جس کی بنا پر وہ قابل فروخت شے بن سکے ۔ جب تک زمین کے ہر حصے میں شرح لگان معین نہ کر دی جائے ہمارے لیے یہ ممکن

---

[1] جلد 3، لندن ۔ 1826ء، صفحات 602 ۔ 632 ۔

نہیں ہے کہ ہم زمین کو وہ حیثیت دے سکیں جو اس کو ملنی چاہیے، یا ہم اس کو ایک ایسی نجی جائداد کی حیثیت دے سکیں کہ وہ آسانی سے بیع یا رہن کی جا سکے۔ جب شرح لگان معین ہو جاتی ہے اور بے یقینی کی حالت باقی نہیں رہتی تو تمام اس زمین کی قیمت بڑھ جاتی ہے جس پر بہت زیادہ لگان نہیں عائد ہوتا۔ جب کسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا پھل حاصل کر سکے گا تو وہ زمین کو ترقی دیتا ہے جس سے اس کی قیمت میں دن بدن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔"

انتظامی کاموں کے لیے ہندوستانیوں کی خدمات حاصل کرنے کا سوال

"کس منہ سے ہم پدرانہ حکومت کی بات کر سکتے ہیں اگر ہم انھیں تمام اہم خدمات سے علیحدہ رکھیں اور کہیں، جیسا کہ ہم کچھ مدت پہلے تک کہتے رہے ہیں، کہ ایک ایسے ملک میں جہاں پندرہ ملین انسان بستے ہیں صرف ایک یوروپین کے علاوہ کسی کو اتنے اختیارات بھی نہیں دیے جا سکتے ہیں کہ چھڑی کی ایک ضرب مارنے کا حکم دے سکے۔ اس قسم کا حکم امتناعی ایک پوری قوم کو ذلت کی سزا دینے کے مترادف ہے جس سے کبھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ کسی قوم کو کبھی اتنی توہین آمیز سزا دی گئی ہو۔ انسانیت کا وہ کمزور اور غلط تصور، جو اس خیال کی بنیاد ہے، ہندوستانیوں کی نظر میں اس توہین کو حق بجانب قرار نہیں دے سکے گا کہ انھیں ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے اور ان کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے چھوٹے موٹے جرائم کا بھی فیصلہ کر سکیں۔ ہم کہتے تو یہ ہیں کہ ہم ان کی ترقی کے خواہاں ہیں لیکن ذرائع ایسے اختیار کرتے ہیں جو ہماری کامیابی کو ناممکن بنا دیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کی وکالت کرنے والوں کی نظر اُن عوامل پر نہیں جو ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔ وہ ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے، ان کو کوئی اختیارات نہیں سونپنا چاہتے اور حتی الامکان انھیں تمام عہدوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں لیکن علم کی روشنی پھیلا کر ہندوستانیوں کو روشن دماغ بنانے کا اُنھیں نہایت شوق ہے۔

" قرون مظلمہ نے بھی اس قسم کے مہمل زعم کو شاید ہی جنم دیا ہو۔ آخر ہر ملک اور ہر زمانے میں تحصیل علم کا محرک شہرت، دولت اور خوف حاصل کرنے کے جذبے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یا بڑے بڑے کمال حاصل کرنے سے کیا فائدہ اگر ان کا بہترین استعمال یعنی قوم کی خدمت نہ کی جا سکے اور صاحب کمال لوگوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق ملک کے انتظامی کاموں میں مختلف فرائض ادا کرنے کا موقع نہ دیا جائے ......"

" صرف کتابوں سے کیا ہوگا۔ سیدھا سادھا خشک ادب کسی قوم کا کردار نہیں تبدیل کرسکتا۔ یہ صرف اُس وقت ہوسکتا ہے جبکہ علم و دولت، عزت اور سرکاری ملازمتوں کے راستے کھول دیے جائیں۔ اس قسم کے فوائد کی توقع کے بغیر سائنس کے کمالات لوگوں کے کردار کو بلند نہیں کرسکیں گے۔"

" اس کا اطلاق دوسری قوموں کی طرح ہندوستان پر بھی ہوتا ہے۔ خود ہماری قوم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر برطانیہ پر کل کسی بدیسی طاقت کا تسلط ہو جائے۔ لوگوں کو حکومت میں حصہ لینے سے محروم کر دیا جائے، ان کی کوئی عزّت نہ ہو، وہ کوئی ایسا اعلیٰ عہدہ نہ حاصل کرسکیں جس سے اعتماد بھی ظاہر ہو اور مالی منفعت بھی حاصل ہو، ان کو ہر حال میں ناقابل اعتماد سمجھا جائے تو ان کا تمام علم اور تمام ادب چاہے وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی انھیں ایک یا دو نسلوں میں تنگ خیال، دغا باز اور بے ایمان قوم بننے سے نہیں بچا سکتا ہے۔"

" اگر ہم فرض بھی کرسکیں کہ کسی ہندوستانی کی مدد کے بغیر ملک کا تمام کاروبار اعلیٰ اور نچلی سطح پر یورپینوں کی مدد سے چلایا جا سکتا ہے پھر بھی ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ سیاسی غلطی بھی ہوگی اور اخلاقی غلطی بھی۔ ہماری حکومت سے ہندوستان کے لوگوں کے دلی تعلق کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت سے سرکاری دفتروں میں روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔ جوں جوں ہم انھیں ملازمتوں سے علیحدہ کریں گے ان پر ہماری گرفت کمزور ہوتی جائے گی۔ اگر ہم نے سب کو علیحدہ کر دیا تو ہمارے لیے محبت کے بجائے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جائے گی۔ ان کے احساسات پوری آبادی کو متاثر کریں گے، اس کا اثر ہندوستانی فوج پر پڑے گا اس کے نتیجہ میں اتنی زیادہ بے چینی پیدا ہوگی کہ ہمارے لیے اس پر قابو پانا یا اس کی مزاحمت کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اگر یہ صورت ممکن بھی ہو کہ وہ کوئی مخالفت نہ کریں اور خاموشی سے سپر انداز ہو جائیں تو صورت حال بدتر ہو جائے گی۔ ان کے کردار پست ہو جائیں گے، سرکاری منصب و اعزاز کی امیدیں ختم ہو جائیں گی تو ان کی امنگوں پر بھی پانی پھر جائے گا اور وہ ایک مجہول اور قابل نفرت قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو اپنی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ تمام اعلیٰ مقاصد سے بے نیاز ہوگی۔ اگر ہمارے طریقہ حکومت کا نتیجہ ایک پوری قوم کی ذلت و خواری کی صورت میں نکلے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم اس ملک سے نکال دیے جائیں۔"

محاصل اور قانون سازی

"لوگوں کا یہ حق کہ ان پر محاصل اُن کی مرضی کے مطابق عائد کیے جائیں تمام آزاد ممالک میں اہم ترین حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے انسانوں کے خیالات کو بہت متاثر کیا ہے اور آزادی کے محافظوں نے جس بات کا اکثر پُر زور الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ اُن ملکوں میں بھی جو آزاد نہیں ہیں محاصل حکومت کے اہم ترین فرائض میں داخل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محاصل کا اثر لوگوں کی آسایش اور مسرت پر پڑتا ہے اور اس بات نے انھیں اکثر مزاحمت پر آمادہ کر دیا ہے۔ چنانچہ محاصل کی افادیت اور خطروں نے مطلق العنان حکومتوں کو بھی اس ضرورت سے آگاہ کر دیا ہے کہ ان کے انتظام و انصرام کے لیے ملک کے قابل ترین لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔۔۔۔۔"

"دوسرے ملکوں میں حکومت اور حکومت کے افسر قوم کا جز ہوتے ہیں اور ہر سرکاری اقدام کے اثرات اور اس کے متعلق ملک کی رائے عامہ سے باخبر ہوتے ہیں۔ مگر یہاں حکومت کو اس قسم کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ یہاں کی حکومت ایسے لوگوں کے لیے قوانین بناتی ہے جن کی قانون سازی میں کوئی آواز نہیں ہوتی اور جن کے متعلق بہت کم معلومات اسے حاصل ہیں۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ حکومت اس وقت تک لوگوں کے حالات کے مطابق قانون نہیں بنا سکتی ہے جب تک اس کو وہ ذہین و فعال مقامی افسر اس موضوع پر صحیح صحیح معلومات نہ فراہم کریں جن کے فرائض میں لوگوں کے حالات و خیالات کی تفتیش کرنا اور ان کے متعلق رپورٹ پیش کرنا داخل ہے۔ لیکن یہ حکام اس قسم کی معلومات صرف تجربے کار ہندوستانی ملازمین کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں جو اپنی منصبی نوعیت کی بنا پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔"

انگریز راج کے فوائد اور نقصانات

"اگر ہم اُن فوائد اور نقصانات کے مقابلے کا خلاصہ تیار کریں جو ہندوستانیوں کو ہماری حکومت کی بدولت اٹھانے پڑے ہیں تو میرا خیال ہے کہ اس کا نتیجہ مشکل ہی سے اُس حد تک حکومت کے حق میں ہوگا جس قدر اس کو ہونا چاہیے۔ بیرونی جنگوں اور داخلی شورشوں کی تباہیوں

سے وہ نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں، تشدد کے خلاف ان کی جان و مال کی زیادہ حفاظت کی جاتی ہے، صاحبانِ اقتدار نہ ان کو من مانی سزائیں دے سکتے ہیں نہ ان کی جائداد چھین سکتے ہیں۔ ان پر مجموعی اعتبار سے محاصل کا بوجھ کم ہے لیکن دوسری طرف قانون سازی میں ان کی کوئی آواز نہیں ہے، قوانین کے نفاذ میں بھی ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے، وہ سول یا فوجی اعلیٰ عہدے نہیں حاصل کر سکتے اور ہر جگہ انھیں کم حیثیت نسل کے لوگ سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ملک کے دیرینہ مالکوں کے بجائے انھیں خدمتگار اور غلام سمجھا جاتا ہے۔"

"جب تک ہم ان میں کردار کی اعلیٰ صفات پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں ہندوستانیوں کو انصاف پر مبنی قوانین اور مناسب و متوازن محاصل سے مستفید ہونے کا موقع دینا کافی نہیں ہے لیکن کسی بدیسی حکومت کے دور میں کردار میں پستی پیدا کرنے کے اتنے زیادہ اسباب ہوتے ہیں کہ اس کو گرنے سے روکنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ یہ پرانی کہاوت ہے کہ جو آزادی کھو دیتا ہے وہ اپنی آدھی خوبیاں کھو دیتا ہے۔ اس کا اطلاق افراد کے ساتھ قوموں پر بھی ہوتا ہے۔ املاک نہ ہونے سے آدمی کے کردار میں اتنی پستی نہیں پیدا ہوتی ہے جتنی اُس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب جائداد ایک ایسی بدیسی حکومت کے رحم و کرم پر ہو جس پر اس کا اختیار نہ ہو۔ جس طرح ایک غلام انسانی حقوق سے محروم ہو جاتا ہے اسی طرح ایک محکوم قوم غلام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور تمام قومی حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ خود پر محاصل عائد کرنے، اپنے لیے قانون بنانے، قانون کے نفاذ میں حصہ لینے یا ملک کے عام نظم و نسق میں شریک ہونے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ برطانوی ہند کو اس قسم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے......"

"ہندوستان میں ہماری حکومت کی بڑی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ رجحان ہے کہ سماج کے اعلیٰ طبقوں کو ختم کر دیا جائے یا انھیں پستی کے غار میں گرا دیا جائے، سب لوگوں کو ایک سطح پر لایا جائے اور انھیں قدیم رسوخ و اثر سے محروم کر کے ملک کے داخلی نظم و نسق کے لیے ان کی افادیت کو کم کر دیا جائے۔ دیسی حکومتوں کے زمانے میں دولت مند اشراف کا ایک طبقہ ہوا کرتا تھا جو جاگیرداروں، انعام داروں اور دوسرے سول اور فوجی حکام پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ لوگ خاص خاص تاجروں اور کسانوں کے ساتھ مل کر ایک بڑی جماعت بن جایا کرتے تھے۔ یہ دولت مند ہوا کرتے تھے یا کم از کم ان کی معاشی حالت اطمینان بخش ہوا کرتی تھی۔ ایک حکمراں کی جاگیریں اور انعام دوسرے حکمراں تسلیم کر لیا کرتے تھے۔ سول اور فوجی افسر اکثر تبدیل

ہوتے رہتے تھے لیکن جب اُن کی جگہ نئے لوگوں کی تقرری عمل میں آتی تھی اور ان نے حقدار دل کو نئی جاگیریں اور انعام دیے جاتے تھے تو ان تبدیلیوں کی وجہ سے ملک میں ایسے لوگ ابھرتے رہتے تھے جو اپنی دولت کی بنا پر ملک کی زراعت اور صنعت کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے ہماری حکومت کے زمانے میں اس قسم کے مواقع ختم ہو گئے ہیں۔ تھوڑی بہت اہمیت رکھنے والے فوجی اور سول عہدوں پر بھی یوربین قابض ہیں جو اپنی پس انداز کی ہوئی دولت اپنے ملک کو بھیج دیتے ہیں۔"

ہندوستان کا مستقبل

"ہمیں اپنے انتظامات کے دوران اس بڑے سوال پر نظر رکھنی چاہیے کہ لوگوں کے کردار پر ان کا کیا اثر پڑے گا؟ کیا ہم کردار کو ابھارنا چاہتے ہیں یا اس میں پستی پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا ہم اس سے مطمئن ہو جائیں گے کہ ہماری طاقت محفوظ رہے اور ہم لوگوں کا تحفظ کرتے رہیں چاہے وہ اخلاقی طور سے اس سے بھی زیادہ گر جائیں جتنے اس وقت گرے ہوئے ہیں؟ یا ہم اس امر کی کوشش کریں گے کہ ان کا کردار بلند ہو، ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو کہ وہ نہ صرف ملک کے نظم ونسق میں ذمہ داری کے کام سنبھال سکیں بلکہ اس کی ترقی کے منصوبے بنا سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ مقامی لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بڑھایا جائے اور اس کا خیال رکھا جائے کہ جب ہندوستان سے ہمارے روابط ختم ہوں تو ایسا نہ معلوم ہو کہ ہماری حکومت کا صرف یہ کارنامہ رہا کہ ہم نے انھیں جیسا پایا تھا اس سے کہیں زیادہ ذلیل وخوار اور خود پر حکومت کرنے کے ناقابل چھوڑا۔ اُن کے کردار کو بلند کرنے کے لیے مختلف منصوبے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن ان میں کوئی منصوبہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکے گا جب تک اس کو ہماری اس پالیسی کا اصول نہ بنا لیا جائے کہ ہمیں ان کی اصلاح کرنی ہے۔ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا تو ہم یقین کر سکتے ہیں کہ ثابت قدمی سے کوشش کرنے کے نتیجہ میں وقت گزارنے کے ساتھ ہم اس مقصد کو حاصل کر سکیں گے۔ ہمارے پاس نہ اتنا تجربہ ہے اور نہ ہم یہاں کے لوگوں سے اس حد تک واقف ہیں کہ عملی تحقیق وتفتیش کے بغیر ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ اُن کی اصلاح کے لیے کون سا طریقہ کارگر ہوگا۔ بہت سے طریقے تجویز کیے جا سکتے ہیں۔ غالباً وہ سب کسی نہ کسی

حد تک مفید ثابت ہوں گے۔ لیکن میرے خیال میں کامیابی کے نقطۂ نظر سے کوئی طریقہ اتنا مناسب نہیں ہوگا جتنا کہ یہ طریقہ کہ ان پر اعتماد کرکے، ان کو اہم عہدوں پر مقرر کرکے اور غالباً حکومت کے تحت قریب قریب ہر عہدے کا انھیں اہل قرار دے کر ان میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ فی الحال یہ ضروری نہیں کہ اس امر کی تشریح کی جائے کہ وہ کس قسم کے عہدوں کے اہل قرار دیے گئے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انھیں کسی ایسے عہدے سے محروم رکھا جائے جس کے وہ اہل ہوں۔ اس سے ہماری حکومت کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ حکومتوں نے قوموں کے کردار کو کتنا متاثر کیا ہے اور کچھ لوگ جو کسی زمانے میں نہایت متمدن تھے وحشت و جہالت کے گڑھے میں گر گئے اور دوسرے لوگ جو پہلے اجڈ گنوار تھے تہذیب و شائستگی کی اونچی سطح تک پہنچ گئے، تو ہمیں اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اگر مناسب اقدام کریں تو رفتہ رفتہ ہندستانی رعایا کے کردار میں اتنی تبدیلی کر دیں گے کہ وہ اپنا نظم و نسق سنبھال سکیں اور اپنا تحفظ کر سکیں۔"

سر ٹامس منرو کے انتقال کو پچھتر سال ہو گئے ہیں۔ ٹامس منرو کی طرح کے حاکم نایاب ہیں اور مدراس کے صوبے کے ہر ضلع کے 150,000 کسانوں سے مناسب محصول آراضی وصول کرنے کا مشکل کام ابھی تک قابل اطمینان حد تک پورا نہیں ہو سکا ہے۔ منرو کے انتقال کے پچیس سال بعد اسکاٹ لینڈ کے ایک ممتاز باشندے نے، جس نے ہندوستان کے نظم و نسق میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کی، مدراس کے طریقے کے متعلق لکھا تھا۔

"آپ غور کیجیے کہ ایک کلکٹر کو 150,000 کسانوں سے نپٹنا ہوتا ہے جن میں کوئی پٹے دار نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک فصل بونے اور فصل کاٹنے کی مناسبت سے لگان دیتا ہے کسان کے جانوروں، بھیڑوں اور بچوں، کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ہر کسان کو چھوٹ دینی ہوتی ہے اگر وہ چھوٹ کے لیے مناسب وجوہ بیان کر سکے۔ اگر انگلستان یا کسی دوسرے ملک میں یہ طریقہ رائج ہوتا تو کاشت کی دشواریوں اور بڑے بڑے خاندانوں کے خلاف کتنی چیخ پکار ہوتی۔ کیا کوئی کسان کبھی یہ بات تسلیم کر سکتا ہے کہ اس کے کھیت میں کچھ پیدا ہوا ہے، اُس کے جانور کے بچہ پیدا ہوا ہے یا اس کی بیوی کے بچہ نہیں ہوا ہے، اگر کلکٹر نبی ہوتا پھر بھی ایک ہی ضلع میں کسی اسرائیلی پیغمبر کی طرح سینکڑوں سال گزارنے کے بعد بھی وہ اپنے

فرائض منصبی کا اہل نہ ہو پاتا لیکن وہ تو ایک معمولی انسان ہے، بدیسی ہے اور مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اس لیے تعجب ہوتا اگر اس کے ہندوستانی نائب و مددگار اپنی مرضی کے مطابق کام نہ کرتے اور جو اختیارات انھیں حاصل تھے ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے۔ چنانچہ اس بات پر عام اتفاق پایا جاتا ہے کہ پورے کے پورے نظام میں اور خاص طور سے چھوٹ کے معاملے میں شدید خرابیاں پائی جاتی ہیں، حیلہ سازی اور ہر قسم کی سازشوں کی انتہا نہیں ہے اور مدراس کا کلکٹر مخبروں پر اعتماد کرتا ہے جس کی وجہ سے حالات اور بگڑ رہے ہیں[1]۔"

سر ٹامس منرو عمر بھر کوشش کرتا رہا کہ مدراس کے کسان کی شرح لگان معین ہو جائے تاکہ وہ زمین کو ترقی دے اور اس سے فائدہ بھی اٹھائے۔ حالانکہ معینہ لگان کے اصول کو کسی قانون یا اعلان کے ذریعے تسلیم نہیں کیا گیا لیکن مدراس کی حکومت نے ٹامس منرو کے چالیس سال بعد اس کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ سنہ 56-1855ء کی انتظامی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ مدراس کے کسان کو "حکومت اُس وقت تک بے دخل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ معینہ لگان ادا کرتا رہے...... اس نظام کے تحت کسان قریب قریب مالک ہوتا ہے، اس کا حق ملکیت سیدھا سادھا مگر مکمل ہوتا ہے اور اسے دائمی پٹے کے تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں"۔ سنہ 1857ء میں بورڈ آف ریونیو نے کہا تھا۔ "مدراس کا کسان اپنی زمین پر دائمی قبضہ رکھ سکتا ہے اور اس کے لگان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا"۔ حکومت مدراس نے سنہ 1862ء میں حکومت ہند کو مطلع کیا تھا کہ "اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ رعیت واری طریقے کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین پر حکومت کا مطالبہ ہمیشہ کے لیے معین کر دیا جاتا ہے[2]۔"

یہ بار بار کیے جانے والے حتمی اعلان، جن میں امکانی زور بیان سے کام لیا گیا تھا، اب نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ سنہ 1855ء میں ہونے والی جانچ کے بعد ہر بندوبست کے موقع پر حکام مال اپنے صوابدید سے کام لے کر ایک ایک کھیت کا لگان مقرر کرتے ہیں۔ مدراس کے

1۔ جارج کیمپ بل، 'Modern India' لندن، سنہ 1852ء

2۔ 18 فروری سنہ 1862ء کا مراسلہ۔

کسان کا لگان معین نہیں ہے، اضافوں کے خلاف اس کا کوئی تحفظ نہیں ہے اور ترقی کے لیے کوئی مناسب محرکات نہیں ہیں۔ غیر یقینی لگان کی چھری ہر وقت اس کی گردن پر رکھی رہتی ہے۔

زمین کا محصول کیا ہے؟ 1856ء میں کورٹ آف ڈائرکیٹرز نے کہا تھا کہ حکومت کو ایسا لگان وصول کرنے کا حق نہیں ہے جو کاشت کی لاگت اور کاشت سے متعلق سامان کے منافع مہیا کرنے کے بعد فاضل پیداوار پر مشتمل ہو بلکہ وہ صرف مالگزاری کی حقدار ہے[1]۔ اس کے دو سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کر دی گئی۔ شاہ انگلستان کو حکومت منتقل ہونے کے بعد پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان سر چارلس وڈ (Sir Charles Wood) نے، جو بعد میں لارڈ ہیلی فیکس کے نام سے مشہور ہوا، خواہش ظاہر کی تھی کہ لگان کا صرف ایک حصہ جو عام طور سے نصف کے برابر ہونا چاہیے، زمین کے محصول کے طور پر وصول کیا جائے[2]۔

یہ شرح بہت زیادہ سہی مگر اس سے ایک واضح حد قائم ہو جاتی ہے۔ عملاً اس اونچی حد سے بھی تجاوز کیا جاتا ہے اور مدراس میں زمین کے محصول کے نام سے جو رقم وصول کی جاتی ہے وہ تمام کی تمام معقول و مناسب لگان پر مشتمل ہوتی ہے۔ حکومت نے اب مالگزاری کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی ہے جو کھیت کی پیداوار کی ایک تہائی کے برابر ہے اور یہ قریب قریب پورے معقول لگان پر حاوی ہوتی ہے۔ چھوٹی کاشت کی حد تک، جس کی سالانہ پیداوار 12 پونڈ کے قریب ہوتی ہے، کاشت کی لاگت اور کاشت کے سامان کا منافع سات یا آٹھ پونڈ کے قریب ہو جاتا ہے اور زمین کے محصول کے طور پر حکومت چار پونڈ کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ایسا مطالبہ ہے جس کی رقم معقول لگان کے پچاس فی صدی کے بجائے پورے کے پورے معقول لگان پر مشتمل ہوتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کے غیر یقینی مطالبے کی خرابیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ مدراس کے کسان حسب معمول بے وسیلہ تھے۔ 1877ء کا قحط پڑا تو وہ بے بس ہو گئے اور

---

[1] مراسلہ مورخہ 17 دسمبر 1856ء

[2] 1864ء کا مراسلہ۔

صوبے کے پچاس لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس کے تین سال بعد مارکوئس آف رپن (.Marquis of Ripon) وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور اس نے مدراس کے زرعی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔

مدراس کے کسان کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ زمین کے محصول قطعی طور سے معین کر دیا جائے، حالانکہ حکومت مدراس 1856ء اور 1862ء میں اس حق کو تسلیم کر چکی تھی، پھر بھی لارڈ رپن نے یہ فیصلہ کیا کہ ان اضلاع کی حد تک جن کی پیمائش ہو چکی ہے اور بندوبست کر دیا گیا ہے زمین کے محصول میں صرف قیمتوں میں اضافہ کی صورت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے[1]۔ اس نے مالگزاری میں اضافے کا راستہ تو بند نہیں کیا تھا پھر بھی اس سے کسانوں کو اتنا یقین ہو گیا تھا کہ زرعی پیداوار کی قیمت بڑھنے کی معقول بنیاد کے علاوہ کسی اور صورت میں مالگزاری میں اضافہ نہیں ہوگا۔ محصول کو قطعی طور سے معین کرنے کے حق کو نظر انداز کرنے کی صورت میں جو بہتر سے بہتر سمجھوتہ ہو سکتا تھا وہ لارڈ رپن کا یہ فیصلہ تھا۔ اس نے مدراس کے کسانوں میں کسی حد تک وہ احساس تحفظ پیدا کر دیا جس کے بغیر دنیا کے کسی حصے میں زراعت فروغ نہیں پا سکتی۔

دسمبر 1884ء میں لارڈ رپن ہندوستان سے واپس چلا گیا اور جنوری 1885ء میں سکرٹیری آف اسٹیٹ برائے ہند نے اس کے منصفانہ ضابطے کو منسوخ کر دیا۔ اس طرح انڈیا آفس نے ثابت کر دیا کہ ہندوستانی کسانوں کے تعلق سے وہ بھی اتنا ہی سخت گیر اور تنگ نظر ہے جتنا کہ سابق کورٹ آف ڈائرکٹرز تھا۔ آج (1901ء میں) مدراس کے کسانوں کو حکومت کے غیر یقینی مطالبوں اور غیر منصفانہ اضافوں کے خلاف کسی قسم کا تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس کے پاس نہ روپیہ پس انداز کرنے کا کوئی محرک ہے اور نہ اپنی حالت سدھارنے کا کوئی ذریعہ ہے۔

---

[1] مراسلہ مورخہ 17 اکتوبر 1882ء۔

باب 10

لارڈ ویلزلی اور شمالی ہند کی فتوحات (1795ء - 1815ء)

ہندوستان کا وہ صوبہ جواب شمالی۔ مغربی صوبہ و اودھ کہلاتا ہے۔ مختلف زمانوں میں برطانیہ کے زیر حکومت آیا۔ وارن ہیسٹنگز نے اودھ کے نواب کے انتقال کے بعد اس کے جانشین سے معاہدہ کرکے بنارس اور کچھ ملحقہ اضلاع پر قبضہ کرلیا تھا۔ لارڈ ویلزلی کے دباؤ میں آکر اودھ کے نواب نے 1801ء میں الہ آباد اور کچھ دوسرے اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیے تھے۔ لارڈ لیک نے 1803ء کی مرہٹوں کی جنگ میں آگرہ اور گنگا اور جمنا کی وادی فتح کرلی تھی۔ اودھ کے بقیہ حصے پر 1856ء میں لارڈ ڈلہوزی نے قبضہ کرلیا تھا۔

کارنوالس اور شور چاہتے تھے کہ اُسی قسم کا دائمی زمینداری بندوبست بنارس میں کیا جائے جیسا کہ 1793ء میں بنگال میں کیا گیا تھا۔ 1787ء سے 1794ء تک بنارس کے راجہ سے مذاکرات ہوتے رہے اور 27 اکتوبر 1794ء کو ایک معاہدہ ہوگیا۔ بنارس کا راجہ انگریزوں کے حق میں اُن حقوق سے دستبردار ہوگیا جو اس سے پہلے اسے پوری ریاست میں حاصل تھے۔ صرف ایک چھوٹے سے علاقے میں اُس کے زمیندارانہ حقوق برقرار رہے جس کو وہ اپنی خاندانی جائداد کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ معاہدہ ہوجانے کے بعد سر جان شور نے جو اس وقت ہندوستان کا گورنر جنرل تھا اس علاقے کے گانوؤں کے زمینداروں کے ساتھ جو انگریزوں کے قبضے میں آگئے تھے مالگزاری کا بندوبست کیا اور بہت سے پرانے زمینداروں کو ان کی وہ تمام زمینداریاں واپس کردیں جو راجہ کی حکومت کے زمانے میں ان سے چھین لی گئی تھیں۔ زمین کی مالگزاری مقرر کرنے کا اصول یہ طے پایا کہ حکومت اور کسانوں کے درمیان اس تناسب سے فصل کا بٹوارہ کیا جائے جو ملک کے مختلف حصوں میں کسی قدر بدلتا رہتا تھا اور 1795ء میں بنارس کے پورے علاقے میں مالگزاری کا بندوبست استمراری کردیا گیا۔[1] بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ضابطے تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ بنارس

---

[1] پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحات 45-48۔

میں نافذ کر دیے گئے، اور ساتھ ہی مال اور فوجداری کے قوانین بھی نافذ کیے گئے۔

اس کے چھ سال بعد اودھ کے نواب نے الہ آباد کا ضلع اور دوسرے اضلاع ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیے جو عام طور سے "مقبوضہ اضلاع" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ اس معاہدہ کے متعلق نواب اور لارڈ ویلزلی کے درمیان ہونے والے طویل مذاکرات میں وہ دھمکیاں شامل ہیں جن کی وجہ سے دی جانے والی رقم میں کمی کے عوض یہ اضلاع انگریزوں کے حوالے کیے گئے تھے، بعد میں چل کر لارڈ ویلزلی کی ان مجرمانہ کارروائیوں کے خلاف سنگین فردِ جرم قائم کی گئی۔ ان واقعات کا تعلق سیاسی تاریخ سے ہے جو اس کتاب کا موضوع نہیں ہے[1]۔

---

[1] وہ رقم جو لارڈ ٹن ماؤتھ کے معاہدے کی رو سے وزیر (اودھ کا نواب) ادا کرتا تھا۔ 76,00,000 روپیہ ہوتی تھی۔ مزید فوج جو اس پر تھوپی گئی تھی اس کا سالانہ خرچ 54,12,929 روپیہ تھا۔ چنانچہ مجموعی رقم 1,30,12,929 روپیہ ہوئی۔ نواب سے کہا گیا کہ وہ اتنا علاقہ دائمی طور سے انگریزوں کے حوالے کر دے جس کی مالگزاری موجودہ غیر پیداواری حالت میں بھی، اور اس علاقے کی آئندہ ترقی سے قطع نظر، وصولیابی کے اخراجات کی منہائی کے بعد، اُس رقم کے برابر ہو۔ اس رقم کی منہائی کے بعد وزیر کو وصول ہونے والی مالگزاری کی رقم 10,00,00,000 روپیہ رہ جاتی۔ چنانچہ جس علاقے سے اُسے محروم کیا جا رہا تھا وہ اُس کے مجموعی علاقے کے نصف سے زیادہ اور دو تہائی سے کسی قدر کم تھا۔

مل نے برٹش انڈیا (British India) حصہ ششم باب 9 میں لکھا ہے۔

"اگر بدقسمتی سے اس اقدام کے لیے اس کی منظوری نہ حاصل کی جا سکتی تو اس سے کہا جاتا کہ علاقے حوالہ کرنے کی کارروائی پر اس نقطۂ نظر سے غور کرے کہ بشرط ضرورت اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے طاقت کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔"

لارڈ ویلزلی کے زمانۂ حکومت کے متعلق سرکاری دستاویزات بھی دیکھیے۔ خوش قسمتی سے میرے پاس سرکاری دستاویزات کی نقلیں چار جلدوں میں موجود ہیں جو خود لارڈ ویلزلی کی ملکیت تھیں اور اس کی موت کے بعد اس کی دوسری کتابوں کے ساتھ فروخت کر دی گئی تھیں۔ ان جلدوں میں بین السطور، حواشی اور کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے حوالے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

جس دن ویلزلی نے اس معاہدہ کی توثیق کی جس سے کمپنی کو "مقبوضہ اضلاع" حاصل ہوئے تھے اسی دن اس نے ان اضلاع کا انتظام اور وہاں بندوبست کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تین سول ملازمین پر مشتمل بورڈ آف کمشنرز (Board of Commissioners) کی تقرری عمل میں آئی اور گورنر جنرل کے بھائی ہنری ویلزلی کو نئے علاقے کا لفٹنٹ گورنر اور بورڈ کا صدر مقرر کیا گیا۔ ہنری ویلزلی نے زمینداروں اور کسانوں کے ساتھ تین سال کے لیے مالگزاری کا بندوبست کیا۔ اس نے جو بندوبست کی رپورٹ مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۰۳ء بھیجی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بھی اُسی طرح ضرورت سے زیادہ مالگزاری مقرر کی گئی تھی جیسی کہ کمپنی کے ملازم ہندوستان میں حاصل ہونے والے ہر نئے علاقے میں کرتے تھے۔

" 3 - کلکٹروں نے صوبہ کا بندوبست میرے بریلی پہنچنے سے پہلے کر لیا تھا۔ بندوبست میں جمع بندی اسی قدر رکھی گئی تھی جتنی کہ اس وقت تھی۔ جب ہز ایکسیلینسی نواب وزیر نے علاقہ ہمارے حوالے کیا تھا۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ یہ بندوبست ملک کے موجودہ وسائل کی غلط جانچ کی بنا پر کیا گیا ہے اور اس رقم کو وصول کرنا مشکل ہو گا پھر بھی میں نے اس خیال سے کلکٹروں کے کیے ہوئے حالیہ بندوبست کو منسوخ کرنے سے گریز کیا کہ اس قسم کی مداخلت ان کا وقار کم کر دے گی۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بحرانی دور میں اُن کی حمایت کی جائے ......"

" 18 - مغل حکومت کے زمانے میں ان صوبوں کی مالگزاری سے متعلق جو دستاویزات مجھے حاصل ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مالگزاری کی رقم قریب قریب ڈھائی کروڑ روپیہ ہوتی تھی ...... میں توقع کرتا ہوں کہ برطانوی حکومت کے نرم اور منصفانہ نظام میں ان صوبوں کی مالگزاری، پوری کاشت کیے جانے کی صورت میں، دو کروڑ اور پچاس

(بقیہ صفحہ گزشتہ) خود لارڈ ویلزلی کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اُس نے اپنے امن پسند جانشینوں کارنوالس اور بارلو کی پالیسیوں کے متعلق دلچسپ باتیں لکھی ہیں، جنھوں نے ان کے طریقۂ عمل کو یکسر بدل دیا تھا۔ غصے میں بھرے ہوئے ویلزلی نے اپنے جانشینوں کی پالیسی کے متعلق کہیں کہیں لکھا ہے "نہایت نفرت انگیز" اور "اپنی نفی کرتا ہے یہ انصاف سے بعید ہے"

لاکھ روپیہ ہوگی ....

"24 - حال میں نافذ ہونے والے ضابطوں کے تحت آبکاری یا تیز شرابوں کی ضرورت پر لگنے والی ڈیوٹی کی آمدنی کم سے کم اس رقم کے برابر ہوگی جو بیان میں درج کی گئی ہے ...."

"30 - اب میں ان انتظامات کی روداد حضور کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جن کا مقصد یہ ہے کہ نمک کی خرید و فروخت کے جملہ حقوق صرف کمپنی کو حاصل ہو جائیں[1]۔"

اس رپورٹ کے ساتھ ایک نقشہ بطور ضمیمہ شامل ہے جس میں مندرجہ ذیل رقمیں درج ہیں۔

	روپیہ
نواب کی عائد کردہ مالگزاری کی رقم	1,35,23,474
انگریزوں کی عائد کردہ مالگزاری کی رقم پہلا سال	1,56,19,627
انگریزوں کی عائد کردہ مالگزاری کی رقم۔ دوسرا سال	1,61,61,786
انگریزوں کی عائد کردہ مالگزاری کی رقم تیسرا سال	1,68,23,563

ان رقموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال اور مدراس کے صوبوں کو حاصل کرنے کے بعد ابتدا میں جو غلطی کی گئی تھی وہی غلطی شمالی ہند میں دہرائی گئی۔ ملک کے بڑے بڑے علاقے جنھیں بار بار ہونے والی جنگوں نے پریشان اور بالجبر وصولیابیوں نے تباہ کر دیا تھا ایک ایسی طاقت کے زیر اقتدار آئے تھے جو بڑی بھی تھی اور متمدن بھی۔ یہ موقع تھا جب امن پسند اور جفاکش لوگوں کو کچھ سہولت ملتی۔ یہ موقع تھا کہ ان کا بوجھ کم کیا جاتا اور ان کے وسائل کو ترقی دی جاتی لیکن ہنری ویلزلی کے ہاتھوں میں انتظام آنے کے ایک سال کے اندر "مقبوضہ اضلاع" میں کمپنی کا مطالبہ نواب کے مطالبے سے بقدر بیس لاکھ روپیہ تجاوز کر گیا اور تیسرا سال ختم ہونے سے پہلے اس میں دس لاکھ کا مزید اضافہ ہو گیا۔ جب کہ نواب کا مطالبہ محض نام نہاد مطالبہ تھا —— وصولیابی فصلوں کی حالت کے مطابق کی جاتی تھی —— کمپنی کے مطالبے کی وصولیابی میں جتنی سختی برتی جاتی تھی ہندوستان کے لوگوں کو اس کا پہلے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ایک کلکٹر

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات سے تعلق رکھنے والے کاغذات کا کاغذ نمبر 15، 1806ء صفحہ 34 وغیرہ۔

مسٹر ڈمبل ٹن (Mr Dumbleton) نے شکایت کی تھی کہ 1802ء کا بندوبست "معقول معاوضے سے تجاوز کر گیا ہے" اور یہ کہ برطانوی حکومت نے "وصولیابی میں اُسی قسم کی آسانیاں فراہم کیے بغیر" نواب کی اونچی شرح کو برقرار رکھا ہے۔

تمام دوسری صورتوں میں پوری پوری کوشش کی گئی کہ حاصل ہونے والے نئے علاقوں میں منظم حکومت قائم کی جائے۔ بنگال ریگولیشنز (Bengal Regulations) کا نفاذ 24 مئی 1803ء کو کیا گیا اور علاقے کو سات ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر ضلع میں ایک سول حاکم کا تقرر کیا گیا جو جج اور مجسٹریٹ کے فرائض انجام دیتا تھا اور ایک دوسرا سول ملازم کلکٹر مقرر کیا گیا۔ اپیلیں سننے اور دورہ کرنے کے لیے ایک عدالت بریلی میں قائم کی گئی اور تحصیلداروں اور زمینداروں کو جس طرح بنارس میں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ چوروں کو پکڑیں اور اپنے حلقے میں امن قائم رکھیں اسی قسم کے اختیارات یہاں بھی دیے گئے۔[1]

ایک اور اہم ریگولیشن کا نفاذ کیا گیا[2] جس کی رو سے اس سہ سالہ بندوبست کو تسلیم کر لیا گیا جو مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ بندوبست کی مدت ختم ہونے کے بعد تین سال کے لیے پھر بندوبست کیا جائے گا، اس کے بعد چار سال کے لیے بندوبست کیا جائے گا اور اس کی مدت بھی ختم ہونے کے بعد بندوبست استمراری کیا جائے گا۔ ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی نے کہا ہے[3] کہ "اس طرح حکومت اعلیٰ نے مالکان آراضی سے وعدہ کر لیا" کہ ہنری ویلزلی کے پہلے بندوبست سے دس سال کی مجموعی مدت گزر جانے کے بعد "بندوبست استمراری رائج کیا جائے گا۔"

1803ء میں جنرل ویلزلی نے (گورنر جنرل کا دوسرا بھائی جو بعد میں لارڈ ولنگٹن (Lord Wellington) کے نام سے مشہور ہوا) آسائی کی مشہور لڑائی میں مرہٹوں کی طاقت جنوب میں ختم کر دی اور جنرل لیک نے لاسواری کی لڑائی میں انھیں شمال میں شکست فاش دی۔ گنگا اور جمنا کے دوآبے پر قبضہ کر لیا گیا اور اس علاقے کو "مقبوضہ اضلاع"

---

[1] 1803ء کا ریگولیشن نمبر 35۔

[2] 1803ء کا ریگولیشن نمبر 25

[3] پانچویں رپورٹ، 1812ء، صفحہ 51

سے ممتاز کرنے کے لیے جو دو سال پہلے اودھ کے نواب سے لیے گئے تھے مفتوحہ صوبجات کا نام دیا گیا۔ 1803ء میں بندیلکھنڈ اور کٹک پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

مفتوحہ صوبجات کا نظم و نسق پہلے لارڈ لیک کے سپرد کیا گیا لیکن 1805ء میں اس علاقے کو پانچ ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا اور وہاں عدالت اور مال کے حکام مقرر کر دیے گئے۔ اور حاصل کیے ہوئے اضلاع کی طرح کلکتہ کے اعلیٰ حکام کو ان پر راست اختیار حاصل ہو گیا۔ وہ ریگولیشنز جو حاصل کیے ہوئے اضلاع میں نافذ کیے گئے تھے مفتوحہ صوبجات میں بھی نافذ کر دیے گئے اور اول الذکر علاقے کے مالکان آراضی سے جو وعدے کیے گئے تھے وہی مفتوحہ صوبجات کے مالکان آراضی سے بھی کیے گئے اور یہ طے ہو گیا کہ باری باری سے ایک سال، تین سال اور چار سال کے لیے بندوبست کیا جائے اور مالکان آراضی کے راضی ہو جانے کی صورت میں بندوبست استمراری رائج کیا جائے۔[1] دو سال بعد یہ وعدہ دہرایا گیا لیکن اس دفعہ کہا گیا کہ بندوبست استمراری کا انحصار کورٹ آف ڈائریکٹرز کی تصدیق پر ہوگا۔[2]

1803ء میں مرہٹوں کے ساتھ ہونے والی جنگ نے شمالی ہند کو تباہ کر دیا تھا اور کمپنی کے ملازمین نے اتنی سختی کے ساتھ مالگزاری کی تشخیص کی کہ لوگوں کو اپنی حالت سدھارنے کا موقع نہیں مل پایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1804ء میں وسیع پیمانے پر قحط پڑا۔ اس کے بعد حکومت کو مالگزاری میں بھاری چھوٹ دینے پر مجبور ہونا پڑا، مالکان آراضی کو قرض اور پیشگی روپیہ دیا گیا اور بنارس، الٰہ آباد، کانپور اور فتح گڑھ بھیجے جانے والے غلے کے لیے سرکاری امداد دی گئی۔ ایک خصوصی کمیشن کی تقرری 1807ء میں عمل میں آئی تاکہ چار سال تک وہ بندوبست کی نگرانی کر سکے۔ نافذ ہونے والے ریگولیشنز کی رو سے چار سال بعد اس کو دائمی حیثیت دی جانے والی تھی۔

اب ہم اس مشہور مباحثہ کا ذکر کریں گے جو شمالی ہند میں ہونے والے بندوبست استمراری کے سوال پر ہوا تھا۔

خصوصی کمشنروں آر۔ ڈبلو۔ کاکس (R.W. Cox) اور ہنری سینٹ جارج ٹکر

---

[1] 1805ء کا ریگولیشن نمبر 35

[2] 1807ء کا ریگولیشن نمبر 25

(Henry st Georgetucker) نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں بندوبست استمراری کے فوائد کو تسلیم کیا گیا تھا لیکن انھوں نے حاصل ہونے والے اضلاع میں اور مقبوضہ صوبجات میں فوری طور سے اس قسم کا بندوبست کرنے کی مخالفت کی تھی۔

" 230۔ ہمیں خود اس کا احساس ہے کہ آراضی پر حکومت کے مطالبے کو معین کر دینے سے مفید نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عارضی بندوبست سے لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے دھوکے دھڑی اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں عام طور سے شک وشبہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر سرکاری محاصل میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہے اور لوگوں کو اپنی مزید محنت کا پھل حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو ملک میں کوئی قابل لحاظ ترقی ہو سکتی ہے لیکن بندوبست استمراری کے اصول کی موافقت میں ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کے باوجود ہم گورنر جنرل اِن کا ؤنسل کی خدمت میں اپنی سوچی سمجھی اور غیر مشروط رائے پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ مقبوضہ اضلاع اور مفتوحہ صوبجات کی حد تک یہ اقدام ابھی بے وقت ہے۔ اس کو رائج کرنے کی قبل از وقت کوشش کے نتیجہ میں سرکاری وسائل کی بھاری قربانی دینی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مخصوص صورتوں میں یہ فریقین کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ حالانکہ اس اقدام کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان کی دیرپا خوشحالی کا انتظام کیا جائے"[1]

شمالی ہند میں بندوبست استمراری کے خلاف خطرے کا یہ پہلا اعلان تھا۔ اس اعلان کا محرک یہ خوف تھا کہ "سرکاری آمدنی کی قربانی دینی ہوگی" لیکن خصوصی کمشنروں کے استدلال کا فیصلہ کن جواب ایچ۔ کول۔ بروک (H. Cole brooke) نے دیا۔

" 3۔ ۱۴ر جولائی 1802ء اور ۱۱ر جولائی 1805ء کے اعلانات کی رو سے حکومت مالکان آراضی کے ساتھ بندوبست استمراری کرنے کا وعدہ کر چکی ہے۔ حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ معینہ مدتیں گزرنے کے بعد اس آراضی کا جو زراعت کے معاملے میں حسب ضرورت ترقی کر چکی ہو اور جہاں اس اقدام کی معقول وجوہ موجود ہوں منصفانہ شرائط پر بندوبست استمراری کیا جائے گا۔ اس موضوع پر پوری طرح غور کرنے کے بعد اور ان حالات سے اچھی طرح واقف

---

[1] رپورٹ مورخہ 13ر اپریل 1808ء۔

ہونے کے بعد جن کا اب ذکر کیا جا رہا ہے ان درمیانی مدتوں کے متعلق قبل از وقت فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ جون 1807ء میں گورنر جنرل ان کاؤنسل نے زمینداروں اور دوسرے مالکان کو 1807ء کے ریگولیشن نمبر 10 کے ذریعے آگاہ کیا تھا کہ وہ اگر اس کے لیے تیار ہوں اور کورٹ آف ڈائرکٹرز اگر اس انتظام کو منظور کرے تو موجودہ بندوبست کے آخری سال کی جمع بندی کو ہمیشہ کے لیے معیّن کر دیا جائے گا۔

" 4۔ اگر اس حتمی وعدے کی خلاف ورزی کی گئی تو ہم لوگوں کے اعتماد سے محروم ہو جائیں گے "

" 9۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو سابق کمشنروں کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ حکومت چونکہ ایک وسیع جاگیر کی مالک و قابض ہے اس لیے آئندہ ہونے والی ترقیوں میں حصے داری کے حق سے اسے دستبردار نہیں ہونا چاہیے "

" 26۔ بنگال و بہار اور ساحل کارومنڈل کے علاقوں میں بندوبست استمراری رائج کرنے کے اہم موقعوں پر اور سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد غیر مزروعہ زمین کی آئندہ ترقی میں حصہ داری کے جن دعوؤں سے حکومت دستبردار ہوئی تھی وہ ان سے کہیں بڑے تھے جو سابق بورڈ آف کمشنرز نے مقبوضہ اضلاع اور مفتوحہ صوبجات کے سلسلے میں پیش کیے ہیں۔"

" 27۔ بنگال میں اس کے خوشگوار نتائج دیکھے جا سکتے ہیں۔ ملک کی خوشحالی کی تجدید، اس کی فزوں تر دولت اور تیزی سے ہونے والی ترقی بلا شبہ بندوبست استمراری کی دین ہیں۔ یہ اصول اتنی سمجھداری پر مبنی تھا کہ منصوبے کے خاکے کی خانہ پری میں جو بڑی بڑی غلطیاں ہوئیں وہ بھی اس کے تصور میں مایوسی کا رنگ نہ بھر سکیں۔"

" 32۔ میں کسی نظری دلیل پر اس تجربے کو ترجیح دیتا ہوں ...... ہمیں توقع تھی کہ غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لا کر زمینداریوں کو جو ترقی دی جائے گی اس سے مالکان آراضی کی آمدنیوں میں اضافہ ہو جائے گا اور وہ دولت مند ہو جائیں گے۔ اس کی بنا پر وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ موسم کے تلوّن اور خشک سالی اور سیلاب کی عارضی تباہیوں کا مقابلہ کر سکیں اور مالگزاری میں چھوٹ دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

" 33۔ یہ توقعات پوری ہو گئیں۔"

" 38۔ یہ رائے عام طور سے پائی جاتی ہے کہ برطانوی طریقۂ حکومت ہماری ہندوستانی

رعایا کو پسند نہیں ۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ رائے بے بنیاد نہیں ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب وہ ہمارے طریقۂ حکومت کے صرف اُن پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں جو انھیں پسند نہیں اور ان نعمتوں سے انھیں محروم رکھا جاتا ہے جو انھیں عزیز ہیں تو زمینداروں اور ان کے ساتھ عام لوگوں نے جو توقعات باندھ رکھے ہیں اُن میں انھیں مایوسی ہوگی اور پھر وہ اسی مناسبت سے حکومت سے اور زیادہ بدظن ہوجائیں گے ۔

" 63 - آخر میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ مجھے کمشنروں کی اس سفارش سے اتفاق ہے کہ ہماری حکومت کے نظم و نسق کی خصوصیتیں یکسانیت، اعتدال پسندی اور انصاف پسندی ہونی چاہئیں۔ یکسانیت کے ثبوت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم ایک سوچے سمجھے اقدام سے گریز کریں جو ہماری رعایا کے لیے مفید ہے ۔ زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرکے اور اپنے کسانوں سے زیادہ سے زیادہ لگان حاصل کرکے ہم اپنی اعتدال پسندی کا ثبوت نہیں پیش کرسکتے نہ ہم اپنے چھوٹے چھوٹے مالکان آراضی کے لڑکوں کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کرکے اپنی انصاف پسندی کا مظاہرہ کرسکتے ہیں ۔"[1]

اس روئیداد کے ساتھ کاونسل کے ایک اور رکن لمس ڈن (Lumsden) کی لکھی ہوئی اس سے ملتی جلتی روداد، لارڈ منٹو نے، جو اس وقت گورنر جنرل تھا، کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بھیجدی ۔ لارڈ منٹو نے خود بھی وضاحت کے ساتھ رائے ظاہر کی تھی ۔

" اُن دستاویزات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے بعد جن کا تعلق بنگال، بہار، اُڑیسہ، بنارس اور ان علاقوں میں بندوبست استمراری کو رواج دینے سے ہے جو فورٹ سینٹ جارج کی پریسیڈنسی میں شامل ہیں اور مقبوضہ اضلاع اور مفتوحہ صوبجات کے مجوزہ بندوبست استمراری کے متعلق رپورٹوں اور رودادوں پر بھی غور کرنے کے بعد اس کو نہ صرف اس اقدام کی صحت بلکہ اس کی اشد ضرورت کا بھی یقین ہوگیا ہے ۔"[2]

لیکن ڈائریکٹر رائے قائم کرچکے تھے ۔ ایک دفعہ حالات سے مجبور ہوکر وہ قوم کے مفاد میں اپنے منافع میں آئندہ ہونے والے اضافے کو قربان کرچکے تھے ۔ لارڈ کارنوالس کا انتقال ہوچکا

---

[1] سنہ 1808ء کی کول بُرک کی روداد ۔

[2] مراسلہ مورخہ 15 ستمبر سنہ 1808ء ۔

تھا اور ڈائرکیٹر ایک دفعہ پھر فیاضی کے جرم کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اب ان کی پالیسی تھی " زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کی جائے اور ہمارے کسانوں سے زیادہ سے زیادہ لگان حاصل کیا جائے۔"

انھوں نے جواب دیا " کٹک یا ہمارے کسی دوسرے صوبے میں بندوبست کو دائمی حیثیت اس وقت نہیں دی جائے گی جب تک اس کی تیاری کی تمام کارروائیوں سے ہمیں مطلع نہ کیا جائے اور جب تک ان کارروائیوں کی بنیاد پر پیش کی گئیں آپ کی تجاویز ہماری منظوری نہ حاصل کرلیں۔" نو مہینے بعد انھوں نے پھر لکھا " اس مراسلہ کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو واضح ہدایت کی جائے کہ آپ بنگال کی معینہ مالگزاری کو ہمارے نئے حاصل ہونے والے علاقوں میں توسیع دینے کے لیے ہماری طرف سے کوئی وعدہ نہ کیجیے۔"[1]

ان مراسلوں نے گورنر جنرل کو پریشان کر دیا۔ ان میں صرف اتنی ہی ہدایت نہیں کی گئی تھی کہ ایک ایسے اقدام سے گریز کیا جائے جو ہندوستان کے لوگوں کی بھلائی کے لیے ضروری تھا بلکہ اُس حتمی وعدے کی خلاف ورزی کی بھی، ہدایت کی گئی تھی جو دو دفعہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ غیر مشروط طور پر کیے جا چکے تھے اور ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۵ء کے ریگولیشنوں میں شامل تھے۔ وہ اعلان ۱۸۰۳ء کے ریگولیشن نمبر 25 کی دفعہ ۹ تھا (مقبوضہ اضلاع کے لیے) اور اُس میں مندرجہ ذیل تحتی دفعہ شامل تھی۔

" یہ دس سال کی مدت گزر جانے کے بعد انہی لوگوں کے ساتھ (اگر وہ اس کے لیے آمادہ ہوں اور اگر ایسے کوئی لوگ سامنے نہ آئیں جن کا دعویٰ بہتر بنیادوں پر قائم ہو) ایسی آراضی کے لیے جو زراعت کی حد تک ضرورت کے مطابق اتنی ترقی کر چکی ہو کہ اس اقدام کا جواز مہیا کر سکے اور ایسی شرائط پر جنھیں حکومت معقول و مناسب قرار دے بندوبست استمراری کیا جائے گا۔"

اور اُس اعلان میں جو ۱۸۰۵ء کے ریگولیشن نمبر ۹ میں شامل تھا (مفتوحہ صوبجات کے لیے) اس وعدے کو ان الفاظ میں دہرا گیا تھا۔

دس سال کی مدت گزر جانے کے بعد جو ۱۲۲۲ف میں ختم ہو گی انہی لوگوں کے ساتھ

---

[1] مراسلات مورخہ یکم فروری ۱۸۱۱ء اور 27 نومبر ۱۸۱۱ء۔

(اگر وہ اس کے لیے آمادہ ہوں اور اگر ایسے لوگ سامنے نہ آئیں جن کا دعویٰ بہتر بنیادوں پر قائم ہو) ایسی آراضی کے لیے جو زراعت کی حد تک ضرورت کے مطابق اتنی ترقی کر چکی ہو کہ اس اقدام کا جواز مہیا کر سکے اور ایسی شرائط پر جنھیں حکومت معقول و مناسب قرار دے بندوبست استمراری کیا جائے گا۔"

یہ وعدے ہندوستان کے لوگوں سے غیر مشروط طور پر کمپنی کے ذمہ دار ملازموں اور ایجنٹوں نے کیے تھے اور اس لیے کمپنی کو انھیں پورا کرنا چاہیے تھا۔ سنہ 1807ء میں یہ وعدہ سنہ 1807ء کے ریگولیشن نمبر 10 میں تیسری دفعہ دہرایا گیا (مقبوضہ اور مفتوحہ صوبجات کے لیے) اور اس وقت اس وعدے میں پہلی بار یہ شرط شامل کی گئی کہ بندوبست استمراری اس صورت میں ہو سکے گا جبکہ "اس انتظام کو عزت مآب کورٹ آف ڈائرکیٹرز کی منظوری حاصل ہو جائے۔"

سنہ 1811ء میں جاری ہونے والی ڈائرکیٹروں کی ہدایت ان وعدوں کو کس طرح فسخ کر سکتی تھی؟۔ حکومت ہند نے سنہ 1812ء میں لکھا تھا "حالانکہ ان ریگولیشنوں میں کورٹ کی منظوری کی شرط شامل نہیں تھی پھر بھی اس انتظام کے متعلق جو سنہ 1803ء اور سنہ 1805ء کے ریگولیشنوں کی رو سے کیا گیا تھا عزت مآب ڈائرکیٹروں کی مخالفت کا علم اگر ریگولیشنوں کے نفاذ کے ابتدائی زمانے میں ہو گیا ہوتا تو اس مخالفت کی حمایت میں کورٹ کی نگرانی کے لازمی اختیارات کو استعمال کیا جا سکتا لیکن اب جبکہ مقبوضہ صوبوں میں معاہدے کی مدت ختم ہو چکی ہے اور مفتوحہ علاقوں میں دو تہائی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے اس کو ختم کرنا ہماری رائے میں، جیسا کہ ہم آپ کو اطلاع دے چکے ہیں، نہ تو پالیسی کے مطابق ہے اور نہ انصاف پر مبنی۔[1]

لارڈ منٹو نے ایک روداد میں جو خود اس کی لکھی ہوئی تھی اس امر کی کوشش کی کہ ڈائرکیٹروں کے حالیہ احکامات کی تعبیر محدود معنی میں کرے۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان احکامات کے لفظی معنوں کو "حکومت کے ان وعدوں سے مطابقت دے سکے جو اس سے اعلانیہ اور حتمی طور سے مالکان آراضی کے ساتھ کیے تھے۔"[2]

---

[1] مراسلہ مورخہ 9 اکتوبر سنہ 1812ء

[2] روداد مورخہ 11 جولائی سنہ 1812ء

1813ء میں ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے لارڈ منٹو نے ڈائرکٹروں کے احکامات کے خلاف ایک اور احتجاج کیا۔ اس نے بتایا کہ بندوبست استمراری میں مالگزاری کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس نے مزید لکھا کہ آڈم اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (دولت اقوام) (Wealth of Nations.) میں بار بار بدلنے والے آراضی کے محصول کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس سے زمین کو ترقی دینے کی راہ میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ اس نے زور دیا کہ شمالی ہند کی ان زمینداریوں کے لیے بندوبست استمراری کیا جائے جو واقعی زمینداروں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس میں غیر مزروعہ زمین کو شامل کیا جائے۔ آخر میں اس نے لکھا کہ کسی اچھی حکومت کا مقصد اگر یہ ہے "کہ مقامی لوگوں کی حالت کو سدھارا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ بندوبست استمراری کے علاوہ کوئی اور اقدام اتنی تیزی سے اور اتنے موثر انداز سے اس اہم مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔"[1]

لیکن کمپنی کے ڈائرکٹر اپنی بات پر اڑے رہے۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی بھلائی کے خواہاں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مفادات سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے 1803ء اور 1805ء میں کیے گئے وعدوں سے نجات حاصل کرنے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ یہ ایک ایسا طریقہ تھا جس کو کوئی عدالت حق بجانب قرار نہیں دے سکتی تھی ایک سلطنت کے حکمرانوں کا تو ذکر ہی کیا یہ طریقہ ایمان دار تاجروں کے شایان شان بھی نہیں تھا۔

"حکومت نے مالکان آراضی سے بندوبست استمراری کا جو وعدہ کیا تھا اس کی جزوی شرط یہ تھی کہ وہ وقت پر حکومت کا مطالبہ ادا کرتے رہیں اور برابر قابض رہیں۔ اس شرط میں ایک اور زیادہ اہم دفعہ بھی شامل تھی یہ کہ اس دوران زمین پر کاشت کو اتنی ترقی دی جائے کہ مطالبے پر دائمی حدود عائد کرنے کا اس کو جواز قرار دیا جا سکے۔ 1803ء اور 1805ء کے ریگولیشنوں میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ کتنی ترقی کی بنا پر اس اقدام کو مصلحت یا انصاف کے مطابق سمجھا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کا تعین کسی آئندہ ریگولیشن سے بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوال تو ایسا ہے جس پر آئندہ حکومت کو غور کر کے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ ریگولیشنوں میں

---

[1] مراسلہ مورخہ 17 جولائی 1813ء

کوئی ایسی بات بھی نہیں کہی گئی ہے جس کی بنا پر حکومت کے فیصلے پر کوئی چھوٹی سے چھوٹی پابندی عائد کی جا سکے نہ ایسی کوئی پابندی عائد کی جانی چاہیے[1]"۔

اگر یہ دلیل ایمانداری پر مبنی ہوتی تو اس کے نتیجے میں کچھ ترقی یافتہ زمینداریوں میں فوراً بندوبست استمراری ہونا چاہیے تھا اور بقیہ میں کچھ مدت بعد۔ لیکن اس کا مقصد تو ایک وعدہ کو خوبصورتی سے ٹالنا تھا اور اس میں انھیں کامیابی حاصل ہو گئی۔ 1813ء میں کسی زمینداری میں بندوبست استمراری نہیں ہوا اور اس کے بعد آج تک نہیں ہو سکا ہے۔

لارڈ مائر (Lord Moire)، جو بعد میں مارکوئس آف ہسٹنگز (Marquis of Hastings) کے نام سے مشہور ہوا، لارڈ منٹو کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اُس کا زمانہ حکومت نیپال کی جنگ، پنڈاریوں کے ساتھ جنگ اور مرہٹوں کے ساتھ آخری جنگ کے لیے مشہور ہے جس کی بنا پر 1817ء میں بمبئی کے صوبے پر قبضہ ہو گیا۔ ان حادثوں کی وجہ سے کچھ مدت تک لارڈ ہسٹنگز شمالی ہند کے بندوبست کی طرف توجہ نہ کر سکا۔

---

[1] مراسلہ مورخہ 16 مارچ 1813ء

باب 11

لارڈ ہیسٹنگز اور شمالی ہند کا محال واری بندوبست (1815ء تا 1822ء)

مرہٹوں کے ساتھ لڑی جانے والی آخری جنگ ختم ہو گئی اور آخری پیشوا 1818ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ اب لارڈ ہیسٹنگز کو ہندوستان میں آراضی کے مناسب انتظام کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا جو پنڈاروں کے دلوں اور مرہٹوں کی فوجوں سے نپٹنے کے مقابلے میں زیادہ دشوار تھا۔ جب تربیت یافتہ فوج میں اور غیر تربیت یافتہ دلوں میں مقابلہ ہو تو علاقوں کو فتح کرنا اور ان پر قبضہ جمانا آسان ہوتا ہے لیکن اس قسم کی فتوحات کی کہانی کو ہندوستان کی تاریخ کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ملک کی صحیح تاریخ تو نظم و نسق کی اور نئی حکومت میں لوگوں کی حالت کی کہانی ہے۔

مفتوحہ اور مقبوضہ علاقوں (شمالی ہند) کے بورڈ آف کمشنرز نے، جو سر ایڈورڈ کول برک اور مسٹر ڈانٹ پر مشتمل تھا، مختلف اضلاع یعنی مراد آباد، بریلی، شاہجہاں پور اور روہیلکھنڈ میں بندوبست کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے ایک دفعہ پھر اس بات پر زور دیا کہ مالگزاری کا جو تعین کیا جائے اسے دائمی حیثیت دے دی جائے۔

"حکومت نے از راہ نوازش ہمیں جو منصب عطا کیا ہے ہم اس کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں گے اگر ہم اپنی یہ متفقہ رائے نہ پیش کریں کہ ہمارے مقبوضہ علاقے کے اس حصے کو اگر بندوبست استمراری کے فوائد سے محروم رکھا گیا تو برطانوی حکومت کے مفادات کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ مقبوضہ اور مفتوحہ علاقوں کے لوگ مدت سے اور بے چینی کے ساتھ بندوبست استمراری کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"حالانکہ ہم اپنی جگہ پر مطمئن ہیں پھر بھی ہم مالی نقطۂ نظر سے اس اقدام کے فوائد کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔ ہمیں تو حکومت کے عہد کا پاس کرنا ہے جس سے مندرجہ بالا دو ریگولیشنوں کے ذریعے لوگوں سے وعدہ کیا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ عزت مآب کورٹ آف ڈائریکٹرز سے بندوبست استمراری کے متعلق تفصیلی مذاکرات کے بعد یہ ریگولیشن بنائے گئے تھے اور ان کے

متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس ملک اور یورپ کے اقتدار اعلیٰ رکھنے والے لوگوں کے قطعی اور آخری فیصلے کے مطابق ہیں ......"

"اس کے ساتھ ہم اس امر کی اجازت بھی چاہتے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور مشترکہ رائے ظاہر کرسکیں کہ بندوبست کی دائمی حیثیت سے کم تر کوئی اقدام ان صوبوں کے مالکان آراضی کے توقعات کو پورا نہیں کرسکے گا۔ جن کی بنیاد اُن کے خیال میں حکومت کے حتمی وعدے ہیں[1]"

دوسرے سال یعنی 1819ء میں مسٹر ڈاوڈس ویل (Mr Dowdeswell.) نے ہندوستان میں نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہونے سے کچھ دن پہلے اس موضوع پر ایک روداد لکھی تھی۔ انھوں نے صاف صاف باتیں کہی تھیں۔

"میرے خیال میں صورت حال یہ ہے کہ حکومت نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد سے وعدہ کیا تھا کہ 'مندرجہ بالا چند مستثنیات کے علاوہ' فتح کرنے یا قبضہ کرنے کی تاریخ سے دس سال گزرنے کے بعد انھیں بندوبست استمراری کے فوائد حاصل ہوسکیں گے ......"

"اس بات سے مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں اس قسم کے واقعات اور خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور رہوں جو میرے خیال میں اُن لوگوں کو پسند نہیں آئیں گے جن کو اُن پر خاص طور سے غور کرنا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ عزت مآب کورٹ آف ڈائریکٹرز اُن عوامل کے ساتھ انصاف کرے گا جو مجھے صاف گوئی پر اکسارہے ہیں۔ اگر مجھے انتخاب کی آزادی حاصل ہوتی تو میں اُس فرض کی ادائیگی سے انکار کردیتا جو مجھے اس وقت ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ چونکہ میرے خیال میں یہ میرا اہم فرض ہے کہ میں اپنے احساسات کو ظاہر کروں اس لیے انھیں قلمبند کر رہا ہوں ......"

"اگر میں یہ دکھانے میں معاون ثابت ہوسکوں کہ یہ اقدام ملک کی زراعتی ترقی کو فروغ دے کر حکومت کے مفادات کی اعانت کرے گا تو میرا دلی مقصد پورا ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ سرکاری وسائل کی غیر ضروری قربانی کے بغیر انگریزوں سے لوگوں کے لگاؤ میں اضافہ ہو جائے گا۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ مالکان آراضی رفتہ رفتہ اُس آراضی کو زیر کاشت لاکر جو مزروعہ آراضی کے درمیان واقع ہے یا دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پرگنہ، موضع یا زمینداری کے دوسرے ایسے حصوں میں واقع ہے جہاں بندوبست

---

[1] رپورٹ مورخہ 27 اکتوبر 1818ء۔

ہو چکا ہے اپنی گزر بسر کے ذریعوں کو ترقی دے سکیں گے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا تحریر میں دکھایا جا چکا ہے بقیہ زمین از روئے قانون حکومت کی ملکیت ہو گی .....''

''لیکن میں اس بات کو سمجھداری، انصاف اور تدبّر سے تعبیر نہیں کر سکتا ہوں کہ حکومت رفتہ رفتہ شرح تشخیص میں اتنا اضافہ کر دے کہ زمین سے حتی المقدور زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرے۔ میرا خیال ہے کہ شرح تشخیص میں اُس حد تک اضافہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے جس حد تک وہ زرعی طبقات کی خوشحالی اور ملک کی بتدریج ترقّی سے مطابقت رکھتی ہے .....''

''غالباً ہمیشہ کے لیے میں اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔ میں اپنے کام سے مطمئن بھی ہوں اور مجھے اس پر فخر بھی ہے کہ ملک میں خوشحالی اور داخلی امن کو برقرار رکھنے میں میری خدمات کو بھی دخل ہے، میں نے دیوانی اور فوجداری عدالتی نظام کو ترقی دینے کی حتی الوسع کوشش کی ہے اور سرکاری وسائل کے انتظام میں میں نے جو حصہ لیا ہے اس کی وجہ سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ حالانکہ تمنّاؤں کی کوئی حد نہیں ہے پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ ملک سے رخصت ہونے سے پہلے اگر میں مغربی صوبوں میں بندوبست استمراری کو رائج ہوتے دیکھ لیتا تو پھر غالباً میری کوئی آرزو تشنہ نہ رہتی''[1]

نمایاں حیثیت رکھنے والا ایک اور حاکم سر ایڈورڈ ڈبر وک چالیس سال تک ملک کی شاندار خدمات انجام دینے کے بعد ہندوستان سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس نے بھی ملازمت سے سبکدوش ہونے سے پہلے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے بڑھتے ہوئے تباہ کن مطالبوں کے مقابلے میں ملک کے لوگوں کی متوقع دولت اور زمین سے حاصل ہونے والے آئندہ فوائد کا تحفظ کرے۔ اس نے اپنی روداد کے ساتھ جو 1820ء میں لکھی گئی تھی ایک بیان بھی پیش کیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ 1807ء سے 1818ء تک کی بارہ سال کی مدت میں مفتوحہ اور مقبوضہ صوبوں میں مالگزاری میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور اس نے سفارش کی کہ مالگزاری کے مطالبوں پر وہ حدود عائد کی جائیں جن کا وعدہ کیا گیا تھا اور جن کی وجہ سے ''مالکان آراضی اپنی مزید محنت کا پھل حاصل کریں گے''[2]

---

[1] روداد مورخہ 7 اکتوبر 1819ء۔

[2] روداد مورخہ 17 مارچ 1820ء

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سر ایڈورڈ کول بروک کے بیان سے اخذ کیے گئے ہیں اور دس روپے کو ایک پاؤنڈ کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔

شمالی ہند کے مفتوحہ اور مقبوضہ صوبے

سال	مال گزاری	مجموعی آمدنی
	پاؤنڈ	پاؤنڈ
1807ء	20,08,955	2,65,396
1808ء	20,42,347	23,04,004
1809ء	22,54,791	25,79,949
1810ء	23,92,852	27,82,643
1811ء	24,14,737	27,41,728
1812ء	22,74,709	26,46,858
1813ء	25,08,681	29,31,906
1814ء	25,02,223	28,15,579
1815ء	24,83,133	28,91,045
1816ء	26,65,667	31,30,853
1817ء	26,26,761	29,26,923
1818ء	28,92,789	32,62,366

اسی سال کچھ دن بعد لکھی جانے والی ایک اور روداد میں سر ایڈورڈ کول بروک نے ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی کا تحفظ کرنے کی آخری کوشش کی جن کے درمیان وہ مدتوں رہ چکا تھا۔

"اس ملک سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے وقت جہاں میں نے اپنی زندگی کے بیالیس سال گزارے ہیں اور اس ملازمت سے سبکدوش ہوتے وقت جس میں آنجہانی وارن ہسٹنگز کی ابتدائی جانبداری کی بنا پر 1780ء میں حکومت کے فارسی سکریٹری کی حیثیت سے

میرا تقرر ہوا تھا اور جس میں اٹھارہ سال کی عرصے میں نے ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیا اگر میں اپنی منصبی زندگی میں ایک ایسا آخری کام کر جاؤں جس سے مجھے یہ یقین ہو کہ برطانوی علاقے کے اس حصے میں جہاں میں بارہ سال تک اپنے فرائض منصبی ادا کرتا رہا ہوں مالگزاری کی شرح کی حد مقرر ہو جائے گی اور لوگوں کو یہ نعمت حاصل ہو جائے گی تو مجھے اس سے بڑا اطمینان ہوگا ...... میں یہ بات نہیں بھول سکتا ہوں کہ ان صوبوں کی حد تک اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے میں مالکان آراضی کے طریقوں اور خصوصیتوں کا مرہون منت ہوں ۔ اگر میں اس اقدام کی صحت پر یقین نہ بھی رکھتا جب بھی جذبۂ احسان مندی مجھے اس قسم کا بدلہ دینے پر مجبور کرتا۔"

یہ جذبات شریفانہ تھے مگر بے سود ثابت ہوئے ۔ ہندوستان کے لوگوں کی امن پسندی اور وفاداری حکومت کو اس بات پر کبھی آمادہ نہیں کر سکی کہ وہ اپنے مالی مطالبات میں کمی کرے ۔ اس کے برعکس ان خصوصیتوں نے مطالبوں میں اضافہ کرنے کے لیے حکومت کی ہمت افزائی کی یہاں تک کہ لوگ تباہ اور بے وسیلہ ہو گئے حالانکہ انگریزی راج میں انھیں امن و تحفظ نصیب تھا، لوگ جز رس اور جفاکش تھے اور زمین زرخیز تھی ۔

بورڈ آف کمشنرز، مسٹر ڈاوڈس ویل، سر ایڈورڈ بروک، مسٹر اسٹورٹ (Mr Stuart)، مسٹر اڈم، مسٹر فین ڈل (Mr Fendall) کی رپورٹوں کا سہارا لیتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز نے کورٹ آف ڈائریکٹرز سے بندوبست استمراری کے لیے آخری درخواست کی جس کا برطانوی حکومت وعدہ کر چکی تھی اور جو لوگوں کی خوشحالی کے لیے ضروری تھا ۔

"یہ ہماری متفقہ رائے ہے کہ معینہ جمع بندی کے اصول پر یا معینہ اور مقررہ شرح کی رو سے تشخیص مالگزاری کے اصول پر مفتوحہ اور مقبوضہ صوبوں میں مالگزاری کا بندوبست استمراری کر دیا جائے۔"[1]

ایک تجارتی کمپنی کے ڈائریکٹروں نے جواب ایک سلطنت کے مالک بن بیٹھے تھے ایسی

---

[1] مالگزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بھیجا جانے والا مراسلہ جس پر گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز کے علاوہ کاؤنسل کے اراکین اسٹورٹ، اڈم اور فین ڈل کے دستخط تھے، مورخہ 16 ستمبر 1820ء

رکھائی کے ساتھ لارڈ ہسٹنگز کی تجاویز کو رد کر دیا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اپنے مالی مفاد کے مقابلے میں وہ لوگوں کی حقیقی مسرت کا کتنا خیال رکھتے تھے۔"

"ہم ایک دفعہ پھر آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم اُس رائے سے اتفاق کرنے کو تیار نہیں ہیں جس پر بقول آپ کے آپ سب کا اتفاق ہو گیا ہے۔" کہ معینہ جمع بندی کے اصول پر یا معینہ اور مقررہ شرح کی رو سے تشخیص مالگزاری کے اصول پر مفتوحہ اور مقبوضہ صوبوں میں مالگزاری کا بندوبست استمراری کر دیا جائے۔" ہم ایک دفعہ پھر اُس حکم کو صاف دہراتے ہیں جو اس شعبے کے متعلق ہمارے مراسلے مورخہ 15 جولائی 1819ء کے پیراگراف نمبر 86 میں مالگزاری کے کسی بندوبست استمراری کے خلاف درج ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ نہ صرف اس قسم کے بندوبست سے گریز کریں بلکہ اس قسم کا کوئی اقدام نہ کریں جن کی بنا پر آئندہ بندوبست استمراری کی کوئی توقع قائم کی جائے۔[1]

اس طرح چالیس سال کے لیے یہ بحث ختم ہو گئی۔

اس دوران ہولٹ میکنزی (Holt Mackenzie) نے، جو اس زمانے میں بورڈ کا سکریٹری تھا، 1819ء کی مشہور روداد لکھی جس میں اس نے بتایا کہ شمالی ہند میں گاؤں پنچایتیں موجود ہیں اور سفارش کی کہ جہاں جہاں اس قسم کی پنچایتیں موجود ہیں اس سے باقاعدہ پیمائش و تفتیش کے بعد بندوبست کیا جائے۔[2] اس روداد میں مختلف اضلاع کا جائزہ لیا گیا تھا اور تجویز کی گئی تھی گاؤوں کی پیمائش کی جائے، کھتونیاں تیار کی جائیں اور گاؤں پنچایتوں کی نمائندگی گاؤں کے مکھیا کریں جن کو نمبردار کہا جائے یا ایسے لوگ جن کا کلکٹر کے رجسٹر میں ایک "نمبر" ہو اور جن پر ریاست کو مالگزاری ادا کرنے کی ذمہ داری ہو۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا تھا کہ شرح تشخیص میں اضافہ کرنے کے بجائے اس میں یکسانیت پیدا کی جائے اور مالگزاری ادا کرنے والوں کو اُس وقت جو حقوق تھے اُن کو برقرار رکھا جائے۔

چونکہ 1821ء میں بندوبست استمراری کا خیال ترک کر دیا گیا تھا اس لیے ہولٹ میکنزی

---

[1] گورنر جنرل ان کاونسل کے نام مالگزاری سے متعلق کورٹ آف ڈائرکٹرز کا مراسلہ مورخہ یکم اگست 1821ء

[2] روداد مورخہ یکم جولائی 1819ء

کی روداد کو بندوبست کی اساس بنایا گیا۔ خیال یہ تھا کہ جہاں زمیندار موجود ہیں وہاں ان سے بندوبست کیا جائے اور جہاں گاؤں پنچایتیں مشترکہ طور سے زمین پر قابض ہیں، وہاں اُن سے بندوبست کیا جائے۔ خاص طور سے اس امر کی خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ زمین کے محصول کی شرح مقرر کرتے وقت اعتدال سے کام لیا جائے۔ حکومت نے 1822ء کی تجویز میں اس پر خاص طور سے زور دیا تھا۔

"87۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے قدیم قوانین کی رو سے بادشاہ کو پیداوار کا ایک حصہ دیا جاتا تھا جو اعتدال پر مبنی ہوتا تھا۔ لیکن اگر ہم قدیم زمانے کے دستور کا فیصلہ نسبتاً جدید ہندو ریاستوں کے دستور کی بنا پر کریں تو ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کاشتکاروں سے وصول ہونے والی حقیقی رقمیں ہمیشہ نام نہاد شرح تک محدود نہیں ہوا کرتی تھیں۔۔۔۔۔"

"88۔ اسی طرح مغلوں کا وہ طریقہ تھا جس کی تشریح مسٹر گرانٹ نے کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رقم کی شرح کا تعین اوسط پیداوار کے چوتھائی حصے کی قیمت کے تعین کی بنا پر کیا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔"

"93۔ بہرحال گورنر جنرل ان کاؤنسل اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ دیسی ریاستیں جن کی جگہ ہم نے لی ہے اگرچہ اپنے مالی مطالبوں کا تعین کرنے میں بھی پرانے رواجوں کا بہت خیال رکھا کرتی تھیں اور خاص طور سے آخر کے دنوں میں، اُن میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس رقم کو وصول کرلیں جسے وہ واجب الوصول سمجھتی تھیں، پھر بھی (اس کے باوجود کہ کسانوں کے حالات پر انھیں نظر رکھنی پڑتی تھی) کسی نے حکومت کے مطالبے کی شرح معین کرنے کے سرکاری حق پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔"

"101۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اُسے خاص طور سے اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا مطالبہ بہت زیادہ نہ ہو۔ اس امر کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ ہم تو یہ سمجھیں کہ ہم خالص لگان کا ایک حصہ وصول کر رہے ہیں اور ہم حقیقت میں کسان کی محنت کی اجرت اور کاشتکاری کے سامان کے منافع کا ایک حصہ بھی چھین لیں۔۔۔۔۔۔"

"129۔ جب اس لگان کی شرح معین ہو جائے جو کسانوں کو ادا کرنا چاہیے تو پھر ہمیں درمیانی منیجروں (مالکان آراضی) کو ملنے والے فوائد کی نوعیت اور مقدار کا تعین کرنا ہوگا، اور اس امر کا تعین کرنا ہوگا کہ حکومت کے مطالبے کو حدود کے اندر رکھنے کی وجہ سے حاصل

ہونے والے منافع اور خالص لگان کو کس تناسب سے تقسیم کیا جائے .....۔"

" 337 ۔ گورنر جنرل ان کا ؤنسل کو ان شہادتوں سے بڑا اطمینان ہوا، جو دوسرے موقعوں پر پیش کی گئیں، کہ ہندوستانی حکام مال میں اعزازی انعامات کی قدر و منزلت کا احساس پایا جاتا ہے ۔ اس احساس کو زندہ رکھنا اشد ضروری ہے۔ حکومت سرکاری ملازمین کے کسی طبقے کے تعلق سے اس قسم کی غلط جزرسی پر عمل نہیں کرنا چاہتی ہے جو اُن احکام کو جن پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے افلاس اور بے عزتی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دے۔"[1]

اس تجویز کے ایک ہفتہ بعد 1822ء کا ریگولیشن نمبر 7 منظور کیا گیا" جس میں ان اصولوں کا اعلان کیا گیا جن کی بنا پر مقبوضہ اور مفتوحہ صوبوں میں، بشمول کٹک، پتس پورا ور اس کے متعلقات کے، مالگزاری کا بندوبست کیا جانا قرار پایا تھا۔"

بندوبست پر نظر ثانی کرتے وقت ہر گاؤں اور ہر زمینداری کا بندوبست کرنا تھا۔ چونکہ ہندوستانی زبان میں زمینداری کو محال کہا جاتا ہے اس لیے شمالی ہند میں ہونے والے اس بندوبست کا نام محال واری بندوبست پڑ گیا۔ کسی زمینداری کی مالگزاری کے مطالبے میں اُس وقت تک اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ زمیندار کا منافع سرکاری مطالبے کے پانچویں حصے سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس قسم کے حالات میں " شرح تشخیص کو اس طرح کم زیادہ کیا جائے کہ مذکورہ بالا زمینداروں وغیرہ کو جمع بندی یا مالگزاری کے مطالبے کا بیس فیصدی منافع مل جائے۔" چنانچہ ایک ایسی ریاست میں جس کے لگان کی مجموعی رقم 1200 پاونڈ ہو، سرکاری مطالبہ 1,000 پاونڈ کر دیا جاتا تھا تاکہ مالک آراضی کے پاس 200 پاونڈ یا سرکاری مطالبے کا پانچواں حصہ بچ جائے۔ اس طرح سرکاری مطالبہ زمینداری کے مجموعی لگان کے 83 فی صدی سے زیادہ ہوتا تھا۔

کلکٹروں کو کسانوں کے ساتھ پٹّہ کرنے کا اختیار حاصل تھا جس میں لگان کی نوعیت درج کر دی جاتی تھی ۔ ان صورتوں میں جہاں زمینداریوں پر مالکان آراضی کے بجائے کسانوں کا مشترکہ قبضہ تھا وہاں سرکاری مطالبہ بڑھا کے لگان کا 95 فیصدی بھی کیا جا سکتا تھا یعنی تمام کا تمام لگان "جس میں سے مالکانہ یا ایسے دوسرے مقامی محصول منہا کر دیے جاتے

---

[1] حکومت کی تجویز مورخہ یکم اگست 1822ء

تھے جن کے متعلق حکومت طے کرے اور جن کی رقم 5 فیصدی سے کم نہ ہو"؛ ایسی صورت میں کلکٹر کو اختیار حاصل تھا کہ وہ گاؤں کی زمینوں کو پھر سے تقسیم کر دے یا سرکاری مطالبے کو اس تناسب سے تقسیم کر دے جو مختلف کسانوں سے علیحدہ علیحدہ واجب الوصول ہو۔

کلکٹروں کو اختیار دیا جا سکتا تھا کہ وہ مالکان آراضی اور کسانوں کے باہمی مقدمات کی سماعت کر سکے، واجب ادا لگان کا تعین کر سکے، اُن کی حساب فہمی کرا سکے اور مالک آراضی اور کسان کے درمیان زمین، لگان، پٹّے یا معاہدے سے تعلق رکھنے والے تنازعات کا فیصلہ کر سکے۔ کلکٹر کے فیصلوں کے خلاف بورڈ میں اپیل دائر کی جا سکتی تھی یا عدالت دیوانی میں باقاعدہ دعویٰ دائر کیا جا سکتا تھا۔"[1]

شمالی ہندوستان کا پہلا جامع قانون قبضہ آراضی اس قسم کا تھا جو شمالی ہند کے اضلاع حاصل کرنے اور فتح کرنے کے بیس سال بعد نافذ ہوا۔ اس کی دفعات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی خرابیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ کلکٹر کے فیصلے کے علاوہ ایکٹ میں اس لگان کا کوئی منصفانہ معیار مقرر نہیں کیا گیا تھا جو کسانوں کو ادا کرنا تھا۔ اس نے لگان کے صرف سترہ فیصدی کے علاوہ مالکان آراضی کے لیے کوئی منصفانہ منافع نہیں تجویز کیا تھا۔ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ "زیادہ مطالبے کے خلاف تحفظ کیا جائے" اور "لگان کا صرف ایک حصہ وصول کیا جائے"، لیکن اس کے برعکس اس ایکٹ نے ملک کے قریب قریب تمام تر لگان پر قبضہ کر لیا تھا جس کی بنا پر مالکان آراضی اور کسان یکساں طور پر تباہ ہو گئے تھے۔ اس ایکٹ کی وجہ سے لوگوں کے لیے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ دولت پس انداز کر سکیں یا اپنی مادی حالت کو سدھار سکیں اور اس نے اس کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا کہ پہلے بندوبست کی چھوٹی سی مدت ختم ہونے کے بعد آئندہ ہونے والے بندوبستوں میں ریاست کے مطالبے پر حدود عائد کیے جا سکیں۔

اس طریقے کی سختی نے آخر میں اس کو ختم کر دیا۔ کمپنی کے عظیم ترین اور بہترین گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک نے 1832ء میں شمالی ہند کے لوگوں کو کچھ سہولتیں فراہم کیں۔ آئندہ باب میں ہم 1833ء کے بندوبست کی کیفیت بیان کریں گے۔

---

[1] 1822ء کا ریگولیشن نمبر 7۔

باب 12

شمالی ہند کی معاشی حالت (1800ء)

پچھلے ابواب میں ہم نے بنگال، مدراس اور شمالی ہند کے بندوبستوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر جگہ مقامی حکام مالگزاری کے بندوبست استمراری پر زور دیتے تھے۔ بنگال میں 1793ء میں زمینداری بندوبست استمراری ہوا جو 1795ء میں بنارس میں بھی نافذ کر دیا گیا۔ مدراس میں شمالی سرکاروں اور کچھ دوسرے علاقوں میں 1802ء اور 1805ء کی درمیانی مدّت میں زمینداری بندوبست استمراری کیا گیا لیکن اس کے بعد ڈائرکٹروں کی پالیسی بدل گئی۔ ٹامس منرو نے رعیت واری بندوبست استمراری کی اور بورڈ آف ریونیو نے گانو کے ساتھ بندوبست استمراری کی سفارش کی۔ ایک رعیت واری بندوبست ہوا لیکن اس کو دائمی حیثیت نہیں دی گئی۔ شمالی ہند میں لارڈ ویلزلی نے 1803ء اور 1805ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے زمینداری بندوبست استمراری کرنے کا وعدہ کیا اور لارڈ منٹو اور لارڈ ہسٹنگز نے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے ڈائرکٹروں پر زور ڈالا۔ ڈائرکٹروں نے وعدہ خلافی کی اور محال واری بندوبست کرنے کے احکام جاری کیے جس کی حیثیت دائمی نہیں تھی۔

ہندوستان میں انگریزی راج کے دوسرے دور میں مالگزاری کے بندوبستوں کی تاریخ کچھ اس قسم کی تھی۔ برطانوی حکام کی پہلی نسل یعنی کلایو اور وارن ہسٹنگز کی نسل نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ انھیں زمین کے مسئلے نے پریشان کر دیا تھا اور ان کے سخت اور نت نئے طریقوں کا نتیجہ مظالم اور ناکامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دوسری نسل یعنی کارنوالس، ویلزلی اور لارڈ ہسٹنگز کی نسل نے بنگال، بنارس اور شمالی سرکاروں کو زمینداری بندوبست استمراری عطا کیا مدراس کے نئے نئے حاصل ہونے والے علاقوں میں رعیت واری بندوبست جاری کیا جس کی دائمی حیثیت نہیں تھی اور شمالی ہند کے مقبوضہ اور مفتوحہ صوبوں میں محال واری بندوبست کو رواج دیا۔ اس کی حیثیت بھی دائمی نہیں تھی۔

اب اس کہانی کو تھوڑی دیر کے لیے ختم کر دیں اور انیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں ہندوستان کے لوگوں کی معاشی حالت پر غور کریں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تفصیل کے ساتھ اس پر غور کریں کہ ہندوستان کے لوگ رہتے کس طرح تھے، کھیت کیسے جوتتے تھے کس قسم کی اشیا بنایا کرتے تھے، مردوں کی بافت کیا تھی اور کتنی اجرت ملتی تھی، عورتیں کس قسم کے کام کیا کرتی تھیں۔ قوموں کی تاریخ میں اس سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز کوئی دوسرا مطالعہ نہیں ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں لوگوں کے مادی حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر فرانسس بکانن (Dr Francis Buchanan.) کی بیش قیمت کتاب میں ـــــ جو اعداد و شمار کا پہلا محقق تھا اور جسے ہندوستان کی برطانوی حکومت نے اس کام پر لگایا تھا ـــــ لوگوں کی صنعتوں اور روزگاروں کے متعلق تفصیلی معلومات مل جاتی ہیں۔

24 فروری 1800ء کو لارڈ ویلزلی نے، جو اس زمانے میں گورنر جنرل تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک طبی افسر ڈاکٹر بکانن کو جنوبی ہند میں سفر کرنے پر معمور کیا تاکہ لوگوں کی حالت، ان کی زراعت اور ان کی صنعتوں کے متعلق معاشی تحقیقات کی جا سکے۔ ڈاکٹر بکانن مدراس سے کرناٹک، میسور، کیمبٹور، ملابا اور کنارا گیا۔ اس سفر کے دوران اس نے جو روزنامچہ لکھا اور اس کی تفتیش و تحقیق کے نتائج 1807ء میں لندن میں تین جلدوں میں شائع ہو گئے۔ ہمارے اس باب کی بنیاد اس کی کتاب ہے جس میں 1800ء میں جنوبی ہند کے لوگوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مدراس کی جاگیر

23 اپریل 1800ء کو ڈاکٹر بکانن اعداد و شمار کی تحقیقات کے دورے پر مدراس سے روانہ ہوا۔ مدراس کے نواح میں غیر مزروعہ زمین بہت کم تھی اور بارش کافی ہونے کی صورت میں دھان کی اچھی فصل ہوتی تھی۔ کہیں کہیں لوگ تالابوں اور پانی کے ذخیروں سے کھیتوں کی آبپاشی کیا کرتے تھے اور ان کھیتوں میں دھان کی فصل لہلہا رہی تھی۔ کار خیر میں دلچسپی رکھنے والوں نے راستوں میں سرائیں بنا دی تھیں جہاں مسافر مفت قیام کر سکتے تھے۔

کچھ دور چل کر سڑک پچھم کی طرف مڑی اور ایسے علاقے سے گزری جو اس وقت تو

بے برگ ہے ،، لیکن ناریل کے باغوں کی وجہ سے ترقی کر رہا تھا۔ کنداتورو میں علاقہ زیادہ سرسبز نظر آیا اور ڈاکٹر بکانن نے ہندوؤں کے قدیم آب رسانی کے ان ممکن ذرائعوں کا مطالعہ کیا جن کے لیے جنوبی ہند مشہور تھا۔ ان میں ایک طریقہ پانی کے ذخیرہ کرنے کا تھا۔ اس کے لیے دو قدرتی ٹیلوں کی درمیانی کھلی ہوئی جگہ کو ایک مصنوعی پشتے کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ اس طرح سات یا آٹھ میل لمبی اور تین میل چوڑی پانی کی جھیل بن گئی تھی۔ اس میں سے متعدد چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی تھیں جن سے خشک موسم میں کھیتوں کی آبپاشی کی جاتی تھی۔ برسات میں چیر ندی اس کو بھر دیا کرتی تھی۔ جگہ جگہ دروازے بنے ہوئے تھے جنھیں پتھر رکھ کے مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ یہ پتھر ڈھلواں رکھے جاتے تھے تاکہ ضرورت سے زیادہ پانی ان پر بہہ کر نکل جائے۔ ایک دفعہ اٹھارہ مہینے تک بارش نہیں ہوئی اور اس ذخیرہ سے تیس گاؤں کے کھیتوں کی آبپاشی ہوتی رہی۔ ڈاکٹر بکانن نے لکھا تھا" ایسے ملک میں جہاں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑنے کا امکان رہتا ہے اس قسم کا پانی کا ذخیرہ نہایت بیش قیمت ہوتا ہے"۔

مغرب کی طرف آگے چل کر کنڈاتورو اور سری پرماتورو کا درمیانی علاقہ بنجر تھا، جس میں چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ کاشت نہ ہونے کے برابر تھی اور اکثر اتنی فصل بھی نہیں ہوتی تھی کہ بیج کی قیمت نکل آئے۔ لیکن خودرو کھجوریں اور تاڑ پائے جاتے تھے۔ تاڑ سے ایک مشروب حاصل کیا جاتا تھا جس کو تاڑی اور جگاری کہتے تھے۔

سری پرماتورو میں ایک اور پرانا پانی کا ذخیرہ تھا جس سے گاؤں کے کھیتوں کی آبپاشی ہوتی تھی۔ یہ کھیت دو ہزار ایکڑ زمین پر مشتمل تھے جس میں دھان پیدا ہوتا تھا۔ اس کے بعد زمین پھر بنجر تھی اور بہت کم کاشت ہوتی تھی یہاں تک کہ ڈاکٹر بکانن قدیم ہندو دارالسلطنت کانچی پہنچ گیا جو اس زمانے میں کانجی ورم کہلاتا تھا۔

کانجی ورم میں ایک بڑا پانی کا ذخیرہ تھا جس سے بہت سے کھیتوں کی آبپاشی ہوتی تھی جن میں دھان کی فصل لہلہا رہی تھی۔ نواب محمد علی کے دیوان نے بھی ایک خوبصورت تالاب تعمیر کیا تھا جس میں چاروں طرف سرخ پتھر کاٹ کر لگایا گیا تھا جو تہہ تک لگا ہوا تھا۔ تالاب کے ادھر ادھر سرخ پتھر کی سرائیں تعمیر کی گئی تھیں تاکہ مسافر ان میں قیام کر سکیں اور ستونوں پر نفیس نقش و نگار بنائے گئے تھے۔

کانجی ورم ایک بڑا شہر تھا جس کی تعمیر میں سلیقے سے کام لیا گیا تھا لیکن آبادی زیادہ نہیں

تھی ۔ بہت سی عمارتیں خالی پڑی تھیں اور زیادہ تر مکان ایک منزلہ تھے ۔ ان کی دیواریں کچی تھیں اور چھتیں کھپریل کی تھیں ۔ ان کی تعمیر ایک مربع کی شکل میں کی جاتی تھی جس کے بیچ میں صحن ہوتا تھا ۔ سڑکیں چوڑی اور صاف تھیں اور زاویہ قائمہ بناتی ہوئی ایک دوسرے کو کاٹتی تھیں ۔ سڑکوں کے دونوں طرف ناریل کے درختوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں ۔ علاقے کے زیادہ تر برہمن یا تو شنکرا چاریہ کے پیرو تھے یا راما نج آچاریہ کے ۔ شنکرا چاریہ نویں صدی میں پیدا ہوئے تھے اور بڑے کٹر ویدانتی تھے جن کا خیال تھا کہ برہم کے علاوہ کوئی شے وجود نہیں رکھتی ہے ۔ راما نج آچاریہ گیارھویں میں پیدا ہوئے تھے اور زیادہ عمومی ویدانتی تھے جو ذات وصفات کی تجسیم کا درس دیا کرتے تھے ۔ موجودہ زمانے میں شنکر کے عقیدوں کو شیومت کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور راما نج کے عقیدوں کو وشنومت کے ۔

کانجی ورم سے روانہ ہونے کے بعد ڈاکٹر بکانن نے ایک دفعہ پھر علاقے کو بنجر پایا ۔ یہاں تک کہ وہ دمرلو پہنچ گیا جو مدراس کی جاگیر کا آخری گاؤں تھا ۔ دمرلو اور اولور کے درمیانی علاقے کو جہاں دھان پیدا ہوتا تھا پالار دریا سے نکلی ہوئی ایک نہر سیراب کرتی تھی ۔ اولور کی زمین اچھی تھی لیکن اس میں صرف وہ غلہ پیدا ہو سکتا تھا جس کو پانی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی ہے اور کھیتوں میں جھاڑیاں اور درخت اُگ آئے تھے ۔

مدراس کی جاگیر جو نصف صدی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں تھی بہ حیثیت مجموعی فروغ نہیں پا رہی تھی ۔ بار بار ہونے والی جنگوں کی وجہ سے، زمین کے بھاری محاصل کی وجہ سے اور آمدنی کو مقامی ترقی کے کاموں پر صرف کرنے کے بجائے ان اشیا کی خرید پر صرف کرنے کی وجہ سے جو کمپنی برآمد کیا کرتی تھی ملک غریب ہو گیا تھا اور آبادی کم ہو گئی تھی ۔ کنڈاتورو کے کلکٹر مسٹر پلیس (Mr Place.) نے اپنے زمانۂ نظم ونسق میں پانی کے پرانے ذخیروں کی مرمت کرائی تھی اور زمین کے محصول میں خاصہ اضافہ کر دیا تھا ۔ لیکن بہت زیادہ علاقے میں نہ آبپاشی کا کوئی انتظام تھا، نہ کاشت ہوتی تھی اور آبادی بھی بہت کم تھی ۔ بقول ڈاکٹر بکانن وہ علاقہ "ریگستان" تھا ۔

کرناٹک

جس وقت ڈاکٹر بکانن نے کرناٹک کا سفر کیا اس وقت تک لارڈ ویلزلی نے اس پر

قبضہ نہیں کیا تھا اور اس لیے اس پر اس وقت بھی کرناٹک کے نواب کی حکومت برائے نام تھی اور اس کا نظم و نسق عملاً کمپنی کے ملازمین کے ہاتھوں میں تھا۔

آرکاٹ جاتے ہوئے ڈاکٹر بکانن نے ہندوؤں کا تعمیر کیا ہوا ایک اور شاندار پانی کا پرانا ذخیرہ دیکھا جو کاویری پاک کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ذخیرہ "تقریباً آٹھ میل لمبا اور تین میل چوڑا ہے اور ملک کے قابل لحاظ حصے کی آبپاشی اس کے ذریعے ہوتی ہے۔ مجھے کوئی سرکاری تعمیر دیکھ کر اس سے زیادہ اطمینان کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس سے لوگوں کو وہ تمام آسائشیں حاصل ہوتی ہیں جن سے لطف اندوز ہونے کی ان کا اخلاق اجازت دیتا ہے۔"

کاویری پاک سے آرکاٹ جانے والی سڑک خراب حالت میں تھی اور گاڑیوں کے لیے ناقابل گزر تھی۔ لوگ عام طور سے بیل گاڑیوں میں سفر کیا کرتے تھے اور مسلمان عورتیں سفید برقعے پہنے ہوئے کبھی کبھی بیلوں پر سوار دیکھی جا سکتی تھیں۔ آرکاٹ کا شہر بڑا تھا اور وہاں موٹا جھوٹا سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ مکان قریب قریب ویسے ہی جیسے مدراس کی جاگیر کے شہروں میں تھے۔ آس پاس کی پہاڑیاں درختوں سے خالی تھیں۔ یہ پہاڑیاں سرخ پتھر کی تھیں جن کے پتھر تیزی کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔ آرکاٹ اور مغربی پہاڑیوں کے درمیان کی کچھ زمین اچھی تھی جہاں باغات تھے اور بارانی غلہ پیدا ہوتا تھا باقی بنجر پڑی تھی۔

آرکاٹ سے مغرب کی طرف ویلور کو جانے والی سڑک اور ویلور سے پالی گونڈا جانے والی سڑک پالار دریا کی وادی سے گزرتی تھی۔ وہاں کی زمین زرخیز و سرسبز تھی۔ ویلور کا قلعہ بہت بڑا بھی تھا اور بہت خوبصورت بھی۔ شہر بھی بڑا تھا اور ہندو فن تعمیر کا نمونہ تھا لیکن جو گاؤں سڑک پر واقع تھے ان میں غربت اور دکھوں کے نظارے دیکھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ویران پڑے تھے۔ پالی گونڈا کے لوگ ریت میں چھ سات فٹ گہری نالیاں کھود کر پالار دریا سے پانی حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ پانی کچھ دوسری نالیوں کے ذریعے کھیتوں کی آبپاشی کے لیے لے جایا جاتا تھا جس نے ویلور کی وادی کو کرناٹک کا سب سے اچھا علاقہ بنا دیا تھا۔

بارہ محل

اس کے بعد ڈاکٹر بکانن مشرقی گھاٹ کو عبور کر کے ہرمنی کو ونکٹا گیری پہنچا جو بارہ محل

میں واقع تھا۔ اس علاقے میں ٹامس منرو کچھ سال پہلے بندوبست کر چکا تھا۔ یہاں کے اتار چڑھاؤ اور لہراتے ہوئے مناظر نے ڈاکٹر بکانن کے دل میں انگلستان کی یاد تازہ کر دی اس کے خیال کے مطابق آدھا علاقہ مزروعہ اور بقیہ جھاڑیوں کا میدان تھا جو چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کچے لوہے اور سیاہ ریت سے لوہا تیار کیا جاتا تھا اور کئی مقامات پر نمک دستیاب ہوتا تھا۔ زمین سرخ تھی جس میں کچے لوہے کے ساتھ سنگِ مردہ اور سرخ پتھر کے ذرّے شامل تھے۔ گاؤں اور شہروں میں جھونپڑوں کی دیواریں اسی مٹّی سے بنائی جاتی تھیں۔ انھیں لیپا جاتا تھا اور ان پر اوپر سے نیچے کی طرف چوڑی چوڑی سفید اور سرخ لکیریں بنا دی جاتی تھیں۔ کہیں کہیں گھروں کی افقی چھتوں پر بھی اس مٹّی کا لیپ کیا جاتا تھا۔

مشرقی میسور

اس کے بعد ڈاکٹر بکانن میسور کے راجہ کے علاقے میں داخل ہوا۔ ایک سال پہلے ٹیپو سلطان کے انتقال کے بعد لارڈ ولیزلی نے اس کو گدی پر بٹھا دیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ دالورد ایک خاصا بڑا قصبہ تھا جہاں ہر ہفتہ بازار لگتا تھا۔ وہاں موٹا جھوٹا سوتی کپڑا بنا کرتا تھا جو زیادہ تر باہر بھیجا جاتا تھا۔ آس پاس کے گاؤوں میں معمولی قسم کے کمبل بھی بنائے جاتے تھے جو کملی کہلاتے تھے۔ کل زمین کا $\frac{2}{3}$ حصہ قابل زراعت تھا اور اس کے تقریباً بارہویں حصے کی آبپاشی ہوتی تھی۔ پنّار دریا کے کنارے دھان پیدا ہوتا تھا۔ عورتیں زمین میں کھاد ڈالا کرتی تھیں۔ وہ کھاد ڈلیوں میں بھر کر کھیتوں کو لے جاتی تھیں۔ کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے بیل اور بھینسے استعمال کیے جاتے تھے۔

۱۵ مئی کو ڈاکٹر بکانن بنگلور پہنچا۔ سرحد کی حفاظت کے لیے حیدر علی نے مسلمانوں کے فوجی فن تعمیر کے مطابق اس شہر کی تعمیر کی تھی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے اس کو ویران کر دیا تھا۔ ٹیپو سلطان کا خیال تھا کہ بہادر انگریزی فوج کے خلاف دفاعی نقطۂ نظر سے وہ بیکار تھا۔ اس شہر میں بڑے بڑے باغات تھے جو مربعوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے، اس کی آب وہوا سرد اور انگور کی بیلوں کے موافق تھی جو بڑی تعداد میں پائی جاتی تھیں۔ سیب اور آڑو کے علاوہ صنوبر اور شاہ بلوط کے درخت بھی بڑی تعداد میں تھے جو راس امید سے لائے گئے تھے۔ بنگلور کے نواح میں قابل زراعت آراضی کل زمین کی $\frac{1}{10}$ سے زیادہ نہیں تھی۔ چونکہ حالیہ جنگوں کے

زمانے میں پانی کے ذخیروں کی نگہداشت نہیں کی جا سکی تھی اس لیے تھوڑی سی زمین جس کی آبپاشی ہو سکتی تھی، اور جو پہلے زیر کاشت تھی، اب زیادہ تر بنجر پڑی تھی۔ ٹیپو سلطان نے جس وقت حیدر علی سے ورثے میں سلطنت پائی تھی اس وقت اس کی حالت بہت اچھی تھی۔ لوگوں نے ڈاکٹر بکانن کے سامنے حیدر علی کی بڑی تعریف کی لیکن ٹیپو کے مظالم نے یا اس کی جنگوں نے لوگوں کو بڑی پریشانیوں میں گرفتار کر دیا تھا اور ⅔ کسان اپنا گھر بار اور علاقہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

8 مئی کو ڈاکٹر بکانن نے سرنگا پٹم پہنچ کر، جو اس وقت میسور کے راجہ کا دارالسلطنت تھا، اپنا مراسلہ تعارف پیش کیا۔ دوسرے دن وہ پورنیا سے ملا۔ پورنیا وہ مشہور ہندو وزیر تھا جس کے نظم و نسق کی انتہائی تعریف جنرل ویلزلی نے (جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن ہو گیا) اور ہندوستان میں رہنے والے اُن تمام یورپیوں نے کی ہے جن کا اُس سے سابقہ پڑا۔ ٹیپو سلطان کے عہد حکومت میں بھی پورنیا کو بہت اختیارات حاصل تھے اور ٹیپو نے اگر اس کی بات پر دھیان دیا ہوتا تو وہ ٹیپو کو بچا لیتا۔ ٹیپو کی موت کے بعد نئے راجہ کے عہد حکومت میں وہ میسور کا قریب قریب حکمراں بن گیا تھا۔

سرنگا پٹم جس کی آبادی ٹیپو سلطان کے زمانے میں غالباً ڈیڑھ لاکھ تھی اب جنگوں کی وجہ سے تباہ ہو چکا تھا اور اس کی آبادی مشکل سے 32,000 نفوس پر مشتمل تھی۔ کاویری کے شمال کا علاقہ پٹنا آشٹا گرام کہلاتا تھا اور جنوب کا علاقہ مہاسورا آشٹا گرام۔ دریا کے دونوں طرف کا علاقہ رفتہ رفتہ اونچا ہوتا گیا تھا اور قدرتی طور سے زرخیز تھا۔ اس کی آبپاشی نہروں کے ذریعے ہوتی تھی جن کی گولیں درمیانی علاقے کو سیراب کرتی تھیں۔ بڑے بڑے بند بنا کر کاویری دریا کا پانی ان نہروں میں پہنچایا گیا تھا۔ یہ بند بڑی بڑی چٹانیں رکھ کر بنائے گئے تھے جن پر بہت روپیہ صرف ہوا تھا۔ ڈاکٹر بکانن نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مفید تعمیر حیدر علی نے کی تھی یا اس کے پیش رو ہندو راجاؤں نے۔ لیکن ٹیپو کی جنگوں کے زمانے میں بہت نقصان ہوا تھا۔ مندر، گاؤں اور بند مسمار ہو گئے تھے اور نہریں بند ہو گئی تھیں لیکن پورنیا کے زیر انتظام زراعت اور صنعت کی تجدید ہو رہی تھی۔ "ہر چیز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ گاؤں آباد ہو رہے ہیں، نہریں صاف کی جا رہی ہیں اور نیل گائے اور جنگل کے محافظوں کے بجائے امن پسند بیل اپنا مفید کام شروع کر رہے ہیں۔"[1]

1۔ بکانن Journey from Madras (لندن، 1807ء) جلد 1 صفحہ 83۔

میسور میں دھان کاٹنے اور انھیں خراب ہونے سے محفوظ رکھنے کا طریقہ بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ دھان کاٹنے سے ایک ہفتہ پہلے کھیتوں سے پانی نکال دیا جاتا تھا، اس کے بعد زمین سے تقریباً چار انچ کی اونچائی پر دھان کاٹا جاتا تھا اور بالیاں اندر کی طرف کر کے ان کے پوئلے بنا دیے جاتے تھے۔ ایک ہفتہ بعد انھیں کھلیان میں بچھا کر ان پر بیلوں کی دائیں چلائی جاتی تھی۔ اس کے بعد ۵۰ کنڈک کے ڈھیر لگا دیے جاتے تھے۔ ہر ڈھیر پر مٹی سے نشان لگا دیا جاتا تھا اور بھوس چھا دیا جاتا تھا۔ اس حالت میں چاول بیس یا تیس دن تک رہتے تھے تاآنکہ حکومت اور کسان میں ان کا بٹوارہ نہ ہو جائے۔ بٹوارے کے بعد کسان مختلف طریقوں سے اپنا حصہ رکھا کرتے تھے۔ کچھ لوگ اس کو ایک تنگ نالی میں رکھتے تھے جو سخت پتھریلی زمین میں بنائی جاتی تھی اور تقریباً ½ 2 فیٹ گہری ہوتی تھی۔ اس نالی کے فرش پر، بغلوں میں اور اوپر بھوس استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر نالی میں تقریباً ½ 84 سے 168 بشل (Bushel غلے کا پیمانہ) چاول آتا تھا۔ دوسرے لوگ گوداموں میں رکھتے تھے جن کا فرش لکڑی کے مضبوط تختوں کا بنا ہوتا تھا۔ کچھ اور لوگ مٹی کی بنی ہوئی کھتیوں میں رکھتے تھے جس کے اوپر ایک الٹا برتن ڈھکا ہوتا تھا اور ضرورت کے مطابق چاول اس سوراخ میں سے نکالا جاتا تھا جو کھتیا کی تلی کے قریب ہوتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بھوس کے بنے ہوئے بوروں میں چاول رکھا کرتے تھے۔ سرنگا پٹم کے قرب و جوار میں دھان کے علاوہ مونگ، سی سالم اور گنے کی کاشت ہوتی تھی۔ بارانی کھیتوں میں راگی بڑے پیمانے پر بوئی جاتی تھی جو نچلے طبقے کے لوگوں کی غذائی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ بارانی فصلوں میں جوار اور باجرا بہت اہم تھے۔

سرنگا پٹم کے آس پاس کے کھیت عام طور سے دو یا تین ہل کے ہوتے تھے۔ ایک ہل کا کھیت بہت چھوٹا سمجھا جاتا تھا جب کہ چار پانچ ہل کے کھیت کا مالک بڑا کسان سمجھا جاتا تھا۔ پانچوں ہلوں سے ایسی زمین کے ساڑھے بارہ ایکڑ جوتے جا سکتے تھے جس کی آبپاشی ہو اور بارانی زمین کے پچیس ایکڑ جوتے جا سکتے تھے۔ کسانوں کو کھیت سے اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جاتا تھا "جب تک وہ رواج کے مطابق لگان ادا کرتا رہے۔ ٹیپو کے زمانے میں بھی اس قسم کی حرکت کو تعجب سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی شکایت کی جاتی تھی۔" دوسری طرف لگان وصول کرنے والی حکومت کا یہ فرض تھا کہ نہروں اور تالابوں کی

مرمت کرے[1]۔" سرنیگاپٹم کے قریب کھیت مزدور کو ۶ شلنگ ½ 8 پنس ماہانہ اُجرت ملتی تھی اور وہاں سے فاصلے پر پانچ شلنگ چار پنس ماہانہ۔ عورتیں عام طور سے کھیتوں میں کام کرتی تھیں اور کھاد کے ٹوکرے اپنے سروں پر لے جایا کرتی تھیں۔ وہ اچھے کپڑے پہنتی تھیں اور ان کے جسم خوبصورت ہوتے تھے۔ ڈاکٹر بکانن نے لکھا تھا " جیسا جسم اُس علاقے کی مزدور عورتوں تک کا ہوتا ہے میں نے اس سے زیادہ خوبصورت جسم آج تک نہیں دیکھا ہے۔ ان کی گردن اور ہاتھ خاص طور سے سڈول اور حسین ہوتے ہیں[2]۔"

۷ رجون کو ڈاکٹر بکانن سرنیگاپٹم سے بنگلور سے واپس جانے کے لیے روانہ ہوا۔ منڈیم میں اُس نے دیکھا کہ جس زمین میں دھان پیدا ہوتے ہیں اس کی سینچائی تالابوں اور پانی کے ذخیروں سے ہوتی ہے۔ مدوروں میں اس نے ایک پانی کا ذخیرہ دیکھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وشنو وردھن راجا نے سات سو سال پہلے پڑوس کے دریا پر بند باندھ کر تعمیر کیا تھا اور نہر کے ذریعے پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ جب اس کی مرمت ٹھیک سے ہو جاتی تھی تو یہ تمام سال آس پاس کے ان تمام کھیتوں کو سیراب کرتا تھا جن کی سطح اس کے کناروں سے نیچی تھی۔ چیناپٹم میں، جہاں پہلے ایک پولی گر خاندان رہا کرتا تھا جو جسا دیوا راجا کے نام سے مشہور تھا، شیشہ کا سامان اور خوبصورت انگوٹھیاں، باجوں کے فولادی تار، صاف سفید شکر اور کئی دوسری اشیا بنتی تھیں۔ راستے میں دوسرا اہم مقام راماگیری تھا۔ ۱۷۹۲ء میں لارڈ کارنوالس نے جب میسور پر حملہ کیا تھا تو اس میں راماگیری کو بڑا نقصان پہنچا تھا اور وہاں کے لوگ بڑی تعداد میں فاقوں کا شکار ہو گئے تھے۔ مگاڈی میں سڑک ایک خوبصورت علاقے سے گزری جہاں جنگلوں کی بہتات تھی اور جو پہاڑیوں اور نشیبی وادیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بارانی غلّوں کی کاشت ہوتی تھی۔ سوانا درگا کے نواح میں عمارتی لکڑی اور بانس پیدا ہوتے تھے۔ اس پر لارڈ کارنوالس نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا اور اس وقت یہ ویران پڑا تھا۔ آس پاس کی پہاڑیوں میں لوہا صاف کیا جاتا تھا اور اس کو بار بار پگھلا کر اور صاف کر کے کاشتکاری کے اوزار بنائے جاتے تھے۔ اسلحہ سازی کے لیے فولاد بھی تیار کیا جاتا تھا۔ آس پاس صندل اور دوسری

---

[1] بکانن، Journey from Madras جلد 1، صفحہ 124۔

[2] بکانن، Journey from Madras جلد 1، صفحہ 135

قیمتی لکڑی کے درختوں کی کاشت کی جاتی تھی اور لاکھ کے کیڑے پالے جاتے تھے جس سے وہ مشہور رنگ تیار ہوتا تھا جو پرانے زمانے میں ہندوستان کی مشہور ترین پیداوار تھا۔ 21 جون کو ڈاکٹر بکانن بنگلور پہنچ گیا۔

حیدر علی کے زمانۂ حکومت میں بنگلور میں بڑی تجارت ہوتی تھی اور بہت سی اشیا بنائی جاتی تھیں۔ ٹیپو سلطان نے حماقت یہ کی کہ نظام کے علاقے اور کرناٹک سے تجارت ممنوع قرار دے دی جس کی وجہ سے بنگلور کی تجارت تباہ ہو گئی۔ لیکن ہندو راجہ کی تخت نشینی کے بعد اس کی اہمیت پھر سے بڑھنے لگی تھی۔ پونا کے سوداگر کشمیر سے زعفران دمشک اور سورت سے موتی لایا کرتے تھے۔ برہان پور کے سوداگر چھینٹ اور زرتار کی لیس، کپڑا اور تاگا لایا کرتے تھے۔ نظام کے علاقے سے لال رنگ کا سوتی کپڑا آیا کرتا تھا جس پر سنہری اور روپہلی کڑھائی ہوتی تھی، کرناٹک سے نمک، ٹین، سیسہ، تانبا اور یورپی سامان آیا کرتا تھا۔ بنگلور سے عام طور سے چھالیاں، صندل، کالی مرچ، الائچی اور املی باہر جایا کرتی تھی۔ بڑی تعداد میں کمبل اور روئی بھی باہر بھیجی جایا کرتی تھی۔

سامان جانوروں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔ ایک سال میں روئی سے لدے ہوئے 1500 بیل، سوت سے لدے ہوئے پچاس بیل، کچی ریشم سے لدے ہوئے 230 بیل، نمک سے لدے ہوئے 7000 بیل، اور بدیسی مال سے لدے ہوئے 300 بیل علاقے میں آئے اور چھالیوں سے لدے ہوئے 4000 بیل اور کالی مرچ سے لدے ہوئے 400 بیل علاقے کے باہر گئے۔ سوتی کپڑا بنانے والے اپنے لوگوں کے استعمال کے لیے کپڑا بنا کرتے تھے اور ریشمی کپڑا بنانے والے خوبصورت اور مضبوط ریشمی کپڑا بنایا کرتے تھے۔ ریشم کو لاکھ سے سرخ کپیلی پانڈی سے گلابی اور ہلدی کے سفوف سے پیلا رنگا جاتا تھا۔ وہ کاریگر جو ریشمی بارڈر کا سوتی کپڑا بنایا کرتے تھے انھیں آٹھ پنس یومیہ اجرت ملتی تھی اور ریشمی کپڑا بننے والوں کو چھ پنس یومیہ۔ بنکروں کو تاجروں سے پیشگی روپیہ مل جاتا تھا اور وہ اپنا مال یا تو تاجروں کے ہاتھ بیچا کرتے تھے یا عام صارفین کے۔ وہ اپنا مال منڈیوں میں نہیں لے جاتے تھے۔ کئی قسم کی سفید ململ بنائی جاتی تھی جس کی بڑی مانگ تھی۔ برہمنوں کے علاوہ تمام عورتیں ہفتہ واری بازار سے روئی اور اون خریدتی تھیں، اسے گھر لے جا کر سوت کاتتی تھیں اور بنکروں کے ہاتھ بیچ دیا کرتی تھیں۔ اس طرح ہر طبقے کے لوگ، چاہے مرد ہوں یا عورتیں، سوت کات کر فائدہ اٹھایا

کرتے تھے۔

رنگنے کے لیے نیل کا استعمال عام تھا۔ چمڑا رنگنے کی صنعت بہت نفع بخش تھی۔ ریڈی کا تیل، ناریل کا تیل، سی سام کا تیل اور دوسرے تیل بڑے پیمانے پر بنائے اور فروخت کیے جاتے تھے۔

بنگلور کے قریب ایک گانو میں ڈاکٹر بکانن کو بتایا گیا کہ تاجر کاشتکاروں کو پیشگی روپیہ دیتے تھے تاکہ وہ اپنا لگان ادا کرسکیں اور اس کے بعد وہ اصل اور سود کے عوض آدھی پیداوار لے کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر بکانن نے ایک گانو پنچائت میں پیداوار کی تقسیم کا حال بیان کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ غلہ کا ایک انبار جو اوسطاً 2400 سیر کا ہوتا تھا مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کیا جاتا تھا۔

	سیر
گانو کا پروہت	5
گانو کی خیرات	5
گانو کا نجومی	1
گانو کا برہمن	1
گانو کا نائی	2
گانو کا کمہار	2
گانو کا لوہار	2
گانو کا دھوبی	2
گانو کی پیمائش کرنے والا	4
گانو کا کارندہ	7
گانو کا مکھیا	8
گانو کا منیم	10
گانو کا چوکیدار	10
گانو کا منیم	45
گانو کا مکھیا	45

$\frac{20}{169}$

اس طرح کھیتوں کی پیداوار کا $5\frac{1}{2}$ حصہ دے کر گانو والے دھوبی، کمہار، لوہار، پروہت اور نجومی کی خدمات حاصل کر سکتے تھے۔ بقیہ پیداوار کا دس فی صدی دلش مکھ یا زمیندار لے لیتا تھا۔ جو باقی رہتی تھی وہ حکومت اور کاشتکاریں نصف نصف تقسیم ہو جاتی تھی۔ جب حیدر علی نے دلش مکھوں کے طبقے کو ختم کر دیا تو اس نے ان کا حصہ بھی ریاست کے لیے حاصل کر لیا۔[1]

شمالی میسور

بنگلور سے 3 جولائی کو روانہ ہو کر ڈاکٹر بکانن نے میسور کے شمالی حصوں کا طویل دورہ کیا اور پورے علاقے کا چکر لگایا۔ کولار کے آس پاس کے علاقے میں اس نے دیکھا کہ تمام کھیتوں کی سینچائی پانی کے ذخیروں سے ہوتی تھی جو زیادہ تر انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ بڑے ذخیرے حکومت کے خرچ سے بھی تعمیر ہوئے تھے۔ زمانۂ قدیم سے ہندوؤں کی مقرر کی ہوئی مالگزاری کی شرح، جس کا ذکر قدیم دھرم شاستروں میں بھی پایا جاتا ہے، پیداوار کا $\frac{1}{6}$، $\frac{1}{8}$ یا $\frac{1}{12}$ حصہ تھی۔ میسور کے حکمراں اور سردار پیداوار کا نصف حصہ بطور مالگزاری وصول کر لیتے تھے، جو یقیناً زیادہ تھا، لیکن انھوں نے اپنے ذاتی خرچ سے آب رسانی کے ذرائع تعمیر کر کے زراعت کو ممکن بھی بنایا تھا اور وہ اس کا معاوضہ روپے کے بجائے جنس کی صورت میں حاصل کرتے تھے۔

دھان، گنا، پان اور ترکاریاں کولار کے اس علاقے میں پیدا ہوتی تھیں جس کی سینچائی ہوتی تھی۔ چاول اسی مقدار میں پیدا ہوتا تھا جس مقدار میں راگی پیدا ہوتی تھی جو بارانی فصل تھی۔ پوست کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس سے افیون تیار کی جاتی تھی اور خشخاص کی میٹھی روٹی بھی پکائی جاتی تھی۔ پیدا ہونے والے گیہوں کی مقدار چاول کے نصف کے برابر ہوتی تھی۔ کھیتوں پر کام کرنے والوں کو $29\frac{1}{2}$ بشل غلّہ اور 13 شلنگ پانچ پنس سالانہ ملا کرتا تھا۔ روزانہ کی اُجرت مردوں کے لیے تین پنس اور عورتوں کے لیے دو پنس تھی۔

---

[1] بکانن Journey from Madras جلد اول، صفحات 265 وغیرہ

ٹیپو سلطان کی مطلق العنان حکومت کے زمانے میں اور جنگوں کی وجہ سے کولار اور سلاگٹّا دونوں کو نقصان پہنچا تھا لیکن اس کی موت کے بعد وہ سنبھل رہے تھے۔ مختلف قسم کے سوتی کپڑے وہاں کی اہم ترین صنعت تھی۔ وہاں سے مغرب کی طرف چل کر ڈاکٹر بکانن نندی درگا کے مشہور مقام پر پہنچا جس کے قریب سے شمالی پنّار، پالار اور جنوبی پنّار نکلتے ہیں۔ پہاڑیوں کے دوسری طرف کا علاقہ ویران تھا۔ پہلے جہاں کاشت ہوتی تھی اس کا ایک تہائی علاقہ بنجر پڑا تھا اور کارنوالس کے حملے کے بعد سے گاؤں ویران ہو گئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ انھیں پانچ بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں بارش کی کمی، تین حملہ آور فوجیں اور میسور کی دفاعی فوج شامل تھے۔

18 جولائی کو ڈاکٹر بکانن مالا پورا پہنچا۔ سولھویں صدی میں وجیانگر کی سلطنت کے زوال کے بعد وہاں کے پولی گر نرائن سوامی نے آزادی کا اعلان کیا تھا اور ایک آزاد سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی لیکن بعد میں اس ریاست پر مغلوں، مرہٹوں، نظام اور حیدر علی کا تسلط رہا اور آخر میں بحال ہونے والے ہندو خاندان نے اس پر قبضہ جما لیا۔ یہاں چھینٹ اور ململ باہر سے آتے تھے اور شکر باہر بھیجی جاتی تھی۔

مغرب کی طرف تھوڑے فاصلے پر مادھوگیری واقع تھا۔ یہ شہر بھی وجیانگر کی سلطنت کے زوال کے بعد ایک آزاد پولی گر کی سلطنت کا صدر مقام بن گیا تھا لیکن بعد میں وہ میسور کی ریاست میں شامل ہو گیا۔ حیدر علی نے پہاڑی قلعوں کی مرمت کی تھی اور بنکروں کے سو خاندان وہاں آباد کر کے اس کو منڈی میں تبدیل کر دیا تھا لیکن ٹیپو سلطان کے عہدِ حکومت میں اس شہر کی اہمیت کم ہو گئی اور مرہٹوں اور لارڈ کارنوالس کے ساتھ میسور کی جنگوں میں یہ بالکل تباہ ہو گیا۔ جس وقت ڈاکٹر بکانن وہاں پہنچا تو اس وقت دھان، راگی، گنے، گیہوں، دالوں، کپاس، سی سامم اور ترکاریوں کی کاشت وہاں ہوا کرتی تھی۔ بارانی زمین کا لگان جو راگی کی کاشت کے لیے موزوں تھی، ایک شلنگ ایک پنس فی ایکڑ سے لے کر تین شلنگ چار پنس فی ایکڑ تک تھا۔ ایسی زمین کا لگان جس کی آبپاشی کا انتظام تھا 9 شلنگ فی ایکڑ سے لے کر 11 شلنگ فی ایکڑ تھا۔ کسان حقدار سمجھا جاتا تھا اور کئی سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی وہ اپنی زمین کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ اگر اس دوران عارضی کسان زمین کو ترقی دے لیتا تو اصل مالک کو اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی تھی۔ مزدور مرد کو 4 شلنگ ماہوار اور عورت کو

3 شلنگ چار پنس ماہوار اجرت ملا کرتی تھی۔ اس علاقے میں بارش کی کمی کی وجہ سے غذائی اجناس کی قلت تو رہا کرتی تھی لیکن ایسے قحط شاذ و نادر ہی پڑتے تھے جن میں جانی نقصان ہو۔" جب قلت کے مسئلے میں جنگیں بھی شامل ہو جائیں اور غلے کی نقل و حمل میں مزاحم ہوں اس وقت قحط اپنی تمام ہولناکیوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کو اتنی شدت کے ساتھ پہلے کبھی محسوس نہیں کیا گیا تھا جیسا کہ لارڈ کارنوالس کے حملے کے دوران محسوس کیا گیا۔ ملک پر چاروں طرف سے حملہ ہو رہا تھا، ہر طرف دشمن کی فوجیں اندر داخل ہو چکی تھیں یا دفاعی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں، جو تباہی مچانے میں دشمن کی فوجوں سے کم نہیں تھیں، ایسی حالت میں آدھی آبادی فاقوں کا شکار ہو گئی۔"[1]

31 جولائی کو بکانن سیرا پہنچا۔ مغلوں کے عہد میں یہ شہر بڑا بھی تھا اور خوشحال بھی جس میں پچاس ہزار مکان تھے اور اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی۔ بعد میں اس پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا اور مرہٹوں کے حملوں اور ٹیپو سلطان کے مظالم نے اس کو تباہ کر دیا۔ زیادہ دھان، راگی، گیہوں، گنّا، دالیں اور کپاس پیدا ہوتی تھی۔ لگان کبھی رقم کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا اور کبھی جنس کی شکل میں۔ سیرا میں چھالی، کالی مرچ، صندل اور گرم مسالہ باہر سے آیا کرتا تھا اور کمبل، کپڑا، تیل، مکھن، ادرک اور کھوپرا باہر جایا کرتا تھا۔ خاص طور سے باریک گھٹیا قسم کی ململ اور مختلف قسم کے موٹے کپڑے وہاں بنائے جاتے تھے۔

مدھوگیری واپس آکر ڈاکٹر بکانن نے وہاں کے مشہور جانوروں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اس کو بتایا گیا کہ پہاڑی علاقے کے ہر قصبے اور ہر گانو میں جانوروں کے گلے ہوتے ہیں جن کی افزائش نسل کی جاتی ہے۔ گوالے جنگل کے قریب چھوٹے چھوٹے گانوؤں میں رہتے تھے۔ وہ تھوڑی بہت کاشت بھی کرتے تھے اور دودھ، مکھن شہر میں فروخت کیا کرتے تھے۔ ہر خاندان حکومت کو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس افسر کو جس کا کام دودھ مکھن کی نگہداشت تھا، چار شلنگ سالانہ بطور محصول ادا کرتا تھا اور وہ افسر حکومت کو سالانہ مالگزاری ادا کرتا تھا۔ مادھوگیری اور اس کے اطراف میں لوہے کو صاف کر کے فولاد تیار کیا جاتا تھا۔

---

[1] بکانن 'Journey from Madras'، جلد اول، صفحہ 390

وہاں سے جنوب کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر بکانن نے دیکھا کہ تونیا کرائے میں کاشت کی حالت اچھی تھی لیکن سمکور دمیں بہت زمین بنجر پڑی تھی اور تمام گانوؤں کی قلعہ بندی تھی زیادہ تر وہاں راگی کی کاشت ہوتی تھی لیکن دھان کے کھیت بھی دیکھنے میں آئے۔ کچھ اور جنوب کی طرف گوبی واقع تھا جو کسی قدر اہم منڈی تھی۔ وہاں ۱۵۴ دوکانیں تھیں اور ہر ہفتہ میلا لگا کرتا تھا۔ سفید اور رنگین موٹا جھوٹا سوتی کپڑا، کمبل، ٹاٹ، چھالی، کھوپرا، املی، غلہ، لاکھ، لوہا اور فولاد وغیرہ آس پاس کے علاقوں سے لائے جاتے اور اس منڈی میں فروخت کیے جاتے تھے۔

ڈوراگوڈا میں لوہے کی کانیں تھیں اور تینوا کرائے ایک اہم مقام تھا جس میں فصیل تھی اور فصیل کے اندر قلعہ تھا۔ مضافات شہر میں سات سو مکان بنے ہوئے تھے۔ پہلے یہ علاقہ پولی گروں کے ایک طاقتور خاندان کے قبضے میں تھا۔ ان میں سے ایک پولی گر نے چار مندر اور آبپاشی کے لیے چار بڑے بند تعمیر کیے تھے۔ اطراف کی زمین پر ایک زمانے میں خوب کاشت ہوتی تھی لیکن پرسورام بھاؤ کی سرکردگی میں مرہٹوں کے حملہ کے بعد سے یہ علاقہ ویران پڑا تھا۔ جنوب کی طرف تھوڑے فاصلے پر بلورو واقع تھا جہاں کی زمین اچھی تھی اور دھان پیدا ہوتا تھا اور پانی کا ایک بڑا ذخیرہ بھی تھا۔ ۱۷۹۲ء کے کارنوالس کے حملے کی وجہ سے وہ تمام علاقہ برباد ہو گیا تھا جس کے شمال میں بلورو اور جنوب میں سرنگاپٹم واقع تھا ——— ناک کی سیدھ میں اگر کوئی چلتا رہتا تو یہ فاصلہ چالیس میل کا تھا۔ ٹیپو سلطان نے لوگوں کو اس پر مجبور کیا تھا کہ وہ میدانوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جائیں۔ وہاں وہ لوگ جھونپڑوں میں رہا کرتے تھے اور جس طرح ہوتا اپنی گزر بسر کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے فاقوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں جب ڈاکٹر بکانن وہاں گیا تو علاقے کی آبادی آدھی رہ گئی تھی۔

بلورو سے تھوڑے فاصلے پر ناگا منگلا کا ضلع تھا۔ جہاں گانو کا مکھیا جزوی طور سے گانو کا ٹیپائے لیا کرتا تھا اور جزوی طور سے حکومت کی طرف سے لگان وصول کرتا تھا۔ کسان زمین کا مسلّمہ مالک ہوتا تھا اور جب تک وہ پرانی تشخیص کے مطابق لگان ادا کرتا رہتا تھا اس کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس زمین میں دھان پیدا ہوتا تھا اس کا لگان جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا اور بارانی زمین کا لگان رقم کی صورت میں۔

سرنگاپٹم سے تقریباً پندرہ میل شمال کی طرف ایک اونچی پہاڑی پر میل کوٹے واقع تھا جہاں سے

جنوب میں کاویری کی وادی اور میسور کی پہاڑیوں کا، مغرب میں مغربی گھاٹ کا اور جنوب میں سوانادرگا اور سیوگنگا کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہندوؤں کا مشہور تیرتھ تھا۔ جہاں ایک بہت بڑا مندر واقع تھا جس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے۔ وہاں ایک خوبصورت تالاب بھی تھا جس کے چاروں طرف عمارتیں بنی ہوئی تھیں جن میں مسافر ٹھہرا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو سلطان بھی اس مندر کے جواہرات چھینتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ سرنیگاپٹم کے خزانے میں رکھے ہوئے تھے۔ جب انگریزی فوج نے دارالسلطنت پر قبضہ کیا تو انھوں نے بھی جواہرات کو ہاتھ نہیں لگایا۔

میل کوٹے کے جنوب میں تنورو کے مقام پر ڈاکٹر بکانن نے یادوندی کا وہ عالی شان بند دیکھا جو گیارھویں صدی کے معروف مذہبی مصلح رامانج کے نام سے منسوب ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہاں دو پہاڑی نالوں کا سنگم ہوا ہے اور دو پہاڑیوں کے درمیان گھاٹی سے پانی گزرتا ہے۔ رامانج نے اس گھاٹی کو ایک تودے کے ذریعے بند کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی اونچائی 78 ہاتھ اور لمبائی 150 ہاتھ ہے اور وہ نیچے کی طرف 250 ہاتھ موٹا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پانی نکالنے کے لیے ایک پہاڑی میں بڑی سخت محنت و جانفشانی کے بعد ایک نالی کاٹی گئی ہے اور اس کو اتنا لمبا بنایا گیا ہے کہ آس پاس کی زمین کا بڑا حصہ اس سے سیراب ہو سکے جو تین یا چار میل پر مشتمل ہے۔ جب پانی کا ذخیرہ پوری طرح بھر جاتا ہے تو اس میں اتنا پانی ہوتا ہے کہ وہ دو سال تک کسانوں کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔"[1]

پہلی ستمبر کو ڈاکٹر بکانن سرنیگاپٹم واپس آ گیا۔

جنوبی میسور

سرنیگاپٹم سے 5 ستمبر کو روانہ ہو کر ڈاکٹر بکانن نے میسور کے جنوبی حصوں کا دورہ کیا۔ پالی ہولی کے پاس جو حال میں ہونے والی ایک جنگ میں پوری طرح برباد ہو چکا تھا اس نے کاویری سے نکلنے والی دو نہریں دیکھیں جن سے مہاسور اآشتاگرام کے ضلع میں کھیتوں کی

---

[1] بکانن، Journey from Madras. جلد دوم، صفحات 82-83۔

آبپاشی ہوتی تھی۔ ان میں سے ایک نہر میں ایک چشمہ تھا جو کبھی پوری طرح خشک نہیں ہوتا تھا اور جس کی وجہ سے کسان اس موسم میں بھی دھان پیدا کر لیتے تھے جب بارش نہیں ہوتی تھی۔

کاویری کا ایک معاون دریا لکشمن تیرتھ کورگ کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ زمین کی آبپاشی کے لیے اس دریا سے چھ نہریں نکالی گئی تھیں۔ وہ بند جن کی وجہ سے دریا کا پانی نہروں میں جاتا تھا بہت نفیس تھے اور ان سے حسین آبشار بن گئے تھے۔ وہ تمام زمین جس کی سینچائی پہلے ان نہروں کے ذریعے ہوتی تھی، 18,000 ایکڑ کے قریب تھی۔

یہاں گانو کے موروثی سربراہ نہیں ہوا کرتے تھے اور مالگزاری وصول کرنے کا کام پٹے داروں کے سپرد تھا۔ وہ کسانوں سے اُس سے زیادہ رقم وصول نہیں کر سکتے تھے جس کا تعین اُس رواج کے مطابق ہوا کرتا تھا جو میسور کے قدیم راجاؤں نے قائم کیا تھا حیدر علی نے ہرکارے یا مالگزاری کے نگران مقرر کیے تھے جو پٹے داروں کو قابو میں رکھتے تھے اور لوگوں کی شکایتیں سنا کرتے تھے۔ ٹیپو سلطان نے ہرکاروں کو موقوف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں پر مظالم ہونے لگے اور حکومت کو دھوکہ دیا جانے لگا۔ مغرب کی طرف آگے چل کر جو علاقہ واقع تھا وہ 1761ء میں باجی راؤ اور اس کے ساتھی مرہٹوں کے حملے کی بنا پر اور 1791ء میں کارنوالس کے حملے کی بنا پر بالکل ویران اور غیر آباد ہو چکا تھا۔ پریاپٹن، جس کو انگریزی نقشوں میں پیریاپٹم کہا گیا ہے، پرانے زمانے میں بڑا اہم مقام تھا اور اُس پر ایک پولی گر خاندان کا قبضہ تھا جو نندی راج کے نام سے مشہور تھا۔ اُس خاندان کا قبضہ اُس علاقے پر تھا جس کے شمال میں کاویری تھی اور مغرب میں کورگ کی سرحد تھی۔ یہ لوگ کورگ کے راجہ کو 9,361 پاؤنڈ سالانہ بطور مالگزاری دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے ایک راجکمار نے 1645ء میں میسور کے خلاف نہایت بہادری سے اپنا دفاع کیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ مزید مزاحمت ممکن نہیں تو اس نے اپنی عورتوں اور بچوں کو تہہ تیغ کر دیا اور خود تلوار سونت کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا اور میدان کارزار میں جان دے دی۔ اس کے بعد بھی پریاپٹن کورگ اور میسور کی سرحدی لڑائیوں کا میدان بنا رہا۔ جب ٹیپو سلطان نے کورگ کو فتح کیا تو اسے نقصان پہنچا اور انگریزوں کے ساتھ ہونے والی ٹیپو کی جنگ میں تو یہ بالکل ہی برباد ہو گیا۔ ڈاکٹر بکانن نے لکھا تھا۔ "اس کے کھنڈروں میں شیر رہتے ہیں، کچھ رات پہلے ایک گھوڑا غلطی سے چلا گیا تھا اس کو ختم کر دیا گیا اور دوپہر کے وقت بھی لوگ

وہاں اکیلے جاتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں۔ جب میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ کسی مندر میں داخل ہونا چاہتا تھا تو اس کو مصلحت کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ شیر دھوپ سے بچنے کے لیے مندروں میں پناہ لیا کرتے ہیں۔[1]

پریا پٹن کے قریب کی زمین کی پوری آبپاشی پانی کے ذخیروں سے ہوتی تھی لیکن جنوبی حصے میں لکشمن تیرتھ دریا کی نہریں کسانوں کو پانی مہیا کیا کرتی تھیں۔ ضلع میں ہینویا آبپاشی کے دھان، کارویلا بارانی دھان، گنا، راگی، گھوڑے کا دانہ، دالیں، سی سامم اور دوسری چیزیں پیدا ہوتی تھیں۔ کھیت مزدوروں کو ایک وقت کے کھانے کے علاوہ ایک پاؤنڈ سالانہ سے لے کر ایک پاؤنڈ 7 شلنگ سالانہ تک اجرت ملتی تھی۔ عورتوں کو دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ 6 شلنگ سالانہ اُجرت ملتی تھی۔ میسور کی آخری جنگ سے پہلے غریب سے غریب کسان کے پاس دو ہل ہوتے تھے۔ دولت مند کسانوں کے پاس پندرہ ہل بھی ہوتے تھے۔ جس شخص کے پاس دو ہل ہوتے تھے اس کے پاس عام طور سے چالیس بیل، پچاس گائیں، چھ سات بھینسیں اور سو بھیڑیں یا بکریاں ہوتی تھیں۔ آبپاشی ہونے والی زمین کی پیداوار میں سے گاؤں کے کارکنوں کا حصہ نکال کر جو بچتا تھا وہ حکومت اور کسان کے درمیان نصف نصف تقسیم ہو جاتا تھا۔ جنگ سے پہلے بڑے بڑے کھجوروں کے باغ تھے اور اچھی چراگاہیں تھیں جنگل کے دامن میں صندل کے درخت اگتے تھے۔

پریا پٹن کے جنوب مشرق میں ہنا گوڈو کے قریب ڈاکٹر بکانن نے لکشمی تیرتھ دریا کا ایک بند دیکھا، اس کے متعلق وہ لکھتا ہے: قدرتی چٹانوں کے ایک سلسلے سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جو دھار کو کاٹتا ہے۔ اس کی دراریں پتھروں سے بند کر دی گئی ہیں اب اس نے ایک نفیس بند کی صورت اختیار کر لی ہے جس پر سے سوگز چوڑا اور چودہ فیٹ اونچا آبشار گرتا ہے جو ہرے بھرے جنگلوں میں بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اس بند سے نکلنے والی نہریں مشرق کی طرف جاتی ہیں...... اور ان سے تقریباً 2678 ایکڑ زمین کی سینچائی ہوتی ہے۔[2]

1۔ بکانن Journey from Madras جلد دوم، صفحہ 94

2۔ بکانن Journey from Madras جلد دوم، صفحہ 119

ہنا گوڈ د کے جنوب مشرق میں ہیگیوڈ دیو کی قدیم سلطنت واقع تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس نے پندرھویں صدی کے آغاز میں اس علاقے کو صاف کر کے وہاں لوگوں کو آباد کیا تھا حیدر علی کے زمانے تک اس شہر میں ایک ہزار مکانات تھے لیکن جب ڈاکٹر بکانن وہاں گیا تو صرف اسّی مکان باقی تھے۔ یہ علاقہ صندل کے جنگلوں کے لیے مشہور تھا، 'موٹا بیٹا' جو تھوڑی دور پر مشرق میں واقع تھا، کچے لوہے کے لیے مشہور تھا۔

یکم اکتوبر کو ڈاکٹر بکانن تیور د پہنچا جو کاویری کے معاون دریا کم بینی کے کنارے واقع تھا۔ اس ضلع کے کچھ گاؤوں میں گوڈیا گانو کے سربراہ موروثی ہوتے تھے۔ حکومت اور عام لوگ دونوں انھیں ٹھیکے داروں پر ترجیح دیا کرتے تھے جو خود بھی گوڈ کہلاتے تھے۔ موروثی گوڈ کسانوں سے زیادہ واقف تھے، ان کی بات لوگ زیادہ خوشی سے مانتے تھے اور ساہوکاروں میں ان کی ساکھ زیادہ تھی اور وہ لگان کی معینہ شرح ادائیگی کی کمی پوری کر لیا کرتے تھے۔ ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں شحنہ فصل پر قبضہ کر لیتا تھا۔ شحنہ کے فرائض میں اس فصل کے فروخت کا کام بھی شامل تھا جو حکومت کا حصہ ہوا کرتی تھی اور لگان کے طور پر وصول کی جاتی تھی۔ تیور د اور نرسنگھ پور کے علاقے بہت خوبصورت تھے۔ ہر کھیت پر باڑ لگائی جاتی تھی اور کاشت اچھی طرح کی جاتی تھی۔ پورا علاقہ بلندی پر واقع تھا۔ دھان وہاں نہیں پیدا ہوتا تھا۔

نرسنگھ پور کاویری دریا کے کنارے واقع تھا۔ وہاں دو مندر تھے اور تقریباً دو سو مکانات۔ اس کے آس پاس کی زمین سیاہ تھی جو بہت زرخیز تھی اور کپاس خوب پیدا ہوتی تھی۔ گیہوں اور روغن کی پیداوار برابر ہوتی تھی۔ سُرخ مٹی میں راگی کی کاشت ہوتی تھی جو اس کے لیے موزوں تھی۔

کیمبٹور

اکتوبر کے شروع میں ڈاکٹر بکانن میسور سے روانہ ہوا اور کیمبٹور جاتے ہوئے انگریزی علاقے میں داخل ہوا۔ کول گالا کے ضلع میں کاشت خوب ہوتی تھی۔ وہاں چالیس یا پچاس پانی کے بڑے بڑے ذخیرے تھے جن سے سینچائی ہوتی تھی۔ میسور کی حکومت نے اسّی سال پہلے ان کی مرمت کی تھی۔ ضلع پر کمپنی کا قبضہ ہو جانے کے بعد ان میں سے کچھ کی دوبارہ مرمت کمپنی کے ملازمین نے کی تھی۔ پانی کے ایسے ذخیروں کے پاس سے گزرتے ہوئے جن کی مرمت اس وقت تک

نہیں ہو پائی تھی ڈاکٹر بکانن نے دیکھا کہ تمام آراضی بنجر پڑی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس علاقے میں کس حد تک کھیتی کا انحصار آب رسانی کے ذرائع پر تھا۔ وہاں کے کلکٹر میجر میک لیوڈ (Major Macleod) نے گوڈا یا گانو کے سربراہ کے اختیارات ختم کر دیے تھے۔ اور انھیں کسانوں سے مالگزاری وصول کرنے کے لیے مقررہ تنخواہوں پر ملازم رکھ لیا تھا۔ اس پالیسی سے مالگزاری میں اضافہ تو ضرور ہو گیا لیکن ہندوستان کے گانوؤں کے قدیم رسم ورواج کا زوال شروع ہو گیا۔

گنگا ناچوکی کا شاندار آبشار اور سیوا نا سمدرا کا جزیرہ دیکھ کر ڈاکٹر بکانن ششدر رہ گیا۔ بڑا چوکی کا جنوبی آبشار اور زیادہ خوبصورت تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ گنگا راجہ نے 1200ء میں سیوا نا سمدرا کی ریاست کی بنیاد ڈالی تھی لیکن اس کا خیال ہے کہ 1522ء زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ تین راجاؤں کی حکومت کے بعد پڑوس کے حکمرانوں کے مشترکہ حملے نے ریاست کو تباہ کر دیا۔

کول گالا اور سیٹ گالا کے علاقے مغرب میں واقع تھے۔ مشرقی گھاٹ کی پہاڑیاں بالائی علاقے کی سطح سے 2000 فیٹ بلند تھیں۔ پالیا تک پورا علاقہ زیرِ کاشت تھا۔ لیکن اُس کے بعد آدھی آراضی غیر مزروعہ تھی اور تالاب ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ آگے چل کر ڈاکٹر بکانن متھرتی کے مقام پر گھاٹوں کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوا اور دشوار گزار راستوں پر سے گزرتا ہوا کاویری پورا پہنچا جو کاویری دریا کے کنارے واقع تھا۔ یہاں درّے کی حفاظت کے لیے ایک سرحدی لوئی گر نے قلعہ تعمیر کیا تھا۔

کاویری پورا میں ایک قدیم پانی کا ذخیرہ تھا۔ جس سے پانچ سو ایکڑ زمین کی سینچائی ہوتی تھی لیکن پچاس سال پہلے پانی نے اس کے پشتے کو توڑ دیا تھا اور پھر اس کی مرمت نہ ہو سکی تھی۔ بالائی اور نشیبی علاقے کی تجارت کا مرکز کاویری پورا تھا۔ ڈاکٹر بکانن کو روزمال سے لدے ہوئے چالیس پچاس جانور راستے میں ملتے تھے۔ کاویری کے ایک اور معاون دریا ٹم بولو کے ساتھ ساتھ پانچ قدیم پانی کے ذخیرے واقع تھے لیکن پچاس سال پہلے ان سب کے پشتے پانی کے زور سے ٹوٹ چکے تھے اور ان کی مرمت نہیں ہو سکی تھی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کمپنی کی حکومت میں گانو کے سربراہ برطرف کر دیے گئے تھے۔ میجر میک لیوڈ کے زیرِ انتظام جو علاقہ تھا اس کی سالانہ مالگزاری 0,293 پاؤنڈ سے لے کر

16,545 پاؤنڈ تک تھی۔ اس کی وصولیابی تنخواہ پانے والے تحصیلداروں کے ذریعے ہوتی تھی جنہیں مالگزاری وصول کرنے کے علاوہ مجسٹریٹ اور پولیس کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ کھیت مزدوروں کو کسان پانچ شلنگ سے چھ شلنگ آٹھ پنس سالانہ تک اُجرت دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں رہنے کو مکان اور $\frac{2}{3}$ 1 بشل غلّہ ہر مہینے دیا جاتا تھا۔ اگر ان کی بیویاں کام کرنے کے قابل ہوتیں تو انھیں یومیہ اُجرت دی جاتی تھی۔ گھاٹوں میں استعمال ہونے والے کاشتکاری کے اوزاروں کے مقابلے میں میدانوں میں استعمال ہونے والے اوزار کم بھی تھے اور فرسودہ بھی تھے۔

ایسے علاقے سے گزرنے کے بعد جس کا تین چوتھائی حصہ غیر مزروعہ تھا ڈاکٹر بکانن ۱۹ر اکتوبر کو ٹالاریا پہنچا جو بھوانی دریا کے کنارے واقع تھا۔ بھوانی دریا کے بند سے دریا کے دونوں طرف ایک ایک نہر نکالی گئی تھی۔ ان نہروں سے جس زمین کی سینچائی ہوتی تھی اُس میں ہر سال ایک فصل ضرور ہو جاتی تھی۔ اس بند سے سیراب ہونے والی تھوڑی سی زمین ایسی بھی تھی جس میں دو فصلیں ہو جاتی تھیں۔ لیکن پانی کا ملتے رہنا یقینی نہیں تھا۔ کمپنی کی حکومت میں کسانوں سے پورا لگان وصول کیا جاتا تھا چاہے پیداوار اچھی ہو یا بری۔ وہ اس کو زیادتی سمجھتے تھے اور اس امر کے خواہشمند تھے کہ پرانا طریقہ پھر سے رائج کر دیا جائے۔

اناکوڈا دیری میں دھان کی کاشت کی جاتی تھی جہاں بھوانی دریا کی نہروں کا پانی پہنچتا تھا۔ دریا پر بند ان جیسے راجہ نے ڈیڑھ صدی پہلے بنایا تھا۔ جس زمین تک پانی نہیں پہنچ پاتا تھا وہاں $\frac{1}{2}$ حصے سے زیادہ آراضی زیرِ کاشت نہیں تھی۔ زمین تو اچھی تھی لیکن جنرل میڈوز (Genral Meadows) کے حملے نے زراعت کو تباہ کر دیا تھا۔ وہاں کے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے تھے اور زیادہ تر مر گئے تھے۔

ڈاکٹر بکانن کے وہاں پہنچنے سے کچھ مہینے پہلے کمپنی کا تجارتی ریزیڈنٹ مقیم سلیم وہاں آچکا تھا اور کمپنی کی طرف سے بنکروں کو پیشگی روپیہ دے چکا تھا۔ جس کپڑے کی فرمائش کی گئی تھی وہ شالام برد کہلاتا تھا اور بنگال کے بفتا کے مشابہ تھا۔ اس کی لمبائی 36 ہاتھ اور عرض $2\frac{1}{4}$ ہاتھ ہوتا تھا۔

جنوب کی طرف سفر کرتا ہوا اور ایک بنجر علاقے سے گزرتا ہوا ڈاکٹر بکانن 28ر اکتوبر کو کیمبٹور کے رہم شہر میں داخل ہوا۔ اس وقت جو شخص وہاں کا حکمراں تھا وہ شہر کی

بنیاد ڈالنے والے کی بیسویں پیڑی سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان پہلے نومدورا کے راجہ کو خراج دیا کرتا تھا لیکن بعد میں میسور کے زیر اقتدار آ گیا تھا۔ میسور کی جنگوں میں شہر کو بہت نقصان پہنچا تھا لیکن اب اس کی حالت سنبھل رہی تھی۔ شہر میں دو ہزار مکانات تھے۔

شہر کے اطراف کی زمین میں دھان پیدا ہوتا تھا۔ اس زمین کی سینچائی اُن پانی کے ذخیروں سے ہوتی تھی جس کو نویل دریا کی نہریں پانی مہیا کرتی تھیں۔ بارانی زمین میں راگی اور دوسری فصلیں بوئی جاتی تھیں۔ کہیں کہیں کپاس اور تمباکو کی کاشت ہوتی تھی۔ دولت مند کسان چھالی اور ناریل کی کاشت بھی کرتے تھے۔ ٹوپن بٹیامین، جو کیمبٹور سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا، لوہا صاف کیا جاتا تھا۔ ضلع میں 459 کرگھے تھے۔ نیچی ذات کے کسانوں کی عورتیں سوت کاتنے میں بڑی مشاق تھیں۔ تاگے کو ضرورت کے مطابق لال یا نیلا رنگا جاتا تھا۔ تجارتی رزیڈنٹ مقیم سیلم نے کیمبٹور کے بنکروں کو دو دفعہ پیشگی روپیہ دیا تھا۔ پہلے ان کو ہر کرگھے پر تقریباً ۴ شلنگ سالانہ محصول دینا ہوتا تھا۔ کمپنی کی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کے بجائے اسٹامپ ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ یہ لوگ اس کو زیادتی سمجھتے تھے۔ انھوں نے کلکٹر سے درخواست کی تھی کہ پچھلا طریقہ رائج کر دیا جائے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

کیمبٹور کے مشرق میں تری پورا واقع تھا جو تین سو مکانوں کا قصبہ تھا۔ جہاں ہفتے میں ایک دفعہ بازار لگا کرتا تھا۔ اُس کے قرب و جوار کی زمین پر سال میں دھان کی ایک فصل ہوا کرتی تھی۔ اس زمین کی آبپاشی جزوی طور سے پانی کے ذخیروں سے ہوتی تھی اور جزوی طور سے نویل دریا سے نکلنے والی نہروں سے۔ مرمت نہ ہونے کی وجہ سے اُس زمین کا ایک تہائی حصہ غیر مزروعہ تھا جس پر پہلے کاشت ہوا کرتی تھی۔ جن کھیتوں میں اچھی پیداوار نہیں ہوتی تھی وہ چراگاہوں میں تبدیل کر دیے جاتے تھے اور ان کا لگان کم ہوتا تھا۔ چینا مالی میں جو اور مشرق کی طرف واقع تھا لوہا صاف کیا جاتا تھا۔ صاف کیے ہوئے لوہے کا تیرھواں حصہ بطور محصول حکومت کو دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جلانے کی لکڑی کاٹنے پر بھی محصول دینا ہوتا تھا۔ چینا مالی میں صرف 125 مکانات تھے اور وہاں چیچک پھیلی ہوئی تھی۔ ضلع کی آراضی کی سینچائی کیلی دریا سے ہوتی تھی لیکن چاول کی کاشت نہیں ہوتی تھی۔

چینا مالی کے شمال میں پیرن ڈور واقع تھا جس میں 118 مکانات تھے اور ضلع میں 800

کر گئے تھے۔ حیدر علی کے زمانے میں اروڈو میں تین ہزار مکانات تھے اور وہ کاویری کے کنارے واقع تھا لیکن ٹیپو سلطان کے عہد میں اُس کا زوال ہو گیا۔ جنرل میڈوز کے حملے میں وہ بالکل برباد ہو گیا لیکن صلح ہو جانے کے بعد سنبھل رہا تھا۔ اروڈو کے پاس سے گزرنے والی نہر نہایت نفیس تھی۔ کہا جاتا تھا کہ کالنگ راجہ نے چار سو سال پہلے اس کو تعمیر کیا تھا۔ اس سے اس وقت کی 3459 ایکڑ زمین کی آبپاشی ہوتی تھی۔

کاویری کے ساتھ تھوڑی دور چل کر کوڈوموڈی کا اہم قصبہ آتا تھا جس میں ایک قدیم مندر اور 118 مکانات تھے۔ کاویری سے نکلنے والی ایک نہر نویل دریا کے اوپر سے گزر کر بکپور گانو تک گئی تھی اور ایک بڑے علاقے کی آبپاشی کا ذریعہ تھی۔ اس علاقے میں ٹیپو سلطان پیداوار کا ½ حصہ بطور لگان وصول کیا کرتا تھا۔ انگریزوں نے اس کو رقم میں تبدیل کر کے 1799ء میں 3 شلنگ 3/7 5 پنس فی ایکڑ لگان مقرر کیا۔ 1800ء کے لگان کا تعین اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔

کیمبٹور کے شمالی حصے کے کلکٹر میجر میک لیوڈ نے ڈاکٹر بکانن کو بتایا کہ ملک کے رواج کے مطابق کسی کسان کو اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ لگان ادا کرتا رہے۔ میجر کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ وہ جنس کی صورت میں لگان بھی وصول کرے اور بڑے پیمانے پر ہونے والے غبن کو بھی روک سکے۔ جس وقت کمپنی نے سیلم کے علاقے پر قبضہ کیا تو اس زمین کا لگان جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا جس کے دھان بویا جاتا تھا اور کاویری کی نہروں سے جس کی آبپاشی ہوتی تھی کمپنی کے ملازمین نے لوگوں کی چیخ پکار کے باوجود اس لگان کو رقم کی صورت میں وصول کرنا شروع کیا، زراعت کو توسیع دی اور مالگزاری میں اضافہ کر دیا۔ چونکہ رعیت داری طریقہ میں زیادہ مالگزاری وصول ہوتی ہے اس لیے اس کو زمینداری پر ترجیح دی گئی۔ "کرنل ریڈ نے مالگزاری وصول کرنے کے لیے جو ضابطے نافذ کیے ہیں اُن سے میرے خیال میں زمینداروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وصولیابی ہو سکتی ہے اور مجھے اس کا یقین ہے کہ اگر وصولیابی میں کمی ہوئی تو اس کی وجہ یا تو فرض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی یا کلکٹروں کی بے ایمانی۔ یہاں میں موروثی زمینداروں کا ذکر مالگزاری اور ملک کے سیاسی حالات کے سیاق و سباق میں کر رہا ہوں۔ جہاں تک زراعت کی ترقی کا تعلق ہے انھیں مفید سمجھا جا سکتا ہے۔[1]"

---

[1] بکانن Journey from Madras، جلد دوم، صفحہ 296

کارودو خاصہ بڑا قصبہ تھا جس میں ایک ہزار مکانات تھے اور جو کاویری کے معاون امراوتی دریا کے کنارے واقع تھا لیکن وہاں کے تاجر چھوٹے موٹے دوکاندار تھے اور بنکروں کی تعداد کم تھی۔ اس ضلع کی آبپاشی کاویری کی دو نہروں اور امراوتی کی متعدد نہروں کے ذریعے ہوتی تھی۔ گنا، دھان اور باراتی فصلوں کی کاشت ہوتی تھی۔

17 نومبر کو ڈاکٹر بکانن داراپورم (دھرم پورا) پہنچا جو کیمبٹور کے جنوبی علاقے کے کلکٹر مسٹر ہرڈس (Mr. Hurdis) کا مستقر تھا۔ کلکٹر ایک باعمل، ذہین اور ہمدرد قسم کا نوجوان افسر تھا جو لوگوں سے مراسم رکھتا تھا، ذات پات کے جھگڑے چکایا کرتا تھا اور ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ "مسٹر ہرڈس کا خیال ہے کہ لگان کی موجودہ شرح بہت زیادہ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں کے کسان بھی بہت غریب ہیں.... کسانوں کی غربت اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں پیدا ہونے والی فصلوں کی خرابی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو زمین لینے پر مجبور کیا جاتا ہے جن کے پاس کاشت کے وسائل نہیں ہوتے۔ چنانچہ دیکھنے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کھیت مزروعہ ہے لیکن اس کاشت کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ آدھی زمین کا غیر مزروعہ رہنا اس سے زیادہ بہتر ہوتا۔"[1] اس کے اسباب دوسری جگہ بتائے گئے ہیں۔ کمپنی یہ چاہتی تھی کہ تمام قابل کاشت زمین کی مالگزاری وصول کی جائے چاہے اس پر کاشت ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ لگان کی شرح بہت زیادہ تھی۔ جس زمین میں پان کی کاشت ہوتی تھی اس کے لگان کی شرح 3 پاؤنڈ 16 شلنگ 9 پنس فی ایکڑ تھی۔ جہاں دھان پیدا ہوتا تھا اس کی شرح ایک پاؤنڈ 5 شلنگ 2 پنس فی ایکڑ سے لے کر 1 پاؤنڈ 15 شلنگ 9 پنس فی ایکڑ تک تھی۔

مغرب کی طرف چلتے ہوئے ڈاکٹر بکانن 24 نومبر کو پالاچی پہنچا۔ یہاں روم کے سکے کھود کر نکالے گئے تھے جو ایک برتن میں بھرے ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگسٹس اور ٹائی بیریس کے زمانوں میں اس قدیم پانڈیا علاقے کی روم سے تجارت ہوتی تھی۔ اس ضلع کی سب سے خراب زمین کو چراگاہ بنا دیا گیا تھا جس پر کوئی لگان نہیں دینا ہوتا تھا اور گاؤں کی بقیہ زمین کو قابل زراعت قرار دیا گیا تھا جس پر اوسطاً 2 شلنگ $10\frac{3}{4}$ پنس فی ایکڑ سے لے کر 7 شلنگ

1۔ بکانن، Journey from Madras. جلد دوم، صفحہ 309

3 پنس فی ایکڑ تک لگان عائد کیا جاتا تھا۔" کسان شکایت کرتے ہیں کہ انھیں زمین لینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور انھیں اُس سے زیادہ زمین لگان پر لینی پڑتی ہے جتنی زمین جوتنے کے وسائل وہ رکھتے ہیں۔ ایک کسان جو 17 پولا زمین (ایک پولا = ½4 سے 6 ایکڑ) لیتا ہے وہ صرف 9 پولا جوت سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس مکمل وسائل موجود ہوں تو وہ گیارہ یا بارہ پولا جوت سکتا ہے۔ پھر ایک تہائی زمین غیر مزروعہ رہتی ہے۔ لیکن کچھ گاؤں میں لگان کی پانچویں حصے کی چھوٹ دے دی گئی اور کچھ میں تیسرے حصے کی تاکہ جہاں سب زمین جوتنے کے لیے وسائل موجود نہ ہوں وہاں کسان کے اس نقصان کی تلافی کی جا سکے جو اس کو اس طریقۂ لگان کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ طریقۂ لگان بہت ناقص ہے[1]۔"

مالابار

29 نومبر کو ڈاکٹر بکانن مالابار میں داخل ہوا، کچھ مہینے پہلے حکومت بمبئی نے یہ علاقہ حکومت مدراس کو منتقل کر دیا تھا۔ وہ تمورا راجہ کے علاقے میں داخل ہوا جس کو یورپی مصنفین زموروں کے نام سے پکارتے تھے۔ جنوب کے اونچے پہاڑوں کی بلندیوں سے آبشار گرتے تھے اور کھیتوں کے پاس گھنے جنگل اور پھلوں کے باغ تھے لیکن بارانی زمین کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کی جاتی تھی اور ایسی زمین کم تھی جس پر دھان کی کاشت کی جا سکے۔ کولن گوڈو کے شہر میں ایک ہزار مکانات تھے جن میں اکثر بنکر رہتے تھے جو کمبیٹور سے روئی منگایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر بکانن نے جتنے علاقے دیکھے تھے ان میں پالی گھاٹ سب سے خوبصورت تھا۔ یہ بنگال کے بہترین علاقوں کے مشابہ تھا لیکن بالائی علاقوں کی کاشت کی دیکھ بھال کم کی جاتی تھی۔ حیدر علی نے مالابار کی فتح کے بعد وہاں قلعہ بنایا تھا۔ قدیم راجاؤں کے زمانے میں زمین کا محصول ادا نہیں کرنا پڑتا تھا لیکن حیدر علی نے ایک محصول لگایا تھا جس کو نگادی کہتے تھے۔ یہ محصول نشیبی زرخیز علاقوں پر لگایا گیا تھا۔ بالائی علاقے اس سے مستثنیٰ تھے۔ ٹیپو سلطان کے مظالم نے بہت سے مالکان آراضی کو جنوب کی طرف تراونکور میں امان لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس وقت ڈاکٹر بکانن پالی گھاٹ گیا تھا اس وقت دھان کی اوسط پیداوار ⅛7

---

[1] بکانن Journey from Madras جلد دوم صفحات 319-320

سیڈ تھی۔ اس میں سے ½4 سیڈ دھان لگان کے طور پر حکومت وصول کر لیتی تھی یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیداوار کا 60 فی صدی سے زیادہ لگان تھا۔ مسٹر سمی (Mr Smee) کے اعداد و شمار کے مطابق مالکان آراضی پر جو زمین کا محصول عائد کیا جاتا تھا اس کی شرح لگان کی ½84 فی صدی ہوتی تھی[1] سالانہ بارش دھان کی ایک فصل کے لیے کافی ہوتی تھی۔ مالکان آراضی نے اپنے خرچ سے جو پانی کے ذخیرے بنائے تھے اُن کی وجہ سے دوسری فصل بھی ہو جاتی تھی۔ جانور بہت چھوٹے اور ملک کی ضرورت کے لیے ناکافی تھے۔ کولن گوڈ میں لوہا تیار کیا جاتا تھا۔

۵ دسمبر کو ڈاکٹر بکانن کوچین کے راجہ کے علاقے میں داخل ہوا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو خراج دیا کرتا تھا لیکن اپنے علاقے میں مکمل سول اور فوجی اختیارات کا مالک تھا۔ "ان علاقوں کے مقابلے میں جہاں کمپنی کو پورے اختیارات حاصل ہیں اُس کے علاقہ کا نظم و نسق اتنا بہتر ہے کہ نہ موپلے شورش پھیلا سکتے ہیں اور نہ نائر[2] کاکاڈ کی پہاڑیاں زیادہ تر بنجر تھیں لیکن چراگاہیں بہتر تھیں، جانوروں کی حالت اچھی تھی اور وادیوں میں غلے کے کھیت تھے جن کے آس پاس پھل دار درختوں کے سائے ہیں۔ لوگوں کے گھر بنے ہوئے تھے۔ قریب میں ایک عیسائیوں کا گانو تھا۔ پاپا یا پادری نے ڈاکٹر بکانن کو بتایا کہ مسیحی مذہب سینٹ ٹامس نے پھیلایا تھا جو ۵۰ء میں مدراس آئے تھے۔

مالابار کے موپلے اٹھارھویں صدی کے وسط میں دولت مند تاجر تھے جن کے پاس جہاز تھے جو سورت، موچا اور مدراس جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر بکانن کے تجربے کے مطابق ساحل پر رہنے والے موپلے امن پسند اور جفاکش تھے لیکن اندرون علاقہ کے لوگ "تندخو، خونخوار اور متعصب بدمعاش" تھے۔ ان کے مذہبی رہنما کا کہنا تھا کہ وہ محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ کی اولاد میں تھا۔

کوچین سے مالابار واپس آنے کے بعد ڈاکٹر بکانن نے شمال کی طرف سفر شروع کیا یہاں تک کہ ½2 دسمبر کو وہ ون کاٹاکوٹے پہنچ گیا۔ وادیاں خوبصورت تھیں، پہاڑیوں کے

---

[1] بکانن، Journey from Madras، جلد دوم، صفحہ 369۔

[2] ایضاً، جلد دوم، صفحہ 388

ڈھال پر چھوٹے چھوٹے قطعے بنا لیے گئے تھے جن میں کاشت ہوتی تھی لیکن پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں بنجر پڑی تھیں۔ کسان زمین کے محصول کے شاکی تھے: "مالابار کی ہر خرابی کا سرچشمہ اس کو بتایا جاتا ہے[1]" ترووانا اور پاروپاناڈا کے درمیانی علاقے میں زراعت کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ آبادی کی کمی اور وہاں کے لوگوں کی غربت تھی لیکن پاروپاناڈا کے قریب ساحل پر ناریل کے باغات تھے جو اچھی فصل دیتے تھے۔ بڑے دن پر ڈاکٹر کالی کٹ پہنچا جو مالابار کا قدیم دارالسلطنت تھا۔

تجارتی ریزیڈنٹ مسٹر ٹورین (Mr Torin) کوشش کر رہا تھا کہ وہاں لنکلاٹ کی صنعت قائم ہو جائے۔ اس کا تھان 72 ہاتھ کا ہوتا تھا اور بنکروں کو اس کی قیمت 18 تسلنگ 6 $\frac{3}{4}$ پنس سے لے کر 16 تسلنگ 4 $\frac{1}{2}$ پنس تک دی جاتی تھی۔ ٹراونکور کوچین سے 344 بنکر لائے گئے تھے اور وہ 237 کرگھوں پر کام کرتے تھے اور ہر مہینے 468 تھان بنایا کرتے تھے۔ مسٹر ٹورین نے ایک کارخانہ پالی گھاٹ میں قائم کیا تھا جو بہتر اور سستا مال تیار کرتا تھا۔

ڈاکٹر بکانن نے اس علاقے کی پیداوار، لگان اور زمین کے محصول کا تخمینہ لگایا اور مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچا۔

خراب کھیت

زمین کا محصول	12 تسلنگ	9 $\frac{1}{2}$ پنس
اخراجات وصولیابی	1 "	3 $\frac{1}{4}$ "
بیج	9 "	4 $\frac{1}{2}$ "
کاشت کے اخراجات	9 "	4 $\frac{1}{2}$ "
مالک آراضی	1 "	11 "
پیشگی رقم کا سود	1 "	$\frac{3}{4}$ "
کسان	7 "	8 "
کل رقم	2 پاؤنڈ 3 تسلنگ، 5 $\frac{1}{2}$ پنس	

[1] بکانن 'Journey from Madras' جلد دوم، صفحہ 468

یا زمین کا محصول قریب قریب ۱۴ شلنگ تھا۔ کاشت کے اخراجات ۱۹ شلنگ تھے اور زمین کے مالک کو صرف ۱۵ شلنگ بچتے تھے۔

گوہانی کھیت

زمین کا محصول اور وصولیابی کے اخراجات	16 شلنگ	10 پنس
بیج	9 "	$4\frac{1}{2}$ "
کاشت کے اخراجات	9 "	$4\frac{1}{2}$ "
سود	1 "	$\frac{3}{4}$ "
مالک آراضی	8 "	$6\frac{1}{4}$ "
کسان	1 پاؤنڈ 5 "	$6\frac{3}{4}$ "
کل رقم	3 پاؤنڈ ۱۰ شلنگ	$8\frac{3}{4}$ پنس

یا زمین کا محصول قریب قریب 17 شلنگ تھا۔ کاشت کے اخراجات ۱۹ شلنگ تھے۔ اور زمین کے مالک کو صرف 1 پاؤنڈ ۱۴ شلنگ کی بچت ہوتی تھی۔

یکم جنوری 1801ء کو ڈاکٹر بکانن تمارا چیری پہنچا۔ یہاں کی تمام آراضی پر موپلاؤں کا قبضہ تھا جن کے پاس وہ رہن تھی۔ ہندوؤں پر ٹیپو سلطان کے مظالم کی اور موپلوں کی جنگوں کی وجہ سے کرم بارا کے اُس علاقے کا چوتھائی حصہ ویران پڑا تھا جہاں دھان پیدا ہوا کرتا تھا اور اس پر جنگلی درخت اگ آئے تھے۔ کچھ بڑے کسانوں کے پاس دس ہل، بیس بیل، بیس غلام اور کنیزیں، دس ملازم اور پچیس دودھ دینے والی گائیں تھیں لیکن ایسے کسانوں کی تعداد کم تھی۔ غلام کی قیمت بہت کم تھی یعنی ۹ شلنگ $\frac{1}{3}$ 6 پنس فی نفر سے لے کر 8 2 شلنگ 8 پنس فی نفر۔ کنیزوں کی قیمت اس کی آدھی ہوا کرتی تھی۔

وہاں کا کلکٹر مسٹر کاورڈ (Mr. Coward) ضلع کے دورے میں ڈاکٹر بکانن کے ساتھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ضلع کے ایک چوتھائی حصے کی آبپاشی ہو سکتی ہے اور وہاں دھان کی کاشت کی جا سکتی ہے، تقریباً آدھے حصے کی سطح بلند ہے جہاں بارانی فصلیں بوئی جا سکتی ہیں یا باغ لگائے جا سکتے ہیں اور بقیہ حصہ پتھریلا ہے۔ "مسٹر کاورڈ کا خیال ہے کہ زمین کا محصول اتنا زیادہ ہے کہ اس سے زراعت کے کام میں رکاوٹ پڑتی

ہے[1]

5 جنوری کو مسٹر کادر ڈے سے رخصت ہو کر ڈاکٹر بکانن کیپٹن آس برن (Captain Asburne.) کے ساتھ راجہ کے صدر مقام کوٹی پورم گیا۔ یہ راجہ کمپنی کو خراج ادا کرتا تھا۔ مگر اپنے علاقے میں اسے پورے اختیارات حاصل تھے۔ یہاں زمین کا محصول 40 فیصدی تھا۔ پیداوار کا 27 فی صدی مالک آراضی کو ملتا تھا اور 33 فی صدی کسانوں کو۔ حالانکہ کیپٹن آس برن اس کے ساتھ تھا پھر بھی اُس ملک کی عورتوں نے اس اہم مہمان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ "چونکہ نائر یوربینیوں سے دشمنی رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے عورتوں کو سمجھا دیا کہ ہم ایک قسم کے بھوت ہیں جن کے دم ہوتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ عورتیں انھیں دیکھ کر بھاگ جایا کرتی تھیں[2]۔

ٹیلی چیری، ماہی اور دھرماپٹم کے حلقے کا انتظام مسٹر اسٹریچی (Mr Strachy.) کے سپرد تھا جو "ایسا شریف نوجوان ہے جس سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں"۔ مسٹر اسٹریچی کا خیال تھا کہ اس حلقے میں کاشت کی جاسکتی ہے یا باغات لگائے جاسکتے ہیں لیکن اس کا زیادہ تر حصہ بنجر پڑا ہوا ہے۔ اس زمین کا محصول جس میں دھان پیدا ہوتا تھا لگان کا 25 فیصدی تھا۔ اس ضلع کی تجارت اہم تھی اور خاص طور سے کالی مرچ، صندل اور الائچی کی تجارت ہوتی تھی۔

کنانور کے مقام پر مالابار کے شمالی ضلع کے کلکٹر مسٹر ہاگسن (Mr Hodgson.) نے ڈاکٹر بکانن کا خیر مقدم کیا۔ ایک موپلا خاتون نے جس کا لقب بی بی تھا اور جو ان لوگوں کی اولاد میں تھی جنھوں نے ابتدا میں ڈچ لوگوں سے کنانور خریدا تھا، ڈاکٹر بکانن کی شاندار دعوت کی۔ بی بی زمین کے محصول کے طور پر 14,000 روپے کمپنی کو دیا کرتی تھی اور کنانور اور لکا دیو جزائر کے بڑے حصے کی مالک تھی۔ نائروں کی طرح موپلوں میں بھی عورت وارث ہوا کرتی تھی۔

چیرکل پہاڑی علاقہ تھا اور وہاں کاشت بہت کم ہوتی تھی۔ کنانور اور چیرکل میں 10,386 مکانات تھے۔ جنوری کے وسط میں ڈاکٹر بکانن مالابار سے روانہ ہو کر کنارا گیا جو

---

[1] بکانن 'Journey from Madras.' جلد دوم، صفحہ 502

[2] بکانن 'Journey from Madras.' جلد دوم صفحہ 514

شمال میں واقع تھا۔

کنارا

جیسا کہ ہم ایک پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ اپنے زمانے کا سب سے نمایاں اور کامیاب حاکم ٹامس منرو جب بارہ محل کا بندوبست کر چکا تو اس کو 1798ء میں کنارا بھیجا گیا تا کہ وہاں بھی بندوبست کرے۔ اس وقت کنارا کا راجہ بیمار تھا۔ لیکن اس کا بھانجہ، جس کو وہ اپنا جانشین مقرر کر چکا تھا، منرو سے ملا۔ منرو نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریاست کے متعلق اس کا دعویٰ کمپنی کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس دوران ریاست کا انتظام تحصیلدار رود، کے سپرد کر دیا گیا تھا، راجہ کے اختیارات سلب کر لیے گئے تھے اور اس کی گزربسر کے لیے نجی جاگیر دی گئی تھی۔ جس کی حد تک زمین کا محصول معاف کر دیا گیا تھا۔ نائروں کو شکایت تھی انگریزوں نے اس قسم کا انتظام کر کے وعدہ خلافی کی ہے۔ منرو نے ٹیپو سلطان کے 32000 روپیہ کے برائے نام مطالبے کے بجائے 24000 روپیہ زمین کا محصول مقرر کیا۔ لیکن اس تخفیف شدہ مطالبے کو بھی ملک ادا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مطالبہ بھی آراضی کے مجموعی لگان پر حاوی تھا۔ تری مولا راؤ، جو تحصیلدار تھا، اس محصول کو آرکاٹ کے محصول سے زیادہ سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر بکانن ایک ہفتہ منگلور میں ٹھہرا جو ایک جھیل کے کنارے واقع تھا۔ اس جھیل اور سمندر کے درمیان ایک ریتیلے ساحل کی پٹی تھی۔ ایک زمانے میں یہ بندرگاہ تھا لیکن سمندری راستے کی گہرائی کم ہو جانے کی وجہ سے اس وقت جب بکانن وہاں گیا ایسے جہاز نہیں آسکتے تھے جن کے لیے دس فیٹ سے زیادہ گہرے پانی کی ضرورت ہوتی تھی ٹیپو سلطان نے منگلور کے قلعے کو مسمار کر دیا تھا۔

ٹیپو سلطان نے انعام یا وہ زمینیں جو مندروں کو دی گئی تھیں واپس لے لیں لیکن ان میں سے کچھ کو چھپا لیا گیا۔ ٹامس منرو اور اس کے جانشین ریون شا (Revenshaw) نے حالات کو برقرار رکھا۔ ہندوؤں کے ایک خاص مندر کی سالانہ آمدنی 193 پاؤنڈ 8 شلنگ

---

[1] بکانن، 'Journey from Madras' جلد سوم، صفحہ 12

3 پنس تھی۔ مزروں کی تشخیص کو زیادتی سمجھا گیا اور اس کی وجہ سے شکایتیں پیدا ہوئیں "مالکان آراضی کا کہنا ہے کہ محصول کی رقم لگان کی رقم سے زیادہ ہے اور یہ کہ انھیں حکومت کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے مجبوراً قرض لینا پڑتا ہے یا اپنی خود کاشت کے منافع کا ایک حصہ دینا پڑتا ہے .... لیکن غربت کے رونے کی وجہ سے، جو عام طور سے اور ہندوستان کے ہر حصے میں رویا جاتا ہے اور اس احتیاط کی بنا پر جو مظالم کے طویل سلسلے کی وجہ سے ہر بات کو چھپانے میں برتی جاتی ہے، کسان کے حقیقی حالات کو معلوم کرنا بہت دشوار ہوگیا ہے۔ پھر بھی کنارا میں زمین سے متعلق ہر قسم کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے جتنا شدید مقابلہ ہوتا ہے اس کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں ہوگا کہ اس کے علاوہ کہ مالکان اپنے وسائل کے مطابق جتنی زمین میں چاہیں کاشت کرسکتے ہیں۔ انھیں اب بھی زمین میں کافی دلچسپی ہے۔ بہرحال ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ اس جائیداد میں مدتوں دخل اندازی نہ کی جائے۔ کوئی ایسا ملک ترقی نہیں کرسکتا ہے جہاں تمام تر زمین ریاست کی ملکیت ہو[1]۔" ڈاکٹر بکانن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں لگان زیادہ ہونے کی صورت میں بھی زمین حاصل کرنے کے لیے مقابلہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین قوم کی گزر بسر کا واحد ذریعہ ہے۔ کسان ہر شرط پر یا تو کھیت حاصل کرے یا فاقے کرے۔

اس زمین کی آبپاشی جس میں دھان ہوتے تھے نشیبی وادیوں کی ندیوں سے نکلنے والی نہروں سے ہوتی تھی یا بلندیوں پر واقع پانی کے ذخیروں سے۔ بہت اونچی جگہوں پر فصل کا انحصار بارش پر تھا۔ وہاں کے عیسائی گنے کی کاشت کرتے تھے۔ چھالی اور کالی مرچ کی کاشت باغوں کی صورت میں ہوتی تھی۔ مالابار کی طرح یہاں کے لوگ بھی نمک بنایا کرتے تھے لیکن اس کی مقدار ناکافی تھی۔ زیادہ تر چاول، چھالی اور کالی مرچ باہر بھیجی جاتی تھی سوتی اور ریشمی کپڑے، تمباکو اور نمک باہر سے آتے تھے۔

منگلور سے دس میل کے فاصلے پر آرکولا واقع تھا۔ چونکہ اس میں پہلے کونکنی عیسائی رہتے تھے اس لیے اس کو فرنگی پیٹا بھی کہتے تھے۔ پورا علاقہ مالابار کے مشابہ تھا، پہاڑوں کے ڈھلان پر کاشت کے لیے قطعے بنے ہوئے تھے لیکن یہاں کے لوگ مالابار کے لوگوں کے

---

[1] بکانن *Journey from Madras* جلد سوم، صفحات 33-35

مقابلے میں جفاکش کم تھے۔ حال میں ہونے والی جنگوں میں ٹیپو سلطان اور کورگ کے راجہ نے اس کے نواحی علاقے کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ڈاکٹر بکانن نے راستے میں بہت سی توپیں دیکھیں جنھیں ٹیپو سلطان منگلور سے سرنیگا پٹم لے جانا چاہتا تھا۔ بامالا دریا پر ایک بند تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے کسانوں کے لیے پانی کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔

5 ؍فروری کو ڈاکٹر بکانن اینورو کے شہر میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے آٹھ جینی مندر دیکھے اور ایک عظیم الجثہ جینی مورتی دیکھی جو ایک ایسی سرخ چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی تھی جو کھلے میں واقع تھی۔ جینی مندروں کے پاس حیدر علی کے زمانے میں جتنی زمین تھی ٹیپو سلطان کے زمانے میں وہ کم کر دی گئی تھی۔ مسز و نے زمین بحال کر دی لیکن اُس کے جانشین ریون تیا نے زمین کے رقبہ میں پھر سے کمی کر دی۔ گوتم راجہ (بدھ) کا بت جو کارکولا میں نصب تھا سرخ چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس کی بلندی 38 فیٹ تھی اور کتبے کے مطابق وہ بت بکانن کی آمد سے 369 سال پہلے بنایا گیا تھا یعنی 1432ء کے قریب۔

کچھ اور مغرب کی طرف ہاریا دیکا واقع تھا۔ ڈاکٹر بکانن 10 ؍فروری کو وہاں پہنچا۔ اس نے وہاں زمین کے محصول کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کو بتایا گیا کہ لگان کی نصف رقم محصول کے طور پر وصول کی جاتی ہے لیکن "وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب چاول سستا ہوتا ہے تو پورا لگان بھی زمین کے محصول کے برابر نہیں ہو پاتا ہے۔"

دوسرے دن اُدیپو کے مقام پر اس نے ایک دفعہ بحر عرب کا نظارہ کیا۔ اُدیپو میں مادھو آچاریہ کا نام اب بھی احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ چودھویں صدی کے عظیم ہندو عالم اور مصلح تھے۔ ان کے پیرو وہاں پائے جاتے تھے۔ وہاں سنیاسیوں کے تین مندر اور چودہ خانقاہیں تھیں۔ سنیاسی مذہبی گروہ سمجھے جاتے تھے۔ ادیپو سے لے کر سمندر تک دھان کی کاشت ہوتی تھی۔ آس پاس کے پانچ گانوؤں کے اعداد و شمار کی بنا پر معلوم ہوا کہ 2048 پگوڈا میں سے، جو اُن کی پیداوار کی مجموعی قیمت تھی، کسانوں کو 1295 پگوڈا ملے۔ عام طور سے حکومت کا حصہ مجموعی پیداوار کا چوتھائی ہوتا ہے۔ ان گانوؤں میں 671 پگوڈا میں اس میں سے 37۔ انعام یافتہ یا خیراتی ہیں۔ مالک آراضی کے لیے 82 پگوڈا کی بچت ہوتی ہے[1]۔

---

[1] بکانن۔ Journey from Madras. جلد سوم، صفحہ 103۔

شمال کی طرف چلتے ہوئے ڈاکٹر بکانن کنداپورا پہنچا۔ وہاں اُس نے دریا پار کیا اور کنارا کے شمالی علاقے میں داخل ہوگیا۔ جس کا انتظام مسٹر ریڈ (Mr.Read) کے ہاتھ میں تھا "ایک شریف نوجوان جس نے اسی اسکول میں تربیت پائی تھی جس میں مسٹر ریون شا نے تربیت پائی تھی" یہ کچھ اور شمال کی طرف بید رد واقع تھا۔ وہاں ایک مندر تھا جو شیو سے منسوب تھا اور باٹو کولا کا بڑا قصبہ تھا جہاں 500 مکانات تھے۔ شمال کی طرف چلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ نیچی پہاڑیوں اور سمندر کے درمیان ایک میل سے لے کر ڈیڑھ میل تک چوڑی ساحلی پٹی تھی جس میں دھان کی کاشت ہوتی تھی۔ مورد دیس وارا کا مندر ایک بلند قلعہ بند راس پر واقع تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر کبوتروں کا جزیرہ تھا جہاں جنگلی کبوتر رہا کرتے تھے۔ وہاں مونگا بھی ہوتا تھا اور لوگ اس کو جمع کرنے کے لیے کشتیوں میں جایا کرتے تھے۔ 21 رفروری کو ڈاکٹر بکانن اُنور کے شہر اور اسی نام کی ایک بڑی جھیل تک پہنچ گیا۔ پہلے اُنور ایک بڑا شہر اور تجارتی مرکز تھا اور حیدر علی نے یہاں جنگی جہاز بنانے کے لیے ایک گودی تعمیر کی تھی۔ اس کے مطلق العنان اور بیوقوف بیٹے نے معاہدہ منگلور کے ذریعے حاصل کرکے اس بڑی منڈی کو تباہ کر دیا۔ جب ڈاکٹر بکانن وہاں گیا تو شہر ویران پڑا تھا۔ گوا سے تجارت کے لیے کشتیاں آیا کرتی تھیں۔ سوداگر جو جھیل کے کنارے بکھرے ہوئے تھے باہر بھیجنے کے لیے اُن سے چاول، کالی مرچ، کھوپرا، چھالی اور نمک لگی ہوئی مچھلیاں خریدا کرتے تھے۔ زیادہ تر مزروعہ زمین نجی ملکیت تھی لیکن پہاڑیوں اور جنگلوں پر حکومت قابض تھی۔ ہر شخص اپنی تمام جائیداد پر رہن کا محصول ادا کیا کرتا تھا اور اسے حق حاصل تھا کہ وہ جس طرح چاہے اُس پر کاشت کرے۔ اوسط درجے کے کسانوں کے پاس چار یا چھ ہل ہوتے تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کے پاس صرف ایک ہل تھا اور وہ غریب تھے۔ کسان چار سال سے لے کر دس سال تک کے پٹے پر کھیت لیا کرتے تھے اور مالکوں کو لگان دیا کرتے تھے۔ مالک حکومت کو زمین کا محصول ادا کرتے تھے۔

"مالک کو زمین کے محصول کے لیے ضمانت دینی ہوتی ہے۔ اگر وہ ضمانت نہیں دیتا ہے تو حکومت کی طرف سے ایک حاکم مال بھیجا جاتا ہے جو اس کی فصل کی نگہداشت کرتا ہے۔ پیداوار کو فروخت کرکے اس میں سے مالگزاری کاٹ لیتا ہے۔ یہ ناقص طریقہ ہے اور درحقیقت میں ہندوستان کی ایجاد ہے۔ چونکہ جو شخص پیداوار حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہ کسان

سے بھتا لینے کا حقدار ہوتا ہے اور اس طرح وہ ایک بے مصرف گوڑیا ہوتا ہے جو کسی بڑے آدمی کی نزاع میں شریک ہو گیا تھا اس لیے وقتی طور سے اس کی ہوس پوری ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ضمانت دے دیتا ہے اور ادائیگی سے قاصر رہتا ہے تو ضمانت کی مدت گزرنے کے تیسرے دن ضامن بلایا جاتا ہے اور اس وقت تک نظر بند رکھا جاتا ہے جب تک مالگزاری ادا نہ کر دی جائے۔[1]

ایک زمینداری جو زمین کے محصول کے طور پر بیس پگوڈا ادا کرتی تھی سو پگوڈا میں فروخت ہو سکتی تھی اور پچاس پگوڈا میں رہن رکھی جا سکتی تھی۔ باپ کی جائیداد تمام لڑکوں میں برابر تقسیم ہو جاتی تھی لیکن بڑا بھائی سب جائیداد کا انتظام کرتا تھا اور وہ مل کر رہتے تھے۔ جب جائیداد رشتے کے کئی بھائیوں میں تقسیم ہوتی تھی تو عام طور سے اس کا پٹا کر دیا جاتا تھا اور لگان تقسیم کر لیا جاتا تھا۔ ایک گوہانی کھیت میں دھان کے بیس سے تیس بشل فی ایکڑ پیدا ہوتے تھے جب کہ خراب کھیت میں 6 سے لے کر 16 بشل فی ایکڑ تک پیدا ہوتے تھے۔ گنے، کالی مرچ، صندل، الائچی، چھالی اور کھوپرے کی تجارت کی جاتی تھی۔

اُنور کے شمال میں گوکرن واقع تھا۔ یہ ایک اہم مقام تھا۔ یہاں شیو کی مشہور مورتی کی پوجا ہوتی تھی جس کو مہابالیسور کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لنکا کا بادشاہ راون یہ مورتی شمال کے پہاڑوں سے لایا تھا۔ اس نے دم لینے کے لیے یہ مورتی یہاں رکھدی اور پھر اُسے اٹھا نہ سکا۔ قصبہ میں 500 مکانات تھے جن میں سے آدھے برہمنوں کے قبضے میں تھے۔ وہاں ایک بڑا سا تالاب تھا جس کے قریب ایک خانقاہ تھی اور ایک مندر میں شنکر نرائن کی مورتی رکھی تھی۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے یہ عقیدہ عام تھا ..... کہ شیو اور وشنو ایک ہی خدا کے مختلف نام ہیں"

انکولا کی سالانہ مالگزاری 000و29 پگوڈا تھی جب کہ اُنور کی مالگزاری 000و51 پگوڈا تھی اور کنداپور کی 000و50۔ ایک تہائی زمین بنجر پڑی تھی۔ چور کئی دفعہ انکولا کا بازار جلا چکے تھے لیکن انگریزوں کی حکومت میں اس کی حالت سنبھل رہی تھی۔ کہنے کو تو ٹامس منرو کی عائد کردہ شرح مالگزاری ٹیپو سلطان کی شرح کے مقابلے میں کم تھی لیکن حقیقت میں

---

[1] بکانن، Journey from Madras، جلد سوم، صفحہ 140

وہ زیادہ رقم وصول کرتا تھا۔

"حکام مال کے کہنے کے مطابق ٹامس منرو نے زمین کے محصول کی شرح بہت کم کر دی تھی لیکن اُس کی دیکھ بھال اور وصولیابی میں برتی جانے والی سختی کی وجہ سے اس نے محصول کی جتنی رقم وصول کر لی وہ پہلے وصول ہونے والی رقموں سے بہت زیادہ تھی"[1]۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ کمپنی کے ملازمین کبھی پرانی مالگزاری کو برقرار و بحال رکھتے تھے اور کبھی اس میں اضافہ یا کمی کر دیا کرتے تھے لیکن مالگزاری کی وصولیابی میں وہ جتنی سختی برتتے تھے اتنی سختی کبھی پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

تینوں شمالی ضلعوں یعنی کندپورا، اُنور اور انکولا کا بڑا علاقہ پتھریلا اور اُدسر تھا اور کاشت کے لیے موزوں نہیں تھا۔ مسٹر ریڈ نے مختلف قسم کی زمین کا مندرجہ ذیل تخمینہ لگایا تھا۔

	مزروعہ زمین	قابل زراعت	اُدسر
کندا پورا	32٪	08٪	60٪
اُنور	26٪	12٪	62٪
انکولا	20٪	20٪	59٪

کہا جاتا ہے کہ ادسر ہونے کے باوجود میجر منرو کے انتظام کے پہلے سال میں مالگزاری کی اتنی رقم ملی جتنی پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ مسٹر ریڈ کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمین پر لگان بڑھا دیا گیا تھا جو حقیقت میں زیر کاشت تھی لیکن مجھے اس بیان کی صحت میں شبہ ہے[2]۔

یہ ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کہ ہم ڈاکٹر بکانن کی واپسی کا حال بیان کریں۔ وہ میسور سے گزرتا ہوا 6 جولائی 1801ء کو مدراس پہنچا۔ جنوبی ہند میں مشرقی سمندر سے مغربی سمندر تک کے سفر کا حال جس کا خلاصہ ہم نے اس باب میں پیش کیا ہے پرانی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی

1ـ بکانن Journey from Madras جلد سوم، صفحہ 180

2ـ بکانن Journey from Madras. جلد سوم صفحہ 191

کی نئی حکومت کے زمانے میں ملک کے لوگوں کی معاشی حالت کے متعلق بیش بہا دستاویز ہے۔ جہاں جہاں کمپنی کی حکومت قائم ہوئی وہاں جنگیں ختم ہوگئیں اور امن قائم ہوگیا۔ ان تمام نعمتوں کے باوجود، جو کمپنی کے نظم و نسق کی دین تھیں، کمپنی نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ زمین کے محصول کی شرح میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔ اس لیے کمپنی کی حکومت میں لوگ انتہائی غریب ہوگئے۔ ان کی حالت میسور کی دیسی ریاست کے لوگوں سے بھی بری تھی جن پر ہندوستانی وزیر پورنیا حکومت کر رہا تھا۔

باب 13

شمالی ہند کی معاشی حالت (1808ء - 1815ء)

کورٹ آف ڈائرکٹرز نے جنوبی ہند میں ڈاکٹر فرانسس بکانن کی معاشی تحقیقات کی قدر و قیمت کو تسلیم کیا اور اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کوئی اہم شخصیت شمالی ہند میں بھی اس قسم کی تحقیقات کرے۔ چنانچہ 1807ء میں ڈاکٹر بکانن کو ہدایت کی گئی کہ وہ بنگال اور شمالی ہند کے کچھ اضلاع کے اعداد و شمار جمع کرے۔ سات سال تک بہت احتیاط کے ساتھ تفتیش کی گئی جس پر 30000 پاؤنڈ صرف ہوئے۔ حکومت ہند نے جمع کیا جانے والا بیش بہا مواد انگلستان بھیج دیا لیکن بہت دن تک اس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اسکاٹ لینڈ میں ڈاکٹر بکانن کو ایک بڑی جائیداد ورثے میں مل گئی۔ جائیداد پانے کے بعد اس نے ہملٹن کا نام اختیار کر لیا اور اس سے پہلے کہ اس کی محنت کے پھل منظر عام پر آسکیں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد منٹگمری مارٹن (Montgomery Martin) نے جو برطانوی نو آبادیات کا مورخ تھا اور ہندوستانی موضوعات پر بہت سوچ سمجھ کر اور احتیاط کے ساتھ لکھا کرتا تھا، ڈاکٹر بکانن کے مسودوں کو دیکھنے کی اجازت حاصل کی۔ ڈاکٹر بکانن نے محنت شاقہ کے بعد جو معلومات حاصل کی تھیں ان کا ایک معقول انتخاب 1838ء میں تین جلدوں میں لندن سے شائع کر دیا گیا۔ انیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں شمالی ہند کے معاشی حالات کا بہترین اور سب سے زیادہ قابل اعتبار بیان ہمیں ان جلدوں میں ملتا ہے۔ اس کتاب کے مقصد کے پیش نظر ہم موجودہ باب میں اس حصے کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جن میں اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔

شہر پٹنہ اور بہار کا ضلع

(رقبہ 5358 مربع میل۔ آبادی 3364420)

ضلع کی سب سے اہم پیداوار دھان تھا۔ اوسطاً دھان ایک روپے کا ستر سیر

یا ایک شلنگ کا تقریباً ستر پاؤنڈ بکا کرتا تھا۔ گیہوں اور جو کی اہمیت کے اعتبار سے دوسری حیثیت تھی اور کبھی کبھی وہ ملا جلا کر بوئے جاتے تھے۔ آٹے کی روٹی بنائی جاتی تھی یا غلے کو بھون کر اور پیس کر ستو بنائے جاتے تھے۔ مارو اگرمیوں میں بوئی جاتی تھی۔ مکا اور جوار گنگا کے کنارے پیدا ہوتی تھی۔

کیسری، بھٹ، مٹر، مسور، ارہر یا مونگ اور لذیذ ترکاریوں کی کاشت کی جاتی تھی جو غذا کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ تیل کے لیے تل اور دوسرے پودوں کی کاشت کی جاتی تھی۔ یورپ سے آلو آچکا تھا۔ 8,000 ایکڑ میں کپاس پیدا ہوتی تھی۔ اس میں چوتھائی حصہ ایسا تھا جس میں کوئی اور فصل نہیں ہوتی تھی۔ 7,000 ایکڑ میں گنے کی کاشت ہوتی تھی گانو کے قریب باغوں میں پوست کی کاشت ہوتی تھی اور 160 ایکڑ میں تمباکو بوئی جاتی تھی۔ بہار کا پان دوسرے پانوں سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور کلکتہ، بنارس اور لکھنؤ بھیجا جاتا تھا۔ نیل کی کاشت کم ہو رہی تھی۔ زمیندار اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن کسم کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔

کسان فصل کاٹنے کے اخراجات کی منہائی کے بعد آدھی فصل زمیندار کو بطور لگان دیا کرتے تھے لیکن زمین کی سینچائی کے لیے جن نہروں اور پانی کے ذخیروں کی ضرورت ہوتی ہوتی تھی ان کی تعمیر اور مرمت کے کل اخراجات زمیندار برداشت کرتے تھے۔[1]

ایسے بڑے تالاب کھودنے پر پانچ سو روپے خرچ ہوتے تھے جن کی لمبائی ایک میل یا اس سے زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن چھوٹے چھوٹے تالاب تعداد میں زیادہ تھے جن کی کھدائی پر 25 روپے سے لے کر 100 روپے تک خرچ ہوتے تھے۔ بہت سی نہریں کئی میل لمبی تھیں اور گرمی کے زمانے میں دریا میں جتنا پانی باقی رہتا تھا اس سے زیادہ پانی کی انھیں ضرورت ہوتی تھی۔ سردیوں کی زیادہ تر فصلوں کی، ترکاریوں کی، اور گنے کی آبپاشی کنوئیں سے ہوتی تھی۔ جہاں تک چراگاہوں کا تعلق تھا 27 مربع میل غرقی میں آئی ہوئی زمین تھی، 384 میل ایسی زمین تھی جس پر جنگل تھا، بکھری ہوئی جھاڑیاں تھیں، 470 میل

---

[1] منٹگمری مارٹن، History of Eastern India (لندن 1828ء) جلد اول، صفحات 282 اور 294

باغات تھے، 205 میل بلندی کی زمین تھی اور 417 میل ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے، دریا، تالابوں کے کنارے اور ادسر تھے۔ پٹنہ اور گیا کے شہروں کے علاوہ کسان اس زمین کی قیمت نہیں دیا کرتے تھے جس پر وہ گھر بناتے تھے " جو شخص کھیت لگان پر لیتا ہے وہ گھر کی قیمت ادا نہیں کرتا ہے " دستکار، تاجر اور مزدور زمین کا لگان یا تو رقم کی صورت میں دیا کرتے تھے یا کام کی۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسان کا لگان پیداوار کا نصف حصہ تھا جس میں سے فصل کاٹنے کے اخراجات منہا کر دیے جاتے تھے۔ اس لگان میں اس زمین کا لگان جس پر وہ گھر بناتا تھا، آبپاشی کے مصارف اور چراگاہ کی سہولت بھی شامل ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ پیداوار کا نصف حصہ وصول کرنے میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی "تقسیم کا طریقہ اتنا پریشان کن ہے کہ فصل تیار ہونے کے بعد اپنا اپنا حصہ مانگنے کے بجائے مالک اور کسان دونوں اس پر تیار ہو جاتے ہیں کہ غلّہ کی ایک مقدار یا اس کی قیمت دے دی جائے " ایک زمینداری کے علاوہ کسانوں کے ذمے زمینداروں کا بقایا بہت کم ہے۔ یہ زمیندار عام طور سے کسانوں کو پیشگی روپیہ دے دیا کرتا تھا ...... زمینداروں کی طرف سے کسانوں کو پیشگی روپیہ یا تقاوی دینے کے رواج کا مقصد یہ ہے کہ وہ کاشت کر سکیں۔ یہ طریقہ عام نہیں ہے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک رائج ہے "[2] ڈاکٹر بکانن کی تحقیقات کے زمانے میں ایک تبدیلی یہ آ رہی تھی کہ جنس کے بجائے رقم کی صورت میں لگان ادا ہونے لگا تھا۔

ایک ہل چلانے والے ملازم کی سالانہ اُجرت 16 روپے سے لے کر 22 روپے تک ہوا کرتی تھی (یا تین یا چار شلنگ ماہوار) ۔ گوڑائی کرنے والوں کو، دھان کے پودے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والوں کو اور سردی کی فصل کو پانی دینے والوں کو تین یا چار روپیہ (دو پنس) روزانہ اجرت دی جاتی تھی۔ جو عورتیں زرائی اور دھان کے پودے کی منتقلی کا کام کرتی تھیں انھیں مردوں کے برابر اجرت ملتی تھی۔ وہ فصل کاٹنے میں بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔

زراعت کے بعد ہندوستان کی اہم قومی صنعت سوت کاتنا اور کپڑا بننا تھی۔ سوت کاتنے

---

[1] منٹگمری مارٹن History of Eastern India. جلد اول، صفحہ 299

[2] ایضاً، جلد اول، صفحات 133 اور 305۔

کا کام صرف عورتیں کیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر بکانن کے اندازے کے مطابق اُس ضلع میں 3,30,426 عورتیں سوت کاتا کرتی تھیں۔" ان میں سے زیادہ تر سہ پہر میں کچھ گھنٹے کے لیے چرخہ چلاتی ہیں۔ اگر اوسط کو تخمینے کی بنیاد بنایا جائے تو ان میں سے ہر عورت سال بھر میں جتنا سوت کاتتی ہے اس کی قیمت 7 روپے 12 آنے 8 پائی ہوتی ہے اور سوت کی مجموعی سالانہ قیمت 23,67,277 روپے ہوتی ہے۔ اگر اسی طرح عام مال کی قیمت فروخت نکالی جائے تو 12,86,272 روپے ہوتی ہے۔ اس طرح سوت کاتنے والوں کا سالانہ منافع 10,81,005 یا تین روپے چار آنے فی کس ہوا۔ چونکہ کچھ برسوں سے نفیس کپڑے کی مانگ برابر کم ہو رہی ہے ان عورتوں کو بہت نقصان ہوا ہے۔[1]

سوتی کپڑا بننے والے لاتعداد تھے۔ جن کرگھوں پر چادریں اور میز پوش بنائے جاتے تھے اُن کی تعداد 750 تھی۔ سالانہ بنائے جانے والے مال کی قیمت 5,40,000 روپیہ ہوتی تھی۔ ان میں سے سوت کی قیمت منہا کرنے کے بعد 81,400 روپیہ منافع بچتا تھا۔ اس حساب سے ہر کرگھے کا منافع 108 روپیہ ہوا جس پر تین آدمی کام کرتے تھے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فی کس سالانہ آمدنی 36 روپے (72 شلنگ) ہوئی لیکن زیادہ تر بنکر ملک میں استعمال ہونے والا موٹا جھوٹا کپڑا بنایا کرتے تھے جس کی سالانہ پیداوار کی قیمت 24,38,621 روپے ہوا کرتی تھی۔ اس میں سے سوت کی قیمت منہا کردی جائے تو 6,67,242 روپیہ منافع بچا کرتا تھا۔ اس حساب سے ہر کرگھہ پر 28 روپیہ (56 شلنگ) منافع آتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ "کمپنی کا آسامی بن جانے کے بعد ہر شخص کو دو روپے دیے جاتے ہیں اور اس سے وعدہ لیا جاتا ہے کہ جب تک وہ کمپنی کی ضرورت کا مال تیار نہ کرے کسی اور شخص کے لیے کام نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ کمپنی کے تجارتی ریزیڈنٹ نے انھیں پیشگی روپیہ کبھی نہیں دیا ہے۔ ایجنٹ ہر شخص کو حکم دیتا ہے کہ وہ فلاں فلاں قسم کے کپڑے کے اتنے تھان بنائے۔ کپڑا تیار ہونے

---

1 منٹگمری مارٹن History of Eastern India (لندن 1838ء) جلد اوّل، صفحہ 350

کے بعد انھیں معینہ شرح کے مطابق اس کی قیمت دی جاتی ہے۔[1]

جو جزوی یا کلی طور سے ٹسر کے کپڑے بنایا کرتے تھے۔ زیادہ تر بھٹو ہا، گیا؛ اور نودا میں رہتے تھے۔ پیداوار کی مجموعی سالانہ قیمت 21،710 روپیہ ہوتی تھی جس میں سے ہر کرگھے کا منافع 30 روپے سے لے کر 90 روپے سالانہ تک ہوا کرتا تھا اور اس پر ایک مرد اور ایک عورت کام کرتے تھے۔

دوسری اہم صنعتیں تھیں کاغذ سازی، چمڑے کا کام، عطر سازی، لوہار کا کام، سنار کا کام، پتھر کاٹنے کا کام، کمہار کا کام، راج گیری، چونا بنانے کا کام، رنگ ریز کا کام، کمبل بننے کا کام اور چاندی سونے کے تار بنانے اور کپڑا بننے کا کام زیادہ تر داخلی تجارت بلدیا بیوپاریوں کے ہاتھ میں تھی جن کے پاس سامان لادنے والے بیل ہوا کرتے تھے۔ ایک بیل اور پانچ روپے کے سرمائے سے بیوپاری تجارت شروع کر سکتا تھا۔ وہ عام طور سے ایک مہینے میں پچاس روپے کا مال بیچ لیا کرتے تھے جس پر چھ سے بارہ فی صدی کا منافع ہوتا تھا۔ اس طرح اس کی سالانہ آمدنی 32 روپے (½ 6 شلنگ) ہو جایا کرتی تھی۔ پٹنہ سے کلکتہ مال کشتیوں کے ذریعے لے جایا جاتا تھا۔ سو من غلہ (8000 پاؤنڈ) لے جانے کا کرایہ بارہ سے پندرہ روپے تک ہوتا تھا (½ 24 شلنگ سے 30 شلنگ تک) کم فاصلوں پر غلہ بیل گاڑیوں کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا۔ پٹنہ سے گیا کو بارہ سے پندرہ من تک (960 سے 1200 پاؤنڈ تک) غلہ لے جانے کا کرایہ تین روپیہ یا 6 شلنگ ہوتا تھا۔

سو سال پہلے ہندوستان میں جو خاص خاص پیشے اور کاروبار تھے ان کی فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ ذرائع آمدنی کتنے کم ہو گئے ہیں۔ چونکہ لوگوں کے استعمال کا زیادہ تر سوت اور کپڑا لنکا شائر سے آتا ہے۔ اس لیے کتائی اور بنائی قریب قریب ختم ہو گئیں۔ کاغذ کی صنعت کو بھی زوال ہوا ہے۔ چمڑے کا بہتر سامان بنانے کے لیے کھالیں یورپ بھیجی جاتی ہیں۔ مقامی رنگوں کی جگہ کیمیاوی رنگوں نے لے لی ہے۔ بیوپاری اور ان کے مال ڈھونے والے بیل قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب باربرداری کا منافع کشتیوں کے ملاحوں کے بجائے ریلوں کو

---

[1] منٹگری مارٹن، History of Eastern India. (لندن 1838ء) جلد اول، صفحہ 355

ملتا ہے جو بدیسی سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں۔ لوگوں کی صنعتیں اور کاروبار ختم ہو جانے کے بعد
ان کی گذر بسر کا انحصار محض زراعت پر ہے۔

شاہ آباد کا ضلع

(رقبہ 4087 مربع میل۔ آبادی 520 ، 19 ، 14۔)

دھان سب سے زیادہ ہوتا تھا لیکن کچھ زمینداروں نے چونکہ اپنی زمینداریوں میں تالابوں
کی مرمت نہیں کی اس لیے اس کی کاشت میں کمی ہو گئی تھی۔ آدھے ضلع میں دھان کی فصل تھی۔
اگر آبپاشی کا بہتر انتظام ہو جاتا تو شاہ آباد میں بھی اتنی پیداوار ہو سکتی تھی جتنی پٹنہ اور بہار میں
ہوتی تھی۔ لیکن شاہ آباد کا چاول اچھی قسم کا نہیں تھا۔

یومیہ اجرت پانے والے مزدور کو محض فصل کاٹنے کی کم سے کم مزدوری مجموعی پیداوار کا
$3\frac{3}{4}$ فی صدی اور زیادہ سے زیادہ $8\frac{3}{4}$ فی صدی دی جاتی تھی۔ اوسطاً ایک آدمی 190
پاؤنڈ غلہ ایک دن میں نکالتا تھا۔ اگر وہ یومیہ مزدور ہوتا تھا تو اس کو 6 فی صدی سے زیادہ
اور ملازم ہوتا تھا تو $7\frac{1}{2}$ فی صدی سے زیادہ حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ بیج کا غلہ مٹی کے برتنوں میں
رکھا جاتا تھا۔ عام طور سے غلہ رکھنے کے لیے بھوس کی بنی ہوئی رسیوں کی ایک مخروطی شکل
کی ٹوکری بنائی جاتی تھی جو اُن شہد کے چھتوں کے مشابہ ہوتی تھی جو اسکاٹ لینڈ میں عام
طور سے پائے جاتے ہیں۔ ان ٹوکریوں میں 360 ، 29 پاؤنڈ چاول آ جاتا تھا۔ بڑی
ٹوکریاں کھیت میں رکھی جاتی تھیں اور انھیں مٹی سے لیس دیا جاتا تھا چھوٹی ٹوکریاں
جھونپڑوں کے کناروں کے پاس رکھی جاتی تھیں۔

"اس ضلع کی اُن زمینداریوں کے زیادہ تر مالکان جن پر مالگزاری عائد کی جا چکی ہے
شکایت کرتے ہیں کہ (کمپنی کی حکومت کی) مالگزاری کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ انھیں کچھ بھی
منافع نہیں ملتا ہے۔ کچھ حالتوں میں تو مالگزاری زمین کی قیمت سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے ثبوت
میں وہ کہتے ہیں کہ بہت سے زمینداریوں کا نیلام ہوا تو کسی خریدار نے قیمت نہیں لگائی اور
بقایا رقم کی حد تک حکومت نے نقصان اٹھا کر کم قیمت پر زمین فروخت کی۔ وہ یہ بھی کہتے
ہیں کہ مالگزاری اتنی زیادہ ہے کہ مالکوں کو کچھ نہیں بچتا ہے۔ اس لیے مالک اس قابل بھی نہیں رہے
ہیں کہ پانی کے ذخیروں کی مرمت کرا سکیں۔ بہرحال ان کا کہنا ہے کہ ملک کے لیے دن بدن

مالگذاری ادا کرنا مشکل تر ہوتا رہا ہے[1]" سطح مرتفع کو چھوڑ کر شاہ آباد کی 3151 مربع میل قابل زراعت زمین کی مالگزاری 677 و 32 و 11 روپیہ تھی جب کہ پٹنہ اور بہار میں 5051 مربع میل قابل زراعت زمین کی مالگزاری 269 و 12 و 14 روپے تھی۔

شاہ آباد کی اہم قومی صنعتیں کتائی اور بنائی تھیں - 500 و 59 و 1 عورتیں چرخہ کاتا کرتی تھیں اور ہر سال 000 و 50 و 12 روپے کی قیمت کا سوت پیدا کرتی تھیں۔ اس میں سے اگر روئی کی قیمت منہا کردی جائے تو ہر عورت کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ روپیہ یا دو شلنگ ہوتی تھی۔ یہ آمدنی بہت قلیل تھی پھر بھی یہ قلیل آمدنی خاندان کی یافت میں شامل ہو جاتی تھی۔

بنکر صرف سوتی کپڑا بنایا کرتے تھے۔ ریشمی کپڑا بنانے والے شاہ آباد میں خال خال تھے۔ ضلع کے اندر یہ کام کرنے والوں کے 7025 گھروں میں 7950 کرگھے لگے ہوئے تھے۔ ہر کرگھے کی سالانہ آمدنی $20\frac{3}{4}$ روپیہ یا 41 شلنگ 6 پنس ہوتی تھی۔ ہر کرگھے پر ایک مرد، اس کی بیوی اور ایک لڑکا یا لڑکی کام کرتی تھی لیکن 48 روپیہ یا 4 پاؤنڈ 16 شلنگ سالانہ سے کم میں چونکہ ایک خاندان کی گزر بسر نہیں ہو سکتی تھی اس لیے ڈاکٹر بکانن کو شبہ تھا کہ گئی کی آمدنی کم بتائی گئی ہے۔

شاہ آباد میں کاغذ، عطر، تیل، نمک اور شراب بھی بنتی تھی۔ چاول باہر بھیجا جاتا تھا اور باہر سے منگوایا بھی جاتا تھا، جو بنارس بھیجے جاتے تھے اور ارہر کی دال مرشدآباد بھیجی جاتی تھی۔ چھپرا سے تمباکو، مرزاپور سے شکر، رام گڑھ سے لوہا اور پٹنہ سے جست، تانبا، سیسہ اور ٹین منگوایا جاتا تھا اور خام ریشم، کپڑا، نمک اور آرائش کی اشیا مرہٹوں کے علاقے رتن پور بھیجی جاتی تھیں۔

بہار کے مقابلے میں یہاں بازار کم لگتے تھے لیکن زیادہ تر خرید و فروخت ان ہی میں ہوتی تھی۔ بینک، نوٹ کا ابھی تک عام استعمال شروع نہیں ہوا تھا اور" سونا بالکل غائب ہوگیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سونے کے غائب ہونے کے اسباب وہی ہیں جو بہار میں تھے"۔ کمپنی کے بنائے ہوئے تانبے کے سکے جن کے کناروں پر خط پڑے ہوئے تھے صرف آرا کے شہر میں چلتے تھے۔ دیہی علاقے میں گورکھپور کے بنے ہوئے بھدّے تانبے کے سکّے اور مدھوشاہی اور شیر گنجی پیسے

---

[1] منٹگمری History of Eastern India. (لندن 1938ء) جلد اول، صفحہ 541۔

استعمال ہوتے تھے اور تانبے کے سکّوں کے بدلے میں کوڑیاں دینے کا رواج تھا۔

بہار کے مقابلے میں کشتیاں کم تھیں۔ بندھولیا سے بنارس تک، جو 140 میل کے فاصلے پر واقع تھا، سومن (8000 پاؤنڈ) مال کا کرایہ 12 روپے یا 24 شلنگ تھا، ضلع میں سے دو بڑی سڑکیں گزرتی تھیں۔ ایک کلکتے سے بنارس جانے والی فوجی سڑک تھی جس کی دیکھ بھال سرکار کرتی تھی اور دوسری سڑک گنگا کے قدیم کنارے کے ساتھ ساتھ تھی جس کی مرمت کے لیے ضلع کی مالگزاری ادا کرنے والی تمام زمین سے ایک فی صدی ابواب وصول کیا جاتا تھا۔ برسات کے زمانے میں دونوں سڑکیں ناقابل گزر ہو جاتی تھیں۔

بھوج پور کا کائستھ راجہ ہردار سنگھ، ایک مسلمان زمیندار عبدالنصیر، ایک مسلمان خاتون بی بی عصمت، لالہ راج پال اور لالہ کنکا، جو دونوں کائستھ تھے، تمام مسافروں اور فقیروں کو کھانا کھلانے اور ان کی مدد کرنے کے لیے مشہور تھے۔ غریبوں کی مہمان نوازی کا یہ پرانا طریقہ ہندوؤں میں سدابرت یا دائمی خدا پرستی کہلاتا تھا۔

بھاگلپور کا ضلع

(رقبہ 8225 مربع میل۔ آبادی 2019900۔)

یہاں کی خاص پیداوار دھان تھا۔ 60 سیر دھان میں سے $37\frac{1}{2}$ سیر چاول نکلتے تھے۔ دوسری اہم فصل گیہوں کی تھی، جو مٹر کے ساتھ ملا کر بویا جاتا تھا۔ مکا کی کاشت بلندی پر کی جاتی تھی۔ دوسری ایسی فصلیں بھی بوئی جاتی تھیں جن کی متعدد شاخیں پھوٹتی ہیں مثلاً ماروا کھیری، کودوں، چینا، جینرا اور باجرا۔

کپاس کی کاشت 4000 ایکڑ میں کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پہاڑی قبیلوں کی لوگ پہاڑیوں پر اس کی کاشت خاصے بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ گنے کی کاشت زیادہ تر دریاؤں کے کنارے کی جاتی تھی جہاں نہروں کے ذریعے کھیتوں کی سینچائی کی جا سکتی تھی۔ تمباکو کی پیداوار ضلع کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ مجموعی پیداوار کا نصف حصہ کاشت کے اخراجات پورے کر دیتا تھا۔ زمیندار کا لگان بقیہ پیداوار کے آدھے حصے سے کم ہوتا تھا۔[1] چونکہ پیشگی روپیہ دینے کا طریقہ عام نہیں تھا اس لیے لوگوں پر زیادہ قرض

1۔ منٹگمری مارٹن History of Eastern India (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحہ 22

نہیں ہوتا تھا۔ رقم کی صورت میں لگان قسطوں میں وصول کیا جاتا تھا۔ جنس کی صورت میں لگان فصل تیار ہونے کے بعد وصول کیا جاتا تھا۔" فصل کے بٹوارے سے پہلے کئی قسم کے اخراجات منہا کیے جاتے ہیں۔ خاص طور سے فصل کاٹنے کے تمام اخراجات منہا کیے جاتے ہیں۔ ان اخراجات کی منہائی کے بعد کہیں زمیندار کو آدھا حصہ ملتا ہے اور کہیں $\frac{2}{5}$ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں زمیندار کو نہروں کے تمام اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور خاص طور سے آبپاشی کے لیے پانی کے ذخیروں کے اخراجات اسے برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ فصل کاٹنے کے اخراجات کا، جو سب سے بڑے اخراجات ہوتے ہیں، فائدہ کسان کو ملتا ہے[1]۔"

شمالی حصے میں ہل چلانے والے پوری فصل کے لیے رکھے جاتے تھے۔ انھیں 5 روپے سے لے کر 20 روپیہ تک پیشگی دے دیا جاتا تھا اور وہ اپنے مالک کا کام اس وقت تک کرتے تھے جب تک یہ روپیہ ادا نہ ہو جائے۔ جنوبی حصوں میں فصل تقسیم کرنے کا ایک عجیب و غریب طریقہ تھا۔ کھیت کا مالک پہلے تو بیج کی مقدار کے دوگنے کے علاوہ بچنے والے غلے کا دو تہائی مزید وصول لیتا تھا۔ مزدور کو بقیہ ایک تہائی ملتا تھا۔

ہندو کسانوں کے مقابلے میں پہاڑی قبیلوں کے لوگ کاشت کے معاملے میں کم محتاط بھی تھے اور محنتی بھی کم تھے۔ وہ شراب کے زیادہ عادی تھے۔ ان قبیلوں میں شمالی قبیلوں کے لوگ نسبتاً زیادہ محنتی اور زیادہ سنجیدہ تھے حالانکہ ان میں بھی مرد اور عورتیں دونوں اکثر شراب پی کر ہوش و حواس کھو دیا کرتے تھے۔ پہاڑی قبیلوں میں فصل تیار کرنے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ پتھروں کے بیچ کی خالی جگہوں پر دو تین انگل گہرا سوراخ کر کے ملے جلے بیج کے دس بارہ دانے ڈال دیا کرتے تھے اور ماہ بماہ جوں جوں فصل تیار ہوتی جاتی تھی وہ اسے کاٹتے رہتے تھے۔ شمال کے قبیلے کپاس کی کاشت کرتے تھے لیکن جنوب کے قبیلوں میں اس کا رواج نہیں تھا۔

ہر ذات کے لوگ سوت کاتا کرتے تھے۔ 160،000 عورتیں چرخہ چلاتی تھیں اور ان میں سے ہر ایک روئی کی قیمت منہا کرنے کے بعد ساڑھے چار روپے یا 9 شلنگ سالانہ پیدا کیا کرتی تھی۔ یہ رقم خاندانی یافت میں شامل ہو جاتی تھی۔

---

1 منٹگمری مارٹن، History of Eastern India (لندن 1838)، جلد دوم، صفحہ 223

صرف چند بنکر محض ریشمی کپڑا بناتے تھے۔ بھاگلپور کے آس پاس کے زیادہ تر بنکر ٹسری کپڑا بنایا کرتے تھے جس میں سوت اور ریشم ملا کر استعمال کیا جاتا تھا۔ 3275 کرگھوں پر کام ہوتا تھا کمپنی کا تجارتی ریزیڈنٹ اُن کپڑوں کے لیے ہر سال 10،000 روپیہ پیشگی دیا کرتا تھا جو بافتہ اور نمونہ کہلاتے تھے۔ ملے جلے سوت اور ریشم کا کپڑا بنانے والے ہر بنکر کا سالانہ منافع 47 روپے یا 98 شلنگ ہوتا تھا۔ یہ اس کے علاوہ تھا جو ان کی عورتوں کا حصہ ہوا کرتا تھا۔

سوتی کپڑا بنانے کے کرگھوں کی تعداد 7279 تھی۔ ہر کرگھے سے 20 روپیہ یا 40 شلنگ سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ ایک اور حساب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کو کرنے والے میاں اور بیوی 32 روپیہ یا 64 شلنگ سالانہ کمایا کرتے تھے۔ اس ضلع میں دریاں، نواڑ، خیموں کی رسیاں، چھینٹیں اور کمبل بھی بنائے جاتے تھے۔

اس ضلع کی دوسری اہم صنعتوں میں چوڑی بنانا، چمڑا رنگنا، لوہے کا کام، لکڑی کا کام، برتن سازی، پتھر کاٹنا، چاندی اور سونے کا کام اور جست کے برتن بنانے کا کام شامل تھا۔ یوریین باغدار نیل بنایا کرتے تھے اور وہاں بنایا جانے والا شورہ کمپنی خرید لیتی تھی۔

بنگال کے مقابلے میں یہاں کے لوگ پینٹھ میں خرید و فروخت کم کیا کرتے تھے اور براہ راست دوکانداروں اور تاجروں سے سودا کرنے کے عادی تھے۔ سونا قریب قریب بالکل غائب ہو چکا تھا۔ زیادہ تر کلکتہ کا کلدار روپیہ زر عام کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور مختلف قسم کے تانبے کے سکوں کا بہت رواج تھا۔ "ضلع کے جنوب مغربی علاقے میں سکہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور زیادہ تر تجارتی لین دین اشیا کے تبادلے کی صورت میں ہوتا ہے[1]"

اس ضلع میں دریا کے ذریعے سفر کرنے یا مال لانے لے جانے کا رواج کم تھا۔ منگیر سے کلکتہ تک (300 میل) سو من (8،000 پاؤنڈ) مال لے جانے کا کرایہ 10 روپیہ سے

1۔ منٹگمری مارٹن، History of Eastern India، (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحہ 283۔

14 روپے تک یا 20 شلنگ سے 28 شلنگ تک تھا۔ علاقے کی زیادہ تر داخلی تجارت بیل گاڑیوں یا مال ڈھونے والے بیلوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ ضلع میں سے صرف ایک اہم سڑک گزرتی تھی جو کلکتہ سے پٹنہ اور بنارس کو جاتی تھی لیکن برسات میں وہ باربردار بیلوں کے لیے ناقابل گزر ہو جاتی تھی۔ بلدیا بیوپاریوں یا ان بیوپاریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کے پاس مال برداری کے بیل ہوتے تھے۔ مسافر عام طور سے پیدل سفر کیا کرتے تھے اور ایک یا دو پیسہ فی رات دے کر منڈیوں یا حلوائیوں کی دکانوں میں رات گزارا کرتے تھے۔ اس میں کھانا پکانے کی سہولت بھی شامل ہوتی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت اس کے علاوہ دینی ہوتی تھی۔ مسلمان مسافروں سے ٹھہرنے اور کھانے پکانے کا دوگنا معاوضہ لیا جاتا تھا اس لیے کہ ان کا کھانا پکانے کے لیے بھٹیارے کی خدمات حاصل کرنی پڑتی تھیں۔

گورکھپور کا ضلع

(رقبہ 7½ 23 مربع میل۔ آبادی 5 95 4 د 5 8 د 13)

حالانکہ کچھ علاقوں میں دھان کی کاشت کم ہوتی تھی پھر بھی مجموعی اعتبار سے دھان بہت پیدا ہوتا تھا اور اس کی کاشت ان علاقوں میں کی جاتی تھی جہاں آبپاشی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ گیہوں کی فصل بہت اہم سمجھی جاتی تھی اور ضلع کے کچھ حصوں میں دھان سے زیادہ اس کی کاشت ہوتی تھی۔ عام طور سے گیہوں اور جو ملا کر بوئے جاتے تھے کہیں کہیں گیہوں کے ساتھ تلہن بوئی جاتی تھی اور کہیں جو اور مٹر ملا کر بوئے جاتے تھے۔

پھلی والی فصلوں میں ارہر، چنا، ماش، مسور، بھرنگی اور مٹر کی کاشت عام طور سے کی جاتی تھی۔ مختلف نشاستہ دار جڑی بوٹیوں کی کاشت کی جاتی تھی اور تیل نکالنے کے لیے السی، تل اور رائی بوئی جاتی تھی۔ کپاس کی کاشت کم تھی۔ کھجور اور مہوے کی کاشت ہوتی تھی اور ان کا رس نکالا جاتا تھا جس میں شکر کا عنصر پایا جاتا تھا۔ گنے کی کاشت 600د1 ایکڑ میں ہوتی تھی۔ تمباکو اور پان کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ کمپنی کی حکومت نے پوست کی کاشت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔

کھیتوں کی سینچائی دریاؤں، نہروں، تالابوں اور دلدلوں سے کی جاتی تھی۔ رسیوں

میں بندھی ہوئی ایک ڈلیا سے پانی پھینکا جاتا تھا اور دس آدمی تین سے پانچ ہزار مربع فیٹ زمین کی آبپاشی ایک دن میں کر سکتے تھے۔ کچھ کھیتوں کی سینچائی کنوؤں سے ہوتی تھی۔ چمڑے کا بڑا سا تھیلا ہوتا تھا جس کو جانور کھینچتے تھے۔ لگان زیادہ تر رقم کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ حالانکہ کہیں کہیں پیداوار کی تقسیم کا طریقہ بھی رائج تھا۔ جہاں یہ طریقہ رائج تھا وہاں زمیندار کو جوتنے، بونے اور فصل کاٹنے کے اخراجات منہا کرنے کے بعد پیداوار کا چوتھائی حصہ ملتا تھا۔[1]

گورکھپور کا ضلع اُن اضلاع میں سے تھا جو اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے زمانہ حکومت میں پھل پھول رہے تھے۔ آصف الدولہ کے زمانے میں جب ان اضلاع کے لگان کی وصولیابی کا حق کرنل ہینی کو دے دیا گیا تو استحصال، شورشوں اور آبادی اجڑنے کی وجہ سے انھیں بہت دکھ اٹھانے پڑے۔ مارکوئیس آف ویلزلی کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی رو سے یہ علاقہ 1801ء میں کمپنی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ہم یہ واقعات پچھلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ لارڈ ویلزلی نے 1803ء اور 1805ء میں وعدہ کیا تھا کہ مقبوضہ اور مفتوحہ صوبوں میں بندوبست استمراری کیا جائے گا — لیکن یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہو سکا۔ گورکھپور کے متعلق ڈاکٹر بکانن کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں جو مقبوضہ اضلاع میں سے تھا اور جہاں قبضہ ہونے کے دس سال بعد وہ گیا تھا۔

"کہا جاتا ہے کہ شجاع الدولہ کے زمانۂ حکومت میں ضلع کی حالت اس کی موجودہ حالت سے بہت بہتر تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب لگان وصول کرنے کا ٹھیکہ کرنل ہینی کو دیا گیا تو اس ذات شریف نے وصولیابی میں اتنی سختی برتی کہ علاقہ اجڑ گیا۔ میں نے خود ان علاقوں میں کاشت کے نشانات دیکھے ہیں جو اب بنجر ہیں اور جنگل میں تبدیل ہو گئے ہیں...."

"جب یہ علاقہ انگریزوں کے حوالے کیا گیا تو اس کا انتظام میجر رڈلج (Major Rudlidge) کے سپرد کیا گیا تھا جس نے بڑی محنت اور سمجھداری سے کام کیا۔ ہمارے نظم ونسق کی طاقت نے اسے اختیار دیا اور اس نے فوراً ہر گڑھی کو مسمار کر دیا اور اس طرح

---

[1] منٹگمری مارٹن History of Eastern India (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحہ 537۔

قانون کا مکمل تسلط بٹھا دیا جس نے نچلے طبقوں کا ایسا تحفظ کیا جس کی مثال نہیں ملتی اور ہر طرف سے لوگوں کو لا کر وہاں آباد کر دیا۔ پہلے اس کے مطالبے اعتدال پر مبنی تھے لیکن اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے بہت کم مدّت کے لیے بندوبست کیا.....

حالات کی روشنی میں مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس ضلع کے مالکان آراضی کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کیا گیا ہے۔ گھاگرا کے دائیں کنارے کے علاقے کی طرح جہاں جہاں پوری طرح تسلط ہو چکا ہے وہاں کے لیے میں سفارش کروں گا کہ بنگال، بہار اور بنارس کی طرز کا دائمی بندوبست کر دیا جائے۔"[1]

وہی پرانی کہانی دہرائی گئی ہے۔ جو علاقہ کمپنی کے قبضے میں آیا۔ وہاں ہنگاموں کے بجائے امن قائم ہو گیا اور بدنظمی کے بجائے قانون کا دور دورہ ہو گیا۔ لیکن زمین پر بھاری مالگزاری عائد کر دی گئی جس میں اضافہ ہوتا رہا۔ شمالی ہند میں کئی دہوں تک حملہ آوروں اور غارتگروں کی وقتی دست درازیوں سے زیادہ محصول وصول کرنے والوں کی دست درازیوں کو محسوس کیا گیا۔

ایک لاکھ پچہتر ہزار چھ سو عورتیں چرخہ کاتتی تھیں اور ان کی سالانہ آمدنی ڈھائی روپیہ یا پانچ شلنگ تھی۔ 5434 بنکروں کے خاندان تھے جن کے پاس 6114 کرگھے تھے اور ہر کرگھے کی سالانہ آمدنی 23 روپے آٹھ آنے یا 47 شلنگ تھی۔ ڈاکٹر بکانن کا خیال تھا کہ یہ اندازہ کم ہے اور اسے یقین تھا کہ ہر کرگھے کی سالانہ آمدنی 36 روپے یا 72 شلنگ تھی۔ چھینٹ نواب گنج میں بنائی جاتی تھی اور مقامی استعمال کے لیے کمبل تیار کیے جاتے تھے۔

بڑھئی لوہے کا کام کرتے تھے یا دروازے، کھڑکیاں، گاڑیاں، زراعت کے اوزار، پالکیاں، صندوق اور کبھی کبھی کشتیاں بنایا کرتے تھے۔ ہر سال 200 سے 400 تک کشتیاں بنائی جاتی تھیں۔ ٹھٹھیرے بھرت کے برتن بنایا کرتے تھے۔ چھ آدمی تین مہینے میں 240 روپے کی قیمت کے برتن بنایا کرتے تھے جس میں سے انھیں 56 روپیہ منافع بچتا تھا۔ اس کے

---

[1] منٹگمری مارٹن History of Eastern India (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحات 547 اور 549

معنی تھے کہ ان میں ہر شخص 3 روپیہ یا 6 شلنگ ماہوار کمایا کرتا تھا۔ پیتل کے بہت سے زیور بھی بنائے جاتے تھے۔ ضلع میں شکر سازی اور نمک سازی بھی کی جاتی تھی۔

غلہ اس وقت اودھ کے نواب کی حکومت والے علاقوں سے درآمد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نیپال کے میدانی علاقوں سے بھی غلہ منگایا جاتا تھا۔ تسکر اور تمبا کو ضلع سارن اور دوسرے مقاموں سے درآمد کی جاتی تھی۔ ہاتھی اور تانبے کے برتن نیپال سے آتے تھے اور پیتل اور بھرت کا سامان پٹنہ سے آتا تھا۔ باربرداری کا کام یا تو باربرداری کرنے والے تاجر کرتے تھے یا وہ تاجر کرتے تھے جن کے پاس مال بردار بیل ہوتے تھے یا وہ کسان کرتے تھے جن کے پاس بیل گاڑیاں ہوتی تھیں۔ کپڑے کے تاجر کپڑا درآمد کیا کرتے تھے، بنجارا تاجر نمک لایا کرتے تھے اور نونیا تاجر اس کو فروخت کیا کرتے تھے۔ بنیا غلے کی خردہ فروشی کرتا تھا، روئی کا تاجر روئی درآمد کرتا تھا اور مہاجن کسانوں کو لگان ادا کرنے کے لیے اور زمینداروں کو زمین کا محصول حکومت کو ادا کرنے کے لیے قرض دیتا تھا۔

شاہ آباد، لکھنؤ اور بنارس کی طرح ہر ہفتے پینٹھ لگتا تھا۔ روپے کا استعمال عام تھا اور کلکتے کا روپیہ خال خال نظر آتا تھا۔ تانبے کی مقامی سکہ سازی بند ہو چکی تھی۔ عام طور سے نیپال کے تانبے کے سکے استعمال ہوتے تھے اور کوڑیوں کا بھی رواج تھا۔

گورکھپور کے ایک مذہبی بزرگ نے اپنے شہر کے لوگوں کے استعمال کے لیے کچھ بہت اچھے پل بنائے تھے۔ گورکھپور میں چار سدابرت تھے، جن میں سے دو بھیوا پور میں تھے، ایک لال گنج میں اور ایک منگا ہار میں تھا۔

دیناج پور کا ضلع

(رقبہ 5374 مربع میل۔ آبادی 30,00,000)

دیناج پور کے ضلع کی سب سے اہم پیداوار دھان تھا۔ کچھ کھیتوں میں دھان کی دو فصلیں ہوتی تھیں۔ ایک گرمیوں کے آخر میں کاٹی جاتی تھی اور دوسری سردیوں میں۔ تیسرے قسم کا دھان جس کو بورو کہتے تھے کم مقدار میں بویا جاتا تھا اور موسم بہار میں کاٹا جاتا تھا۔

اس اونچی زمین کو کھاد دی جاتی تھی جہاں دھان کی گرمی کی فصل بوئی جاتی تھی۔ اور وہاں سرسوں کی طرح کی سردی کی فصل بھی بوئی جاتی تھی۔ نچلے علاقوں کو جہاں سردی

کی فصل ہوتی تھی کھاد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں صرف ایک فصل ہوتی تھی۔ عورتیں چھ فیٹ لمبے لکڑی کے موسل سے دھان صاف کرتی تھیں جس کو دھنکی کہتے تھے اور 40 سیر دھان سے 28 سیر صاف چاول حاصل کیا جاتا تھا۔

دیناج پور میں گیہوں اور جو کی کاشت کم ہوتی تھی اور خراب زمین میں ماروا پیدا ہوتا تھا۔ پھلی دار پودوں میں کلائی، کیسری اور مسور کا رواج زیادہ تھا اور سب سے زیادہ بوئی جانے والی دال مٹر تھی۔ تیل نکالنے کے لیے سرسوں، رائی اور السی کی کاشت کی جاتی تھی۔

تقریباً 37,000 ایکڑ میں آم، کٹھل اور املی کے باغ تھے اور 83,000 ایکڑ میں کھانے کے لیے ترکاریاں پیدا کی جاتی تھیں۔ 13,000 ایکڑ میں پٹ سن 8,000 ایکڑ میں کپاس، 5,000 ایکڑ میں نیلے پھول والا سن اور 18,000 ایکڑ میں گنّے کی کاشت ہوتی تھی۔ تمباکو 500 ایکڑ میں پیدا ہوتی تھی اور پان 200 ایکڑ میں۔

نیل اور سورج مکھی کی کاشت رنگ کے لیے کی جاتی تھی۔ نیل کی کاشت 5,000 ایکڑ میں ہوتی تھی۔ جو طریقہ ڈاکٹر بکانن نے وہاں پایا وہ وہی تھا جو آج بھی بنگال کے کچھ حصوں میں پایا جاتا ہے۔ یورپین باغدار ہر کسان کو مجبور کیا کرتے تھے کہ وہ اپنی زمین کے ایک حصے میں نیل کی کاشت کرے۔

تیرا سو ایکڑ گوہانی زمین پر جو جہانند دریا کے ایک میل کے اندر آم، برگد اور پیپل کے باغوں کے درمیان واقع تھی ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے شہتوت کے باغ تھے۔ زیادہ تر ابریشم کے کویوں کے لیے کمپنی کا تجارتی ریزیڈنٹ روپیہ پیشگی دے دیا کرتا تھا۔

کھیتوں کی سینچائی کا طریقہ عام تھا پھر بھی وہ اتنا عام نہیں تھا جتنا اس کو ہونا چاہیے تھا۔ ضلع میں مصنوعی جھیلوں کی تعداد بہت تھی۔ اُن میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جن میں چشمے تھے جس کی وجہ سے ان میں کافی پانی رہا کرتا تھا۔ جب بارش نہیں ہوتی تھی تو ان جھیلوں کا سہارا لیا جاتا تھا۔

ضلع میں 4,80,000 ہل تھے جس کے معنی تھے کہ 9,60,000 ہل کے بیل اور گائیں تھیں۔ ان کے علاوہ افزائش نسل کے لیے جو گائیں رکھی جاتی تھیں ان کی تعداد 3,36,000 تھی۔ چراگاہ کے لیے 261 مربع میل غرقہ کی زمین تھی جس میں خشک موسم میں

گھٹیا قسم کی گھاس اُگ آتی تھی، 221 مربع میل جنگل تھا، تقریباً 300 مربع میل ویر تھا اور 575 مربع میل ایسی زمین تھی جس میں کبھی کبھی کاشت ہوا کرتی تھی اور جس کا ⅘ حصہ ہمیشہ غیر مزروعہ رہا کرتا تھا۔ چراگاہوں کے لیے لگان کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا نہ ان کھیتوں میں جانور چرانے سے کوئی مانع آتا تھا جس میں فصل نہیں بوئی جاتی تھی۔[1]

55 ایکڑ کی کاشت بڑی کاشت سمجھی جاتی تھی، 15 سے 20 ایکڑ تک کی کاشت اچھی کاشت سمجھی جاتی تھی لیکن چھوٹے کسانوں کے پاس، جو اپنے خاندانوں سمیت آبادی کا بڑا حصہ تھے، 5 سے 15 ایکڑ تک کاشت ہوتی تھی۔ کاشت کے اخراجات پیداوار کے آدھے سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور لگان پیداوار کے ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ لگان ہمیشہ رقم کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔[2] ضلع کے اکثر حصوں میں کسانوں کے ساتھ دائمی پٹے کیے جاتے تھے اور کہیں کہیں "اگر کسان ایک کھیت پر دس سال تک قابض رہا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اُسے کھیت پر حسب معمول شرح لگان کی بنا پر دائمی قبضے کا حق حاصل ہو گیا۔"

سوت کاتنے میں، جو ضلع کی خاص صنعت تھی "اونچے طبقے کی عورتوں کا فرصت کا وقت اور کسانوں کی عورتوں کا زیادہ تر وقت صرف ہوا کرتا تھا۔ ہر عورت سہ پہر میں چرخہ کات کر 3 روپیہ یا 6 شلنگ سالانہ عام طور سے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ ضلع میں چرخہ کاتنے والیاں جو روئی خریدتی تھیں اس کی مجموعی قیمت 000ء50ء2 روپیہ ہوتی تھی، بنائے جانے والے سوت کی قیمت 000ء65ء11 روپیہ ہوتی تھی اس لیے عورتوں کی مجموعی آمدنی 000ء15ء9 روپیہ یا تقریباً 000ء00ء1 پاؤنڈ ہوئی۔

مالدے میں بنائے جانے والا مالدائی کپڑے کا تانا ریشم کا ہوتا تھا اور بانا سوت کا۔ اس کپڑے کو بنانے میں بیس ہزار کرگھے مصروف رہا کرتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ہر کرگھا ایک

---

[1] منٹگمری مارٹن، *History of Eastern India.* (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحہ 889۔

[2] منٹگمری مارٹن، *History of Eastern India.* (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحات 907 - 908۔

مہینے میں بیس روپے کی مالیت کا کپڑا بنالیتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر بکانن کا خیال تھا کہ یہ تخمینہ بہت زیادہ ہے۔ تقریباً 800 کرگھے الائچی کی طرح کے بڑے تھان بنایا کرتے تھے اور کمپنی کے ایجنٹ انھیں پیشگی روپیہ دیا کرتے تھے۔

ایسے کپڑے جن کے بنانے میں صرف ریشم استعمال ہوتا تھا مالدا کے آس پاس بنائے جاتے تھے اور بنکروں کے تقریباً 500 خاندان اس کو بناتے تھے اور بنائے جانے والے کپڑے کی مجموعی قیمت 20,000 1 روپیہ یا 12,000 پاؤنڈ ہوتی تھی۔

سوتی کپڑے کی صنعت زیادہ اہم تھی۔ ضلع میں تیار ہونے والے سوتی کپڑے کی قیمت 16,74,000 روپیہ یا 1,67,400 پاؤنڈ ہوتی تھی۔

نچی ذات کے ہندو — کوچ، پولیا اور راج بنسی — اپنے استعمال کے لیے پٹ سن کے کپڑے بنایا کرتے تھے۔ زیادہ تر گھروں میں کرگھے تھے اور زیادہ تر عورتیں سہ پہر میں یہ کام کیا کرتی تھیں۔

مالدا کی مسلمان عورتیں کپڑوں پر کڑھائی کے کام میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ کڑھائی میں یا تو کشیدہ کاری کا کام ہوا کرتا تھا جس میں زنجیرہ یا بیل بنائی جاتی تھی یا چکن کا کام ہوتا تھا جس میں پھول ڈالے جاتے تھے۔ کچھ مسلمان عورتیں پاجاموں کے لیے ریشمی کمربند یا ہار اور بازوبند پرونے کی ڈوریاں بنایا کرتی تھیں۔

کپڑا بنانے کی صنعت سے منسلک رنگنے کی اہم صنعت بھی تھی۔ رنگنے کے لیے نیل، لاکھ، کسم، ہلدی، موسکی، ہوری ٹوکی، موجیتا اور مختلف قسم کے پھول استعمال کیے جاتے تھے۔ دوسری اہم صنعتوں میں فن تعمیر، برتن بنانا، سن کے فرش بنانا، ہاتھوں کا زیور بنانا، چمڑے کا کام، لکڑی کا کام، راج گیری، تانبا، ٹین اور لوہے کا کام، تسکر سازی اور نیل سازی شامل تھی۔ نیل کی صنعت کی بنا پر باغداروں کے خلاف شکایتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر بکانن نے نیل کی صنعت کی غیر ہر دلعزیزی کے اسباب آٹھ عنوانات کے تحت بیان کیے ہیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ باغدار نیل پیدا کرنے والوں کو "اپنا غلام سمجھتے ہیں اور جب ان کے کام سے غیر مطمئن ہوتے ہیں تو انھیں زد وکوب کرتے ہیں اور حبس بے جا کے مرتکب ہوتے ہیں۔" دوسری بات یہ تھی کہ نیل پیدا کرنے والوں کو "زمین کی پیمائش اور ترائی میں دھوکہ دیا جاتا ہے۔" تیسری بات یہ تھی کہ کھیت کی مجموعی پیداوار لگان سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

چوتھی بات یہ تھی کہ باغدار "توہین آمیز برتاؤ کرتے ہیں اور تشدد سے کام لیتے ہیں"۔ پانچویں بات یہ تھی کہ وہ لگان کی وصولیابی میں مزاحم ہوتے تھے۔ چھٹی بات یہ تھی کہ وہ حاکم قوم سے تعلق رکھتے ہیں"۔ "ساتویں بات یہ تھی کہ وہ زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ میں حارج ہوتے تھے اور آٹھویں بات یہ تھی کہ کسانوں کو کاشتکاری کے کام سے باز رکھتے تھے۔

ڈاکٹر بکانن کا خیال تھا کہ یہ شکایتیں مبالغہ آمیز سہی پھر بھی بے بنیاد نہیں ہیں۔ اس کا مزید خیال تھا کہ "نئے لائسنس اگر نہ دیے جائیں اور ان یورپینوں پر جو کمپنی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں یہ پابندی لگادی جائے کہ وہ صرف خاص خاص شہروں اور بندرگاہوں میں بودوباش اختیار کرسکتے ہیں تو اس سے بے انتہا فائدہ ہوگا۔"[1] اس بڑھتی ہوئی خرابی کا سدباب کرنے کے لیے کمپنی نے جو اقدام کیا اس کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔

ضلع کی تجارت کا بڑا حصہ مقامی لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر کمپنی کے ہاتھ میں آگیا تھا ضلع میں کوئی سوداگر یا مقامی بڑا تاجر باقی نہیں رہا تھا "صرف ایک خاندان نے کاروبار کے ذریعے بڑی دولت پیدا کی ہے۔ بیدیاناتھ منڈل کے باپ دادا نوپیڑی سے بڑے پیمانے پر اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تجارت کرتے رہے ہیں جس کی وجہ سے انھیں بڑی شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ خاندان کے موجودہ سربراہ نے تجارت ترک کردی ہے، بہت سی زمین خریدلی ہے اور لوگ جس قدر اس کے باپ دادا کی عزت کرتے تھے اسی قدر اس کی مذمت کرتے ہیں"۔[2]

ضلع کے چھوٹے تاجر جو مہاجن کہلاتے تھے، 2,000 روپیہ سے 25,000 روپے تک کے سرمائے سے چاول، شکر، شیرا، تیل اور تمباکو برآمد کیا کرتے تھے اور نمک، روئی دھاتیں اور گرم مصالحہ درآمد کیا کرتے تھے۔ ضلع میں معینہ دوکانوں کی تعداد 2,000 بھی نہیں تھی لیکن کشادہ جگہوں میں لگنے والے بازار بہت تھے۔ بہت چھوٹے تاجر بیکار

---

[1] منٹگمری مارٹن، History of Eastern India. (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحہ 996۔

[2] منٹگمری مارٹن، History of Eastern India. (لندن 1838ء) جلد دوم، صفحہ 1001۔

کہلاتے تھے۔ سونا بہت کمیاب تھا، کلکتے کے کلدار روپے کو کرنسی کی حیثیت حاصل تھی اور کوڑیوں کا استعمال عام تھا۔

برسات میں کشتیاں زیادہ تر گاؤوں تک جا سکتی تھیں۔ مگر اُس زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے تجارتی مال کم ہوا کرتا تھا۔ خشک موسم میں مال جانوروں پر لاد کر لے جایا جاتا تھا۔ بار برداری کے لیے "سڑکیں نہ ہونے کے برابر" تھیں۔ کشتی کے ذریعے سو من مال کلکتہ لے جانے کا کرایہ 13 روپے یا 26 شلنگ ہوتا تھا۔ بیل گاڑیوں سے بارہ میل سامان لے جانے کا کرایہ آٹھ آنے سے کم ہوتا تھا۔

پورنیا کا ضلع

(رقبہ- 6340 - مربع میل - آبادی 380ر04ر29)

ضلع کی خاص پیداوار موسم بہار میں پیدا ہونے والے دھان، گرمی میں پیدا ہونے والے دھان اور سردی میں پیدا ہونے والے دھان تھے۔ ستر سیر دھان کو اگر ابالے بغیر صاف کیا جاتا تھا تو ۵۰ سیر چاول نکلتے تھے۔ جب ابال کر دھان صاف کیے جاتے تھے تو 65 سیر دھان سے ۵۰ سیر چاول نکلتے تھے۔ عورتیں دھان صاف کرنے کے لیے دھنکی یا لکڑی کا موسل استعمال کرتی تھیں۔

پھلی دار پودوں میں ماش کلائی، کیسری، ارہر، بھٹ، مکئی اور مونگ کا استعمال زیادہ تھا۔ تیل نکالنے کے لیے سرسوں اور رائی، السی اور ارنڈی کے پودوں کی کاشت کی جاتی تھی۔ اٹھائیس ہزار ایکڑ میں ترکاریاں پیدا کی جاتی تھیں۔

پٹ سن کی کاشت اس کے ریشوں کے لیے کی جاتی تھی۔ کپاس کی کاشت محدود پیمانے پر ہوتی تھی۔ گنے کی کاشت زیادہ تر کانکائی ندی کے کنارے ہوتی تھی۔ تمباکو کی آدھی کاشت ضلع کے صدر مقام کے نواح میں ہوتی تھی۔ پان اہم سمجھا جاتا تھا لیکن دیناج پور کے مقابلے میں اس کا استعمال کم تھا۔ ضلع کے جنوب مشرقی حصے میں نیل کی سترہ کوٹھیاں تھیں جن کا منتظم مسٹر ایلرٹن (Mr Ellerton) تھا۔ ان کے علاوہ ضلع کے مختلف حصوں میں پچاس کے قریب نیل کی کوٹھیاں اور تھیں۔ دوسرے مشرقی اضلاع کے مقابلے میں کسم کو کسی قدر زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ریشم کے کیڑوں کے لیے شہتوت کی کاشت صرف ضلع کے

جنوب مشرقی کونے میں ہوا کرتی تھی۔

ضلع کی چراگاہیں 234 مربع میل غیر مزروعہ اونچائی والی زمین، 482 مربع میل ایسی زمین جس پر کاشت نہیں ہوتی تھی اور 186 مربع میل ٹوٹے پھوٹے ٹکروں اور سڑکوں پر مشتمل تھیں۔ اس کے علاوہ 389 مربع میل ایسی نیچی زمین تھی جس پر جھاڑیاں اور تپا اور ہوا کرتی تھی۔ دسمبر اور جنوری میں جب دھان کی سردی کی فصل کٹ جاتی تھی تو ان کے ٹھنٹھ جانوروں کے کام آتے تھے۔ اس کے باوجود ضلع کے جانوروں کے لیے یہ چراگاہیں ناکافی ثابت ہوتیں اگر مورانگ کے جنگل نہ ہوتے جو حکومت نیپال کی ملکیت تھے۔ پانچ چھ سو جانوروں کے گلّے کا مالک اس جنگل میں جانور چرانے کی فیس کے طور پر گورکھا افسر کو ایک بچھڑا دیا کرتا تھا۔" اس ضلع کے کچھ حصوں میں زمیندار، جو یوں تو کٹر ہندو ہیں، اتنے سمجھدار ہیں کہ چراگاہ کا محصول وصول کرتے ہیں۔"

لگانوں کا انحصار مختلف حالات پر ہوا کرتا تھا لیکن " (پیداوار کا) آدھا حصہ کاشت کے مناسب اخراجات کے لیے دیا جاتا ہے اور بقیہ کا آدھا حصہ کسان کی گزربسر کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زمیندار کا مناسب مطالبہ کتنا ہوتا ہوگا۔ غالباً اس کو جو وصول ہوتا ہے مطالبہ اس سے زیادہ کا کیا جاتا ہوگا۔"[1]

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر بکانن کا خیال تھا کہ پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ مناسب لگان ہے لیکن جس وقت کمپنی کی حکومت مدراس کے کسانوں سے پیداوار کا نصف حصہ زمین کے محصول کے طور پر وصول کر رہی تھی اس وقت پورنیا اور بنگال کے دوسرے حصوں کے زمیندار اُس سے بہت کم لگان لے رہے تھے۔

کسی ذات کے لیے کتائی باعث توہین نہیں سمجھی جاتی تھی اور ضلع کی زیادہ تر عورتیں فرصت کے اوقات میں چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ ان کے منافع کا اندازہ لگانا ڈاکٹر بکانن کے لیے آسان نہیں تھا پھر بھی اُس کا قیاس تھا کہ وہ ایک سال میں 3,000,000 روپے کی روئی استعمال کرتی ہیں، جو سوت وہ کاتتی ہیں اُس کی قیمت 13,00,000 روپیہ ہوتی ہے اور

---

[1] منٹگمری مارٹن 'History of Eastern India' (لندن 1838ء)، جلد سوم، صفحہ 490۔

اس طرح انھیں 15,00,000 روپیہ یا 1,50,000 پاؤنڈ منافع ہوتا ہے۔

دوسو کرگھوں پر خالص ریشم کے کپڑے بنے جاتے تھے جن کی قیمت 48,600 روپے ہوتی تھی۔ ان پر 34,200 روپے کا ریشم صرف ہوتا تھا اور 14,400 روپے کا منافع ہوتا تھا۔ اس حساب سے ایک کرگھے کی سالانہ آمدنی 72 روپے یا 144 شلنگ ہوتی تھی۔

ریشم اور سوت ملا کر کپڑے بننے والوں کا قریب قریب وہی حال تھا جو دیناج پور کے بنکروں کا تھا۔

سوتی کپڑا بننے والوں کی تعداد بہت تھی اور وہ لوگ زیادہ تر ملک میں استعمال ہونے والا موٹا جھوٹا کپڑا تیار کیا کرتے تھے۔ نفیس کپڑا بنانے کا کام ساڑھے تین ہزار کرگھوں پر کیا جاتا تھا اور 5,60,000 روپے کا مال تیار کیا جاتا تھا جس میں 1,49,000 روپے کا خالص منافع یا 85 شلنگ فی کرگھہ سالانہ منافع ہوتا تھا۔ دس ہزار کرگھوں پر موٹا جھوٹا کپڑا تیار کیا جاتا تھا جس کی قیمت 10,89,500 روپے ہوتی تھی اور 2,24,000 روپے کا خالص منافع یا تقریباً 45 شلنگ فی کرگھہ کا سالانہ منافع ہوتا تھا۔

شطرنجی اور نواڑ بنانے والے بنکر صدر مقام میں رہتے تھے۔ سنئی کا بنا ہوا موٹا کپڑا بھاری مقدار میں تیار کیا جاتا تھا اور مشرقی سرحد کی زیادہ تر عورتیں اس کپڑے کا لباس بناتی تھیں۔ کمبل اور دوسرے اونی کپڑے بہت ادنیٰ قسم کے ہوتے تھے لیکن سردیوں میں اور برسات میں غریبوں کے بہت کام آتے تھے۔

پورنیا کے دوسرے دستکار طبقوں میں سنار، بڑھئی، بدری اور دوسری دھاتوں کا کام کرنے والے، کمہار اور رنگ ریز شامل تھے۔ تسکر کی صنعت بہت کم تھی۔ پانچ سو خاندان نمک سازی کیا کرتے تھے۔

روئی مغربی ہندوستان سے اور شکر دیناج پور اور پٹنہ سے منگائی جاتی تھی۔ پورنیا میں صرافوں کے سات گھرانے تھے اور وہ اس روپے کی ہنڈیاں دیا کرتے تھے جو انھیں ادا کیا جاتا تھا اور دوسرے خاندانوں کی دی ہوئی ہنڈیاں سکارتے تھے۔ "وہ اگر چاندی اور سونے کا تبادلہ بڑے پیمانے پر کرنا ہے تو وہ صرف ان کوٹھی والوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جگت سیٹھ کا گھرانا 1,00,000 روپے کی ہنڈی فوراً بنا دے گا۔ دوسرے اس کی آدھی رقم سے تجاوز نہیں کریں گے۔" پرانے روپے جن کے کناروں پر خط نہیں ہوتے تھے

عام طور سے ویسے ہی استعمال ہوتے تھے جیسے کلکتے کے خط والے (کلدار) روپے۔" ایک اتنے زیادہ غریب ملک میں سونے کا سکہ غریب طبقوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوا کرتا ہے اور میری حقیر رائے میں اس کو ممنوع قرار دے دینا چاہیے۔ اس ملک میں تو ایک روپیہ بھی بڑی رقم ہے ...... خوش قسمتی سے سونا قریب قریب غائب ہو چکا ہے اور اس کو قانونی طور سے ناقابل ادائیگی قرار دے کر دوبارہ نمودار ہونے سے روک دینا چاہیے۔ ضلع کے زیادہ تر حصوں میں کرنسی چاندی اور کوڑیوں پر مشتمل ہے۔ مغربی حصوں کی طرف کچھ تانبے کے سکے ملتے ہیں جن کو پیسہ کہتے ہیں اور جو 1/64 روپے کے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے ملک کے چھوٹے سے زر کے لیے وہ بھی بہت بڑے سکے ہیں جہاں دو پیسے ایک مرد ملازم کی روزانہ اجرت کے برابر ہوتے ہیں جس میں وہ آسانی سے گزر بسر کر سکتا ہے[1]۔"

ضلع میں پانی کے ذریعے نقل و حمل کا اچھا انتظام تھا اور وہاں دیناج پور کے مقابلے میں زیادہ کشتیاں تھیں۔ پورنیا کے ضلع سے کلکتہ تک سو من (8,000 پاؤنڈ) اناج لے جانے کا کرایہ 14 روپے یا 28 شلنگ تھا۔ صدر مقام کے پاس کچھ سڑکیں اور کچھ نیل کی کوٹھیاں تعمیر ہو گئی تھیں۔ سامان ڈھونے کے لیے بیلوں کے ساتھ ٹٹو بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ مسافروں کو ٹھہرایا کرتے تھے اور منڈیوں یا حلوائیوں کی دوکانیں سرائے کا کام دیتی تھیں جہاں وہ ٹھہر سکتے تھے اور کھانا کھا سکتے تھے۔

خلاصہ

دو بقیہ ضلعوں یعنی رنگ پور اور آسام کے متعلق ڈاکٹر بکانن کی کتاب میں نامکمل بیانات دیے گئے ہیں اور ان میں زراعت اور لگان، صنعتوں اور کاروبار کی تفصیلات درج نہیں ہیں۔ اس لیے موجودہ باب میں ان اضلاع کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔

جن چھ اضلاع کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے اُن کا رقبہ اس زمانے میں موجودہ رقبے سے بہت زیادہ تھا۔ ان کا مجموعی رقبہ 36,000 مربع میل تھا اور مجموعی آبادی ایک کروڑ

---

[1] منٹگمری مارٹن، History of Eastern India (لندن 1838ء) جلد دوم صفحات 340-342

چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ ان وسیع اور کثیر آبادی رکھنے والے اضلاع کے بیان کی بنا پر
بنگال اور شمالی ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام تر مقبوضات کے متعلق ایک رائے قائم
کی جا سکتی ہے۔ لوگ اس وقت بھی بہت زیادہ غریب تھے پھر بھی وارن ہسٹنگز کے زمانے
کے مقابلے میں زراعت ترقی کر چکی تھی اور سنہ 1793ء کے بندوبست استمراری کے بعد بہت سی
غیر مزروعہ زمین زیر کاشت آ چکی تھی۔

حالانکہ زمیندار چاہتے تو یہ تھے کہ زیادہ سے زیادہ لگان وصول کریں لیکن وہ اتنا لگان
کبھی نہیں وصول کر سکے جتنا کمپنی کے ملازمین مدراس میں وصول کیا کرتے تھے اور اس کی بنا پر
ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کسی نہ کسی حد تک لوگوں کا تحفظ کیا اور کچھ حالتوں میں انھوں نے
فصل کاٹنے کے اخراجات کی منہائی کے بعد خالص پیداوار کے نصف کا مطالبہ کیا لیکن
وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انھیں آبپاشی کے ذرائع کی تعمیر و مرمت کے اخراجات برداشت
کرنے چاہئیں لیکن بنگال میں عام طور سے پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ انھیں بطور لگان
ملتا تھا۔ چونکہ حکومت کی مالگزاری ہمیشہ کے لیے معین ہو چکی تھی اور اکثر مقامات پر رواج
کے مطابق لگان بھی معین ہو چکا تھا اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ زمین کو ترقی دینے اور
غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لانے کے لیے محرکات موجود تھے۔

لیکن لوگوں کے ذرائع آمدنی کو جو خطرہ لاحق تھا وہ صنعت و حرفت کا زوال تھا۔
ڈاکٹر بکانن جہاں جہاں گیا وہاں کے لوگ دشواریوں کو محسوس کرنے لگے تھے۔ کچھ مدت
بعد ان دشواریوں میں اضافہ ہو گیا۔ اب ہم لوگوں کی صنعتوں کا حال بیان کریں گے۔

باب 14

صنعتوں کا زوال (1793ء ــــ 1813ء)

پچھلے دو ابواب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک لوگوں کی ایک بڑی تعداد مختلف قسم کے پیداآور کام کیا کرتی تھی۔ لاکھوں عورتیں کتائی کی اجرت سے اپنے خاندانوں کی آمدنیوں میں اضافہ کیا کرتی تھیں۔ لاکھوں انسان رنگ ریزی، چمڑہ رنگنے کا کام اور دھاتوں کا کام کیا کرتے تھے۔

لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ پالیسی نہیں تھی کہ ہندوستانی صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ پچھلے ایک باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ 1769ء میں ڈائریکٹروں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ بنگال میں خام ریشم کی صنعت کو فروغ دیا جائے اور ریشمی کپڑے بنانے کی صنعت کی ہمت شکنی کی جائے۔ انھوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ریشم کاتنے والوں کو کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور انھیں "حکومت کے اختیارات استعمال کرکے اور سخت سزائیں دے کر[1] دوسروں کے لیے کام کرنے سے باز رکھا جائے۔ ان احکامات کا خاطر خواہ اثر ہوا ہندوستان میں ریشمی اور سوتی کپڑے کی صنعتوں کا زوال ہونے لگا اور وہ لوگ جو پچھلی صدیوں میں یورپ اور ایشیا کی منڈیوں کو مال مہیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مقدار میں مال باہر سے منگوانے لگے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس سوتی[2] کپڑے کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو انگلستان سے بیس سال میں صرف ان بندرگاہوں کو بھیجا گیا تھا جو راس امید کے مشرق میں واقع تھے۔ یہ مال زیادہ تر ہندوستان آیا۔

---

[1] عام مراسلہ مورخہ 17 مارچ 1769ء۔

[2] ہاؤس آف کامنز کی مناسب کارروائی کرنے کی ہدایت کا جواب مورخہ 4 مئی 1813ء۔

سال مختتمہ 5 جنوری

سنہ	رقم	سنہ	رقم
سنہ 1794ء	156 پاؤنڈ	سنہ 1804ء	5,936 پاؤنڈ
سنہ 1795ء	717 پاؤنڈ	سنہ 1805ء	31,943 پاؤنڈ
سنہ 1796ء	112 پاؤنڈ	سنہ 1806ء	48,525 پاؤنڈ
سنہ 1797ء	2,501 پاؤنڈ	سنہ 1807ء	46,549 پاؤنڈ
سنہ 1798ء	4,436 پاؤنڈ	سنہ 1808ء	69,841 پاؤنڈ
سنہ 1799ء	7,317 پاؤنڈ	سنہ 1809ء	1,18,404 پاؤنڈ
سنہ 1800ء	19,575 پاؤنڈ	سنہ 1810ء	74,695 پاؤنڈ
سنہ 1801ء	21,200 پاؤنڈ	سنہ 1811ء	1,14,649 پاؤنڈ
سنہ 1802ء	16,191 پاؤنڈ	سنہ 1812ء	1,07,306 پاؤنڈ
سنہ 1803ء	27,876 پاؤنڈ	سنہ 1813ء	1,08,824 پاؤنڈ

سنہ 1813ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی۔ اس تجدید سے پہلے تحقیقات کی گئی تھی اور گواہوں کے بیانات لیے گئے تھے۔

وارن ہسٹنگز، ٹامس منرو اور سر جان مالکم کی طرح کے اہم گواہوں کے بیانات لیے گئے تھے اور ہاؤس آف کامنز نے ہندوستان کے لوگوں کی عام خوشحالی کے لیے سخت تشویش کا اظہار کیا تھا لیکن جہاں تک صنعتوں کا تعلق تھا پارلیمنٹ کے اراکین نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ برطانوی مصنوعات کس طرح ان اشیا کی جگہ لے سکتی ہیں اور ہندوستانی صنعتوں کی قربانی دے کر برطانوی صنعتوں کو کیوں کر فروغ دیا جا سکتا ہے۔

پچھلی نصف صدی میں ہندوستان کو بار بار قحطوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جس سال گواہوں کے بیانات قلمبند کیے گئے تھے اس سال بھی ایک قحط بمبئی کو تباہ کر رہا تھا۔ بنگال اور مدراس میں صنعت و حرفت کا زوال ہو چکا تھا۔ پھر بھی گواہوں کے قلمبند کیے جانے والے بیانات میں ایک سوال بھی ایسا نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ دولت کے اُن ذرائع کی تجدید کے طریقے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی جن پر قوم کی خوشحالی کا انحصار تھا۔ اس کے بجائے ہمیں لگاتار اس قسم کے سوالات ملتے ہیں جن کے ذریعے وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ

برطانوی مصنوعات کو کس طرح ہندوستان کے لوگوں کے سر منڈھا جا سکتا ہے۔

وارن ہسٹنگز سے سوال کیا گیا "کیا آپ ہندوستان کے لوگوں کی عادات و اطوار سے واقفیت کی بنا پر یہ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں میں، خود ان کے استعمال کے لیے، یورپی اشیا کی طلب کا امکان ہے؟"

وارن ہسٹنگز نے جواب دیا "تجارت اُن اشیا کو مہیا کرتی ہے جن سے لوگوں کی ضرورتیں اور آسائش کے مطالبے پورے ہوں۔ ہندوستان کے افلاس زدہ لوگوں کی کوئی ضرورتیں نہیں ہیں۔ ان کی ضرورتیں ان کے مکانوں، ان کی غذا اور ان کے تھوڑے بہت کپڑوں تک محدود ہیں اور یہ تمام اشیا انھیں اُس زمین سے مل سکتی ہیں جس پر وہ رہتے ہیں[1]"۔

سر جان مالکم نے، جو ہندوستان کے لوگوں کے درمیان ایک عمر بتا چکا تھا اور ان کے متعلق اتنی واقفیت رکھتا تھا جتنی کہ اس کے بعد کوئی انگریز حاصل نہ کر سکا، اس قوم کے حسن سیرت کی زوردار الفاظ میں تعریف کی۔ شمالی ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کہا، "وہاں کے ہندو انسانوں کی ایسی قوم نہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ اپنے اعلیٰ اخلاق کی بنا پر اس سے زیادہ نمایاں ہیں...... جتنے کہ وہ اپنی کچھ ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر ہیں۔ وہ بہادر، عالی ظرف اور کریم النفس ہیں اور ان کی حق گوئی اُن کی جرأت کی طرح قابل ذکر ہے۔" جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ برطانوی اشیا کے صارف بن سکتے ہیں یا نہیں تو اس نے جواب میں کہا "وہ برطانوی اشیا کے صارف نہیں بن سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس برطانوی اشیا کو خریدنے کے ذرائع نہیں ہیں چاہے اپنی سیدھی سادھی زندگی اور معمولی لباس کے باوجود وہ اُن کی ضرورت محسوس کریں[2]"۔

گریم مرسر (Graeme Mercer.) نے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (سنہ 1813ء) صفحہ 3۔ وارن ہسٹنگز نے ہندوستان کے لوگوں کے عام کردار کے متعلق ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے جو رائے دی تھی اس کا اقتباس باب 3 میں دیا جا چکا ہے۔

[2] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (سنہ 1813ء)۔ صفحات 54 اور 570

میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت کے علاوہ مالگزاری کے اور سیاسی محکموں میں بھی کام کر چکا تھا، ہندوستان کے لوگوں کے متعلق کہا کہ "وہ طبیعتاً رحم دل، طور طریق میں شائستہ، خاندانی رشتوں میں با محبت، حکومت کے تابعدار اور مذہبی امور سے خصوصی لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں اور مذہبی رسموں کی پابندی کرنے اور تقریبیں منانے میں خصوصیت برتتے ہیں۔" ہندوستانیوں کو یورپی مال سے روشناس کرانے کے تعلق سے اُس نے کہا کہ لارڈ ویلزلی نے روہیلکھنڈ میں میلے شروع کر کے اس مال کے لیے منڈیاں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میلوں میں برطانوی اونی کپڑوں کی نمائش کی جاتی تھی اور اس نے برطانوی ریزیڈنٹ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس مقصد کے لیے ہردوار کے بڑے میلے میں شرکت کرے۔[1]

ایک اور گواہ جان اسٹیسی (John Stacy) کا بیان قابل ذکر ہے۔ اُس نے حکومت بنگال کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ عدلیہ میں کام کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہندوستانی مزدور کی ماہوار آمدنی 3 شلنگ 6 پنس سے 7 شلنگ 6 پنس تک ہوتی ہے۔ اس قسم کی قوم یورپی مال کس طرح استعمال کر سکتی ہے "میرے علم میں یہ بات نہیں کہ وہ معمولاً یورپ کی بنی ہوئی کوئی بھی چیز استعمال کرتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اونی کپڑے اور بڑے عرض کی نفیس سیاہ بانات وہ استعمال کر لیتے ہوں جو اتفاقی طور سے انھیں سستے داموں مل جاتی ہو۔"[2]

اس قسم کے سوالات ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ بات انسانی سرشت کے خلاف ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی خاطر اپنے مفادات قربان کر دے اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں انگریز مدبّروں نے امکانی کوشش کی کہ ہندوستانی صنعتوں کی قربانی کر کے برطانوی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔

1ے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (سنہ 1813ء) صفحہ 296

2ے ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (سنہ 1813ء) صفحات 23 اور 172۔

کمپنی کے گورنر جنرل اور تجارتی ریزیڈنٹوں کی مدد سے برطانوی مصنوعات ہندستانیوں کے سر تھوپے گئے اور امتناعی محاصل عائد کر کے ہندوستانی مصنوعات کو انگلستان جانے سے روکا گیا۔ اس کی تشریح ایک تاجر جان رینکنگ (John Ran King) کے بیان سے ہوتی ہے جس نے ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا ہاؤس میں فروخت ہوئے والی اشیا پر بکری ٹیکس کتنا ہے۔

"اُس کپڑے پر جس کو چھینٹ کہا جاتا ہے 3 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فیصدی محصول درآمد لگایا جاتا ہے۔ اگر اس کپڑے کی کھپت انگلستان میں ہوتی ہے تو اس پر 68 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی کا مزید محصول عاید کیا جاتا ہے"۔

ایک قسم کا مال اور ہے جس کو ململ کہا جاتا ہے۔ اس پر 10 فی صدی محصول درآمد عاید کیا جاتا ہے۔ اگر اس کپڑے کی کھپت انگلستان میں ہوتی ہے تو اس پر 27 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی کا مزید محصول عائد کیا جاتا ہے۔

"ایک اور قسم رنگین کپڑے کی ہے۔ اس کا استعمال اس ملک میں ممنوع ہے۔ اس پر 3 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی محصول درآمد عائد کیا جاتا ہے۔ یہ کپڑا صرف برآمد کیا جاتا ہے"۔

"پارلیمنٹ کے اس اجلاس میں تمام محاصل کو یکجا کر کے اس پر 2 فی صدی کا محصول عائد کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے اس چھینٹ پر، جس کی کھپت انگلستان میں ہو، 78 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی محصول اور انگلستان میں استعمال ہونے والی ململ پر 31 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی محصول ہو گیا ہے"۔

ان امتناعی محاصل کے حقیقی مقاصد کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جان رینکنگ نے مزید کہا تھا "میں اس کو حفاظتی محصول سمجھتا ہوں تاکہ ہمارے مصنوعات کو ترقی دی جا سکے"۔[1]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (1813ء) صفحات 463 اور 467

ان محاصل کا ہندوستانی مصنوعات پر کیا اثر ہوا۔؟ ہنری سینٹ جان ٹکر کا نام شمالی ہند کے بندوبست کے سلسلے میں پچھلے کسی باب میں آچکا ہے۔ وہ ہندوستان کا بہت زیادہ تجربہ حاصل کرنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوکر انگلستان واپس گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر ہو گیا۔ اس نے ہندوستان کی طرف سے انگلستان کی تجارتی پالیسی کے اثرات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ پارلیمانی کمیٹی کی مندرجہ بالا تحقیقات کے دس سال بعد یعنی سنہ 1823ء میں لکھتے ہوئے اس نے نہایت زوردار الفاظ میں اس پالیسی کی مذمت کی تھی۔

"ہم نے ہندوستان کے تعلق سے اس ملک میں کیا تجارتی پالیسی اختیار کی ہے؟۔ ریشمی کپڑے اور وہ کپڑے جو ریشم اور سوت ملا کر بنے جاتے ہیں مدتوں پہلے ہماری منڈیوں سے خارج کیے جا چکے تھے۔ حال میں کچھ تو 67 فی صدی محصول کی وجہ سے اور زیادہ تر بہتر مشینوں کی وجہ سے سوتی کپڑا بھی، جو ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، نہ صرف اس ملک سے خارج کیا جا چکا ہے بلکہ ہم اپنے ایشیائی مقبوضات کی جزوی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اپنا سوتی کپڑا برآمد کر رہے ہیں۔ ہندوستان اس طرح ایک صنعتی ملک سے ایک زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا ہے[1]۔"

اس سے بھی زیادہ اہم ہندوستان کے مورخ ایچ۔ ایچ۔ ولسن کی غیر جانبدارانہ رائے ہے۔

"اس ملک کے ہندوستان کو نقصان پہنچانے کی ایک تکلیف دہ مثال یہ بھی ہے جس کا وہ محکوم ہو گیا ہے۔ شہادت کے دوران (سنہ 1813ء میں) کہا گیا تھا کہ ہندوستان کا بنا ہوا سوتی اور ریشمی کپڑا اُس وقت بھی برطانوی منڈی میں انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کے مقابلے میں 50 سے 60 فی صدی تک کم قیمت پر بیچا جا سکتا ہے اور پھر بھی اس پر منافع کمایا جا سکتا تھا۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا کہ ہندوستانی کپڑے کی قیمت پر 70 اور 80 فی صدی محصول عائد کر کے انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کا

---

[1] ہندوستانی حکومت کی یادداشتیں جو ہنری سینٹ جان ٹکر کے کاغذات کا انتخاب ہے۔ (لندن سنہ 1853ء) صفحہ 494۔

تحفظ کیا جائے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی کپڑے کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا، اگر امتناعی محاصل و احکام نہ موجود ہوتے تو پیزلے (Paisley) اور مانچسٹر (Manchester) کے کارخانے شروع ہوتے ہی رک جاتے اور بھاپ کی طاقت بھی انھیں دوبارہ حرکت میں نہ لا سکتی ہندوستانی مصنوعات کو قربان کر کے انھیں وجود میں لایا گیا ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ انتقامی کارروائی کرتا، برطانوی مصنوعات پر امتناعی محاصل عائد کرتا اور اس طرح اپنی پیداداری صنعت کو تباہ ہونے سے بچا لیتا۔ حفاظت خود اختیاری کی اسے اجازت نہیں دی گئی۔ وہ اجنبی کے رحم و کرم پر تھا۔ برطانوی مال اس کے سر پر تھوپا گیا جس پر کوئی محصول نہیں ادا کیا جاتا تھا اور بدیسی صنعت کاروں نے اس مد مقابل کو دبانے اور آخر میں اُس کا گلا گھونٹنے کے لیے سیاسی ناانصافی کا سہارا لیا جس سے وہ برابر کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔"[1]

جب کہ ہندوستانی مصنوعات کی ہمت شکنی کرنے کے لیے انگلستان میں اس پالیسی پر عمل کیا جا رہا تھا ہندوستان میں جو طریقہ اختیار کیا گیا اس سے حالات میں سدھار ممکن نہ تھا۔ ملک کی آمدنی کمپنی کی سرمایہ کاری پر خرچ کی جا رہی تھی یعنی ہندوستانی مال کی خرید پر صرف کی جا رہی تھی جو یورپ برآمد کیا جاتا تھا، وہاں فروخت ہوتا تھا اور اس کا کوئی تجارتی معاوضہ نہیں ملا کرتا تھا۔ ملک کا کتنا روپیہ اس طرح صرف کیا گیا یہ مندرجہ ذیل فہرست سے ظاہر ہوگا۔"[2]

سال	صنعت کاری کی اصل قیمت، ہندوستان	سال	صنعت کاری کی اصل قیمت، ہندوستان
1793-94ء	12,20,106 پاؤنڈ	1795-96ء	18,21,512 پاؤنڈ
1794-95	12,88,059 پاؤنڈ	1796-97	17,08,379 پاؤنڈ

---

[1] مل History of British India، دسن کا دستور، جلد اول، باب 8، حوالہ

[2] بیانات مندرجہ صفحہ 487، ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ، 1813ء۔

سال	صنعت کاری کی اصل قیمت، ہندوستان
1797-98ء	10,25,204 پاؤنڈ
1798-99ء	20,19,265 پاؤنڈ
1799-1800ء	16,65,689 پاؤنڈ
1800-1801ء	20,13,975 پاؤنڈ
1801-1802ء	14,25,168 پاؤنڈ
1802-1803ء	11,33,526 پاؤنڈ
1803-4ء	11,87,007 پاؤنڈ
1804-5ء	10,88,700 پاؤنڈ
1805-6ء	13,35,460 پاؤنڈ
1806-7ء	9,86,310 پاؤنڈ
1807-8ء	8,87,119 پاؤنڈ
1808-9ء	10,13,740 پاؤنڈ
1809-10ء	12,40,315 پاؤنڈ
1810-11ء	9,63,429 پاؤنڈ
1811-12	11,10,909 پاؤنڈ

۱۹ سال کا کل میزان 2,51,34,672 پاؤنڈ

سالانہ اوسط 13,22,877 پاؤنڈ

اس سرمایہ کاری کا طریقہ حسب ذیل تھا۔ جب ڈائریکٹر مطلوبہ رقم کے متعلق اطلاع دیتے تھے تو ہندوستان کا تجارتی بورڈ کارخانوں کو اس حکم کی نقلیں بھیج دیا کرتا تھا جہاں مال بنایا جاتا تھا۔ کارخانوں کے تجارتی ریذیڈنٹ آرڈر کو مختلف ذیلی کارخانوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور بنکروں کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ ایک معینہ دن پر کارخانوں میں حاضر ہو کر پیشگی روپیہ حاصل کر لیں۔

ہر بنکر کے نام پیشگی رقم درج کر دی جاتی تھی اور جو مال وہ مہیا کر دیتا تھا اس کی قیمت اس میں مجرا کر دی جاتی تھی۔ اگر بنکر شرح کے متعلق اعتراض کرتے تھے تو تجارتی بورڈ اپنی رائے کے مطابق اُس کا فیصلہ کر دیا کرتا تھا[1]۔

ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی نے 1813ء میں گواہوں کے جو بیانات قلمبند کیے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح اس طریقہ کا ناجائز استعمال کیا جاتا تھا۔ ٹامس منرو نے اپنے بیان میں

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ (1813ء) صفحہ 532

کہا تھا کہ بارہ محل میں کمپنی کے ملازمین خاص خاص بنکروں کو جمع کر کے اس وقت تک پہرہ میں رکھتے تھے جب تک وہ صرف کمپنی کو مال مہیا کرنے کا معاہدہ نہ کرلیں[1]۔ جو بنکر ایک دفعہ پیشگی روپیہ لے لیا کرتا تھا پھر وہ مشکل ہی سے اپنا پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ اگر وہ مال بھیجنے میں دیر کرتا تھا تو اس سے جلدی کام کروانے کے لیے ایک چپراسی تعینات کر دیا جاتا تھا اور اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا جا سکتا تھا۔ چپراسی تعینات کرنے کی صورت میں بنکر پر ایک آنہ یومیہ جرمانہ کیا جاتا تھا۔ چپراسی لاٹھی کے ذریعہ اکثر کام کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بنکروں پر جرمانہ کیا جاتا تھا اور اس کو وصول کرنے کے لیے اُن کے بھرت کے برتنوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا[2]۔ اس طرح گاؤں کے تمام بنکر کمپنی کے کارخانوں کے غلام بن گئے تھے۔ مسٹر کاکس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ جس کارخانے کے وہ سربراہ تھے اس کے زیر اختیار 1،500 بنکر تھے۔ اس تعداد میں بنکروں کے خاندانوں کے افراد اور لواحقین شامل نہیں۔

بنکروں پر جو اختیار حاصل کر لیا گیا تھا وہ صرف ایک رواج نہیں تھا بلکہ ایک ریگولیشن کے ذریعے اس کو قانونی شکل دے دی گئی تھی۔ اس ریگولیشن کی رو سے کمپنی سے پیشگی روپیہ حاصل کرنے والا بنکر کسی حال میں کسی دوسرے شخص کے لیے؛ چاہے وہ یورپین ہو یا ہندوستانی، نہ اس قسم کا کام کر سکتا ہے جس کے لیے وہ کمپنی سے معاہدہ کر چکا ہو اور نہ وہ مال دے سکتا ہے جس کا کمپنی سے وعدہ کیا جا چکا ہو۔" اگر وہ حسب وعدہ کپڑا مہیا نہ کر سکے تو "تجارتی ریزیڈنٹ کو اختیار حاصل ہوگا کہ جلدی کام کروانے کے لیے اس پر چپراسی تعینات کر دے۔" اگر بنکر اپنا کپڑا کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس کے خلاف "دیوانی عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔" اگر "وہ بنکر جن کے پاس ایک سے زیادہ کرگھا ہو اور جو ایک یا ایک سے زیادہ کاریگر رکھتے ہوں تحریری معاہدے کے مطابق کپڑا مہیا نہ کر سکیں تو انھیں ہر اُس تھان کی معہودہ قیمت کا 35 فی صدی بطور جرمانہ ادا کرنا ہوگا جو وہ وقت پر نہ دے سکیں۔"

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ (1813ء) صفحہ 153

[2] ایضاً، صفحات 537 ـ 539

زمینداروں اور کسانوں کو "ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تجارتی ریزیڈنٹوں اور ان کے ملازمین کے نبکروں تک پہنچنے میں حارج نہ ہوں" اور انھیں کمپنی کے "تجارتی ریزیڈنٹوں کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ پیش آنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا ہے[1]"

اگر صنعت کار غلام بنا کر رکھا جائے تو مصنوعات نشوونما نہیں پا سکتے۔ اس نظام کا بدترین نتیجہ یہ تھا کہ کمپنی کے ملازموں نے تو ہندوستان کے صنعت کاروں پر اختیار حاصل کر ہی لیا تھا لیکن دوسرے یورپینوں نے زیادہ اختیارات حاصل کر لیے تھے اور ان کے استعمال میں وہ زیادہ سختی برتتے تھے۔

وارن ہسٹنگز نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں انگریز کا کردار بدل جاتا ہے۔ انگریز کے نام سے خود اس کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کو ایسے جرائم کے ارتکاب کے مواقع ملتے ہیں جن کے ارتکاب کی جرأت وہ انگلستان میں نہیں کر سکتا"۔

لارڈ ٹین ماؤتھ نے کہا تھا "میرے خیال میں اس امر کا امکان ہے کہ ملک کے اندرونی حصوں میں یورپینوں کے داخلے اور مقامی لوگوں سے اُن کے میل ملاپ کا نتیجہ یہ ہو کہ مقامی لوگوں میں اعلیٰ صفات پیدا کرنے کے بجائے اُن کی نظروں میں یورپینوں کا عام کردار گر جائے"۔

ٹامس منرو نے کہا تھا "مجھے اُن تاجروں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے جو اس ملک کو چھوڑتے وقت متین و سنجیدہ ہوتے ہیں یا اس کے برعکس وہ جب ایسے لوگوں کے درمیان پہنچ جاتے ہیں جو مزاحمت نہیں کر سکتے اور جن پر حکم چلایا جا سکتا ہے تو وہ مشکل سے اپنی متانت و سنجیدگی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان جانے والے ہر تاجر کے لیے سمجھا جاتا ہے کہ وہ حکومت سے منسلک ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے تین چار سال میں —— میرے خیال میں سنہ 1810ء میں بنگال میں یہ واقعہ پیش آیا —— نجی تاجروں نے، جو نیل کی تجارت کرتے تھے، مقامی لوگوں کو کاٹھ میں ڈالا، اپنے ملازموں وغیرہ کو جمع کیا اور ایک دوسرے سے جنگ کی جس میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے"۔

ٹامس سیڈن ہیم (Thomas Sydenham) نے کہا تھا "میں نے

---

[1] سنہ 1793ء کا ریگولیشن نمبر 31۔

ہمیشہ کہا ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں انگریز بدیسی ملکوں میں زیادہ تشدد سے کام لیتے ہیں اور میرے خیال میں ہندوستان کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔" [1]

انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں یورپین تاجروں اور نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں نے ملک کے اندرونی حصوں میں بہت زیادہ تشدّد سے کام لیا۔ حکومت کو اس موضوع پر مجسٹریٹوں کو گشتی چٹھیاں بھیجنی پڑیں۔ گشتی چٹھی مورخہ 13 جولائی سنہ 1810ء میں کہا گیا تھا۔

"وہ جرائم جن کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں کہی گئی تھیں اور جو نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں کے خلاف انفرادی طور سے پوری طرح ثابت ہو گئے ہیں، مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کر دیے جائیں۔"

"اول — تشدد کے ایسے واقعات جو قانون کی رو سے قتل کی تعریف میں نہ آتے ہوں لیکن اُن کی وجہ سے مقامی لوگوں کی موت واقع ہوئی ہو۔"

"دوم — اس بقایا رقم کی وصولیابی کے لیے جس کو واجب الوصول بتایا جاتا ہو یا دوسرے اسباب کی بنا پر مقامی لوگوں کا حبس بے جا خصوصاً انھیں کاٹھ میں ڈالنے کا جرم۔"

"سوم — اپنے کارخانوں سے متعلق لوگوں کو اور دوسرے لوگوں کی شورش پسندانہ انداز سے جمع کرنا اور نیل کی کوٹھیوں کے دوسرے مالکوں کے ساتھ بلوہ کرنا۔"

"چہارم — کسانوں اور دوسرے مقامی لوگوں کو غیر قانونی طریقے سے لاٹھی یا کسی دوسرے آلہ حرب وضرب سے زدوکوب کرنا۔"

گشتی چٹھی میں مجسٹریٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کاٹھ تلف کروادیں، کسانوں کے کوڑے مارنے اور دوسری جسمانی سزائیں دینے کی رپورٹ کریں اور نیل کی کوٹھیوں کے یورپین مالک جب تک حکومت کے احکامات کی پابندی نہ کریں انھیں ملک کے اندرونی حصوں میں آباد ہونے سے باز رکھیں۔ ایک اور گشتی چٹھی میں، جو 20 جولائی سنہ 1810ء کو جاری کی گئی تھی، مجسٹریٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ان واقعات کی

---

[1] شہادت کی روداد وغیرہ (سنہ 1813ء)، صفحات 2، 10، 138، 359۔

رپورٹ کریں جہاں نیل کی کوٹھیوں کے مالک کسانوں کو پیشگی روپیہ لینے پر اور نیل کی کاشت کرنے پر غیر قانونی طریقوں سے مجبور کرتے ہیں[1]

لیکن بنگال میں نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں کے مظالم نصف صدی تک جاری رہے۔ یہاں تک کہ بنگال کے لوگ بغاوت و مزاحمت پر مجبور ہو گئے۔ 1859ء کی نیل کی شورش کے بعد بنگال کے زیادہ تر حصوں میں یورپین باغداروں نے نیل کی کاشت ختم کر دی۔

بنگال کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار دین بندھو مترا نے اپنی یادگار تمثیل "آئینۂ نیل" میں باغداروں کے مظالم کو پیش کیا ہے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے جرم میں ریورنڈ جیمس لانگ پر جرمانہ کیا اور اس کو قید کی سزا دی۔ لوگ اب بھی جذبہ احسان مندی کے ساتھ ایشلے ایڈن (Ashley Eden.) کا نام یاد کرتے ہیں جو بعد میں بنگال کا لفٹنٹ گورنر ہو گیا تھا۔ اس نے ظلم کو ختم کرنے کے لیے مسلسل کوشش کی۔

آسام میں چائے کی کاشت کے لیے مزدور فراہم کرنے کی خاطر اب بھی ایک خصوصی قانون موجود ہے جس کو لوگ "غلامی کے قانون" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ناواقف مرد اور عورتیں معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد فوجداری قانون کی دفعات کے تحت مجبور ہوتے ہیں کہ ایک معینہ مدت تک چائے کے باغوں میں کام کریں۔ آسام کے چیف کمشنر نے امسال (1850ء) ہر امکانی کوشش کی کہ باغات میں مجبوراً کام کرنے کے دوران غریب مزدوروں کو مناسب اجرت مل سکے لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہمیں ایک دفعہ پھر 1813ء کے بیان کی طرف واپس آنا چاہیے۔

1813ء کی پارلیمانی تحقیقات سے ہندوستانی صنعت کاروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتناعی محاصل میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ کمپنی کی سرمایہ کاری کو نہیں روکا گیا بلکہ پورے ایوان کی کمیٹی نے اس کو صاف صاف منظوری دے دی۔

---

[1] شہادت کی روداد وغیرہ (1813ء)، صفحہ 567۔

مذکورہ بالا لگانوں، مال گزاریوں یا منافعوں کی پوری یا جزوی بچت جو مختلف مدوں کی رقموں کا تعین کرنے کے بعد اور مذکورہ بالا مختلف اخراجات پورے کرنے کے بعد باقی بچے اس سے ہندوستان میں کمپنی کی سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے، چین بھیجی جاسکتی ہے تاکہ وہاں سرمایہ کاری کی جاسکے یا ہندوستان میں قرض ادا کیا جاسکتا ہے یا کسی اور ایسے کام کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے جس کی بورڈ آف کمشنرز کی منظوری کے بعد کورٹ آف ڈائریکٹرز وقتاً فوقتاً ہدایت کرے۔"[1]

مورخ ایچ۔ ایچ۔ ولسن کا کہنا ہے کہ 1813ء کے پارلیمانی مباحثے میں "یہ تو درست ہے کہ ہندوستانی مفادات کے متعلق تشویش کا اظہار بہت کھل کے کیا گیا تھا لیکن اس بات کو ثابت کرنا ذرا مشکل ہوگا کہ جن لوگوں نے مباحثے میں حصہ لیا ان کی اکثریت شاہ کی ہندوستانی رعایا کی خوش حالی کے لیے بے لوث جذبے سے متاثر ہوئی تھی۔۔۔۔ انگلستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کی نظریں اپنے منافعوں پر تھیں"[2]

1813ء کی پارلیمانی تحقیقات کا اصل مقصد انگلستان کے صنعت کاروں کے مفادات کو فروغ دینا تھا۔ نپولین بوناپارٹ نے برطانوی صنعت کاروں کو یورپی بندرگاہوں سے بے دخل کر دیا تھا، انگلستان کے تاجر اور صنعت کار دشواریوں کا سامنا کر رہے تھے اور اس کی صنعتی پیداوار کو فروخت کرنے کے نئے "راستے" دریافت نہ کیے جاسکنے کی صورت میں ملک کو خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ ان حالات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کے خلاف قومی مطالبے کو تقویت پہنچائی اور 1813ء میں جب چارٹر کی تجدید ہوئی تو ہندوستان کے ساتھ تجارت میں کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا گیا۔ اس طرح برطانوی تاجروں کو پہلی دفعہ ہندوستان تک پہنچنے کی آزادی نصیب ہوئی۔ یہ بات انسانی فطرت کے خلاف تھی کہ وہ ہندوستانی صنعت کاروں کی خوش حالی کے لیے خود کو تشویش میں ڈالتے۔

---

[1] پورے ایوان کی کمیٹی کی تجویز، 1813ء۔

[2] مل: 'History of British India' جسے ولسن نے جاری رکھا، جلد اول، باب 8۔

باب 15

صنعتوں کی کیفیت (1813ء - 1835ء)

اس طرح 1813ء میں جب اس کے چارٹر کی تجدید ہوئی تو مشرق کی تجارت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری پہلی دفعہ ختم کی گئی۔ نجی تجارت کی اجازت ملنے کے بعد اس کا حجم بڑھنے لگا اور کمپنی کی تجارت کم ہونے لگی۔ جب کمپنی کے چارٹر کی دوبارہ تجدید کا وقت قریب آنے لگا، جو 1833ء میں ہونے والی تھی، تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ کمپنی کی تجارت کو کیوں نہ بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ انگلستان کی رائے عامہ اس بات کے حق میں تھی کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی تجارت کلیتاً نجی تاجروں کے سپرد کر دی جائے اور انھیں کمپنی کے ساتھ غیر منصفانہ مقابلے پر مجبور نہ کیا جائے جو ہندوستان میں علاقے حاصل کر چکی تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ تاجروں کے فرائض ایک سلطنت کے حکمرانوں کے فرائض سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ اس آخری دلیل پر لندن اور انگلستان کے دوسرے تجارتی مراکز کے تاجروں نے زیادہ سے زیادہ زور دینا شروع کیا۔ وہ ان غیر منصفانہ فوائد کی وجہ سے جو کمپنی کو ہندوستان میں حاصل تھے اس سے حسد کرنے لگے تھے اور انھیں توقع تھی کہ کمپنی کی تجارت ممنوع قرار دیے جانے کے بعد خود ان کی تجارت میں اضافہ ہو جائے گا۔

چنانچہ 1833ء میں کمپنی کی تمام تجارت ممنوع قرار دے دی گئی اور اس تاریخ سے کمپنی نے محض ہندوستان کے حکمراں کی حیثیت اختیار کر لی اور اپنا منافع ہندوستان کی آمدنی میں سے لینے لگی۔

1830ء، 1831ء اور 1832ء میں جب زراعتی امور پر مباحثہ ہو رہا تھا اس وقت ہندوستان کی تجارت و صنعت اور ہندوستان کے نظم و نسق کے تمام شعبوں کے متعلق بہت سی شہادتیں قلمبند کی گئی تھیں۔ 1830ء میں ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے بیش بہا شہادت پیش کی گئی۔ 1830ء، 1830-31ء اور 1831ء

کی ہاؤس آف کامنز کی رپورٹوں میں اس سے زیادہ قیمتی اور تفصیلی شہادتیں شامل تھیں ۔ 1832ء کی ہاؤس آف کامنز کی رپورٹ میں جو نئی شہادت پیش کی گئی تھی اس کو چھ اوراق جلدوں میں شائع کر دیا گیا جو قریب قریب چھ ہزار صفحات پر مشتمل تھیں[1]۔

اس ضخیم شہادت کے وہ حصے جو تجارت اور صنعتوں سے تعلق رکھتے ہیں کسی قدر یک طرفہ ہیں ۔ ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز نے ان صنعتوں کے متعلق تحقیقات کی جن میں برطانوی سرمایہ لگا تھا ۔ یا جن میں برطانوی سرمایہ لگانے کے مواقع تھے ۔ انھیں ہندوستان کے لوگوں کی صنعتوں سے اور ہندوستان کے دستکاروں کی اُجرت و منافع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ انھوں نے اس امر کی تحقیقات کی کہ کمپنی کی تجارت ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ کی ہندوستان سے تجارت میں اضافہ ہو گا یا نہیں اور اس سے انگلستان کے نجی تاجروں اور صنعت کاروں کو فائدہ ہو گا یا نہیں ۔ ہندوستان کی داخلی تجارت پر انھوں نے توجہ نہیں دی جو اس ملک کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی ۔ 1813ء یا 1832ء میں ہونے والی تحقیقات کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی مقامی تجارت اور صنعتوں کو فروغ دیا جائے ۔ پچھلے ستر سال میں بھی اس مقصد کو پورا کرنے کی سنجیدگی اور ثابت قدمی کے ساتھ کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔

اس کے باوجود جو بھی شہادت قلمبند کی گئی ہے اس سے ہمیں بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس ضخیم شہادت کی قابلِ فہم تلخیص اس باب میں پیش کریں جس کی تنگ دامانی کا ہمیں احساس ہے ۔

روئی

امریکہ کی روئی کے مقابلے میں ہندوستانی روئی کا ریشہ چھوٹا ہوتا تھا، وہ زیادہ گندی ہوتی تھی اور صاف کرنے کے دوران ضائع زیادہ ہوتی تھی ۔ یہ زیادہ تر ادنیٰ قسم کا کپڑا بنانے اور اونی کپڑے میں اون کے ساتھ ملانے کے کام آیا کرتی تھی ۔ سورت کی

---

[1] وہ چھ جلدیں ہیں (1) اُمور عامہ ۔ (2) مالیات اور تجارت (3) آمدنی (4) عدلیہ (5) فوجی اُمور (6) سیاسی اُمور ۔

روئی بہترین سمجھی جاتی تھی اور بنگال میں بننے والی ڈھاکہ کی ململ کا جواب انگلستان پیش نہیں کرسکتا تھا۔ ٹینیسی ویلی میں اچھے قسم کی کپاس پیدا کرنے کا تجربہ کامیاب ہوچکا تھا جس کے بیج فرانس کے جزیرے سے درآمد کیے گئے تھے۔ ساحلی علاقوں کے علاوہ لمبے ریشے کی کپاس ہندوستان میں شاذ ہی ہوتی تھی اور لوگوں کو اپنی صنعتوں کے لیے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہندوستان میں تمام تر سوت ہاتھ سے کاتا جاتا تھا۔[1]

امریکہ کی منڈیوں کے مقابلے کی وجہ سے ہندوستانی روئی کی برآمد کم ہوگئی تھی۔ انگلستان کی منڈیوں میں آنے والی روئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں کی روئی بدترین تھی۔ بمبئی کی صاف کی ہوئی روئی اور امریکہ کے بلند علاقوں کی روئی کی قیمتوں میں 10 سے 15 فی صدی تک کا فرق تھا۔ سورت کی روئی عام طور سے انگلستان کے ادنیٰ قسم کے کپڑے میں استعمال کی جاتی تھی اور نفیس روئی کا سوت کاتتے وقت اس میں بھی ملا دی جاتی تھی۔ ہندوستان کی روئی کو ترقی دینے کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکی تھیں۔ کچھ تجربوں میں کپاس زیادہ خراب ہوگئی اور کچھ میں بیج پورے طور سے حاصل نہ کیے جاسکے۔ ہندوستان میں پیدا کی جانے والی کپاس بمبئی لائی جاتی تھی اور یورپین تاجر اس کو خریدتے تھے۔ کپاس پیدا کرنے والی کوئی زمین یورپینوں کے قبضے میں نہیں تھی اور اس کی کاشت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ ہندوستان میں استعمال ہونے والی روئی کو صاف کرنے کی کل ایک ہاتھ سے چلنے والی چھوٹی سی چرخی یا لکڑی کی بنی ہوئی بیلن نما کل ہوتی تھی جو قدیم زمانہ سے استعمال ہو رہی تھی۔ اس کی قیمت 6 شلنگ تھی، اس کو ہاتھ سے چلایا جاتا تھا، اس کو چلانے کے لیے زیادہ طاقت کی ضرورت نہیں تھی اور اس سے کپاس کسی قدر بھونڈے طریقے سے صاف کرلی جاتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرمایہ کاری کے لیے تجارتی ریزیڈنٹ خاص طور سے ٹینی ویلی سے روئی خریدا کرتے تھے۔ 1832ء کی سرمایہ کاری کے لیے 250 پاؤنڈ کی 8000 گانٹھیں خریدی گئیں جو چین بھیجی گئی تھیں۔ یورپینوں کے ذریعے کپاس کی کاشت کے لیے بنگال موزوں نہیں تھا، پھر بھی ڈھاکہ کے آس پاس وہاں کے لوگ نفیس کپاس پیدا کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کی بہترین کپاس

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1830ء خلاصہ

گجرات اور کچھ میں پیدا ہوتی تھی۔ ۱۷۹۰ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی روئی انگلستان میں درآمد کی گئی اور ۱۷۹۱ء میں امریکہ کی روئی۔ ۱۸۲۷ء میں ہندوستان سے روئی کی مجموعی برآمد 68 ملین پاؤنڈ تھی جس کی قیمت ایک ملین پاؤنڈ تھی۔ کلکتہ میں سوت کاتنے کا ایک کارخانہ کھل چکا تھا۔[1]

کمپنی زیادہ تر بمبئی اور بنگال سے روئی برآمد کرتی تھی اور وہاں کے کارخانوں کے ختم ہونے تک وہ مدراس سے بھی برآمد کرتی رہی تھی۔ اندرونی علاقوں سے روئی کشتیوں کے ذریعے کلکتہ لائی جاتی تھی اور موسم کے خلاف تحفظ کا مناسب انتظام نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ چار مہینوں تک کھلے تختوں پر پڑی رہتی تھی۔ اس کے بعد اس کو روئی کے پیچوں میں ڈالا جاتا تھا جس میں بنولے بھی خاصی تعداد میں ڈال دیے جاتے تھے اور بھیگی ہوئی اور پھپھوندی لگی حالت میں اس کو انگلستان روانہ کر دیا جاتا تھا۔ دنیا کی بہترین روئی کے ساتھ اگر اس قسم کا برتاؤ کیا جاتا تو وہ بھی اس سے بہتر حالت میں انگلستان نہیں پہنچ سکتی تھی جس حالت میں بنگال کی روئی پہنچتی تھی۔[2]

ریشم

ریشم کا کیڑا زیادہ تر بنگال میں پایا جاتا تھا۔ شمالی ہند میں یہ نشوونما نہیں پا سکتا تھا اور بمبئی کی زمین شہتوت کی کاشت کے لیے موزوں نہیں تھی۔ انگلستان کے لیے کمپنی کی سرمایہ کاری کا انتظام اس کے تجارتی ریزیڈنٹوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ وہ ابریشم کے کوئے پیدا کرنے والوں کو پیشگی روپیہ دیا کرتے تھے اور ان سے کوئے حاصل کر لیا کرتے تھے۔ کمپنی کے بارہ ریزیڈنٹ اور بہت سے کارخانے تھے لیکن وہ کتے ہوئے ریشم کو چرخیوں پر چڑھانے کے علاوہ ریشم کی صنعت کے تعلق سے کوئی اور کام نہیں کیا کرتے تھے۔ کچھ اور کارخانوں میں "پٹی ریشم" کے تھان بنائے جاتے تھے۔ نفیس ریشمی کپڑا بنانے کا رواج بہت کم ہو گیا تھا اور قابل لحاظ

1۔ ۱۸۳۰ء، ۳-۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۱ء کی ہاؤس آف کامنز کی رپورٹ، خلاصہ

2۔ ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے دی جانے والی شہادت، ۱۸۳۲ء، خلاصہ۔

پیمانے پر انگلستان کا بنا ہوا ریشمی کپڑا درآمد ہونے لگا تھا۔ بہت سے یورپینوں نے بھی کارخانے قائم کیے تھے لیکن وہ کمپنی کے کارخانوں سے چھوٹے تھے جو منڈیوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہندوستانی ریشم کی خرابی یہ تھی کہ اس کا ریشہ چھوٹا تھا اور وہ صاف نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستان کا بہترین ریشم اتنی ہی قیمت اٹھاتا تھا جتنی اٹلی کا بہترین ریشم لیکن زیادہ تر ہندوستانی ریشم کم درجہ کا ہوا کرتا تھا۔ تجارت کمپنی کے ہاتھ میں تھی جو اتنی نگہداشت و نگرانی نہیں کر سکتی تھی جتنی کہ نفیس ریشم کی پیداوار کے لیے ضروری تھی۔ ہندوستان کا ریشم باہر بھیجنے کے لیے کم خریدا جاتا تھا اس کے مقابلے میں چین کے ریشم کو ترجیح دی جاتی تھی۔[1]

ہندوستان میں شہتوت کی تین قسموں کی کاشت ہوتی تھی یعنی سفید شہتوت جس کی کاشت یورپ میں ہوتی تھی، گہرے سرخ رنگ کا شہتوت جس کی کاشت چین میں ہوتی تھی، اور ہندوستانی شہتوت۔ ریشم کے کیڑوں کی دو قسمیں تھیں یعنی دیسی کیڑا اور سال کے سال پیدا ہونے والا کیڑا جو اٹلی یا چین سے لایا گیا تھا اور جس کا ریشم زیادہ نفیس ہوتا تھا۔ شہتوت اور ریشم کے کوئے تیار کرنے کا کام لوگوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ کمپنی انھیں پیشگی روپیہ دیا کرتی تھی اور ریشم یا کوئے لیتے وقت اس سے قیمت چکا لیا کرتی تھی۔ بنگال میں کمپنی کے گیارہ یا بارہ ریشم کے اٹیرن تھے۔ یہ کل اٹلی کے اصول کے مطابق بنائی جاتی تھی اور سیدھی سادھی ہوتی تھی۔ کمپنی کے ریذیڈنٹوں کو مہیا کی جانے والی مقدار پر $2\frac{1}{2}$ فی صدی کمیشن ملتا تھا اور انھیں اپنے لیے ریشم خریدنے کی اجازت بھی تھی۔ وہ برے بھلے ریشم میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ بنگال کا خام ریشم اب پہلے کی طرح اچھا نہیں رہا تھا مگر تجارت کے راستے کھل جانے اور محاصل کم ہو جانے کی وجہ سے وہ برآمد زیادہ ہونے لگا تھا۔ سنہ 1823ء اور سنہ 1828ء کی درمیانی مدت میں انگلستان کو برآمد ہونے والے خام ریشم میں $35\frac{1}{2}$ فی صدی کا اضافہ ہو گیا تھا جب کہ کمپنی کی سرمایہ کاری میں $17\frac{1}{2}$ فی صدی کا اضافہ ہوا تھا۔[2]

بنگال میں ریشم کے کیڑوں کو غذا مہیا کرنے کے لیے شہتوت اور ارنڈ کے پودے استعمال

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے دی جانے والی شہادت، سنہ 1830ء خلاصہ

[2] سنہ 1830ء، سنہ 31-1830ء اور سنہ 1831ء کی ہاؤس آف کامنز کی رپورٹوں میں شامل شہادت کا خلاصہ۔

کیے جاتے تھے۔ شہتوت کے پودے چھ یا آٹھ انچ کی دوری پر ایک قطار میں لگائے جاتے تھے اور وہ تین فیٹ اونچے ہوتے تھے۔ لوگ پیداوار حاصل کرنے میں عجلت سے کام لیتے تھے تاکہ انھیں جلد منافع ہونے لگے۔ وہ اگر ان طریقوں پر عمل کرتے جن پر جنوبی یورپ میں عمل کیا جاتا تھا تو انھیں زیادہ منافع ہوتا۔ پودے لگانے کے تقریباً چار مہینے بعد ان کے پتے پہلی دفعہ توڑ لیے جاتے تھے اور اس کے بعد ہر آٹھویں یا دسویں ہفتے پتے توڑے جاتے تھے۔ پہلے سال چار دفعہ کوئے جمع کیے جاتے اور دوسرے سال میں چھ دفعہ۔ ایک انگریزی ایکڑ کی ایک تہائی زمین 1000 کیڑوں کو روزانہ کی غذا مہیا کر سکتی تھی۔ بُرے بھلے ریشم کا انحصار اس موسم پر ہوتا تھا جس میں ریشم کاتا جاتا تھا۔ دیسی کیڑے سال میں چار دفعہ بچے نکالا کرتے تھے اور سال کے سال رہنے والے کیڑے صرف ایک دفعہ۔ کمپنی کے ریزیڈنٹ جن لوگوں کے ذریعے پیشگی روپیہ دیا کرتے تھے وہ پائے کار کہلاتے تھے اور انھیں کے ذریعے وہ کارخانوں میں کوئے منگایا کرتے تھے جہاں ان کویوں کو مقامی مزدور چرخیوں پر چڑھایا کرتے تھے اور کارخانے سے اس کام کی اجرت پاتے تھے۔ ریزیڈنٹ بارہ تھے۔ سامان آنے کے بعد ریزیڈنٹ اس کی قیمت مقرر کیا کرتے تھے جس کی منظوری تجارتی بورڈ سے حاصل کی جاتی تھی۔ ریزیڈنٹ اس قابل نہیں تھے کہ کوئی صنعت کار اپنے کارخانوں کی نگہداشت اُن کے سپرد کرے۔ 1810ء سے 1830ء تک خام ریشم کی پیداوار میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا اور اور کمپنی نے اس کی مقدار بڑھا دی۔ کمپنی نے ہندوستان میں ریشم کاتنے کا وہ طریقہ بھی شروع کیا جو اٹلی میں رائج تھا۔ تجارت کی آزادی سب کو حاصل تھی اور کچھ لوگوں نے انگلستان سے ہندوستان جاکر وہاں اٹیرن کے کارخانے قائم کیے تھے مگر انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔ وہ کمپنی سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ اٹلی کا ریشم اچھا تھا، فرانس کا ریشم نفیس تھا، بنگال کے ریشم کی بھی اتنی ہی مانگ تھی لیکن وہ اتنا مضبوط نہیں ہوتا تھا جتنا اٹلی، فرانس اور ترکی کا ریشم۔ اٹلی کے ریشم کے مقابلے میں وہ ادنیٰ درجے کا بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اچھائی برائی کے بجائے لوگوں کی نظریں مقدار پر رہا کرتی تھیں اور وہ چرخی پر چڑھاتے وقت اتنی احتیاط نہیں برتتے تھے جتنی اٹلی اور فرانس میں برتی جاتی تھی۔ اس لیے بنگال کا ریشم میلا، غیر ہموار اور "ٹکڑے ٹکڑے" ہوتا تھا جس کا تاگا کئی جگہ سے ٹوٹا ہوتا تھا۔[1]

---

[1] ہاؤس آف کامنز کے سامنے دی جانے والی شہادت، 1832ء، خلاصہ۔

شہادت کے مندرجہ بالا خلاصے سے قاری اُس تبدیلی کو سمجھ سکتا ہے جو کمپنی کے ستر سال کی حکومت کے بعد بنگال کی سوتی کپڑے اور ریشمی کپڑے کی صنعتوں میں آ چکی تھی۔ کبھی کپڑا بنانے سے انھیں روک کر، اور بعد میں کمپنی کے سربراہوں کے زیر اثر، ہندوستان کے آزاد صنعت کاروں کی ہمت شکنی کی جاتی تھی۔ لوگوں نے بڑی حد تک کپڑا بننا ترک کر دیا تھا۔ وہ لوگ جو پہلے خود اپنا سرمایہ لگاتے تھے، خود اپنے گانوؤں اور گھروں میں اشیا سازی کرتے تھے اور خود اپنا منافع حاصل کیا کرتے تھے۔ اب کمپنی کے ریزیڈنٹوں پر انحصار کرنے لگے تھے جو انھیں روئی اور خام ریشم دیا کرتے کرتے تھے اور وہ ریزیڈنٹوں کی مقرر کردہ قیمتیں منظور کر لیا کرتے تھے، سیاسی آزادی کے ساتھ ان کی صنعتی اور معاشی آزادی بھی چھین گئی تھی اور جو کچھ بنانے کے لیے اُن سے کہا جاتا تھا اس کی اجرت اور قیمت انھیں مل جایا کرتی تھی۔ دنیا کی منڈیوں کے لیے آزاد اشیا ساز کی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد ان میں سے ہزاروں اپنی گزر بسر کے لیے کمپنی کے کارخانوں کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ کارخانوں میں خام مال کی مانگ تھی۔ ہندوستان کے لوگوں نے خام مال مہیا کرنا شروع کر دیا، اپنی قدیم صنعتی مہارت بھلا بیٹھے اور صنعتوں کے منافعوں کو کھو دیا۔ انگلستان کے لوگوں نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان بڑھتی ہوئی تجارت پر نظر ڈال کر — یعنی ہندوستان سے خام مال کی برآمد اور ہندوستان میں مصنوعات کی درآمد میں اضافہ کو دیکھ کر یہ کہنا شروع کیا کہ ہندوستان کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز نے اس امر کی تحقیقات کی کہ یہ روز افزوں تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے یا نجی تاجروں کے۔ کسی نے اس امر کی تحقیقات کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ اشیا کے تبادلے میں اس اضافے کے معنی ہندوستان کی صنعتوں کا زوال اور صنعتی منافع کا نقصان بھی ہے۔ کسی نے اس امر کی تحقیقات کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ ہندوستان کے عام لوگوں کی معاشی خوشحالی کے لیے وہاں کے بنکروں کی صنعت کی تجدید کا امکان ہے یا نہیں۔

غذائی غلّے

ہندوستانی کسان کی لاعلمی اور کاشت میں بے پرواہی کے متعلق انگلستان میں

ہمیشہ سے بڑی غلط فہمی رہی ہے لیکن جن انگریزوں نے زراعت کے مطالعے کی تکلیف گوارا کی ہے انھوں نے اس غیر منصفانہ اور غیر حقیقی تصور کو دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے ڈاکٹر والک (Dr. Wallick) نے جو کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نباتاتی باغ (Botanical Garden) کا نگراں رہ چکا تھا، 13 اگست 1832ء کو ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے اس موضوع پر شہادت دی تھی۔

"ہندوستان سے باہر کے یورپینوں نے بنگال کے طریقۂ کاشت کو سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ بنگال کا طریقہ کاشت حالانکہ کئی اعتبار سے بہت سیدھا سادھا اور قدیم انداز کا ہے پھر بھی وہ اتنا پست نہیں جتنا کہ لوگ عام طور پر سمجھا کرتے ہیں اور میرا تجربہ ہے کہ اُس طریقہ میں اچانک کی جانے والی تبدیلیوں کے نتائج اچھے نہیں ہوتے مثلاً یہ بات میرے علم میں ہے کہ لوہے کے یورپین ہل بنگال میں استعمال کیے گئے تاکہ وہ اس معمولی بنگالی ہل کی جگہ لے سکیں جو نہایت تھکانے والا ہوتا ہے اور صرف مٹی کی اوپری سطح کو لوٹتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہاں کی مٹی کی صرف بالائی سطح اچھی ہے۔ لوہے کے ہل کے ذریعے سے جب اس کو پلٹنا چاہا تو اس میں نیچے کی مٹی بھی مل گئی جس نے اسے خراب کر دیا۔"

جب اس سے دریافت کیا گیا کہ کاشت کے ہندوستانی طریقے میں ترقی کی گنجائش ہے تو ڈاکٹر والک نے جواب دیا "جی ہاں۔ مگر اس حد تک نہیں جس حد تک عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دھان کی کاشت کو لیجیے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اگر ایک ہزار سال تک جیتے رہیں تو ہم زراعت کے اس شعبے میں مشکل ہی سے کوئی ترقی دیکھ سکیں گے۔"[5]

5۔ ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء جلد 2، حصہ اول، صفحہ 195۔ آج تک تمام ماہرین کی یہی رائے ہے۔ 1889ء میں ڈاکٹر وویلکر (Dr. Voelcker) کو جو انگلستان کی رائل اگریکلچرل سوسائٹی کا مشاورتی کیمسٹ (consulting chemist) تھا، ہندوستان بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ہندوستان کی زراعت کے متعلق تحقیقات کر سکے اور اس کو ترقی دینے کے لیے تجاویز پیش کر سکے۔ اس نے لکھا تھا "ایک بات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں یعنی انگلستان میں جو عام طور سے

سنہ 1830ء سے کچھ پہلے بنگال سے دھان کی برآمد 000،1 ٹن ہوگئی تھی اس کی بڑی وجہ

سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان میں جس کا اکثر اظہار کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی زراعت مجموعی اعتبار سے قدیم انداز کی اور پچھڑی ہوئی ہے اور یہ کہ اس کے تدارک کے لیے کوئی اقدام نہیں کیے گئے ہیں، سراسر غلط ہے...... بہترین حالت میں ہندوستان کا کسان اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا انگریز کسان بلکہ کچھ اعتبار سے اس سے بہتر ہوتا ہے۔ جہاں تک بدترین حالات کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حال کی ذمہ داری بڑی حد تک ترقی کرنے کے لیے سہولتیں میسر نہ آنے پر ہے۔ یہ ایسی دشواری ہے جس کی مثال کوئی دوسرا ملک پیش نہیں کرسکتا ہے اور کسان نہایت صبر و ضبط کے ساتھ ان دشواریوں کا مقابلہ کرتا ہے اور شکایت کا حرف اس کی زبان پر نہیں آتا۔ اس کی مثال بھی کوئی پیش نہیں کرسکتا۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر برطانوی کسانوں کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انگلستان کے لوگوں نے جب گیہوں کی کاشت شروع کی اس سے صدیوں پہلے ہندوستان کے لوگ اس کی کاشت شروع کرچکے تھے۔ اس لیے اس بات کا امکان کم ہے کہ ان کے طریقۂ کار میں تبدیلی کی گنجائش ہو۔ بڑی بڑی فصلیں پیدا کرنے میں جو چیز حائل ہوتی ہے وہ ان کے محدود وسائل ہیں مثلاً آب رسانی اور کھاد کی دشواریاں وغیرہ لیکن طریقۂ زراعت کے معمولات کو لیجیے۔ نرائی کے ذریعے وہ لوگ زمین کو گھاس سے جتنا پاک رکھتے ہیں اس سے زیادہ کوئی اور نہیں رکھ سکتا، پانی کو اوپر لے جانے کے لیے جو طریقے وہ استعمال کرتے ہیں ان میں بڑی جدت ہے، زمین اور اس کی پیداواری صلاحیتوں کے متعلق انھیں بڑی معلومات حاصل ہیں۔ اور فصل بونے اور کاٹنے کے صحیح وقت سے وہ واقف ہیں۔ یہ باتیں ہندوستان کے بہترین کسانوں تک محدود نہیں بلکہ معمولی کسانوں میں بھی یہ خوبیاں ہوتی ہیں۔ تعجب تو اس پر ہے کہ وہ کھیتوں میں باری باری سے فصل بونے، بیج ملا کر بوئی کرنے اور کھیتوں کو پرتی چھوڑنے کے طریقوں سے کتنی واقفیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے دورے میں جہاں جہاں میں نے قیام کیا وہاں احتیاط کے ساتھ کاشت کرنے اور اس میں جانفشانی، ثابت قدمی اور وسائل کی بارآوری کی جو مثالیں دیکھیں وہ کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔" ہندوستان کی زراعت کی ترقی کے متعلق رپورٹ۔

یہ تھی کہ انگلستان پہنچنے کے بعد دھان اُس مشین سے صاف کر لیے جاتے تھے جو حال ہی میں ایجاد ہوئی تھی ۔ پہلے صاف کیے ہوئے چاول بھیجے جاتے تھے جن میں بہت سا کوڑا کرکٹ ملا ہوا ہوتا تھا اور چاول ٹوٹ جاتے تھے ۔ مشین کی ایجاد کے بعد دھان جانے لگا جس کو انگلستان میں صاف کیا جاتا تھا اور امریکی چاول کی طرح تازہ اور صاف معلوم ہوتا تھا ۔ اگر چاول ہندوستان میں اسی طرح صاف کیا جاسکتا جیسا کیرولینا میں ہوتا تھا تو اس کی زیادہ مقدار برآمد کی جاسکتی تھی، اس لیے کہ چاول کے مقابلے میں دھان کا کرایہ دگنا ہوتا تھا اور وہ دگنی جگہ گھیرتا تھا ۔

نیل

نیل کی کوٹھیوں کے یورپین مالکوں کے تحت کسانوں کی حالت کے متعلق کسی قدر متضاد شہادتیں پیش کی گئیں جو غیر متوقع نہیں تھیں ۔ رمزے (Ramsey) نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ ان کسانوں کی حالت دوسرے کسانوں سے بدتر تھی جو یورپین یا غداروں کے لیے کام کرتے تھے، یورپین باغدار انھیں مجبور کرتے تھے کہ وہ نیل کی کاشت اپنی زمین کے اتنے حصے میں کریں جتنے حصے میں وہ نہیں کرنا چاہتے تھے اور یورپین باغدار زمین جوتنے والے کے حسب مرضی کاشت کرنے کے حق میں دخل اندازی کرتے تھے ۔ دوسرے گواہوں نے اس کے بیان کی تردید کی لیکن جو لوگ بنگال کے اُن حالات کا علم رکھتے ہیں جو سنہ 1860ء تک وہاں پائے جاتے تھے وہ جانتے ہیں کہ رمزے نے جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا تھا وہ مدتوں بنگال میں رائج رہیں ۔

نیل کی کوٹھیوں کے یورپین مالک یا باغدار کسانوں کو پیشگی روپیہ دیا کرتے تھے اور انھیں اس پر تیار کر لیا کرتے تھے کہ وہ ایک خاص قیمت پر نیل کے پودوں کی ایک خاص مقدار مہیا کریں گے ۔ اگر باغدار ظالم ہوتا تھا تو "کسان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ عدالت میں رجوع کرے مگر اس کی امید کم ہوتی ہے کہ عدالت اس کا مقدمہ سنے ۔ بنگال کے نچلے حصوں میں خصوصیت کے ساتھ مظالم کیے جاتے ہیں جہاں یورپین، وردو غلے لوگ آباد ہیں ۔"

کچھ ہندوستانی باغداروں کے بھی بہت سے کارخانے تھے لیکن اُن کا تیار کردہ نیل اتنا اچھا نہیں ہوتا تھا جتنا یورپینوں کا ہوتا تھا ۔ ہندوستانی باغداروں کے بنائے ہوئے

نیل کی مقدار میں اضافہ ہورہا تھا۔ نیل بنانے کے کام میں پانچ سو سے ہزار تک یورپین لگے ہوئے تھے۔ وہ عام طور سے انگلستان سے کوئی سرمایہ نہیں لاتے تھے بلکہ کلکتے کے ہندوستانیوں سے یا کمپنی کے یورپین ملازموں سے یا آڑھتیوں سے روپیہ قرض لے کر کارخانے شروع کرتے تھے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی سرمایہ کار نیل کا کاروبار کرنے کی نیت سے ہندوستان گیا ہو۔[1]

1790ء میں ہندوستان سے نیل آنا شروع ہوا اور چالیس سال میں اس کی مقدار اتنی بڑھ گئی کہ دوسرے ملکوں سے آنے والے نیل کی جگہ اس نے لے لی۔ نیل کی کاشت ڈھاکہ سے دہلی تک ہوتی تھی اور نو ملین پاؤنڈ برآمد کیا جاتا تھا۔ انگریز باغدار ہر سال لگان اور اجرت کے طور پر 16,08,000 پاؤنڈ خرچ کیا کرتے تھے۔ پیدا ہونے والے کل نیل کی قیمت کلکتہ میں 24,03,000 پاؤنڈ ہوتی تھی اور انگلستان میں 36,00,000 پاؤنڈ میں فروخت ہوتا تھا۔ بنگال میں تین سو یا چار سو کارخانے تھے جو زیادہ تر جیسور، کرشنا گڑھ اور ترہٹ میں واقع تھے۔ نیل کی کاشت کے لیے وہ زمین اچھی سمجھی جاتی تھی جہاں گنگا کا سیلاب آیا کرتا تھا۔ نیل کی کچھ کاشت مدراس اور بمبئی میں بھی ہوتی تھی۔ عام طور سے باغدار کلکتے کے بڑے بڑے تاجروں کے پاس اپنی املاک رہن رکھ کر دس یا بارہ فی صدی سود پر روپیہ قرض لیا کرتے تھے۔ چونکہ اس کاروبار میں خطرہ زیادہ تھا اس لیے سود کی شرح اونچی تھی۔ ہندوستانی باغدار نیل سازی میں یورپینوں کی نقل کرنے لگے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نیل کا کاروبار اور اس کی برآمد یورپین لوگوں نے نہیں شروع کی تھی، ایک رنگ کے طور پر مشرق کے لوگ مدتوں سے نیل سے واقف تھے اور اس کا استعمال کیا کرتے تھے۔ نیل سازی اور نیل کی برآمد ہندوستان کے لوگوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔[2]

نیل سازی کا پرانا ہندوستانی طریقہ ناقص تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یورپین

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت 1830ء، خلاصہ

[2] وہ شہادت جو ہاؤس آف کامنز کی 1830ء، 31-1830ء اور 1831ء کی رپورٹوں میں شامل تھی، خلاصہ۔

باغداروں کو نیل سازی کے لیے پیشگی روپیہ دینا شروع کیا اور 1819ء سے نیل کے ذریعے انگلستان کو بڑی بڑی رقمیں بھیجنی شروع کر دیں جس حادثے نے بنگال کے نیل کے کاروبار کو اچانک فروغ دے دیا وہ سینٹ ڈومنگو (St. Domingo.) کی تباہی تھی۔ انقلاب فرانس سے پہلے وہاں سے تمام دنیا کی منڈیوں کو نیل بھیجا جاتا تھا۔ لیکن وہاں کی کالی آبادی کی بغاوت کے بعد ایک پاؤنڈ نیل بھی باہر نہ جا سکا کیونکہ اس بغاوت میں نیل کے تمام کارخانے تباہ ہو گئے تھے[1]

شکر

دکن کے مختلف حصوں میں گنّے کی کاشت ہوتی تھی۔ اس کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی تھی۔ شکر سازی کا ہندوستانی طریقہ بہت سیدھا سادھا تھا اور شکر سازی کی مشینیں ناقص تھیں۔ ان میں ترقی کی بہت گنجائش تھی۔ کپاس اور نیل کی طرح گنّا بونے کی بھی پوری آزادی تھی۔ جزائر غرب الہند کی مشینیں یہاں لائی گئیں لیکن وہ گنّے میں سے اتنی شکر نہیں نکال سکیں جتنی شکر ہندوستان کی سیدھی سادھی مشینیں نکالتی تھیں اور نیا طریقہ شروع کرنے والوں کو گھاٹا ہوا۔ مالابار میں دو یورپینوں نے نیا طریقہ شروع کیا لیکن دونوں نے اسے ترک کر دیا۔ 1792ء سے 1803ء تک گنجم میں گنّے کی کاشت شروع کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کا نتیجہ اطمینان بخش نہیں نکلا[2]

یورپینوں نے گنّے کی کاشت اور شکر سازی کے کام میں اتنی سرگرمی نہیں دکھائی جتنی نیل سازی کے کاروبار میں وہ دکھاتے تھے۔ وہ منڈیوں سے یا کسانوں سے، جن کو پیشگی روپیہ دیا جاتا تھا، مال خرید لیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں استعمال ہونے والی مشینیں ان کے مقابلے میں کمتر درجے کی تھیں جو جزائر غرب الہند میں استعمال ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں گنّے کی کاشت بڑے پیمانے پر بھی نہیں کی جاتی تھی۔ ہندوستان کی شکر بھی جزائر غرب الہند کی شکر کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ کی تھی۔ بنگال میں پیدا ہونے والا گنّا جزائر غرب الہند کے گنّے

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء، خلاصہ۔

[2] ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے پیش کی جانے والی شہادت، 1830ء، خلاصہ

کی شکر کا تھا اور ایک خاص طریقے کو استعمال کر کے بہتر شکر بھی بنائی گئی تھی مگر اس کی لاگت اتنی زیادہ تھی کہ اس میں منافع نہیں ہو سکتا تھا۔ بنگال کی شکر کی مجموعی قیمت پر 12 فی صدی محصول لگایا جاتا تھا جو لاگت پر 200 فی صدی کے برابر تھا[1]

ایسی زمین ہندوستان میں بہت تھی جہاں گنے کی کاشت کی جا سکتی تھی لیکن شکر سازی کا طریقہ ناقص تھا۔ اگر اچھے قسم کے گنے کی کاشت کی جاتی اور گنے کے رس میں سے شکر نکالنے کا ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا جس میں خرچ کم ہوتا تو شکر کی مانگ بڑھ سکتی تھی۔ کمپنی کا ایک کارخانہ بنارس میں تھا جس کے گماشتے ملک میں گھوما کرتے تھے لیکن کچھ مدت پہلے شکر کی درآمد کو ممنوع قرار دینے کے لیے احکامات جاری ہو گئے تھے[2]

تمباکو

چونکہ تمباکو پیدا کرنے والے اور اس کو تیار کرنے والے اپنے کام میں مہارت نہیں رکھتے تھے اس لیے ہندوستان کی تمباکو امریکہ کی تمباکو کی ایک تہائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ تمباکو کے بیج کے انتخاب، زمین، زراعت، کٹائی، تیاری اور گڑیاں بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی۔ امریکہ کا مقابلہ تو ہندوستان نہیں کر سکتا ہے لیکن ہندوستان کی تمباکو کی مانگ بڑھ سکتی ہے بشرطیکہ اس کی کاشت میں مہارت پیدا کی جائے اور سرمایہ لگایا جائے[3]

یورپینوں نے تمباکو کی کاشت میں حصہ نہیں لیا اور اس کی داخلی تجارت کی انھیں اجازت نہیں دی گئی۔ بمبئی کے شمالی اضلاع میں تمباکو کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی اور وہاں بہت اچھی تمباکو پیدا ہوتی تھی۔ انگلستان میں درآمد ہونے والی ایک گڑیا تمباکو کی قیمت امریکہ کی تمباکو سے زیادہ تھی —— یہ چھ پنس میں فروخت ہوئی جب کہ امریکہ کی تمباکو کی ایک گڑیا 5 پنس میں بکتی تھی —— لیکن تجربے کے طور پر برآمد کی جانے والی تمباکو

---

1. ہاؤس آف کامنز کی رپورٹ برائے 1830ء، 31-1830ء اور 1831ء میں شامل کی جانے والی شہادت، خلاصہ۔

2. ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء، خلاصہ۔

3. ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1830ء، خلاصہ۔

کے لیے معلوم ہوا کہ اس کو پوری طرح سکھایا اور کمایا نہیں گیا تھا۔ بنگال اور بمبئی سے بھیجی جانے والی تمباکو کامیاب نہیں ثابت ہوئی۔ گجرات کے وہ کھیت جن میں تمباکو ہوتی تھی بہت صاف ستھرے تھے اور ان کی بہت دیکھ بھال ہوتی تھی اور مدراس میں کیمبٹور کی سب سے قیمتی پیداوار تمباکو تھی[1]۔

تمباکو کے لیے کوئی ہندوستانی لفظ موجود نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کی مقامی پیداوار نہیں ہے لیکن قدیم زمانے سے اس کی کاشت ہندوستان میں ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان میں اس کی کاشت زیادہ نہیں ہوتی تھی اور اس کو صرف اندرون ملک استعمال کے لیے پیدا کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس کو شیرے، گرم مسالوں اور پھلوں میں ملا کر استعمال کیا جاتا تھا۔ گوہانی زمین میں 160 پاؤنڈ فی ایکڑ تمباکو پیدا ہو سکتی تھی لیکن اوسط زمین میں اگر گیلی تمباکو 800 پونڈ فی ایکڑ ہو جاتی تھی تو اچھی پیداوار سمجھا جاتا تھا۔ عام طور سے ہندوستانی تمباکو خراب تھی مگر اس کو بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ شمالی سرکاروں کی تمباکو سے مسولی پٹم میں ٹاس بنائی جاتی تھی جس کی انگلستان میں بڑی قیمت ملتی تھی۔ بنگال میں بھاگل پور کے مقام پر ہوا ناکو بہت اچھی تمباکو تھوڑی مقدار میں پیدا کی جاتی تھی۔

رنگ اور شورا، کافی اور چائے

لاکھ کا رنگ انگلستان میں بڑی مقدار میں درآمد کیا جاتا تھا۔ لاکھ کا ٹکڑا اصل میں گوند ہوتا تھا جس سے رنگ بنایا جاتا تھا۔ اس کے اندر کیڑا یا اس کے انڈے ہوتے تھے۔ رنگ کے اجزا علیحدہ کر کے ان سے رنگ بنالیا جاتا تھا اور گوند سے چپڑا بنایا جاتا تھا۔ لاکھ کے رنگ سے کپڑے گہرے سرخ رنگے جاتے تھے لیکن اس کو بہت نفیس رنگ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لاکھ وارنش کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

قرمز مدراس کے جنوبی حصے میں پایا جاتا تھا اور میکسیکو کے کیڑے کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ 1820ء کے بعد قرمز کی قیمت ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔ غالباً لاکھ کے رنگ

1۔ ہاؤس آف کامنز کی رپورٹ برائے 1830ء، 31-1830ء اور 1831ء میں شامل کی جانے والی شہادت، خلاصہ۔

کی وجہ سے اس کی قیمت گر گئی تھی۔ بنگال سے قرمز نہیں منگایا جاتا تھا۔[1]

1815ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1،67،000 ہنڈرڈیڈویٹ شورا انگلستان میں درآمد کیا لیکن 1832ء میں صرف 37،300 ہنڈرڈیڈویٹ شورا درآمد کیا گیا۔ 1815ء میں شورے کی قیمت 89 شلنگ 6 پنس فی ہنڈرڈیڈویٹ تھی۔ 1822ء میں یہ قیمت گھٹ کر 27 شلنگ رہ گئی تھی۔ 1815ء سے پہلے شورے کی درآمد کمپنی کے لیے منافع بخش تھی لیکن اس کے بعد وہ غیر منافع بخش ہو گئی تھی۔[2]

کافی کی کاشت میں اضافہ 1823ء کے بعد ہوا۔ 1823ء میں حکومت نے کافی کے باغداروں کو کاشت کی اجازت دی اور انھیں اجازت دی کہ وہ زمین پر مدتوں تک قبضہ و دخل رکھ سکتے ہیں۔ یہ ایسی سہولت تھی جو کسی دوسرے قسم کے یورپین باغداروں کو نہیں دی گئی تھی۔ بنگال میں 6،000 ایکڑ پر کافی کی کاشت کی گئی۔ حالانکہ وہ موچا کی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی پھر بھی بنگلور کی کافی اچھی ہوتی تھی اور اس کی کاشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آرکاٹ میں کافی کی کاشت کی کوشش ناکام رہی اور گنجم میں کوکو کی کاشت میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کافی کے لیے بنگال کی دھوپ زیادہ تیز تھی۔ کیمبٹور میں کافی کی کاشت بہت کامیاب ثابت ہوئی۔[3]

اس وقت تک ہندوستان میں چائے کی کاشت شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ڈاکٹر والک نے دھان کی کاشت کے متعلق جس کی شہادت کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے، ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں چائے کی کاشت کرنے کے امکانات کے متعلق بیش قیمت تجاویز پیش کیں۔ اُن کے کچھ اقتباسات ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔

---

1. ہاؤس آف کامنز کی رپورٹوں برائے 1830ء اور 31-1830ء، 1831ء میں شامل کی جانے والی شہادت، خلاصہ

2. ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش کی جانے والی شہادت، 1830ء، خلاصہ

3. ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1830ء۔ ہاؤس آف کامنز کی رپورٹوں برائے 1830ء، 31-1830ء اور 1831ء میں شامل شہادت اور ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء خلاصہ۔

"اس پودے کی سب سے زیادہ کاشت چینی سلطنت کے ان صوبوں میں کی جاتی ہے جو شمالی عرض البلد کے ستائیسویں اور تیئیسویں متوازی خطوط کے درمیان واقع ہیں۔ ان علاقوں میں قریب قریب تمام تر سیاہ چائے پیدا کی جاتی ہے لیکن جنوب میں بھی قریب قریب کینیٹن کے ساحل تک اس کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔"

"پینانگ میں مرحوم مسٹر براؤن کو غیر متعلقہ واقعات کی بنا پر یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ چائے کے پودے کے لیے اس جزیرہ کی آب وہوا موافق ہے۔ اس بنا پر اس نے چائے کی کاشت کا منصوبہ بنایا تھا ...... مجموعی اعتبار سے پودے کی نشوونما اچھی ہوئی لیکن جب پتیاں چننے کا وقت آیا تو اس پر جتنی محنت کی گئی تھی، جتنا وقت صرف ہوا اور جو لاگت آئی اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ پیدا ہونے والی چائے بہت ادنیٰ قسم کی ثابت ہوئی ......

"جاوا میں کیے جانے والے تجربات بھی بے سود ثابت ہوئے جو ایسے ہی حالات میں کیے گئے تھے، اور اس بنا پر ان کو ترک کر دیا گیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد ڈچ حکومت نے لنکا کے جنوبی حصوں میں اس قسم کے تجربے کیے لیکن ان میں بھی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔"

"تقریباً بیس سال پہلے ریو جینرو (*Rio Janeiro*) میں چائے کی کاشت بڑے پیمانے پر شروع کی گئی ..... پیدا کی جانے والی چائے کا ذائقہ اتنا خراب تھا کہ کچھ مدت پہلے باغات کو قریب قریب ختم کر دیا گیا ہے۔"

"مجھے برزیلس (*Brazils.*) میں پیدا ہونے والی چائے کو پرکھنے کا موقع ملا تھا ..... اس کی پتی سے بنی ہوئی چائے انتہائی بدمزہ تھی۔"

"برطانوی سلطنت میں ہندوستان میں کچھ ایسے علاقے ہیں جن کی آب وہوا ان صوبوں کی آب وہوا سے بالکل ملتی ہے جہاں چائے پیدا کی جاتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں ایسی چائے پیدا کی جا سکتی ہے جو چین کی بہترین چائے کا مقابلہ کر سکے .... کمایوں، گڑھوال اور سیرمور کے صوبوں کے حالات اُن صوبوں سے مطابقت رکھتے ہیں جو چین اور جاپان کے صوبوں کے متعلق ہمارے علم میں ہیں جن میں چائے کے پودے کی کاشت بڑے پیمانے پر اور بڑی کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے۔"

"میں اس سے پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ کمیلا کی ایک قسم نیپال کے جنگلوں میں پائی جاتی

ہے۔ 1818ء میں اس کی کیفیت شائع کرتے وقت یہ بات میرے علم میں آئی کہ کھٹمنڈو کے ایک باغ میں چائے کا ایک پودا لگا ہوا ہے اور اس کی نشوونما ہو رہی ہے۔ وہ دس فیٹ اونچا ہے اور سال کے آخری چار مہینوں میں اُس میں بہت سے پھول اور پھل آتے ہیں۔ کچھ مدت بعد جب میں کھٹمنڈو گیا تو میں نے اس پودے کو دیکھا اور دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ گورکھا حکومت کا چین بھیجا ہوا ایک سہ سالہ سفیر اس کے بیج پیکنگ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔"

"اس کی موافقت میں ملنے والی تمام شہادتوں پر غور کرنے کے بعد ہم یقینی طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس بات کا انتظام اگر اچھی طرح کیا جائے تو مستقبل قریب میں عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں چائے کے پودے کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جا سکتی ہے اور ہمیں زیادہ مدت تک متمدن زندگی کی تسکین و آسائش کی ایک شے کے لیے ایک مطلق العنان قوم کی مرضی کے تابع نہیں رہنا ہوگا۔"[1]

ڈاکٹر والک نے یہ خط 2 رفروری 1832ء کو لکھا تھا اور ہم بجا طور سے اس کو ہندوستان میں چائے کی صنعت کے رہنماؤں میں شمار کر سکتے ہیں۔ رہنماؤں میں اس کا مقام اس گمنام گورکھا سفیر کے بعد ہونا چاہیے جس نے نیپال کو چائے سے روشناس کرایا۔

سونا، لوہا اور تانبا

نیل گری میں بہت اچھے قسم کا سونا دستیاب ہوا تھا۔ تھوڑا بہت سونا پہاڑوں کی ترائی میں واقع یوی ناد کے ضلع میں بھی ملا تھا۔ ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں خام لوہا بھاری مقدار میں پایا جاتا تھا۔ رام ناد میں ہندوستانی لوہے کی قیمت برطانیہ اور سوئیڈن کے لوہے کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ یہ زیادہ لچکدار ہوتا تھا لیکن اس کی تیاری میں دھات بہت ضائع جاتی تھی۔ ہندوستان میں تیار کیا جانے والا لوہا برطانوی لوہے کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوہا تیار کرنے کا برطانوی طریقہ

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے دی جانے والی شہادت، 1832ء، حصہ دوم، ضمیمہ 21۔

ہندوستانی طریقے سے بہتر تھا۔

بنگال میں واقع بردوان کے نواح میں ملنے والا خام لوہا اچھا ہوتا تھا مگر مدراس کے ساحل پر دستیاب ہونے والا لوہا اس سے بہتر تھا۔ اس کو فولاد میں تبدیل کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن اگر ایسا کیا جاتا تو بہتر قسم کا فولاد تیار ہوتا تھا۔ مسٹر ہیتھ نے مدراس کے قریب لوہے کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا، جس میں ولایتی مشینیں نصب کی تھیں اور چارٹر کی مدّت ختم ہونے تک لوہا تیار کرنے کی صنعت میں اس کو اجارہ داری کے حقوق حاصل رہے تھے۔ اس کا بنا ہوا لوہا نہ صرف ہندوستانی لوہے سے بہتر ہوتا تھا بلکہ سوئیڈن کے بنے ہوئے لوہے سے بھی بہتر ہوتا تھا۔ مالابار کی سرحد پر خام لوہا بڑی مقدار میں پایا جاتا تھا اور کمبیٹور میں وہ انتہائی سستا تھا۔ کچھ کے علاقہ کا خام لوہا خاص طور سے اچھا ہوتا تھا۔ یہ لوہا زیادہ تر زمین کی سطح پر دستیاب ہوتا تھا۔ اس کو ٹوکریوں میں جمع کرکے لکڑی کے کوئلے سے پھونکا جاتا تھا۔ ہندوستان میں سب سے اچھا فولاد کچھ میں تیار کیا جاتا تھا جس سے زرہ بکتر اور تلوار وغیرہ بنائی جاتی تھی۔ ہندوستان کے شمال مغربی صوبجات میں تانبہ دستیاب ہوتا تھا۔[1] بنگال میں واقع بردوان کے ضلع میں کوئلے کی بڑی بڑی کانیں تھیں۔ ۱۸۳۲ء میں ان سے ہر سال 14,000 یا 15,000 ٹن کوئلہ نکالا جاتا تھا۔ کانوں سے کوئلہ نکالنے کا کام ۱۸۱۴ء میں شروع ہو گیا تھا لیکن ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ زیادہ کوئلہ نکالا جانے لگا۔ کوئلے کی تہہ جو تقریباً ۹ فیٹ کی دبازت رکھتی تھی زمین کی سطح سے تقریباً ۹۰ فیٹ کی گہرائی پر واقع تھی اور اس میں تقریباً دو تین ہزار مزدور کام کیا کرتے تھے۔ ہر مزدور کو چھ شلنگ آٹھ پنس ماہوار اجرت ملا کرتی تھی۔ کوئلہ زیادہ تر بھاپ کے انجنوں میں استعمال ہوتا تھا اور اس مقصد کے لیے سنگاپور بھیجا جاتا تھا۔ کچھ کوئلہ اینٹیں پکانے کے کام بھی آتا تھا۔ کوئلہ بندیل کھنڈ میں بھی دریافت ہوا تھا اور کچھ میں بڑی مقدار میں پایا گیا تھا۔[2]

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی رپورٹیں برائے ۱۸۳۰ء، ۳۱-۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۱ء میں شامل شہادت خلاصہ۔

[2] ہاؤس آف کامنز کی رپورٹیں برائے ۱۸۳۰ء، ۳۱-۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۱ء میں شامل شہادت، خلاصہ۔

کچھ کا کوئلہ بھاپ کے انجنوں کے لیے اچھا نہیں ثابت ہوا اور بمبئی میں انگریزی کوئلہ سستا پڑتا تھا۔ بردوان کا کوئلہ ہندوستان کا بہترین کوئلہ تھا اور کلکتہ میں کوئی دوسرا کوئلہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی قیمت دس آنہ (ایک شلنگ 3 پنس) فی اشبل تھی۔ یہ کوئلہ پٹر پانے کے بجائے جل کر سفید راکھ ہو جایا کرتا تھا۔ جہاں تک لوہا بنانے کے عمل کا تعلق تھا ہندوستانی کوئلہ اتنا اچھا ثابت نہیں ہوتا تھا جتنا انگریزی کوئلہ۔ بہترین انگریزی کوئلے اور بہترین بنگالی کوئلے میں قوت کے اعتبار سے 5 اور 3 کا تناسب تھا۔

ہندوستان کے جنگلوں میں دنیا میں پائی جانے والی ہر قسم کی لکڑی یا اس کا بدل مل جایا کرتا تھا۔ لکڑی کی خاص خاص قسمیں تھیں ساگوان، سال، سی سو، تون، جارول اور آم۔ سال سے جہاز بنائے جاتے تھے، یہ لکڑی عمارتوں اور فوجی مقاصد کے لیے بھی استعمال کی جاتی تھی۔ انتظامات کی خرابی اور اس پر ہونے والے غیر ضروری اخراجات کی وجہ سے سال، سی سو اور بانس کی پیداوار کم ہوتی جا رہی تھی۔ چیڑ اور شاہ بلوط کے درخت بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ہندوستان کی لکڑی بدیسی تجارت کی ایک مد بن سکتی ہے۔[1]

افیم اور نمک

ان اشیا کی حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسی طرح اجارہ داری برقرار رکھی جس طرح آج تک حکومت ہند اس کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ اشیا آمدنی کے اہم ذرائع تھے۔

ہولٹ میکنزی نے جو ان اہم گواہوں میں شامل تھا جن کی شہادت ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی نے 1832ء میں قلمبند کی تھی کہا تھا "افیم اور نمک بنانے کا کام تجارت کے بجائے آمدنی کے لیے کیا جاتا ہے۔ افیم اور نمک کے متعلق جو بھی تجاویز پیش کی گئی ہیں میرے خیال میں ان میں سے کوئی بھی تجویز ایسی نہیں جس کی وجہ سے آمدنی میں بڑی کمی نہ واقع ہو۔ جہاں تک نمک کے محکمے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اکسائز ڈیوٹی لگا کر ہم اتنی خالص آمدنی نہیں حاصل کر سکتے جتنی کہ نمک کی عام فروخت سے حاصل ہوتی ہے.....

"دوسرے ذریعہ سے بھی (افیم) سے بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ قیمت فروخت کی صورت

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش کی جانے والی شہادت، 1832ء، خلاصہ۔

میں لاگت سے زیادہ جو رقم ملتی ہے وہ اس قسم کا محصول ہوتا ہے جو میری رائے میں کسی اور طریقے سے وصول نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ تجارتی نقطۂ نظر سے اس طریقے پر سخت اعتراض کیے جا سکتے ہیں لیکن ہمیں ان اعتراضات کے مقابلے میں روپے کی ضرورت پر نظر رکھنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم کسی اور طریقے سے اتنی رقم نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔"[1]

خلاصہ

مندرجہ بالا تلخیص سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شہادت ۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۲ء کی درمیانی مدت میں ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز کی کمیٹیوں نے قلمبند کی تھی اس میں ہندوستان کی عصری صنعتوں کے متعلق اسی طرح بیش بہا معلومات ملتی ہیں جس طرح ۱۸۰۰ء اور ۱۸۱۵ء کی درمیانی مدت کی صنعتوں کے متعلق ڈاکٹر فرانسس بکانن کے بیان میں ملتی ہیں۔ ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز نے اپنی تحقیقات ان صنعتوں تک محدود رکھی جن میں برطانوی سرمایہ لگا تھا یا منفعت بخش طریقے سے لگایا جا سکتا تھا۔ لاکھوں انسانوں کو روزگار فراہم کرنے والی معمولی صنعتوں میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مثلاً راج گیری اور فن تعمیر، پتھر کاٹنا اور بڑھئی کا کام، کشتی سازی اور لکڑی کا سامان بنانا، بھرت، لوہے اور تانبے کے برتن بنانا، سونے اور چاندی کا کام، کپڑا رنگنے اور چمڑا رنگنے کا کام اور ہندوستان کی کتائی اور بنائی کی زوال پذیر صنعتیں۔

قلمبند ہونے والی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک زراعتی سرگرمیوں کا تعلق تھا انگلستان کچھ نہیں سکھا سکتا تھا۔ لیکن غذائی غلّوں کو صاف کرنے میں، سوت کاتنے اور کپڑا بننے میں، نیل سازی میں، تمباکو، شکر، کافی اور چائے پیدا کرنے میں، لوہے کا سامان بنانے میں، کوئلے اور سونے کی کان کنی میں غرض کہ ان تمام صنعتوں میں جو مشینوں پر منحصر تھیں ۱۸۳۰ء میں یورپ میں جو طریقے اختیار کیے جا چکے تھے وہ ہندوستان کے طریقوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھے۔ یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ایسی حکومت جو قومی

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، ۱۸۳۲ء، حصہ اول، صفحہ 26۔

صنعتوں کو ترقی دینے کی خواہشمند ہوتی وہ ہندوستان کے ہنرمند اور محنتی لوگوں کو ان بہتر طریقوں سے اُسی طرح روشناس کراتی جس طرح ہماری زندگی میں وہ جاپان میں رائج کیے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتی تھی کہ بدیسی تاجر اور حریفانہ جذبات رکھنے والے صنعت کار جو منافع کمانا چاہتے ہوں اس مقصد کو پیش نظر رکھیں۔ چنانچہ اس قسم کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس ایسی پالیسی پر عمل کیا گیا کہ حتی الامکان ہندوستانی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات نے لے لیں ۔ 1832ء کی پارلیمانی تحقیقات کے پانچ سال بعد منٹگمری مارٹن نے ایک تحریر میں اس زمانے کی تجارتی پالیسی کی سخت مذمت کی تھی۔

"جب یہ سرکاری رپورٹ (شمالی ہند میں ڈاکٹر بکانن کی معاشی تحقیقات) حکومت ہند کو پیش کی گئی تو اس کے بعد انگلستان یا ہندوستان میں ان لوگوں کی تکلیفیں دور کرنے کے لیے کیا کوئی اقدام کیا گیا جو ہماری حرص و ہوس اور خود غرضی کا شکار ہیں۔ اس کا جواب نفی میں دینا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس ہم نے ان لوگوں کو زیادہ تباہ کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جو برطانوی کاروبار کی ظالمانہ خود غرضی کے قابل رحم شکار ہیں۔ قاری ان صفحات پر دیکھ سکتا ہے کہ ان ضلعوں میں جن کی جانچ کی گئی تھی کتنے لوگوں کی گزر بسر کا بڑا ذریعہ سوتی کپڑا وغیرہ بننے کی مہارت ہے۔ آزاد تجارت کے نام پر انگلستان نے ہندوؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ برائے نام محصول درآمد کے ساتھ لنکاشائر، یارک شائر، گلاسگو وغیرہ کے بھاپ سے چلنے والے کرگھوں کی پیداوار حاصل کریں۔ دوسری طرف بنگال اور بہار کے بنے ہوئے خوبصورت اور دیرپا کپڑوں پر، انگلستان میں بہت بھاری بلکہ امتناعی محصول درآمد عاید کیا جاتا ہے۔"[1]

ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی نے گواہ، ہولٹ میکنزی، سے دریافت کیا کہ "ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں سب سے زیادہ انگریز سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ کیا ہندوستانیوں میں انگریزی مذاق، فیشن اور طور طریق اختیار کرنے کا شوق بڑھا ہے؟"

ہولٹ میکنزی نے جواب دیا "کلکتہ کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں میں

---

[1] منٹگمری مارٹن، 'Eastern India' (لندن، 1838ء) جلد سوم، دیباچہ۔

انگریزی آرائشی اشیاء کے استعمال کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ ان کے مکانات میں بڑا اچھا سامان ہوتا ہے، ان میں بہت سے لوگ گھڑیاں استعمال کرتے ہیں، وہ گاڑیوں کو پسند کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ شراب پیتے ہیں۔"

ہندوستان میں مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثر کے متعلق اس اہم شہادت کو سن کر انگلستان کے ہاؤس آف کامنز کے سنجیدہ اور قابلِ احترام اراکین کے ہونٹوں پر اِن طمانیت بخش حالات نے مسکراہٹ کی لہر دوڑا دی ہو گی۔

باب 16

بیرونی تجارت (1813ء۔1835ء)

1813ء کے ایک ایکٹ کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ممالک محروسہ کے اخراجات تجارتی اخراجات سے علیحدہ کردیے گئے اور اس امر کی ہدایت کی گئی کہ ممالک محروسہ کی آمدنی سے: (1) فوجی اخراجات پورے کیے جائیں (2) سول اور تجارتی عملے کی تنخواہیں دی جائیں (3) اور ہندوستان کے ذمے جو قرض تھا اس کا سود ادا کیا جائے اور کاروباری منافع کو (1) ہنڈیوں کا روپیہ ادا کرنے اور رواں قرض چکانے کے لیے (2) حصہ رسدی منافع کی ادائیگی کے لیے اور (3) ہندوستان کے قرض کو ادا کرنے یا اس قرض کو کم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جس کے تمسکات انگلستان میں تھے۔

1813ء اور 1828ء کی درمیانی پندرہ سال کی مدت میں ممالک محروسہ کی آمدنی حسب ذیل تھی۔

بنگال	19,61,21,983 پاؤنڈ
مدراس	8,20,42,967 "
بمبئی	3,09,86,870 "
اور دو اور ذیلی مراکز	19,31,480 "
کل میزان	31,10,83,300 پاؤنڈ

اس طرح ممالک محروسہ کی سالانہ اوسط آمدنی بیس ملین پاؤنڈ سے زیادہ آتی ہے۔ وہ "گھریلو اخراجات" جو ممالک محروسہ کی آمدنی میں سے انگلستان میں کیے جاتے تھے ان کا سالانہ اوسط 16,93,472 پاؤنڈ تھا۔ اس طرح ممالک محروسہ کے مجموعی اخراجات

ـہ1 Act 53 Geo 111, 5,155

اس کی مجموعی آمدنی سے زیادہ ہوا کرتے تھے اور ہر سال اوسطاً 12،27،343 پاؤنڈ کا خسارہ ہوتا تھا۔ اس پندرہ سال کی مدت میں ممالک محروسہ پر قرض تیس ملین پاؤنڈ سے بڑھ کر سینتالیس ملین پاؤنڈ ہو گیا تھا۔ 37 سال میں کمپنی کے ممالک محروسہ کے قرض میں بتدریج ہونے والے اضافے کو مندرجہ ذیل اعداد و شمار کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے[1]

اپریل سنہ 1792ء	91،42،720 پونڈ
" سنہ 1809ء	3،08،12،441 "
سنہ 1814ء	3،09،19،620 "
" سنہ 1829ء	4،72،55،374 "

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض میں بڑا اضافہ لارڈ ویلزلی اور لارڈ ہیسٹنگز کے زمانوں میں ہوا جنھوں نے جنگی پالیسی اختیار کی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہنڈیوں کی اور منافع کی رقم ادا کرنے کے بعد کمپنی کی کاروباری آمدنی کا جو روپیہ بچتا تھا اس سے ہندوستان کا قرض یا ایسا قرض ادا کیا جاتا تھا جس کے تمسکات انگلستان میں ہوتے تھے لیکن کاروباری منافع کی یہ بچت سنہ 1814ء، سنہ 1817ء اور سنہ 1818ء میں ایک ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھی، سلطنت کی توسیع اور کمپنی کی تجارت میں کمی کے ساتھ رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور سنہ 1828ء اور سنہ 1830ء کی درمیانی مدت میں صرف 3000 پاؤنڈ سے 000، 2، 4 پاؤنڈ تک رہ گئی۔ سنہ 1824ء کے بعد کمپنی نے ہندوستان کو تجارتی مال بھیجنا بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ صرف فوجی اور سیاسی ضرورت کا سامان بھیجا کرتی تھی۔ ہندوستان کو مال بھیجنا بند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بدلے میں انگلستان بھیجنے کے لیے ہندوستان کی پیداوار یا مصنوعات کا حاصل کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی صنعتوں کا زوال ہو چکا تھا اور کمپنی صرف ہندوستان کا خام ریشم، کچھ ریشمی کپڑا، شورا اور نیل انگلستان بھیجتی تھی۔ نیل کی خریداری کلکتے میں کی جاتی تھی، خام ریشم اور شورا خود کمپنی کے کارخانوں میں تیار کیا جاتا تھا اور ریشم کے تھان حاصل کرنے کے لیے بنکروں کے

---

1. اس شہادت کی روداد جو ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی، سنہ 1832ء جلد 2، رپورٹ۔

سربراہوں سے معاہدے کیے جاتے تھے۔ انگلستان کو ہندوستانی شکر کی برآمد بھی رک چکی تھی۔ ہندوستان کے ساتھ کمپنی کی تجارت میں رفتہ رفتہ ہونے والی کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1832ء میں چارٹر کی تجدید کے وقت کمپنی کی تجارت بالکل ختم کر دی گئی۔

ہندوستان کے ساتھ کمپنی کی تجارت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور ان نجی تاجروں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا جنھیں 1813ء میں پہلے پہل اس کی اجازت دی گئی تھی۔ 1813ء کے بعد کے سولہ برسوں میں کمپنی کی سالانہ تجارت کا اوسط 718 ، 2 8 ، 18 پاؤنڈ تھا اور نجی تجارت کا سالانہ اوسط 452 ، 51 ، 54 پاؤنڈ تھا۔ نجی تجارت کمپنی کی تجارت کی تگنی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مالکوں کے مقابلے میں نجی تاجر ہندوستان سے تجارت کرنے کے زیادہ اہل ثابت ہوئے۔ لیکن نئے انتظام میں بھی ہندوستانی مصنوعات کو ختم کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ 1813ء میں کلکتہ سے دو ملین پاؤنڈ کی مالیت کا سوتی کپڑا لندن بھیجا گیا لیکن 1830ء میں دو ملین پاؤنڈ کی مالیت کا انگریزی سوتی کپڑا کلکتے میں درآمد کیا گیا۔ برطانیہ سے سوتی دھاگہ پہلے پہل 1823ء میں ہندوستان آیا تھا۔ 1824ء میں 1,21,000 پاؤنڈ دھاگہ درآمد کیا گیا تھا۔ 1828ء اس کی مقدار بڑھ کے 40,00,000 پاؤنڈ ہو گئی تھی۔ اونی کپڑا، تانبا، سیسہ، لوہا، شیشے کا سامان اور مٹی کے برتن بھی درآمد کیے جاتے تھے۔ کلکتہ میں درآمد ہونے والے برطانوی مصنوعات پر $2\frac{1}{2}$ فی صدی کا معمولی محصول عاید کیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف برطانیہ میں درآمد ہونے والے ہندوستانی مصنوعات کی قیمت پر 100 فیصدی تک محصول عاید کر کے درآمد میں رکاوٹ ڈالی جاتی تھی۔[1]

1812ء اور 1832ء کی درمیانی مدت میں انگلستان میں درآمد ہونے والے ہندوستانی مصنوعات میں شامل اشیاء تجارت پر عائد کیا جانے والا محصول مندرجہ ذیل نقشے میں دکھایا گیا ہے۔[2]

---

1. ہاؤس آف کامنز کی رپورٹوں برائے 1830ء، 31-1830ء اور 1831ء میں شامل شہادت، خلاصہ۔

2. ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت 1832ء، جلد 2، ضمیمہ 5۔

	1812ء	1824ء	1832ء
	قیمت پر فی صدی	قیمت پر فی صدی	قیمت پر فی صدی
بید کا بنا ہوا آرائشی سامان	71	50	30
ململ	27	$37\frac{1}{2}$	10
چھینٹیں	$71\frac{2}{3}$	$67\frac{1}{2}$	10
دوسرا سوتی کپڑا	$27\frac{1}{3}$	50	20
بکری کی اون کی شالیں	71	$67\frac{1}{2}$	30
سنہرا روغن کیا ہوا سامان	71	$62\frac{1}{2}$	30
چٹائیاں	$68\frac{1}{3}$	50	20

	1812ء	1824ء	1837ء
خام ریشم	2 پاؤنڈ 13 شلنگ ۴ پنس قیمت پر اس کے علاوہ ۴ شلنگ فی پاؤنڈ	چار شلنگ فی پاؤنڈ	1 پنس فی پاؤنڈ
ریشم کے مصنوعات	ممنوع	ممنوع	قیمت پر 20 فی صدی
تانتہ یا دوسرا سادہ یا کامدار ریشمی	ممنوع	ممنوع	قیمت پر 30 فی صدی
کپڑا، ریشم کی بنی ہوئی مختلف اشیا	ممنوع	ممنوع	قیمت پر 20 فی صدی
شکر (لاگت تقریباً ایک پونڈ فی ہنڈرویٹ)	ایک پونڈ 13 شلنگ فی ہنڈرویٹ	3 پاؤنڈ 3 شلنگ فی ہنڈرویٹ	ایک پاؤنڈ 12 شلنگ فی ہنڈرویٹ
عرق	ایک شلنگ 8 پنس فی گیلن، اس کے علاوہ ۱۹ شلنگ $1\frac{1}{2}$ پنس اکسائز ڈیوٹی	دو شلنگ ایک پنس فی گیلن، اس کے علاوہ ۱۷ شلنگ $\frac{3}{2}$ پنس اکسائز ڈیوٹی	15 شلنگ فی گیلن
روئی	16 شلنگ 11 پنس فی 100 پونڈ	6 فی صدی	20 فی صدی

انگلستان میں درآمد ہونے والے ہندوستانی مصنوعات پر اس غیرمنصفانہ اور بھاری محصول کے خلاف ہاؤس آف کامنز میں عرضداشتیں پیش کی گئیں۔ تسکر اور عرقیات پر لگنے والی ڈیوٹی کے خلاف پیش ہونے والی ایک عرضداشت پر تقریباً چار سو انگریز اور ہندوستانی تاجروں نے دستخط کیے تھے۔ اُن دستخطوں میں رام گوپال گھور کا نام دیا ہوا ہے۔ غالباً مشہور ہندوستانی صحافی رام گوپال گھوس کا نام غلط چھپ گیا ہے۔ سوتی اور ریشمی کپڑوں پر محصول کم کرنے کے لیے ایک درخواست برطانوی حکومت کو پیش کی گئی تھی جس پر بہت سے باعزت ہندوستانیوں کے دستخط تھے۔ یہ درخواست مسترد کردی گئی۔ اس پر کچھ لندن کے تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو درخواست دی کہ ان کپڑوں کے انگلستان آنے پر محصول میں $2\frac{1}{2}$ فی صدی کی مجرائی دی جائے۔ اس درخواست سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

انگلستان کی غیرمنصفانہ تجارتی پالیسی نے ہندوستان کے مصنوعات کو کسی حد تک تباہ کیا یہ بات مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتی ہے جس میں 30 سال کی مدت میں کلکتے کے بندرگاہ سے باہر بھیجے جانے والے مال کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہ اعداد و شمار صرف اس مال سے تعلق رکھتے ہیں جو انگلستان بھیجا گیا۔

سال	روئی گانٹھیں	سوتی کپڑا گانٹھیں	ریشم گانٹھیں	ریشمی کپڑا گانٹھیں	لاکھ اور لاکھ کا رنگ۔ من	تیل پیٹیاں
1800ء	506	2,636	213	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	12,811
1801ء	222	6,341	238			9,928
1802ء	2072	14,817	400			8,694
1803ء	2420	13,649	1,232			12,986
1804ء	602	9,631	1,926			18,339
1805ء	2453	2,325	1,327			13,486
1806ء	7315	651	1,689			17,542
1807ء	3717	1,686	482			19,452

سال	روئی گانٹھیں	سوتی کپڑا گانٹھیں	ریشم گانٹھیں	ریشمی کپڑا گانٹھیں	لاکھ اور لاکھ کا رنگ. من	نیل پیٹیاں
1808ء	2016	237	817			16,622
1809ء	40,781	104	1,124			8,852
1810ء	3477	1,167	949			13,264
1811ء	160	955	2,623			14,335
1812ء	-------	1,471	1,889			13,703
1813ء	11,705	557	638	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	23,672
1814ء	21,587	991	1,786			16,544
1815ء	17,228	3842	2,796			26,221
1816ء	85,024	2,711	8,884			15,740
1817ء	50,176	1,904	2,260			15,583
1818ء	1,27,124	666	2,066			13,044
1819ء	30,683	536	6,998	468		16,670
1820ء	12,939	3,186	6,805	522		12,526
1821ء	5,415	2,130	6,977	704		12,625
1822ء	6,544	1,668	7,893	950		19,751
1823ء	11,713	1,354	6,357	742	14,190	15,878
1824ء	12,415	1,337	7,069	1,105	17,607	22,472
1825ء	15,800	1,878	8,061	1,558	13,491	26,837
1826ء	15,101	1,253	6,856	1,233	13,573	14,904
1827ء	4,735	541	7,719	971	13,756	30,761
1828ء	4,105	736	10,431	550	15,379	19,041
1829ء	-----	433	1,000(?)		8,251	27,000(?)

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپین باغداروں کے پیدا کردہ نیل کی مقدار بڑھتی رہی، خام ریشم کی برآمد بحال رہی لیکن ریشمی کپڑے کی برآمد کم ہوتی گئی۔ روئی کی برآمد بھی کم ہو رہی تھی لیکن سوتی کپڑے کی برآمد میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے پہلے چار سال میں ممانعت اور پابندی عائد کرنے والی ڈیوٹی کے باوجود ہر سال کلکتے سے چھ ہزار سے پندرہ ہزار تک گانٹھیں انگلستان درآمد کی جاتی تھیں۔ یہ تعداد تیزی کے ساتھ کم ہونے لگی اور 1813ء کی سطح پر آ گئی۔ 1813ء میں تجارت کا حق نجی تاجروں کو حاصل ہو گیا جس کی وجہ سے 1815ء میں انگلستان جانے والی گانٹھوں میں یک بارگی اضافہ ہو گیا لیکن یہ اضافہ عارضی ثابت ہوا۔ 1830ء کے بعد سوتی کپڑا بنانا اور باہر بھیجنا کم ہوتا گیا اور اس کے بعد پھر کبھی اس میں اضافہ نہ ہو سکا۔ دنیا کے دوسرے ممالک خصوصاً امریکہ، ڈنمارک، اسپین، پرتگال، مارشیس اور ایشیا کی دوسری منڈیوں کو جانے والے ہندوستان کے سوتی کپڑے میں کمی واقع ہونے لگی۔ امریکہ کو 1801ء میں 13,633 گانٹھیں بھیجی گئی تھیں لیکن 1829ء میں اُن کی تعداد کم ہو کر صرف 258 رہ گئی۔ ڈینمارک کو 1800ء میں 1,457 گانٹھیں بھیجی گئی تھیں لیکن 1820ء کے بعد وہاں 150 گانٹھوں سے زیادہ کبھی نہیں بھیجی جا سکیں۔ 1799ء میں 9,714 گانٹھیں پرتگال بھیجی گئی تھیں لیکن 1825ء کے بعد وہاں ایک ہزار گانٹھوں سے زیادہ کبھی نہیں گئیں۔ 1810ء اور 1820ء کی درمیانی مدت میں خلیج عرب اور خلیج فارس کے ممالک کو چار ہزار سے سات ہزار گانٹھیں تک بھیجی جاتی تھیں لیکن 1825ء کے بعد وہاں دو ہزار سے زیادہ گانٹھیں کبھی نہیں جا سکیں۔

ہندوستان میں کپڑے کی صنعت کو زوال ہونے لگا تو انگلستان اور دوسرے ممالک سے کپڑا درآمد ہونے لگا جس کی قیمت غذائی غلّے کی صورت میں ادا کی جاتی تھی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔[1]

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء، جلد 2، ضمیمہ 33۔

کچھ انگریزی اور بدیسی مال جو کلکتے کے ذریعے بنگال میں درآمد کیا گیا۔

سال	بڑے عرض کی نفیس سیاہ بانات کے تھان	سوت پاؤنڈ	سوتی دھاگہ پاؤنڈ	مشین کا دھاگہ پاؤنڈ	تھان کی قیمت پاؤنڈ میں	شرابیں قیمت پاؤنڈ میں
1813ء	3,381	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	اعداد و شمار نہیں دیے گئے	52,253
1814ء	4,635					57,201
1815ء	3,908					59,462
1816ء	3,707					56,411
1817ء	2,355					53,157
1818ء	5,633					36,712
1819ء	9,244					20,988
1820ء	5,546					29,049
1821ء	7,590					30,382
1822ء	5,108					46,235
1823ء	7,346				64,449	30,129
1824ء	5,401				43,030	22,439
1825ء	13,981				1,58,076	14,223
1826ء	9,629				1,78,481	56,058
1827ء	5,430	82,738	4,32,878	3,39,234	2,96,177	80,595
1828ء	7,609	1,49,076	6,42,306	4,64,776	2,35,837	41,142
1829ء	11,838	98,159	3,98,930	9,18,646	21,97,290	31,311

مدراس کے ذریعے مدراس پریسیڈنسی میں آنے والا کچھ انگریزی اور بدیسی مال

سال	چھینٹ پاؤنڈ	لنکلاٹ پاؤنڈ	ململ پاؤنڈ	تھان پاؤنڈ	ساٹن پاؤنڈ	ریشم کے تھان پاؤنڈ	نفیس قسم کی سیاہ بانات پاؤنڈ	شالیں پاؤنڈ	سلے ہوئے اونی کپڑے پاؤنڈ	اونی کپڑا پاؤنڈ
1824ء								181		
1825ء								920		
1826ء			342	903	312		835	1,159		614
1827ء	510	470	441	536	637		2,176	754	601	915
1828ء	219	380	789	958	593		915	1,115	481	1,310
1829ء	352	348	598	474	853	644	1,417	409	581	844
1830ء	372		224	1,121	577	136	1,158	476	365	457

سنہ 1813ء میں ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ٹامس منرو اس بات پر ہنستا تھا کہ کبھی پیزلے کی شالیں ہندوستان کی نفیس شالوں کی جگہ لے سکیں گی۔ سنہ 1826ء میں جب وہ مدراس کا گورنر تھا اس کو اس بات کی تشویش ہوئی ہوگی کہ یورپ کی شالوں کے علاوہ ململ مختلف قسم کے تھانوں، بانات اور اونی کپڑے نے ہندوستان کی مصنوعات کی جگہ لینی شروع کر دی تھی ایک اور اتنا ہی ہمدرد حاکم سر جان مالکم سنہ 1830ء میں بمبئی کا گورنر تھا۔ اُسے بھی ہندوستانی صنعتوں کے زوال اور ہندوستان کے لوگوں کی بڑھتی ہوئی غربت نے پریشان کر دیا تھا۔

"کورٹ (آف ڈائریکٹرز) کے مراسلے میں کہا گیا ہے کہ ان کی توجہ خاص طور سے اس امر پر دلائی گئی ہے کہ ہندوستان کی وجہ سے انگلستان کو اس خام مال کے بڑے حصے کی حد تک بدیسی ملکوں کا دست نگر نہ ہونا چاہیے جس پر اس کی بیش بہا مصنوعات کا انحصار ہے۔

"مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ صرف ریشم کی قسم کی مصنوعات شروع کر کے بہتر ریشے کی روئی کی کاشت شروع کر کے اور صاف شکر بنانے کے حالیہ مساعی کو کامیاب بنا کر ہم اپنے اضلاع کی ہمّت افزائی کر سکتے ہیں۔ اور اپنے علاقوں کے وسائل کو برقرار رکھ سکتے ہیں"

"صرف ان بیش بہا مصنوعات کی ہمت افزائی کر کے جن کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، اور غلے کے علاوہ دوسری اجناس کو ترقی دے کر، کاروبار کی تجدید کر کے اور دولت مند لوگوں کو ملک کے اندرونی حصوں میں رہنے یا آباد ہونے پر آمادہ کر کے ہم ملک کو تقویت پہنچا سکتے ہیں اور اس کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ محاصل ادا کر سکے۔ اُن مقامی لوگوں میں جن پر ہمیں قبضہ واختیار حاصل ہے نہ صلاحیت کی کمی ہے اور نہ شوق کی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو بروئے کار لایا جائے۔ اس کو کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس حکومت کی مساعی، قوت عمل اور توسیع شدہ پالیسی سے پورا کام لیا جائے جو یہ جانتی ہے کہ اپنی خوش حالی میں اور ان لوگوں کی خوش حالی میں ہم آہنگی کس طرح پیدا کی جائے جن پر اس کو اختیار حاصل ہے"[1]

---

[1] حکومت بمبئی کے نظم ونسق کے متعلق سر جان مالکم کی عام روداد مورخہ 30 نومبر سنہ 1830ء۔

سر جان مالکم کی نظر بھی اس بات پر نہ پڑی یا شاید اس نے یہ بات کہنا ضروری نہیں سمجھی کہ اُس حالت میں محکوم لوگوں کی صنعتی خوش حالی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کیونکہ حاکم قوم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کو ایک خام مال پیدا کرنے والے ملک میں تبدیل کر دیا جائے "تاکہ" انگلستان کو اُس خام مال کے بڑے حصّے کی حد تک بدیسی ملکوں کا دست نگر نہ ہونا پڑے جس پر اس کی بیش بہا مصنوعات کا انحصار ہے۔"

انگلستان کے سیاسی رہنماؤں اور سیاسی مصنفوں نے اس پالیسی کا کبھی تذکرہ نہیں کیا جس پر ہندوستان میں عمل ہو رہا تھا۔ اس زمانے کے ماہرین سیاسی معاشیات نے، جن کی رہنمائی ریکارڈ ہو کر رہا تھا، اس موضوع پر کبھی زبان نہیں کھولی۔ زراعتی قوانین (Corn Laws) کے خلاف احتجاج کرنے والوں کے رہنماؤں نے اس پالیسی کے خلاف اپنا منہ بند رکھا اور اس سے واقف بھی نہیں تھے جس کے ذریعے ہندوستان کے لاکھوں بنکروں اور دست کاروں کی روٹی چھینی جا رہی تھی حالانکہ انھوں نے ایک ایسے قانون کے لیے بجا طور سے انگلستان کے مالکان آراضی کے خلاف جدوجہد کی جس سے محنت کشوں اور مزدوروں کو سستی قیمت پر روٹی میسر آ سکے اور انھوں نے اپنی جدوجہد میں کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ کابڈن (Cobden) اور برائٹ (Bright) نے، جو اپنے زمانے کے سب سے زیادہ فراخ دل، ہمدرد اور روشن خیال انگریز تھے، زرعی قوانین کے خلاف جدوجہد کو کامیاب بنایا۔ رابرٹ پیل کا جس نے ۱۸۴۶ء میں ان قوانین کو منسوخ کیا تھا خیال تھا کہ اس کا نام وہ انگریز یاد رکھیں گے "جو ایسی غذا کی فراوانی سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کریں گے جس پر کوئی محصول نہیں ادا کیا جائے گا۔ انصاف کا احساس ان کی غذا کو زیادہ لذیذ بنا دے گا۔" لیکن ہندوستان کے دستکاروں اور صنعت کاروں کی روٹی کو ناانصافی کا احساس اب بھی بے مزہ بنا رہا ہے اور کسی مدبّر نے ابھی تک سنجیدگی کے ساتھ ان کی تباہ شدہ صنعتوں کا تحفظ کرنے، انھیں فروغ دینے اور ان کی تجدید کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

یورپ کے ماہرین معاشیات زیادہ غیر جانب داری کے ساتھ حالات کا جائزہ لے سکے۔ . . . . اور زیادہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر سکے۔ جس وقت انگلستان کے ماہرین معاشیات کے ذہنوں پر زرعی قوانین کی

ناانصافی چھائی ہوئی تھی سیاسی معاشیات کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک اہم کتاب میں جو 1844ء میں جرمنی میں شائع ہوئی تھی ایک جرمن ماہر معاشیات نے بتایا تھا کہ اس سے بڑی ناانصافی ہندوستان میں کی جارہی ہے۔

"اگر وہ ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے کو آزادی کے ساتھ انگلستان آنے کی اجازت دیتے تو انگلستان کی سوتی کپڑے اور ریشم کی صنعت جلد ختم ہو جاتی۔ ہندوستان کو محض اتنا فائدہ حاصل نہیں تھا کہ اسے سستا خام مال اور کم اُجرت پر مزدور میسر آسکتا تھا بلکہ اس کے پاس صدیوں کا تجربہ، مہارت اور رواج بھی تھا۔ اگر مقابلہ کرنے کی آزادی حاصل ہوتی تو ان فوائد کا اثر ضرور پڑتا۔"

لیکن انگلستان اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ ایشیا میں نوآبادیات قائم کر کے صنعتوں میں ہندوستان کے تابع ہو جائے۔ وہ تجارتی بالادستی کے لیے کوشاں تھا۔ اس کو احساس تھا کہ دو ایسے ملکوں میں جو باہمی آزاد تجارت برقرار رکھنا چاہیں وہ ملک بالادستی حاصل کر سکے گا جو مصنوعات فروخت کرے گا۔ جو ملک محض زرعی پیداوار فروخت کرے گا وہ دوسرے کے تابع ہو جائے گا۔ شمالی امریکہ کی نوآبادیوں میں گھوڑے کے نعل میں لگائی جانے والی ایک کیل بھی بنانے کی اجازت نہ دے کر وہ اس اصول پر عمل کر چکا تھا۔ مزید براں اس نے فیصلہ کیا تھا کہ امریکہ میں بننے والی نعل کی کیل انگلستان میں درآمد نہ کی جا سکے۔ ایسے ملک سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ ان مصنوعات کی منڈیوں سے دست بردار ہو جائے گا جو اس کی آئندہ عظمت کی ضامن ہیں اور وہ منڈیاں اُن ہندوؤں کے سپرد کر دے گا جو تعداد میں زیادہ ہیں، انتہائی کفایت شعار ہیں، بہت تجربہ رکھتے ہیں اور صنعتوں کے قدیم طریقوں میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔

چنانچہ انگلستان نے اُن اشیا کی درآمد ممنوع قرار دے دی جو خود اس کے کارخانوں میں بنائی جاتی تھیں۔ مثلاً ہندوستان کا سوتی اور ریشمی کپڑا۔ انگلستان ان کا ایک دھاگہ بھی استعمال کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس سستے اور خوبصورت کپڑے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا بلکہ خود اپنے بنائے ہوئے مہنگے اور ادنیٰ درجے کے کپڑے استعمال کرنے کے حق میں تھا۔ وہ اس کے لیے تیار تھا کہ یورپ کی دوسری قوموں کو ہندوستان کا نفیس کپڑا سستی قیمت پر مہیا کر کے اور اس سستی قیمت کے تمام

فوائد انھیں دینے کو تیار تھا لیکن خود اُس کپڑے کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیا انگلستان کا یہ عمل حماقت پر مبنی تھا۔ آڈم اسمتھ اور جے۔ بی۔ سے (J. B. Say) کے نظریے کے مطابق جو نظریہ قیمیت کہلاتا تھا، اِس میں کوئی شک نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انگلستان کو اپنی ضرورت کا سامان وہاں سے خریدنا چاہیے جہاں سستا اور اچھا مال دستیاب ہوتا ہے۔ اس بات کو حماقت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دوسری جگہوں سے سستا مال خریدنے کے بجائے وہ سامان خود بنائے اور اس پر زیادہ رقم خرچ کرے اور سستا مال خریدنے کا فائدہ یورپ کے دوسرے ممالک کو دے۔

"ہمارے اُس نظریے کے مطابق حالات اس کے برعکس ہیں جس کو ہم پیداواری قوتوں کا نظریہ کہتے ہیں۔ انگلستان کی وزارت نے جب خام مال درآمد کرنے اور کپڑا برآمد کرنے کے اصول پر عمل شروع کیا تو اس نے اس نظریے کے بنیادی اصول پر غور کیے بغیر اس کو عملاً اختیار کرلیا۔

انگلستان کی وزارت سستے اور جلد خراب ہوجانے والی مصنوعات کم داموں پر حاصل کرنے کی خواہشمند تھی۔ وہ زیادہ بیش بہا اور دیرپا صنعتی قوت حاصل کرنا چاہتی تھی۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی معاشیات کے برطانوی ماہرین نے اٹھارھویں صدی کے آخری زمانے سے آزاد تجارت کے اصول کی حمایت شروع کردی تھی لیکن برطانوی حکومت نے اس اصول پر اس وقت تک عمل نہیں کیا جب تک اس نے ہندوستان کی صنعتی طاقت کو ختم نہیں کردیا اور اپنی صنعتی طاقت کو پروان نہیں چڑھالیا۔ اس کے بعد برطانوی قوم آزاد تاجروں میں تبدیل ہوگئی اور انھوں نے دوسری قوموں کو آزاد تجارت کے اصول کو تسلیم کرنے کی دعوت دینی شروع کی۔ دوسری قومیں، جن میں برطانوی نوآبادیات بھی شامل ہیں، زیادہ سمجھداری سے کام لے رہی ہیں

---

[1] فریڈرک لسٹ 'The National System of Political Economy' مترجم سیمپسن۔ ایس۔ لائڈ۔ ایم۔ پی (لندن 1885ء) صفحہ 22

اور اپنی صنعتی طاقت کا تحفظ کر کے وہاں کے لوگوں کی صنعتی طاقت کو کچل دیا گیا۔ اور اس کے بعد اس پر آزاد تجارت تھوپ دی گئی تاکہ اس کی صنعتوں کی تجدید نہ ہو سکے۔

باب 17

داخلی تجارت ــــــ نہریں اور ریلیں (1813ء۔ 1825ء)

ہندوستان کی داخلی تجارت قابلِ نفرت چنگی کے طریقے کی بنا پر، جو گزشتہ صدی کا ورثہ تھا، اب بھی بہت اچھی حالت میں نہیں تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ملک میں قدم جمانے کے لیے اپنے درآمدات اور برآمدات کو اس چنگی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جو داخلی تجارت پر لگتی تھی۔ شاید آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب کمپنی کے ملازمین نے اپنی نجی تجارت کو چنگی سے مستثنیٰ کروانا چاہا تو نواب میر قاسم نے نہایت شرافت اور فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے بنگال میں چنگی ختم کر دی اور اس فراخ دلی کے نتیجے میں اسے اپنے تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ 1765ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال کی قطعی مالک ہو گئی تو اس نے بھی میر قاسم کی تقلید کی اور ہندوستان کی داخلی تجارت کو ظالمانہ چنگی سے بری کر دیا۔ مگر چنگی سے تھوڑی بہت آمدنی بھی ہوتی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی اس آمدنی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

انگریزوں کی حکومت میں چنگی کے نام پر اس سے کہیں زیادہ مظالم ہونے لگے جتنے نواب کے زمانۂ حکومت میں ہوتے تھے۔ کمپنی زیادہ مطلق اور قطعی طاقت کی مالک تھی۔ تھوڑی بہت تنخواہ پانے والا چوکی کا افسر زیادہ ظلم کر سکتا تھا۔ یہ خرابی ساٹھ سال تک برقرار رہی۔ 1825ء میں ہولٹ میکینزی نے، جو اس زمانے میں علاقائی سکریٹری تھا، بہت سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی تھی۔

"اس سے پہلے کہ وہ پریسیڈنسی تک پہنچیں کچھ اشیا کو دس چوکیوں کی خاک چھاننی ہوتی ہے اور ہر چوکی پر کئی کئی ذیلی چوکیوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ملک کی خاص خاص پیداوار بھی بار بار روکی جاتی ہے۔"

"اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ نہ رشوت لی جاتی ہے اور نہ دیر ہوتی ہے پھر بھی اس طریقے سے ملک کی تجارت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ایسے اضلاع میں اشیا کا تبادلہ نہیں

ہو سکتا ہے جن کے درمیان چوکیاں حد فاصل کا کام کرتی ہیں۔ اُن اضلاع میں قیمتوں کا فرق نہ صرف بار برداری کے اخراجات کی بنا پر ہوگا بلکہ 5 یا ½7 فی صدی چنگی جو حکومت عائد کرتی ہے اس فرق کا باعث بنے گی۔ چنانچہ اس سے قیمتوں کی فطری نابرابری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ اس اصول کے برعکس ہے جس کا استعمال ہونے والی اشیا کے محصول پر بیجا طور سے اطلاق ہوتا ہے اس کا بوجھ سب سے زیادہ وہاں پڑتا ہے جہاں صارف کو بغیر محصول ادا کیے زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔"

"لیکن جب حکومت کے مطالبے میں چنگی کے افسروں کے مطالبوں کو شامل کیا جاتا ہے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کم سرمایہ رکھنے والوں کی تجارت کسی طرح جاری نہیں رہ سکتی۔ دولت مند تاجر تو بڑے سے بڑا مطالبہ پورا کر سکتا ہے۔ زیادہ سرمایہ رکھنے والا بڑے بڑے انعام دے سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی حیثیت اور دولت اسے بالجبر وصولی سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن جہاں تک چھوٹے تاجروں کا تعلق ہے تھوڑی سی بخشش ہی اس کے ہونے والے تمام تر منافع پر حاوی ہو سکتی ہے اور اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ انھیں اعتدال پر قائم رکھ سکے ...."

ابھی تک انگلستان کے ارباب اقتدار اور وہاں کے تاجروں کی توجہ زیادہ تر اس امر پر رہی ہے کہ برطانوی مصنوعات کے لیے منڈی تلاش کی جائے۔ چنانچہ ان کی نظر میں ہندوستان جانے والے مال کے بجائے وہاں سے آنے والے مال پر رہی ہیں۔ سنہ 1815ء کے ریگولیشن نمبر 9 میں جو محاصل تجویز کیے گئے ہیں ان کی بنا پر بہت سی ایسی اشیا کا آنا بند ہو گیا ہے جو اس سے پہلے انگلستان سے آتی تھیں۔ برآمدات میں صرف نیل، ردئی، اون اور سن بھیجنے کی اجازت ہے اور میرے خیال میں اس کا مقصد ہندوستان کے بجائے انگلستان کا مفاد ہے۔"

"کلکتہ کی تجارت جن اشیا پر مشتمل ہے اگر ان پر احتیاط سے غور کیا جائے اور چنگی کی اس شرح پر بھی غور کیا جائے جو ہر مال پر عائد کی جا سکتی ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملک کو داخل چنگی کی خرابی سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں کوئی بڑی قربانی بھی نہیں دینی ہوگی۔ کم از کم اس حالت میں کوئی بڑی قربانی نہیں دینی ہوگی اگر مغربی سرحد پر نمک کا محصول وصول کیا جاتا رہے جس کا برقرار رکھنا بنگال کی اجارہ داری کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔"

"اگر داخلی چنگی ختم کر دی جائے اور محاصل درآمد و برآمد میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے

تو ہمیں بقدر 33 لاکھ روپیہ (3,30,000 پاؤنڈ) کم آمدنی ہوگی ۔ اگر مغربی نمک پر محصول عائد ہوتا رہے پھر بھی 22 لاکھ روپے (2,20,000 پاؤنڈ) کا نقصان ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس نقصان کو درآمد و برآمد کے نئے محاصل سے جلدی پورا نہیں کرسکیں گے لیکن اس نقصان کا بڑا حصہ ضرور پورا کیا جاسکے گا۔ مجھے امید ہے کہ مجوزہ انتظامات سے تجارت میں ترقی ہوگی اور ہمارے اخراجات میں تخفیف ہوگی اس لیے آخر میں ہمیں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا"[1]

لیکن ہولٹ میکینزی کی آواز کسی نے نہیں سنی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی تجارت کے فروغ کے لیے 2,20,000 پاؤنڈ کی آمدنی یا اس کا کوئی حصہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی ۔ حالانکہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی خوش حالی کے لیے زبانی جمع خرچ کرتی رہتی تھی لیکن اس کو حاصل کرنے کے لیے ایک پیسہ کی قربانی دینے کو تیار نہیں تھی ۔ اگر داخلی چنگی کو ختم کرنا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں ہوتا تو اس کی حکومت میں چنگی کبھی ختم نہ ہوتی۔

خوش قسمتی سے اس کے ملازمین نے کمپنی کو مجبور کر دیا ۔ کمپنی کا عظیم ترین اور بہترین گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک 1828ء میں ہندوستان آیا ۔ اس نے سر چارلس ٹریولین (Sir Charles Trevelyan) کے سپرد چنگی کی تحقیقات اور اس کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کا کام کیا ۔ ٹریولین نے اپنی مشہور رپورٹ میں اس طریقے کی خرابیوں کو بے نقاب کیا ہے ۔ اس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ بنگال کے نواب کے زمانے میں جو خرابیاں پائی جاتی تھیں انگریزی راج میں ان میں اضافہ ہوگیا ہے، پورے ملک میں تاجروں کا وقت برباد کیا جاتا ہے اور ان سے بہت زیادہ روپیہ وصول کیا جاتا ہے ۔ چنگی کے افسروں کو اتنی کم تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ وہ صرف لوٹ کھسوٹ کر کے زندہ رہ سکتے ہیں اور ان کی لوٹ کھسوٹ کی بنا پر صنعتیں ختم ہوگئی ہیں اور داخلی تجارت مفلوج ہوگئی ہے، مسافروں کو پریشان کیا جاتا ہے اور چنگی گھروں کے پاس سے گزرنے والی عورتوں کی عزت و عصمت محفوظ نہیں رہتی اور ملک میں اس ظالمانہ طریقے کو تھوڑی سی آمدنی کے لیے برقرار رکھا جارہا

---

[1] ہولٹ میکینزی کی یادداشت بنگال کے نمک اور افیم کے متعلق مشورے ۔ 23 جون 1825ء ۔

ہے[1] لارڈ ولیم بینٹنک نے ٹریویلین کی رپورٹ شائع کر دی اور اس طرح داخلی چنگی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

انگلستان میں لارڈ ایلن برا (Lord Ellenborough.) نے اس رپورٹ کی حمایت کی اور 1835ء میں اپنے زوردار الفاظ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس طریقے کی خرابیاں بتائیں۔

"انگلستان کا سوتی کپڑا ½2 فی صدی محصول ادا کر کے ہندوستان میں درآمد کیا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں بننے والے سوتی کپڑے کے خام مال پر 5 فی صدی محصول ادا کرنا پڑتا ہے، سوت پر ½7 فی صدی مزید محصول ادا کرنا پڑتا ہے، کپڑے کی تیاری کے بعد ½2 فی صدی محصول اور ادا کرنا پڑتا ہے اور آخر میں ½2 فی صدی مزید محصول ادا کرنا پڑتا ہے اگر روئی میں کپڑا اسفید درج ہو اور بعد میں رنگ لیا جائے۔ اس طرح ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی کپڑے پر (جو ہندوستان میں استعمال ہوتا ہے) ½17 فی صدی محصول عائد کیا جاتا ہے۔"

"کچی کھال پر 5 فی صدی محصول دینا پڑتا ہے، کھال کو کمانے کے بعد چمڑا بنایا جاتا ہے اور اس پر 5 فی صدی مزید محصول ادا کیا جاتا ہے اور جب چمڑے کے جوتے وغیرہ بنائے جاتے ہیں تو 5 صدی اور محصول دینا پڑتا ہے (اس طرح اُس چمڑے پر جس کا بنا ہوا سامان ہندوستان میں استعمال ہوتا ہے) مجموعی طور سے 15 فی صدی محصول ادا کیا جاتا ہے۔"

"اپنی شکر کی طرف ہمارا کیا رویہ ہے۔ شہر میں گنا لاتے وقت اس پر 5 فیصدی محصول ادا کرنا پڑتا ہے اور 5 فی صدی بلدیہ کا محصول دینا ہوتا ہے۔ شکر تیار ہو جانے کے بعد اسی شہر سے برآمد کرنے پر 5 فی صدی محصول اور دینا پڑتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کی شکر پر جو ہندوستان میں

---

[1] میکالے نے ٹریویلین کی رپورٹ کے حوالے سے لکھا تھا "میں دفتری معاملات کا عادی ہوں پھر بھی میں نے اس سے زیادہ قابلیت کے ساتھ لکھی ہوئی سرکاری دستاویز پہلے نہیں پڑھی تھی اور میرا خیال ہے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ انگلستان میں بھی کوئی ستائیس سالہ نوجوان ایسا نہیں جو اس کو لکھ سکے۔" جی۔ او۔ ٹریویلین، Life and Letters of Lord Macaulay.

استعمال ہوتی ہے) 15 فی صدی محصول دینا ہوتا ہے۔"

"تقریباً 235 اشیا پر داخلی چنگی ادا کرنی ہوتی ہے۔ یہ محصول ذاتی اور گھریلو استعمال کی تقریباً ہر چیز پر لگتا ہے۔ یہ محصول اور اس کے ساتھ تلاشی لینے کا طریقہ انتہائی تکلیف دہ اور پریشان کن ہے اور اس سے کوئی بڑی آمدنی بھی نہیں ہوتی۔ اگر چنگی کا ہر افسر تلاشی لینے کے اختیارات کو استعمال کرے تو تجارت میں غیر ضروری تاخیر اس کو ختم کر سکتی ہے۔ ان اختیارات کا استعمال صرف لوٹ کھسوٹ کے لیے کیا جاتا ہے۔"

"قومی دولت پر اس کا جو اثر پڑ رہا ہے اس سے کہیں زیادہ قومی اخلاق متاثر ہو رہا ہے۔ ہر تاجر، ہر صنعت کار اور ہر مسافر اپنے مال کی حفاظت کے لیے یا اپنے ذاتی آرام و آسائش کے لیے اور اکثر اپنے خاندان کی عورتوں کی خاطر اس پر مجبور رہتا ہے کہ سرکاری ملازمین کے ساتھ غیر قانونی ساز باز کرے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خود ہمارے لوگوں کا اخلاق خراب ہو رہا ہے اور جس کی وجہ سے تمام بدیسی تاجروں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔"

"ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اختیارات سے کام لے کر ہندوستان کے چھ کروڑ لوگوں کو داخل نقل و حمل کی پوری آزادی دے دیں۔ بنگال کے لوگ محنتی ہیں، ان کا ملک زرخیز ہے، وہاں ایسے دریا ہیں جو جہاز رانی کے لیے موزوں ہیں۔ وہاں بیرونی جنگوں کے اثرات نہیں پہنچ سکتے اور قوانین کا غیر جانب دارانہ انصرام ان کی املاک کا تحفظ کرتا ہے۔ حکومت کی روشن خیالی انھیں عام خوش حالی کے اتنے زیادہ ذرائع فراہم کر سکتی ہے جتنے کہ دنیا کے کسی دوسرے ملک کو حاصل نہیں ہیں۔"[1]

لیکن لارڈ ایلن برا کی آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے جواب دیا۔ اس محصول کے خراب اثرات کے متعلق انگلستان کے ارباب اقتدار کی رائے سے ہندوستان کی حکومت باخبر ہے اور وہ جانتی ہے کہ انگلستان کے اعلیٰ اختیار رکھنے والے چاہتے ہیں کہ جب بھی ممکن ہو اس محصول کو ختم کر دیا جائے۔ کورٹ کی رائے میں یہ امر قبل از وقت اور مصلحت کے خلاف ہوگا کہ اس موضوع پر مقامی حکومت کو قطعی ہدایت دی جائے۔"

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے وہ طریقہ اختیار کیا جو بدقسمتی سے

---

[1] لارڈ ایلن برا کا خط ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر اور نائب صدر کے نام، مورخہ 18 مارچ 1835ء

ایسے موقعوں پر عام طور سے اختیار کیا جاتا ہے یعنی مقامی حکومت کی شاندار تصویر کے پیچھے خود کو اور اصلاح نہ کرنے کے اپنے جذبے کو چھپا لیا۔

فطرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ بہانہ بھی ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ ٹریولیین کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہندوستان کی رائے عامہ میں ہیجان برپا ہو گیا تھا اور بالائی صوبجات کی حد تک مسٹر راس نے فیصلہ کیا کہ داخلی چنگی گھر ختم کر دیے جائیں۔ مسٹر راس کی تقلید کرتے ہوئے لارڈ ولیم بینٹنک کے جانشین نے یکم مارچ 1836ء کو بنگال کے چنگی گھر ختم کر دیے اور یکم مئی 1836ء کو شہری محصول ختم کر دیا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بحالت مجبوری اس کو منظور کیا پھر بھی گورنر جنرل کو افسوس کے ساتھ لکھا "آپ نے اس پر عمل کرنے میں جلدی سے کام لیا اور آمدنی میں کمی کو پورا کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بنانے سے پہلے یہ قدم اٹھا لیا۔"[1]

اب ہم اس دن کے قریب پہنچ رہے ہیں جب انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئی۔ لیکن داخلی چنگی کے کچھ برسوں کی کہانی ہمیں اور سنانا ہے تاکہ ہم اس کو آخر تک بیان کر دیں۔ لارڈ آکلینڈ 1836ء میں ہندوستان آیا۔ وہ ملکہ کے زمانۂ حکومت کا پہلا گورنر جنرل تھا۔ نئی حکومت کے ابتدائی زمانے میں بدقسمتی سے ہندوستان کے نظم و نسق میں ایک ایسا احمقانہ قدم اٹھایا گیا جس کا نتیجہ ایک بڑے حادثے کی صورت میں رونما ہوا۔ لارڈ ولیم بینٹنک نے امن، اخراجات میں کمی اور اصلاح کی جو پالیسی شروع کی تھی لارڈ آکلینڈ نے اس کو نظر انداز کیا اور 1838ء کی پہلی افغان جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ کے نتیجے کے طور پر دوستانہ مراسم رکھنے والی ایک جنگ جو قوم سے دشمنی مول لی گئی، 1842ء کی تباہ کن پسپائی سے دوچار ہونا پڑا، 4000 سپاہی اور 12000 دوسرے لوگ ہلاک ہوئے اور ہندوستان کی سرحد کے پار ہونے والی جنگ میں ہندوستان کی آمدنی کا روپیہ خرچ کیا گیا۔

لارڈ ایلن برا، جس نے 1835ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو داخلی چنگی منسوخ کرنے کا مشورہ دیا تھا، 1842ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس نے سندھ میں 1843ء میں داخلی چنگی ختم کر دی، جالون کے علاقے میں 1844ء میں اور مدراس کے صوبے میں 1844ء کے ایکٹ نمبر 6 کے ذریعے چنگی ختم کر دی گئی۔

---

[1] گورنر جنرل ان کاونسل کے نام خط مورخہ 7 جون 1837ء۔

نو سال بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کا پھر وقت آیا تو لارڈ ایلن برا ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کا ایک رکن تھا اور سر چارلس ٹریویلین گواہوں میں شامل تھا، داخلی چنگی کی منسوخی کا حوالہ دیتے ہوئے لارڈ ایلن برا نے دریافت کیا۔

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ لارڈ ولیم بین ٹنک نے آپ کو اس کے متعلق جو تحقیقات کرنے کے لیے بھیجا، تحقیقات کے بعد آپ نے اپنی رپورٹ پیش کی اور حکومت کے ایک ایکٹ کے ذریعے چنگی منسوخ کر دی گئی؟"

سر چارلس نے جواب دیا "اگر میری رپورٹ شائع نہ ہوتی اور حسب معمول اس کے متعلق سرکاری مباحث ہوتے رہتے تو مدتوں تک چنگی اور شہری محاصل منسوخ نہ ہو پاتے لیکن بحث و مباحثے کے بجائے رپورٹ شائع کر دی گئی اور ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ یہ طریقہ زیادہ دنوں تک نہیں برقرار رکھا جا سکے گا۔"[1]

اس زمانے کے قاری کی اطلاع کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس باب میں ہم جس دور کا ذکر کر رہے ہیں اُس زمانے میں ہندوستان میں یکساں کرنسی موجود نہیں تھی۔ کلکتہ کا چاندی کا سکہ" جو سکہ روپیہ کہلاتا تھا مدراس کے روپے سے بقدر $6\frac{2}{3}$ فیصدی زیادہ قیمت رکھتا تھا۔ سونے کی مہر زر قانونی اور ۱۶ روپے کے برابر تھی۔ چونکہ سونے کی قیمت بڑھ گئی تھی اس لیے یہ ۱۸ روپے میں بکنے لگی تھی اور سکہ رائج الوقت نہیں رہی تھی۔ انگلستان کے بنک کے گورنر ہارسلے پامر (*Harsley Palmer*) نے سنہ 1832ء میں شہادت دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہندوستان میں سونا سکہ رائج الوقت کی حیثیت سے نہ استعمال ہوتا ہے اور نہ آئندہ بڑے پیمانے پر استعمال ہو سکے گا وہاں کی حقیقی کرنسی چاندی ہے اور وہ زر قانونی کی حیثیت رکھتی ہے...... ہندوستان میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت سے سونے کو رواج دینے کی ضرورت کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں میں ان کے خلاف ہوں۔"[2]

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کی دوسری رپورٹ، سنہ 1853ء، صفحہ 161

[2] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، سنہ 1832ء، جلد 2۔ صفحہ ۱۰۹

بحر احمر کے راستے سے دخانی جہاز انگلستان سے ہندوستان آنے لگے تھے۔ پھر بھی ان کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ دی ہف لنڈسے (The Hugh Lindsay.) نامی جہاز بمبئی سے تینتیس دن میں سوئز پہنچا۔ آج کل یہ سفر پہلے کے مقابلے میں ایک چوتھائی وقت میں کیا جا سکتا ہے۔

بنگال کے دریاؤں میں دخانی کشتیاں چلانے اور کلکتے اور الٰہ آباد کے درمیان ایک تجرباتی سفر کے متعلق بھی گفتگو ہوئی۔ سنہ 1828ء ہی میں ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ (H. T. Prinsep) نے جو اس زمانے میں سکریٹری تھا، اس موضوع پر ایک دلچسپ نوٹ تیار کیا تھا، اس نے اپنے نوٹ میں کہا تھا کہ چین کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا دریا نہیں جس میں گنگا سے زیادہ کشتی رانی ہوتی ہو۔ سنہ 1785ء میں تیس ہزار ملاح اس دریا سے اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد سے اُن کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔ ہر شخص کو "آنے جانے والی کشتیوں کی قطار دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے دریا خالی نظر نہیں آتا۔ چونکہ ہر موسم میں اور ہر مقام پر یہی عالم ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ شاندار دریا جس حد تک کاروبار کی اور مسافروں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔"[1] موجودہ ریلیں تجارتی ضرورتوں کو بہتر انداز سے پورا کرتی ہیں لیکن ان کی تعمیر بدیسی سرمائے سے ہوئی ہے اور اس کا سود بدیسی حصے داروں کی جیبوں میں جاتا ہے اور لاکھوں ملاح اور کشتیاں بنانے والے، گاڑی بان اور بیلوں کے مالک بے روزگار ہو گئے ہیں۔

اس پر بھی غور کیا گیا کہ ایسی گاڑیوں کے بجائے جن کو جانور کھینچتے ہیں نہر اور ریلوں کو بار برداری کے لیے استعمال کیا جائے۔ اخراجات کا تخمینہ لگانے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک نہر اور ریل کی ایک پٹری تعمیر کرنے پر مساوی اخراجات آئیں گے یعنی تقریباً ۹۰۰ پاؤنڈ فی میل اور نہر سے ۱۹۰ پاؤنڈ فی میل اور ریل سے 175 پاؤنڈ فی میل منافع ہوگا۔

"نہر کے لیے ایسے کام کرنے پڑیں گے جن کی آبپاشی کی نہروں کے لیے ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھی اُن کاموں کی نوعیت میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا لیکن ایسی ریل گاڑی کی

---

[1] ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ کا نوٹ مورخہ 31 جولائی سنہ 1828ء

تعمیر جس کو جانور کھینچیں بہت آسان ہے۔ آبپاشی کے لیے جو مختلف قسم کے کام کیے جاتے ہیں اُن کے مقابلے میں ریل کی تعمیر میں کم رکاوٹیں پڑیں گی۔ ریلوں کو نہروں پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے لیے پانی کی ضرورت نہیں ہوتی جو کرناٹک میں بڑی بیش بہا شے سمجھا جاتا ہے..... لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ روپیہ اور مہارت اگر آبپاشی کے نئے اور پرانے ذرائع پر صرف کی جائے تو مجموعی اعتبار سے ملک کی ترقی کے لیے داخلی نقل و حمل کے ذرائع پر روپیے کے صرف کے مقابلے میں مفید تر ثابت ہوگی یا نہیں ..... یہاں یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا اعداد و شمار صرف ان ریل گاڑیوں کے متعلق ہیں جن کے لیے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ انھیں جانور کھینچیں گے، بھاپ سے چلنے والے انجنوں نے اس کام میں بنیادی تبدیلی کردی ہے اور اخراجات میں بے اندازہ اضافہ کردیا ہے۔ بھاپ سے چلنے والے انجن استعمال کرنے کی صورت میں اتنے ڈھال اور اتنے موڑوں کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے جتنے پہلی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مانچسٹر اور لیورپول میں پٹریاں بچھانے پر 25,000 پاؤنڈ فی میل خرچ ہوا جب کہ انگلستان کی دہری پٹریوں پر (جانوروں کی طاقت استعمال کرنے کی صورت میں) اوسط خرچ پانچ ہزار پاؤنڈ فی میل آتا ہے..... یہ مناسب معلوم ہوتا ہے پٹریوں اور ڈبوں کے پہیوں کی تھوڑی تعداد یہاں بھیج دی جائے تاکہ ٹینک ڈیپارٹمنٹ (Tank Department) میں، جہاں کام ہوتا رہتا ہے۔ موجود رہیں اور حسب ضرورت کام میں لائی جاسکیں۔ ایک ہزار گز اس قسم کی دہری پٹری جو انگلستان میں عارضی ضرورت کے لیے کام میں لائی جاتی ہے اور چالیس ریل کے ڈبوں کے پہیے، جن کی قیمت تقریباً 250 پاؤنڈ ہوئی روانہ کردیے جائیں[1]۔"

مندرجہ بالا اقتباس دینے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے نزاعی امور کے شروع ہونے کی روداد دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی جس نے حالیہ زمانے میں بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ آئندہ دہائیوں میں نہروں اور ریلوں کے تقابلی فوائد پر مباحثے ہوتے رہے اور توقع کے مطابق ریلوں کو ترجیح دی گئی جس سے ہندوستان میں برطانوی تجارت کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء، جلد 2۔ حصہ 2، ضمیمہ 24

نہروں کو ترجیح نہیں دی گئی جن سے ہندوستان کی زراعت کو فائدہ پہنچتا۔ ہندوستان کی حکومت اس حد تک برطانوی تاجروں کے زیر اثر تھی کہ اس نے ہندوستان میں ریلیں تعمیر کرنے والی کمپنیوں کو اس امر کی ضمانت دی کہ ان کا سود ہندوستان کی سرکاری آمدنی سے ادا کیا جائے گا۔ ریلوں کی تعمیر پر 22,50,00,000 پاؤنڈ خرچ کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں منافع کے بجائے 1900ء تک ہندوستان کے محصول دہندگان کو 5,00,00,000 پاؤنڈ کا خسارہ ہوا۔ ہندوستانی زراعت کے مفادات پر اتنی کم توجہ دی گئی کہ 1900ء تک آبپاشی کے ذرائع پر صرف 2,50,00,000 پاؤنڈ صرف کیے گئے۔

باب - 18

حکومت کی بدانتظامی (1793ء سے 1815ء)

وارن ہیسٹنگز اور اس کے بعد لارڈ کارنوالس نے کمپنی کے علاقوں میں سول اور عدالتی انتظام کے لیے جو اقدام کیے تھے ان کا اجمالی ذکر پچھلے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ ان میں کچھ مفید اور اچھی باتیں بھی شامل تھیں لیکن کچھ نقائص بھی تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ جو عدالتی نظام قائم کیا گیا تھا وہ ایک وسیع ملک کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھا۔ کارنوالس کی موت کے وقت اُن علاقوں کی آبادی جو کمپنی کے قبضے میں آ گئے تھے دس کروڑ تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کی مدد اور تعاون کے بغیر یہاں کے عظیم اور متمدن لوگوں کے لیے عدالتیں قائم کرنے اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

یوروپین جج لوگوں کی زبان سے پوری طرح واقف نہیں تھے اور ان کے رسم و رواج سے تو ان کی واقفیت اور بھی کم تھی۔ ہندوستانی دفتری ملازمین کم تنخواہیں پاتے تھے اور اس لیے بے ایمان تھے اور انصاف اس کو ملتا تھا جو زیادہ قیمت ادا کر سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ ڈھیروں مقدمے جمع ہو جایا کرتے تھے اور ان کے فیصلوں میں اتنی دیر ہوتی تھی کہ عملاً لوگ انصاف سے محروم رہتے تھے۔ گواہوں کی فوج اپنے گھروں اور کاموں کو چھوڑ کر دور دراز عدالتوں میں حاضری دیا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں گواہ کے طور پر کسی کو پیش کرنا ایک سنگین سزا کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ مقدمہ بازی کو مہنگا بنانے اور لوگوں کو عدالت کی طرف رجوع کرنے سے باز رکھنے کے لیے طرح طرح کی فیسیں وصول کی جانے لگیں۔ کام کم کرنے کے لیے ججوں کو مزید اختیارات دے دیے گئے اور اپیل کا حق محدود کر دیا گیا۔ اس خرابی کا تدارک کرنے کے لیے تمام ظالمانہ اقدام کیے گئے جس کا صرف ایک حقیقی حل تھا یعنی لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے اور عدالتی کام ان کے سپرد کر دیا جائے۔

"اس بات کو بھلا دیا گیا ہے کہ یوروپیوں کی حکومت قائم ہونے سے صدیوں پہلے تک

مقدمات کا فیصلہ صرف ہندوستان کے لوگ کیا کرتے تھے پھر بھی سماج میں کوئی انتشار نہیں تھا اور مصنفوں اور مسافروں کی شہادتوں کے مطابق ایسے بھی دور آئے جب ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ پھول پھل رہا تھا اور وہاں کے لوگ خوشحال اور خوش و خرم تھے۔[1]

"اگر انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں دیوانی عدالتوں میں اس قسم کے نقائص پائے جاتے تھے تو فوجداری عدالتوں میں زیادہ شدید نقائص موجود تھے بنگال میں قدم قدم پر چوروں کے گروہ موجود تھے جن کو ڈاکو کے نام سے پکارا جاتا تھا کم تنخواہ پانے والی بے ایمان پولیس کی مدد سے مجسٹریٹ ان پر قابو نہیں پا سکتے تھے بڑے بڑے شہروں اور تجارتی مراکز میں دلیری کے ساتھ چوریاں کی جاتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے اور چوروں کے مشہور سرداروں کو روپیہ دیا کرتے تھے ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۰ء تک ملک میں برابر خطرہ محسوس کیا جاتا رہا۔ بنگال کے چوروں کے قصے بازاروں اور منڈیوں میں سنائے جاتے تھے۔ مجسٹریٹ اور پولیس بے بس تھی اور لوگ اپنی قسمت پر قانع تھے۔" اعلیٰ ترین انگریز حکام کی آنکھوں کے سامنے سماج کی حالت نہایت ناقص اور انتشار پذیر تھی اور یہ حالات اس شہر میں پائے جاتے تھے جو حکومت کا صدر مقام تھا اور جہاں ملک کے لوگ بجا طور سے امن و حفاظت کی توقع کیا کرتے تھے۔ اس کا موقع نہیں تھا کہ رفتہ رفتہ اس خرابی کا تدارک کیا جائے۔ لوگ ہماری آنکھوں کے سامنے مر رہے تھے۔ ہر ہفتے کی دیر کثیر آبادی والے اضلاع کے نہتے لوگوں کی موت یا اذیت کا پیغام ہوا کرتی تھی۔[2]

ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ اس خرابی سے بدتر ثابت ہوئیں۔ جرائم کے انسداد میں مجسٹریٹوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے دو یورپین پولیس کے کپتانوں کی تقرری عمل میں آئی۔ خصوصی مجسٹریٹ مقرر کیے گئے اور چوری کی وارداتوں کو

---

1. مل History of British India جس کو ولسن نے جاری رکھا، کتاب اول، باب 7

2. لارڈ منٹو کی روداد مورخہ 24 نومبر ۱۸۱۰ء۔

ختم کرنے کے لیے انھیں خصوصی اختیارات دیے گئے۔ انھوں نے مشتبہ لوگوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے مخبر مقرر کیے اور اس طرح جرائم کی برائی میں وسیع پیمانے پر کی جانے والی مخبری کی برائی شامل ہوگئی۔ مخبری ہونے پر گانوؤں کے رہنے والوں کی اندھا دھند گرفتاریاں عمل میں آتی تھیں، وہ مہینوں جیلوں میں پڑے رہتے تھے اور اکثر جیل میں مرجایا کرتے تھے۔ بنگال کے ہر بڑے جیل میں سینکڑوں ہزاروں بے قصور لوگ بھرے ہوئے تھے۔ دیہات کے لوگ مجسٹریٹوں کے غصے سے زیادہ مخبروں کی عداوت سے خائف تھے۔

1813ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اپنے اُن نمایاں ملازمین کو، جو اس وقت انگلستان میں تھے، ہندوستان کے عدالتی نظام کے متعلق سوالنامے بھیجے۔ اُن میں سے زیادہ تر اس پرانی روایت کو اب بھی سینے سے لگائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کے لوگ اس قابل نہیں کہ انھیں اعلیٰ عہدے دیے جائیں —— ایک ایسی روایت جس میں یہ فائدہ تھا کہ ہندوستان کے تمام اعلیٰ عہدے اُن کے بیٹوں، بھتیجوں، دوستوں اور عزیزوں کے لیے محفوظ تھے لیکن کمپنی کے ان ملازموں نے جو قابل تھے اور سوجھ بوجھ رکھتے تھے اس نظریے کی سطحیت کو سمجھ لیا تھا اور انھوں نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا کہ ہندوستان پر حکومت صرف اسی صورت میں کی جاسکتی ہے کہ وہاں کے لوگوں کا تعاون حاصل کیا جاسکے۔ حالانکہ اُس زمانے میں ایسی بات کہنا بدعت کے مترادف تھا جن لوگوں نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا اور سچ بولنے کی جرأت کی اُن میں بنگال کا سر ہنری اسٹریچی، مدراس کا ٹامس منرو اور بمبئی کا کرنل واکر شامل تھے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کو انھوں نے جو جوابات دیے تھے ان کے حصے قاری کے سامنے پیش کردیے جائیں۔

سر ہنری اسٹریچی نے لکھا تھا "جن خرابیوں کی طرف میں اشارہ کرچکا ہوں ان کے تدارک کے لیے میری رائے میں مزید عدالتیں قائم کی جائیں جو ہندوستانیوں پر مشتمل ہوں اور جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوں۔ یہ عدالتیں ہمارے ضابطوں کے مطابق کام کریں۔ ہندوستانی ججوں کو اگر اچھی تنخواہیں دی جائیں تو وہ اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا کریں گے۔ مجھے اس بات کا بالکل یقین ہے۔ اس پر زیادہ روپیہ خرچ نہیں ہوگا ممکن ہے کہ بالکل روپیہ نہ خرچ کرنا پڑے۔ مقدمات کی فیس سے تمام اخراجات پورے ہوجائیں گے۔ حالانکہ بہتر یہ ہوگا کہ ہندوستانی ججوں کو معقول تنخواہیں دی جائیں۔ بہرحال لگان کی ناجائز

وصولی کی صورت میں نقل حاصل کرنے یا کاغذات طلب کرنے کی کوئی فیس نہیں ہونی چاہیے۔ اسٹامپ کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ غرض کہ مقدمہ دائر کرنے کی فیس کے علاوہ کوئی خرچ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر منصفوں (ہندوستانی سول ججوں) کو ۵۰۰ روپے کی مالیت کے مقدمات فیصل کرنے کے اختیارات دے دیے جائیں، جو رجسٹراروں کے موجودہ اختیارات کے مطابق ہوں گے، تو مجھے یقین ہے کہ صرف مقدمے دائر کرنے کی فیس اتنی ہوگی کہ ہندوستانی ججوں اور ان کے عملے کو تنخواہ دی جاسکے۔ جب میں کہتا ہوں کہ ہندوستانی جج کو معقول تنخواہ دی جائے تو اس کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ اُسے یورپین جج کی تنخواہ کے دسویں حصے سے کچھ کم تنخواہ دی جانی چاہیے۔"

"اگر کمپنی اس کو پسند کرے تو میرے خیال میں بنگال کا تمام عدالتی کام رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کے سپرد کردیا جائے۔ ہندوستانی بھی ہمارے ضابطوں کے تحت اسی انداز سے کام کریں گے جیسے یورپین کرتے ہیں بلکہ کچھ حالات میں وہ بہتر ثابت ہوں گے اور ان پر دسویں حصے کے بقدر رقم خرچ ہوگی۔"[1]

ہندوستان کے یورپین تاجروں کا ذکر کرتے ہوئے سر ہنری نے لکھا تھا "نصف صدی بلکہ اس سے زیادہ مدت سے بنگال کی تجارت زیادہ تر یورپینوں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔"

"یورپین تاجروں کے مظالم صرف اس وقت ختم ہوئے جب دیوانی اور فوجداری عدالتیں اپنی موجودہ صورت میں قائم کی گئیں اور کچھ مدت تک کام کرتی رہیں۔ وہ مزدور اور دستکار جو کمپنی اور دوسرے یورپین تاجروں کے لیے کام کرتے تھے قید کیے جاتے تھے، جسمانی سزائیں پاتے تھے اور چپراسیوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھاتے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ملک کا پرانا دستور ہے۔ اس کو شروع کرنے کی ذمہ داری یورپین لوگوں پر نہیں ہے۔ پھر بھی کمپنی کے گماشتوں کو بڑے اختیارات حاصل تھے اور وہ انتہائی جابر و ظالم تھے۔"

1ـه East India Papers. (لندن 1820ء)، جلد 2، صفحہ 56

"نمک کے محکمے میں عام طور سے دھوکے دھڑی سے کام لیا جاتا تھا اور سختی برتی جاتی تھی۔ ہزاروں آدمیوں کو کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور انھیں بہت کم اُجرت دی جاتی تھی، ہر سال کئی سو انسانوں کو یہ کام کرنا پڑتا تھا۔ کچھ حالتوں میں ان کے ہاتھ پیر باندھ کر انھیں سندربن کے نہایت غیر صحت مند علاقوں میں بھیجا جاتا تھا کہ وہ کمپنی کی اجارہ داری کے لیے نمک سازی کر سکیں۔"

"یہ تمام حالات 1793ء میں عدالتیں قائم ہونے تک برقرار رہے۔ اس کے بعد لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ کارروائیاں غلط ہیں۔ تمام برائیاں اس وقت تک برقرار رہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم نے ان کو جائز قرار دینے کے لیے قانون بنائے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ لوگ شکایت نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ شکایت کرنے کے عادی ہوتے تو کلکٹر ان کے استغاثوں کے سویں حصے کی بھی سماعت نہ کر پاتا۔ اس کے علاوہ ان کا عمل ملک کے رواج سے مطابقت رکھتا تھا۔"

"مجموعی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی کے اور ان یورپینوں کے تجارتی لین دین میں جو کمپنی کے ملازم نہیں تھے ہندوستانیوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ خاص خاص مظالم کے لیے کلکٹر کبھی کبھی سزا بھی دیا کرتے تھے۔"

"دیوانی عدالتوں کے فیصلوں سے اور چھوٹے موٹے فوجداری کے مقدموں میں مجسٹریٹوں کی دی ہوئی سزاؤں سے، جن میں نسبتاً تاخیر کم ہوتی ہے، 1793ء کے بعد ایک بڑی تبدیلی آگئی ہے اور حالات بہتر ہو گئے ہیں۔"

انتظامی اور عدالتی فرائض کے اہم مسئلے پر جو 1793ء میں لارڈ کارنوالس نے بانٹ دیے تھے، سر ہنری اسٹریچی کے خیالات موجودہ حالات میں خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں۔

"بنگال میں 1793ء سے پہلے کلکٹر، جج اور مجسٹریٹ کے اختیارات بٹے ہوئے نہیں تھے اور ان عہدوں پر علیحدہ علیحدہ لوگوں کا تقرر نہیں ہوا کرتا تھا۔ میرے خیال میں کچھ مدت پہلے بھی اس منصوبے پر ضروری طور سے عمل کیا گیا تھا لیکن آخر میں ترک کر دیا گیا تھا۔ بہر حال اس زمانے تک عدالتوں کی ثانوی حیثیت تھی چاہے عدالتی اختیارات کلکٹروں کو حاصل تھے یا کسی اور کو۔ کلکٹر اپنے دوسرے فرائض کے مقابلے میں اس کو کم وقت دیتا تھا۔ ملک کے خاص اور پرانے دستور کے مطابق حکومت کا اصل کام اور بنیادی مقصد مال گزاری کی وصولیابی

سمجھا جاتا تھا۔"

"اس کے بعد (1793ء) بنگال کی حکومت نے عدالتی حکام کے ذریعے اپنی بے شمار رعایا کے تحفظ اور خوشحالی کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی۔"[1]

سر ہنری اسٹریچی نے بنگال کے زمینداری کے طریقے کے تحت کسانوں پر ہونے والے ظلم کے متعلق بہت کچھ کہا ہے یہ ظلم جو 1859ء، 1868ء اور 1885ء کے رینیٹ ایکٹوں (Rent Acts) کے بعد ختم ہو گیا، اتنے ہی زوردار الفاظ میں اُس نے مدراس کے رعیت واری طریقے کے تحت کسانوں پر ہونے والے ظلم کا بھی ذکر کیا تھا۔

"رعیت واری علاقوں کے کلکٹر اپنے نظام سے بنگال کے عدالتی اداروں کی بے آہنگی کا لاکھ ذکر کریں۔ مدراس کی حکومت سال بہ سال بنگال کے ضابطے نافذ کرنے میں لاکھ دیر کرے اور لاکھ کہے کہ کلکٹروں کا اثر زائل ہو جائے گا اور مالگزاری کی وصولیابی میں رکاوٹیں پڑیں گی ......

"اگر عدلیہ کے قیام کے بعد رعیت واری کا طریقہ کامیابی سے چلایا جا سکے۔ اگر ایسے قواعد بنائے جا سکیں جن کے تحت رعیت واری علاقے کا کلکٹر ایک جاگیر کے منیجر کی حیثیت سے کام کر سکے اور لوگوں کی شکایتوں کو دور کرنے کے اختیارات حسب معمول جج کو حاصل ہوں تو میں اُس طریقے کی مذمت نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے اس پر اعتراض ہے کہ رعیت واری علاقے کے کلکٹر کو کس قسم کے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔ اس کو ایک جاگیر کا منیجر سمجھا جانا چاہیے۔ اس لیے اسے اپنے اختیارات کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ان اختیارات کو جبری وصولی کے لیے استعمال کرے۔ ہندوستان میں ہر جاگیر کا منیجر جبری وصولی کا فطری میلان یا رجحان رکھتا ہے۔ اگر ایک ایسا شخص جو کسانوں سے لگان وصول کرتا ہے اس فرض کی ادائیگی کے وقت یہ سوچے کہ وہ خود اور اس کے ماتحت کسانوں پر جو مظالم کرتے ہیں ان سے کسانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے دنیا کا سب سے موزوں شخص وہ خود ہے اور یہ کہ اس کے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کی نگہداشت و نگرانی کی کوئی ضرورت

---

[1] East India Papers، (لندن 1820ء)، جلد 2، صفحہ 58۔ بدقسمتی سے انتظامی اور عدالتی فرائض پھر یکجا کر دیے گئے ہیں۔

نہیں تو میرے خیال میں وہ شخص سخت غلطی کرتا ہے۔"[1]

سر ہنری کے اس بیش بہا خط کا ایک اور اقتباس پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں اس نے زور دار الفاظ میں کہا ہے کہ ہندوستان کے لوگ یورپین حکام کی نگرانی اور نگہداشت کے بغیر اعلیٰ اور ذمہ دار عدالتی فرائض سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

"میرے خیال میں یورپین حکام کی نگرانی ضروری نہیں۔ سوال نمبر ۱ کے جواب میں اس موضوع کے متعلق میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں۔ اگر ہندوستان کے لوگ ان عہدوں یا دوسرے عہدوں کے لیے موزوں نہیں ہیں تو ان کے بجائے اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم ان کی ہمت افزائی کریں، اگر ہم انھیں اس کا موقع دیں کہ وہ اعلیٰ عہدوں کی توقع رکھ سکیں، ....
اگر ہم انھیں اچھی تنخواہیں دیں، اگر ہم ان میں خود اعتمادی پیدا کر سکیں تو وہ جلد ہندوستان کے ہر عہدے کے لیے موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے اجازت دیجیے کہ میں وہ بات دہرا سکوں جو مدتوں پہلے میں کہہ چکا ہوں اور جس میں اس موضوع کا نچوڑ میں نے پیش کر دیا تھا۔ وہ بات یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو چھوٹے چھوٹے اور کم حیثیت عہدوں تک محدود رکھ کر ان کی توہین کرتے ہیں اور انھیں کچلتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعلیم نہایت ناقص ہوتی ہے اور وہ، خصوصیت کے ساتھ ہندو، جہالت اور ضعیف الاعتقادی کے شکار ہیں پھر بھی جو فرائض ان کے سپرد کیے جاتے ہیں ان کو پورا کرنے کی ضروری صلاحیت وہ اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ مزاج، عادت، اور خصوصی حالات کی بنا پر جج کے فرائض ادا کرنے کی صلاحیت اُن میں ہم سے زیادہ ہے۔"

"لیکن ہم یورپین کو ایسی حیثیت دیتے ہیں کہ اُسے طمع کی حاجت نہیں رہتی۔ ایک ہندوستانی کو جس کے باپ دادا غالباً بڑی حیثیت کے مالک تھے ہم چھوٹا موٹا کلرک بناتے ہیں اور اسے بیس یا تیس روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا

---

[1] East India Papers. (لندن، ۱۸۲۰ء)، صفحات 64-65۔ مدراس کے رعیت واری علاقے کا کلکٹر اب بھی (۱۹۰۱ء) اپنے ضلع کا مجسٹریٹ ہوتا ہے۔

دامن صاف نہیں اور کمپنی کے ملازموں کے علاوہ کوئی قوم اُن پر حکومت کرنے کے قابل نہیں[1]"

حالانکہ سرہنری اسٹریچی کے خط کے بقیہ حصے میں بیش بہا باتیں کہی گئی ہیں پھر بھی اب ہم اس سے رخصت ہوں گے۔ اس نے اعداد و شمار پیش کر کے بتایا کہ بنگال کی چوریوں کے انسداد کے لیے کتنے سخت قدم اٹھائے گئے۔ چوبیس پرگنہ کے جیل میں دو سو نو اشخاص شبہ کی بنا پر بند کر دیے گئے۔ جن میں سے کچھ تو پانچ مہینے تک بند رہے اور مجسٹریٹ نے ان کا بیان تک نہیں لیا۔ اردوال میں ہونے والی چوری کے شبہ میں باسٹھ آدمی گرفتار کر لیے گئے، ان میں سے نو جیل میں مر گئے۔ مقدمے کی سماعت کے بعد کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکا۔ ڈُن گین کی چوری کے شبہ میں چوراسی اشخاص کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اُن میں سے صرف 2 کے خلاف جرم ثابت ہو سکا۔ مدن پور کی ایک چوری کے شبہ میں ایک سو بانوے اشخاص گرفتار ہوئے۔ اُن سے جبراً اقبال جرم کرایا گیا۔ یا ان کے خلاف اقبال جرم کی جھوٹی شہادت پیش کی گئی۔ ان میں سے چھیالیس کو ایک سال تک ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہننا پڑیں، تین جیل میں مر گئے اور مقدمے کی سماعت کے بعد بقیہ رہا کر دیے گئے۔ نومبر 1808ء اور مئی 1809ء کی درمیانی مدت میں 2071 اشخاص شبہ کی بنا پر نادیا کے ضلع میں گرفتار کیے گئے۔ چھ مہینے کے اندر ان میں سے اڑتالیس اشخاص کی جیل میں موت واقع ہو گئی، 278 کے خلاف مقدمے کی سماعت ہوتی رہی اور 1477 کا بیان بھی نہیں لیا گیا۔ سرہنری نے کہا تھا "یہ دل ہلا دینے والا ظلم، یہ عدالت کا غلط استعمال جو ہماری آنکھوں کے سامنے عمداً کیا جاتا ہے، سینکڑوں لوگوں کی گرفتاری، پریشانی، دروغ بیانی، لوٹ کھسوٹ، جیلوں میں بے گناہوں کی موت یہ واقعات ان لوگوں کی پیشانیوں پر کلنک کے ٹیکے ہیں جو ان کی اجازت دیتے ہیں کسی صورت میں بھی اس کو برداشت نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ ڈاکو کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں، لیکن اس خوفناک طریقے نے جو خرابیاں پیدا کر دی ہیں ان کے مقابلے میں ڈاکوؤں کو کمتر خرابی قرار دینا پڑے گا۔[2]"

---

1. East India Papers (لندن، 1820ء)، جلد 2، صفحہ 67۔
2. East India Papers (لندن، 1820ء)، جلد 2، صفحہ 70

ایک اور یادداشت میں ٹامس منرو نے گاؤں پنچائتوں کے ذریعے ہندوؤں کے قدیم طریقۂ عدالت کا ذکر کیا اور اس کی اچھائیاں اور برائیاں دکھائیں۔

"اس میں شک نہیں کہ پنچائتوں کے فیصلوں سے مقامی لوگوں کے لگاؤ کی وجہ وہاں کے حکمرانوں کی ضمیر فروشی کا خوف تھا، لیکن تجربے نے غالباً ان کے اس خیال کی تصدیق کی کہ منصف کتنا ہی ایماندار اور باعمل کیوں نہ ہو پھر بھی جلدی اور ٹھیک ٹھیک مقدمہ فیصل کرنے کی اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہو سکتی جتنی کہ اس ادارے میں ہے۔"

اس پرانے طریقے کا اس طریقے سے مقابلہ کرتے ہوئے جس کو انگریزی راج میں شروع کیا گیا تھا اس نے کچھ فکر انگیز جملے کہے۔

"یہ ظاہر ہے کہ ہمارا موجودہ طریقہ نہ صرف زیادہ مہنگا اور پریشان کن ہے بلکہ غیر موثر بھی ہے۔ حکومت بنگال کے پاس تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار زیر سماعت مقدمات باقی ہیں۔ ان مقدموں کے لیے کم سے کم دس لاکھ گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر ہم ان گواہوں پر ہونے والے اخراجات پر غور کریں، اس مسافت پر غور کریں جو انھیں طے کرنی ہوگی اور اس وقت پر غور کریں جب وہ اپنے گھروں سے دور رہیں گے تو ہم بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملک کو کتنا نقصان ہوگا لیکن کہا جاتا ہے کہ اس خرابی سے بچنا مشکل ہے جو ہندوستان کے لوگوں کے مقدمہ بازی کے شوق کا نتیجہ ہے۔ اگر واقعی انھیں مقدمہ بازی کا شوق ہوتا تو اس کا مظاہرہ اس وقت ہونا چاہیے تھا جب انھیں مقدمے دائر کرنے میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں انھیں دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ انھیں مقدمہ بازی کا شوق نہیں ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا ہے کہ ان کے باہمی مقدمات کتنی آسانی سے طے ہو گئے اور کتنی ایمانداری کے ساتھ ہارنے والے فریق نے دوسرے فریق کا مطالبہ تسلیم کر لیا لیکن اس میں تعجب کی بات نہیں۔ جوں جوں مقدمے کی سماعت تھکا دینے والے مراحل سے گزرتی ہے ویسے ویسے اخراجات اور تاخیر کی بنا پر مقدمہ بازی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے.... ہمارا طریقہ مقدمہ بازی کے جذبے کو جنم دیتا ہے اور ہم لوگوں پر مقدمہ بازی کے شوق کی بے بنیاد تہمت لگاتے ہیں۔"[1]

---

[1] East India Papers (لندن، 1820ء) جلد 2، صفحات 116-118

آخر میں ہم بمبئی کے کرنل واکر کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس نے انگریزی راج میں شروع ہونے والے عدالتی نظام کی اچھائیوں اور برائیوں کو نہایت اعتدال پسندی اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔

"انگریزوں کے شروع کیے ہوئے عدالتی طریقے کی اکثر تعریف کی گئی ہے اور قومی فخر کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ انسان دوستی کے جذبے پر مبنی ہے اور اس پر عمل کرنے میں بڑی دیانت سے کام لیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رعایا کے تمام طبقوں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے اور انسانی کمزوریوں سے قطع نظر انصاف کے معاملے میں بڑی سختی برتی جاتی ہے اور یکساں غیر جانب داری سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طریقے کے نقائص کی اصل وجہ عادات کا اختلاف ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بدیسی لوگوں کے مقدمے فیصل کرنے میں ایک اجنبی کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسی دقت ہے جو کبھی دور نہ کی جا سکے گی لیکن مقامی لوگوں کو عدالتی کاموں میں شریک کر کے اس کو کم کیا جا سکتا ہے....
موجودہ نظام کا سب سے بڑا نقص غالباً یہ ہے کہ مقامی لوگوں کو بالکل ہی نظر انداز کر کے اجنبیوں کو عہدے دیے جاتے ہیں۔"[1]

ہندوستان کے لوگوں کی جفاکشی اور دیانت کے متعلق ڈائرکٹروں نے جو نواں سوال کیا تھا اس کے جواب میں کرنل واکر نے بار بار اس موضوع کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی۔

"کمپنی کی سول حکومت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مقامی آبادی کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مقامی لوگوں کا تقرر جن عہدوں پر کیا جاتا ہے وہ سب سے کم حیثیت کے ہوتے ہیں ایسے عہدے جن کو حاصل کرنے کی خواہش کوئی یورپین نہیں کر سکتا۔ ان اسامیوں پر کام کرنے کے لیے انھیں جو تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ ان کی اور ان کے خاندانوں کی گذر بسر کے لیے بمشکل کافی ہوتی ہیں۔ باحیثیت اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اس قسم کے مواقع نہیں دیے جاتے ہیں جو انھیں کمپنی کی ملازمت پر آمادہ کر سکیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ انھیں تنخواہیں کم دی جاتی ہیں بلکہ ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان کے دلوں میں شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے........

---

[1] 'East India Papers' (لندن، ۱۸۲۰ء) جلد 2، صفحات 183-184

"ہندوستانیوں کے دل ہاتھ میں لینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انھیں ایسے عہدے دیے جائیں جن سے ان کی عزت بڑھے اور انھیں مالی فائدہ ہو۔ یہ امید فضول ہے کہ کوئی شخص محض املاک کی حفاظت سے کبھی بھی مطمئن ہو سکتا ہے اگر باعزت توقعات کے تمام راستے کسی پر بند کر دیے جائیں تو اس توہین آمیز علیحدگی سے اس کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں، اس کا خاندانی وقار مجروح ہوتا ہے اور کمزور اور ناکارہ لوگوں کے علاوہ سب اس سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ سماج کے بالائی طبقے اس کو ناانصافی سمجھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ملک میں بااثر اور باحیثیت ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ملک کی رائے عامہ کو وجود میں لاتے ہیں۔ جب تک اس قسم کی مخالفت کا جذبہ برقرار رہے گا۔ برطانوی حکومت کو ہمیشہ ایک ایسا جوا سمجھا جائے گا جو لوگوں کی گردنوں پر بالجبر رکھ دیا گیا ہے"۔.....

"روم کے لوگوں کو قوموں کو محکوم بنانے کے فن کا امام سمجھنا چاہیے جن کا کام ہی ملکوں کو فتح کرنا تھا اور جنھوں نے متمدن دنیا کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ سمجھدار لوگ جن ملکوں پر قبضہ کرتے تھے وہاں کے نظم و نسق کا بڑا حصہ ہمیشہ مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا کرتے تھے"[1]

یہ عجیب بات ہے کہ تاریخی واقعات کے وسیع جائزے کے بعد کرنل منرو اور کرنل واکر ایک ہی نتیجے پر پہنچے۔ کرنل منرو نے مسلمان فاتحین کا ذکر کیا جنھوں نے ہندوستان کے ہندوؤں کو "ریاست کے اونچے منصب" دے کر پانچ سو سال شمالی ہند میں حکومت کی۔ کرنل واکر نے روم کے فاتحین کا ذکر کیا جنھوں نے "مفتوحہ ممالک کے نظم و نسق کا بڑا حصہ وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر" تقریباً اتنی ہی مدت تک مغربی دنیا پر قبضہ رکھا۔ وہ لوگ جو ہندوستان کے انگریزی راج کی نعمتوں کا پورا پورا شعور رکھتے ہیں ——— اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ اس میں پیش پیش ہیں ——— وہ یہ بھی جانتے ہیں اور انھیں اس کا غم ہے، کہ اعلیٰ عہدوں اور نظم و نسق کی نگرانی سے ہندوستانیوں کو عملاً علیحدہ رکھ کر راج کو غیر ہر دلعزیز اور سلطنت کو کمزور بنایا جا رہا ہے۔

1۔ East India Papers (لندن، 1820ء) جلد 2 صفحات 185-186

ہندوستان کے لوگوں کے کردار کو غلط انداز سے پیش کرکے اس علیحدگی کو عام طور سے جائز قرار دیا جاتا ہے۔ کرنل واکر نے اپنے خط کے آخر میں محتاط الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"کمپنی کو سب سے زیادہ احتیاط ان رپورٹوں کے سلسلے میں برتنی چاہیے جو اس کی ہندوستانی رعایا کی صلاحیتوں کے متعلق پیش کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی رپورٹیں ان یورپینوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں جو کمپنی کی ملازمت میں ہیں۔ لیکن وہ لوگ اپنے مفاد یا میلان خاطر کی بنا پر ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کے متعلق اکثر غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اس قسم کے محرکات سے بالاتر ہیں اور غالباً ایسے لوگ بہت کم ہیں جو عمداً اس قسم کا قدم اٹھائیں اس کے باوجود اس اصول پر خفیہ طریقے سے عمل کیا جاتا ہے اور انسانی تصورات و خیالات پر اس کا اثر پڑتا ہے چاہے اس اثر کو محسوس نہ کیا جائے"[1]

---

1. East India Papers (لندن، 1820ء) جلد 2، صفحہ 188

باب 19

انتظامی اصلاحات اور لارڈ ولیم بینٹنک (1815ء سے 1825ء)

سر ہنری اسٹریچی، کرنل منرو اور کرنل واکر جیسے لوگوں کی شہادتوں نے 1812ء کی ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی مشہور پانچویں رپورٹ نے اور 1813ء میں ہاؤس آف کامنز میں دی جانے والی منرو اور مالکم کی شہادتوں نے انگلستان کی رائے عامہ کو متاثر کیا اور کورٹ آف ڈائرکٹرز ہندوستان کے عدالتی نظام میں اصلاح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ انھوں نے ایک خصوصی کمیشن مقرر کیا جس کے سپرد عدالتی طریقے کی تحقیقات اور اصلاح کا کام کیا گیا۔ کرنل منرو اس کمیشن کا صدر بنایا گیا۔

منرو جون 1814ء میں انگلستان سے روانہ ہوا اور اٹھارہ مہینے کے سفر کے بعد ستمبر میں مدراس پہنچا۔ اس نے وقت برباد کیے بغیر حسبِ عادت فوراً کام شروع کر دیا اور اسی سال بڑے دن سے پہلے چھ عنوانات کے تحت اپنی تجاویز حکومت مدراس کو پیش کر دیں۔ اس کی تجاویز مندرجہ ذیل تھیں: (1) کلکٹر کو مجسٹریٹ کے اختیارات دیے جائیں اور گاؤوں کی چوکیداری کے اختیارات گاؤں کے مکھیا کو دوبارہ دے دیے جائیں (2) گاؤں پنچایتوں کی تجدید کی جائے (3) ہندوستانیوں کو ضلع ججوں یا کمشنروں کے عہدوں پر مقرر کیا جائے (4) کلکٹروں کو اختیار دیا جائے کہ وہ پٹے کے متعلق ضابطے نافذ کر سکیں (5) زمینداروں کے قرقی کرنے کے اختیارات میں کمی کی جائے (6) سرحدی نزاع کے دعوے کلکٹر فیصل کرے۔[1]

یہ ابتدائی تجاویز پیش کرتے وقت جن دو اہم تصورات نے محرکات کا کام کیا ان پر غور کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ تمام عدالتی کام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دینا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ مکھیا، ضلع کے جج اور کمشنر مقرر کیے جائیں۔ دوسری

---

[1] کرنل منرو کا مراسلہ حکومت مدراس کے نام مورخہ 24 دسمبر 1814ء، پیراگراف 6۔

بات یہ ہے کہ وہ تمام انتظامی کاموں یعنی مالگزاری کے کام، مجسٹریٹ کے کام اور پولیس کے کام میں مرکزیت پیدا کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ فرائض ایک حاکم یعنی ضلع کلکٹر کے سپرد ہوں۔ اُس کا پہلا خیال جزوی طور سے عمل میں لایا جا سکا اور اب تک ضلع کے جج کا عہدہ یورپینوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے دوسرے خیال پر بدقسمتی سے آج تک عمل ہو رہا ہے جو شاید صرف بدنظمی اور بدانتظامی کے زمانے میں بجا قرار دیا جا سکتا۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ دو سال کی مدت میں کمیشن نے جو کام کیا اس کی روداد سنا سکیں یا اس خط و کتابت کا جائزہ لے سکیں جو ایسٹ انڈیا پیپرز کے تقریباً 500 صفحات پر مشتمل ہے[1] اتنا بتا دینا کافی ہے کہ پہلے کمیشن نے سات ریگولیشنز کے مسودے تیار کیے اور نظر ثانی کے لیے مدراس کی اعلیٰ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے سپرد کر دیے۔ اس کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز کا مراسلہ مورخہ 20 دسمبر 1815ء موصول ہوا جو کمیشن کو بھیج دیا گیا۔ حکومت مدراس اور اعلیٰ عدالتوں کی تجاویز کی روشنی میں مسودوں میں بہت ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ بالآخر 1816ء کی مختلف تاریخوں میں 15 ریگولیشنز منظور کیے گئے۔

ان ریگولیشنز کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس کے بہت سے لوگوں کو ذمہ دار عہدوں پر ملازمت مل گئی اور بہت سا عدالتی کام ان کے سپرد ہو گیا۔ اس اصلاح کی وکالت کئی سال سے کمپنی کے سمجھدار ملازم کر رہے تھے کیونکہ یہ ایک اچھے نظم و نسق کے لیے ضروری تھی۔ اس ضروری اصلاح کو عملی شکل دینے کا کام ٹامس منرو نے انجام دیا۔

کورٹ آف ڈائرکٹرز نے حکومت مدراس کو لکھا تھا "اس فرض کا سب سے اہم اور مشکل ترین حصہ اعلیٰ کمشنر کرنل منرو کو انجام دینا پڑا۔ اگر آپ کو یقین دلانا اور سول سروس کو اطلاع دینا ہمارا مقصد نہ ہوتا تو اس کی سفارشوں کے متعلق کچھ کہنا لایعنی ہوتا۔ اس نے کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے کمپنی کی اور ہندوستان کے لوگوں کی جو خدمت کی ہے وہ اس کی باعزت سرکاری زندگی کے دوران کیے جانے والے ہر کام کی طرح اس قابل ہے کہ اس کو دلی مبارکباد پیش کی جائے"[2]

---

[1] جلد 2، (1820ء)، صفحات 291 — 769

[2] عدالتی نظام کے متعلق مدراس کو مراسلہ، مورخہ 12 مئی 1819ء

یہ تعریف بجا تھی۔ ہندوستان کی رائے عامہ نے اس کی تصدیق کردی۔ اس کے باوجود، میں کہنا پڑتا ہے کہ منرو کے ریگولیشنز کے کچھ مقاصد پورے نہ ہوسکے۔ گانو کی چوکیداری کی ذمہ داری گانو کے مکھیا کے سپرد کرنے کی کوشش ترک کردی گئی ہے اور پورے ہندوستان میں پولیس کا علیحدہ شعبہ قائم کردیا گیا۔ کچھ وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر کسی اور مقام پر کیا گیا ہے گانو پنچائتوں کی تجدید میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ اب وقت آگیا ہے کہ زیادہ سوچے سمجھے ریگولیشنوں کے تحت گانو پنچائتیں بنائی جائیں۔ جب تک پنچائتیں نہیں بنیں گی حکومت ہند اس ملک کے لوگوں سے رابطہ قائم نہیں کرسکے گی۔

منرو نے ایک شخص کے ہاتھ میں کلکٹر، مجسٹریٹ اور پولیس کے اختیارات مرکوز کرنے کی جو غلطی کی تھی اُس نے دائمی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ یہ غلطی حکومت مدراس کے احتجاج کے باوجود 1815ء اور 1816ء میں بھی کی گئی تھی۔ حکومت مدراس کے ایک رکن مسٹر فلرٹن (Mr. Fullerton) نے فرائض کو یکجا کرنے کے مقاصد کو وضاحت کے ساتھ بیان کردیا تھا۔

"میرے خیال میں کلکٹر کو مجسٹریٹ کے اختیارات سونپنا بھی ایک ایسا قدم ہوگا جس سے عدالتی نظام کے فوائد کو دھکا پہنچے گا۔ اس سے انتظامیہ کو ضرورت سے زیادہ اختیارات مل جائیں گے اور محکمہ انصاف نے لوگوں میں تحفظ کا جو جذبہ پیدا کردیا ہے وہ کم ہوجائے گا جس سے لوگوں کا اعتماد مجروح ہوگا۔"[1]

حکومت مدراس کو اس خیال سے اتفاق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پولیس کی نگرانی کا کام تو کلکٹروں کے سپرد کردیا جائے لیکن انھیں مجسٹریٹ کے اختیارات نہ دیے جائیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کورٹ آف ڈائریکٹرز سے رجوع کیا گیا۔ کورٹ نے حکومت مدراس کی رائے مسترد کردی اور ہدایت کی کہ مال گزاری وصول کرنے کے فرائض اور مجسٹریٹ کے فرائض ایک ہی حاکم کے سپرد کیے جائیں۔

"وہ بات جس کی بنا پر آپ میں اور کرنل منرو میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا ہے صرف یہ ہے کہ کرنل منرو کے خیال میں ہمارے مراسلے کے اس حصے کے معنی جس میں ہم نے کلکٹروں کو

---

[1] روداد مورخہ یکم جنوری 1816ء۔

مجسٹریٹوں کے اختیارات سونپنے کا حکم دیا تھا صرف اتنے نہیں کہ محض پولیس کی نگہداشت ونگرانی ان کے سپرد کر دی جائے بلکہ مجسٹریٹ کے تمام تر فرائض ان کے سپرد ہونے چاہئیں۔ لیکن ہمارا گورنر ان کونسل سمجھتا ہے کہ ہم صرف پولیس کی نگہداشت و نگرانی ان کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہم وضاحت کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ اختیارات کی منتقلی کے سلسلے میں ہمارے مقصد و معنی وہ تھے جو کرنل منرو نے سمجھے ہیں[1]۔"

حکومت مدراس نے بادل نخواستہ یہ فیصلہ تسلیم کیا۔ رابرٹ فلرٹن نے پھر لکھا "یہ بات لاکھ افسوسناک سہی کہ میں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے حکام بالا کے احکامات ان کے خلاف ہیں پھر بھی میرا ضمیر اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنی رائے بدل دوں۔ مزید غور اور اس حکم کے بعد وصول ہونے والی مختلف سرکاری دستاویزات کے مطالعے نے میرے اس خیال کو تقویت پہنچائی ہے کہ ضلع میں مجسٹریٹ کے تمام تر اختیارات کلکٹر کو دینے سے محکمہ مال کو اتنے زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں گے کہ ان کے غلط استعمال کے خلاف موثر انداز سے چارہ جوئی نہیں کی جا سکے گی[2]۔ کلکٹر کے اختیارات کا بڑا حصہ مقامی افسران مال کو تفویض کیا جائے گا اور گشتی جج کے کبھی کبھی ہونے والے دورے کی نگرانی نہیں کی جا سکے گی۔"

اب ہم بمبئی کے حالات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے ابواب میں بمبئی کا ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بنگال اور مدراس پر قبضہ ہونے کے نصف صدی بعد بمبئی کے زیادہ تر حصے پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ 1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر اور 1761ء کی جنگ وانڈی واش کے بعد مدراس پر انگریزوں کا پورا پورا اثر قائم ہو گیا تھا لیکن

1ھ عدالتی نظام کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کا خط حکومت مدراس کے نام مورخہ 20 دسمبر 1815ء، پیراگراف 12 اور 13

2ھ روداد مورخہ 13 دسمبر 1816ء۔ غالباً رابرٹ فلرٹن کے علم میں یہ بات تھی کہ ڈائریکٹروں کو مال گزاری کی زیادہ فکر تھی اور ان کی پالیسی کا اصل مقصد یہ تھا کہ محکمہ مال کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں۔

وارن ہیسٹنگز اور لارڈ ویلزلی کی جنگوں کے باوجود مغربی ہندوستان پر مرہٹوں کا قبضہ رہا۔ آخری پیشوا 1802ء میں انگریزوں کی فوجوں کی مدد سے پونا کے تخت پر بیٹھا اور انگریزوں کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی رو سے اس نے اپنے علاقے میں برطانوی امدادی فوج رکھنا قبول کرلیا۔ یہاں سے وہ حادثات شروع ہوئے جنھوں نے مرہٹوں کی طاقت کو ختم کردیا۔ پیشوا نے اپنے ان نئے دوستوں کی بے پناہ طاقت کو محسوس کرنا شروع کیا اور اس نے خود پر جو بندش عائد کی تھی اس کی وجہ سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ بالآخر اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹادیا اور انگریزوں کے خلاف مورچہ سنبھالا مگر اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور 1817ء میں اس کی ریاست برطانوی علاقے میں شامل کرلی گئی۔

چونکہ مرہٹوں کے معاملات کا الفنسٹن کو بڑا تجربہ تھا اس لیے مفتوحہ علاقے میں امن وامان قائم کرنے کے لیے وہ سب سے موزوں سمجھا گیا۔ جنوری 1818ء میں اسے دکن کا کمشنر مقرر کیا گیا۔ کمشنر کی حیثیت سے اس نے جو کام کیے ان کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ 1819ء میں وہ بمبئی کا گورنر مقرر ہوا۔ اس اعلیٰ عہدے پر وہ آٹھ سال تک فائز رہا اور اس آٹھ سال کی مدّت میں اس نے مغربی ہند میں برطانوی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

ایک فراخ دل حاکم کی حیثیت سے اُس کی شہرت کی بنیاد تین قسم کے کاموں پر قائم ہے۔ سب سے پہلے اس نے قوانین کا مجموعہ تیار کیا۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس زمانے کے حالات میں جس قدر بھی ممکن تھا انتظامی کاموں کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہندستان کے لوگوں کے ہاتھوں میں دیا جائے۔ اس کا تیسرا اور آخری مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں صحتمند تعلیمی طریقے کو رواج دیا جائے تاکہ وہ لوگ اپنے معاملات کے آئندہ انتظام کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری سنبھالنے کے اہل ہوجائیں۔

پہلا کام اچھی طرح اور اطمینان بخش انداز سے پورا ہوگیا۔ "بمبئی کے تمام رگیولیشنوں کا ایک مجموعہ تیار کرلیا گیا جن کی ترتیب موضوعات کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ ستائیس رگیولیشنوں پر مشتمل ہے جو ابواب اور دفعات میں تقسیم کردیے گئے ہیں اس کے موضوعات بھی وہی ہیں جو بنگال کے رگیولیشنوں کے ہیں۔ لیکن ایک معاملے میں یہ مجموعہ بنگال کے رگیولیشنوں سے مختلف ہے۔ اس میں فوجداری قانون کا ایک حصہ بھی شامل ہے[1]۔" اس کے علاوہ الفنسٹن نے

---

[1] سر جیمس اسٹیفن، سماجی سائنس کی ترقی کے لیے نیشنل ایسوسی ایشن کی روداد برائے 73-1872ء۔

کوشش کی کہ لوگوں کے قانونوں، رواجوں اور طریقوں کا ایک مجموعہ تیار کرے۔ اس نے لکھا "جس کو ہم ہندوؤں کا قانون کہتے ہیں اس کا اطلاق صرف برہمنوں پر ہوتا ہے۔ ہر ذات کے قوانین اور رواج جدا ہیں"۔ الفنسٹن چاہتا تھا کہ تمام ذاتوں اور قبیلوں کے مختلف رواجوں کا ایک مکمل مجموعہ تیار کر لیا جائے۔ یہ تصور اس کے شایانِ شان سہی مگر اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا اور اس لیے یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

ہندوستان کے بہترین حاکم انگلستان کے خیالات عالیہ اور ثقافت میں کتنی دلچسپی لیا کرتے تھے یہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانے میں الفنسٹن ہندوؤں کے قوانین اور رواجوں کا مجموعہ تیار کر رہا تھا انھیں دنوں جیریمی بنتھم (Jaremy Bentham) کی تحریروں کا بغور مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ اس نے بنتھم کے متعلق اسٹریچی کو لکھا تھا:۔

"آپ نے جیریمی بنتھم کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ان سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا مجھے بڑا شوق تھا جو پورا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی صلاحیتوں کا مالک ہے لیکن اس کے ساتھ وہ سنکی بھی بہت ہے۔ اس کے نظریات و خصائل میں یہ اوصاف غالباً دنیوی امور سے دامن بچائے رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے کتابوں کا جو تحفہ مجھے بھیجا ہے میں اس کے لیے فخر محسوس کرتا ہوں۔ کوئی دوسرا مصنف اگر مجھے یہ اعزاز بخشتا تو میری نظر میں اس کی قدر و قیمت اس اعزاز سے زیادہ نہ ہوتی۔ میں نے جب آپ کو پچھلا تفصیلی خط لکھا تھا اس وقت میرا خیال تھا کہ بنگال سے آنے والے مشیروں کو جن کی پونا میں آمد کی توقع تھی اس ہندو قانون کا جس کی رو سے برہمن مقدموں کا فیصلہ کیا کرتے تھے اور مرہٹوں کے علاقے کے رواجوں کا مجموعہ تیار کرنے کا کام سپرد کر دوں تاکہ اس کی جزوی اصلاح ہمارے قانون کی روشنی میں کی جائے۔ لیکن مشیر نہ آسکے اور میں نے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی یہ کام مجھے دشوار نظر آیا"۔[51]

ہندوستان کے مورخوں نے اس بات کی کافی وضاحت نہیں کی ہے کہ ہندوستان کے ڈیڑھ صدی کے انگریزی راج کی تشکیل میں یورپی تصورات کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ فریڈرک اعظم کی

---

51 خط مورخہ 3 ستمبر 1820ء Life of the Hon Mountstuart Elphinston.' از جے۔ ای۔ کول برک (1884ء) جلد 2، صفحہ 115

جنگوں نے اٹھارھویں صدی میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگو کا سلسلہ شروع کیا جس نے ہندوستان میں فرانس کی طاقت کو ختم کر دیا۔ نپولین کی جنگوں نے لارڈ ویلزلی اور لارڈ ہیسٹنگز کی جنگوں کے لیے محرکات مہیا کیے۔ عدالتی، سول اور دوسرے داخلی اصلاحات کی کوشش نے، جن کا نتیجہ انگلستان کے 1832ء کے ریفارم ایکٹ (Refo rm Act) کی صورت میں ظاہر ہوا، ہندوستان میں بھی اصلاحات کی داغ بیل ڈالی جس کی وجہ سے مدراس، بمبئی، اور بنگال کے انتظامی کاموں کی ذمہ داری بڑی حد تک مقامی لوگوں کے سپرد ہو گئی۔ اس کے بعد ستر برسوں میں انگلستان میں امن اور اصلاحات کے ہر دور نے ہندوستان میں واضح اصلاحات کو جنم دیا اور انگلستان میں محسوس ہونے والی ہر جنگی لہر نے ہندوستان میں حوصلہ مندانہ منصوبوں اور اکثر احمقانہ جنگوں کو ہوا دی۔ ہندوستان کے لوگوں کو عمومی نمائندگی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وہ ملک کئی اعتبار سے انگلستان کا محکوم بن گیا ہے۔ انگلستان کے عارضی پاگل پن کے زمانے میں ہندوستان کو احمقانہ اور رجعت پسندانہ اقدامات کو برداشت کرنا پڑتا ہے احمقانہ جنگوں کے اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں۔

اس باب میں ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت صحت مند برطانوی اثرات پڑ رہے تھے جنھوں نے منرو، الفنسٹن اور بینٹنک کو نہ صرف ہندوستان کے قوانین کی اصلاح بلکہ حکومت میں لوگوں کے جائز حقوق پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ منرو کی طرح الفنسٹن بھی اپنی رائے کے اظہار میں وضاحت سے کام لیا کرتا تھا اور اس موضوع پر جب کسی خط و کتابت یا روداد لکھنے کا موقع آیا تو اس نے صاف صاف رائے ظاہر کی۔ نمونے کے طور پر اس کے ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو 1822ء میں منرو کو لکھا گیا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ نے مدراس میں کسی قسم کے نیٹو بورڈ (Native Board) کی داغ بیل ڈالی ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ اس منصوبے کی تفصیلات سے مطلع کریں۔ اس انتظام کا ایک بڑا فائدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستانیوں کو اعلیٰ اور با اختیار آسامیوں کے لیے بھرتی کرنے کا راستہ کھل جائے گا۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آپ کی رائے میں اس منصوبے کا اطلاق عدالتی اور دوسرے محکموں پر بھی کیا جا سکے۔ ہندوستانیوں کو

حکومت کرنے کے لیے ہندوستانیوں سے مشورہ لینے کی اہمیت کے علاوہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی حکومت میں کچھ نہ کچھ حصہ لینے کا موقعہ دیا جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پچاس سال ہم اس طرح اور کام کرلیں پھر ہمیں مجبوراً یہ قدم اٹھانا ہوگا۔ ہم نے حکومت اور تعلیم کا جو طریقہ یہاں رائج کیا ہے وہ اس ملک کے لوگوں کو کبھی نہ کبھی ضرور بدل دے گا اور اس کے بعد انھیں چھوٹی موٹی ملازمتوں تک محدود رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر ہم نے ان کی صلاحیت و قابلیت کے لیے پہلے سے راستے نہیں کھول دیے تو ہمیں ایسے دھماکے کے لیے تیار رہنا چاہیے جو حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔"[1]

چار سال بعد ہنری ایلس (Henry Ellis) کے نام ایک خط میں الفنسٹن نے اس موضوع پر زیادہ زوردار طریقے سے اپنی سوچی سمجھی رائے ظاہر کی۔

"ہمیشہ سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستانیوں کے تعلق سے ہم وہی رویہ اختیار کریں جو تاتاریوں کے تعلق سے چینیوں نے اختیار کیا ہے یعنی حکومت اور فوجی طاقت ہمارے ہاتھوں میں رہے۔ مگر ملک کا نظم و نسق رفتہ رفتہ ان کے سپرد کردیا جائے۔ ہم صرف اس حد تک نگرانی و نگہداشت کے اختیارات اپنے پاس رکھیں جس کی بنا پر ان کو حرکت میں لایا جاسکے اور سمت کا تعین کیا جاسکے۔ یہ تبدیلی اتنی آہستہ آہستہ کی جائے کہ اس سے ڈائرکٹر خائف نہ ہوں اور جیسا کہ آپ کا خیال ہے یہ نہ محسوس کریں کہ ان کی سول پرستی ختم ہو رہی ہے۔ بہر حال ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے اور ہمارے ہر اقدام کا مقصد یہی ہونا چاہیے۔"[2]

---

[1] سر جے۔ ای۔ کول برک، Life of the Hon Mountstuart Elphinston. (۱۸۸۴ء)، جلد 2، صفحہ 142۔ خط مورخہ 27 اکتوبر 1822ء

[1] سر جے۔ ای۔ کول برک، Life of the Hon Mountstuart Elphinston. (۱۸۸۴ء)، جلد 2، صفحہ 186۔ خط مورخہ 30 اکتوبر 1826ء

ڈائرکٹر اور ان کی مربیانہ حیثیت ختم ہوگئی ہے لیکن انگریز نوجوانوں کے لیے ہندوستان میں روزگار کی تلاش کی وجہ سے اب بھی اعلیٰ عہدوں کے دروازے عملاً ہندوستانیوں پر بند ہیں۔

الفنسٹن نے عمر بھر ان تصورات کی حمایت و اشاعت کی۔ ہندوستان کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے تقریباً بیس سال کے بعد جب وہ سرے کے دیہات کے ایک پرسکون گھر میں اپنی کتابوں کے درمیان زندگی گزارا کرتا تھا، ہندوستان کے معاملات کا مسلم الثبوت ماہر سمجھا جاتا تھا اور کئی بار ہندوستان کے گورنر جنرل کے عہدے کی اس کو پیش کش کی جا چکی تھی، اس وقت بھی وہ اپنی خط و کتابت میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کرتا رہتا تھا۔

"ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستانیوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنی حکومت میں اس طرح حصہ لیں جو ہمارے لیے مفید ہو، خود ان کے لیے مفید ہو اور تمام دنیا کے لیے مفید ہو اور اسی شاندار کارنامے کو اور اس احساس کو کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا اپنی محنت کا سب سے بڑا صلہ سمجھیں۔"[1]

ہم اتنا بتا دیں کہ الفنسٹن نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس پالیسی پر عمل کرنے کی امکانی کوشش کی۔ سر ٹامس منرو نے مدراس میں جو مثال قائم کی تھی اس نے الفنسٹن کو اس امر کا موقع دیا کہ بمبئی میں عدالتی کام مختلف درجوں کے ہندوستانی سول ججوں کے سپرد کر دے۔

الفنسٹن کی حکومت کا تیسرا اور آخری مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں تعلیم پھیلائے۔ اُس زمانے میں تعلیم کے نقطۂ نظر سے بمبئی سب سے زیادہ پس ماندہ پریسیڈنسی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پادری کچھ خیراتی اسکول چلایا کرتے تھے اور مشنریوں کی خدمات کچھ تھوڑے سے امریکی مشنریوں تک محدود تھیں جو سنہ 1816ء میں بمبئی آئے تھے۔ سنہ 1820ء میں الفنسٹن نے ایک عام جلسے کی صدارت کی اور غریبوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایک سوسائٹی کے لیے 5000 پاؤنڈ کا عطیہ حاصل کیا اور اگلے سولہ سال تک یہ سوسائٹی ہندوستانی زبانوں میں دی جانے والی تعلیم کی نگرانی کرتی رہی۔

---

[1] "ہندوستان کے تعلق سے برطانیۂ عظمیٰ کے فرائض" کے موضوع پر کیمرون (Cameron) کی پارلیمنٹ میں تقریر میں درج ہے۔ ایس۔ کاٹن Mountstuart Elphinston and the 'Making of South-Western India' (1896ء)، صفحہ 190

ابتدائی تعلیم کے طریقے کے متعلق جو تفصیلی تحقیقات کی گئی تھی اس سے معلوم ہوا کہ بمبئی کے صوبے میں جس کی آبادی تقریباً پچاس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، 1832ء میں 1705 اسکول تھے جن میں 35,143 طالب علم پڑھتے تھے۔[1]

اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کی کوششوں میں الفنسٹن کو خود اپنی کاؤنسل کی مخالفت کے ساتھ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ الفنسٹن چاہتا تھا کہ نوجوان سول افسروں کی تربیت کے لیے بمبئی میں ایک کالج کھولے جس میں ہندوستانی افسروں کی تربیت کا ایک خصوصی شعبہ بھی ہو۔ اس منصوبے کے دوسرے حصے کی مخالفت خود اس کی کاؤنسل نے کی اور ڈائریکٹروں نے پورے منصوبے کو رد کر دیا۔

عام تعلیم کو فروغ دینے کے لیے الفنسٹن نے مندرجہ ذیل تجویزیں پیش کیں (1) ہندوستانی بچوں کے اسکولوں کی تعداد بڑھائی جائے اور انھیں ترقی دی جائے۔ (2) انھیں درسی کتابیں مہیا کی جائیں (3) تعلیم حاصل کرنے کے لیے نچلے طبقوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ (4) یورپی سائنسوں کی تعلیم کے لیے نئے اسکول کھولے جائیں (5) اخلاق اور طبعی سائنسوں کی کتابیں دیسی زبانوں میں تیار کی جائیں (6) انگریزی پڑھانے کے لیے نئے اسکول کھولے جائیں (7) لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ ڈائریکٹروں کو مطمئن کرنے کے لیے الفنسٹن نے بتایا کہ اسکولوں پر کمپنی کو بہت کم روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ ان کے زیادہ تر مصارف گاؤں کے لوگ برداشت کریں گے۔ پھر بھی اس کے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے یہ اسکیم منظور نہ ہو سکی۔ بمبئی میں پہلا انگریزی کا اسکول 1828ء میں قائم ہوا یعنی الفنسٹن کی روانگی کے ایک سال بعد، اسی سال پونا کے سنسکرت کالج میں ایک انگریزی کا شعبہ بھی کھولا گیا اور بمبئی کا عظیم الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ 1834ء سے پہلے وجود میں نہ آسکا۔

1824ء میں اس نے جو روداد لکھی تھی اس کے ایک دو اقتباسات پیش کر کے ہم الفنسٹن کی تعلیمی سرگرمیوں کے بیان کو ختم کرتے ہیں۔

---

[1] جے۔ ایس۔ کائی Mountstuart Elphinston and the Making of South western India. 1896ء صفحہ 193۔

"ہماری ہندوستانی حکومت کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے مشرق کی ریاستوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ہم نے وہ تمام راستے مسدود کر دیے ہیں جن سے ملک شان و شوکت حاصل کیا کرتا تھا اور ہم نے کوئی ایسا کام بھی نہیں کیا ہے جس کی افادیت یا شان و شوکت کو تسلیم کیا جائے۔ بجا طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کے سرچشموں کو خشک کر دیا اور ہماری فتح کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کی وجہ سے نہ صرف علم کی ترقی رک گئی بلکہ قوم کے سرمایۂ علم اور گزشتہ عظیم فنکاروں کے کارناموں کے کم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس طریقۂ عمل کو بدلنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"[1]

اس نے اسی سال مزید لکھا تھا کہ:-

"اگر ہم ہندوستانیوں کو عام ملازمتوں کے لیے تیار کریں اور اس کے بعد انھیں ملازمتیں دے کر ان کی ہمت افزائی کریں تو جلد نقشہ بدل سکتا ہے۔ مستقبل قریب میں ہم دیکھ سکیں گے کہ جس طرح یورپین ماتحت افسر آج کل کام کیا کرتے ہیں ہندوستانی بھی ضلع کے ایک حصے کی نگرانی کیا کریں گے۔ ترقی کی وہ منزل بھی آسکتی ہے جب وہ رجسٹرار اور سب کلکٹر بنائے جا سکیں بلکہ کلکٹروں اور ججوں کے عہدوں پر بھی فائز ہو سکیں۔ یہ توقع تخیل پرستی نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب ہندوستانیوں اور انگریزوں میں اسی قسم کا رشتہ ہوگا جیسا کہ چینیوں اور تاتاریوں میں ہے یعنی یورپینوں کے ہاتھوں میں حکومت اور فوج کی طاقت رہے گی اور ہندوستانی زیادہ تر سول ملازمتیں حاصل کر لیں گے اور فوج کے چھوٹے موٹے افسر بنائے جا سکیں گے۔"[2]

ہندوستان نے اپنے دو سب سے عظیم حاکم ایک ہی سال میں کھو دیے۔ جولائی سنہ 1827ء میں سر ٹامس منرو کا انتقال ہو گیا اور اس کے چار مہینے بعد ماونٹ اسٹورٹ الفنسٹن ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ اسی سال لارڈ ولیم بینٹنک ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور منرو اور الفنسٹن کے شروع کیے ہوئے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا قرعہ

1۔ فارسٹ Selections from the Minutes and other official writing of the Hon Mountstuart Elphinston (سنہ 1884ء) صفحہ 102

2۔ مندرج ہے۔ سی۔ کائی، محولہ بالا کتاب۔

اس کے نام پڑا۔

کوئی حاکم اُس صحت مند رائے عامہ کے اس سے قومی تر اثرات کے دوران ہندوستان نہیں بھیجا گیا تھا جو نپولین کی جنگوں کے بعد یورپ میں تشکیل ہو رہی تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں وہ مدراس کا گورنر رہ چکا تھا، ایک بغاوت کی وجہ سے اپنے عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور یورپ کی سیاست میں حصہ لینے لگا تھا۔ وہ سسلی اور اٹلی کی آزادی کے لیے ڈیوک آف اورلینس (جو بعد میں لوئی فلپ کے نام سے فرانس کا بادشاہ بن گیا) سے ساز باز کر رہا تھا۔ ۱۸۱۴ء میں جنیوا کی فتح کے بعد اس نے جنیوا کا پرانا آئین نافذ کر دیا اور اٹلی کے لوگوں کو جد و جہد کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی دعوت دی۔ لیکن فتحیاب اتحادی پرانے طریقوں کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ویانا کی کانگریس نے اٹلی کو آسٹریا کی محکومی کی لعنت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے تیرہ سال بعد جب فرانس ۱۸۳۰ء کے انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا اور جب انگلستان میں ریفارم ایکٹ کی جد و جہد شروع ہو چکی تھی لارڈ ولیم بینٹنک گورنر جنرل کی حیثیت سے ۱۸۲۸ء میں ہندوستان پہنچا۔

لارڈ ولیم بینٹنک نے منرو اور الفنسٹن کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر انتظامی اور تعلیمی اصلاحات کیں۔ عدلیہ کا بڑا حصہ باصلاحیت ہندوستانی حکام کے سپرد کر دیا گیا اور ہندوستانی ججوں کے لیے صدر آمین کے نام سے ایک اعلیٰ عہدہ تشکیل کیا گیا۔ مال کے کاموں کے ساتھ کچھ انتظامی کام بھی ان کے سپرد کیے گئے، اور ان کے لیے ایک بہتر عہدہ تشکیل کیا گیا جس کو ڈپٹی کلکٹر کہتے تھے۔ پچھلے ستر سال میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں نے ثابت کر دیا کہ وہ انتہائی مشکل انتظامی کاموں کی ذمہ داری سنبھالنے کے اہل ہیں اور ان میں صلاحیت و دیانت کی کمی نہیں۔

شمالی ہند کا ۱۸۲۲ء کا بندوبست بہت ظالمانہ ثابت ہو چکا تھا۔ جس کی رو سے ریاست لگان کا تین چوتھائی حصہ بطور زمین کے محصول کے وصول کیا کرتی تھی۔ لارڈ ولیم بینٹنک نے اس میں ترمیم کی اور سرکاری مطالبہ لگان کا دو تہائی کر دیا گیا۔ ۱۸۳۳ء میں ایک نیا بندوبست کیا گیا جس کا مہتمم مسٹر برڈ تھا۔ اس بندوبست سے لوگوں کو سہولت بھی ملی اور مال گزاری میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ہم کسی اگلے باب میں اس

بندوبست کا ذکر کریں گے۔

راجہ رام موہن رائے نے، جو تعلیم یافتہ ہندوؤں میں سب سے زیادہ روشن خیال تھے، ہندوؤں کے اُس رواج کو ختم کرنے کے کام میں گورنر جنرل کی حمایت کی جس کی رو سے ہندو بیوہ اپنے مرحوم شوہر کی چتا پر جل کر جان دے دیا کرتی تھی اور جس کو ستی کہا جاتا تھا۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کو ختم کرنے میں جو ٹھگ کہلاتے تھے سلی مین (Sleeman.) کا نام سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے تھے۔ سنہ 1832ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی اور کمپنی کو تجارت کی ممانعت کر دی گئی۔ اب وہ تاجر نہیں تھی بلکہ ہندوستان کی حکمراں تھی۔ نظم و نسق کو بہتر بنانے میں کمپنی کو لارڈ ولیم بین ٹنک جیسا با صلاحیت مددگار ملا۔ گورنر جنرل کی کاؤنسل میں ممبر قانون کی جگہ وجود میں لائی گئی، اور مشہور معروف میکالے پہلے ممبر قانون کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔

اس سے پہلے کسی گورنر جنرل کو اتنے پر جوش رفیق کار نہیں نصیب ہوئے تھے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں کہا جا چکا ہے ٹریویلین نے اس چنگی کو ختم کرنے کے سلسلے میں پہلا فیصلہ کن قدم اٹھایا جو مدتوں ہندوستان کی تجارت میں رکاوٹیں ڈالتی رہی تھی۔ میکالے نے قانونی امور اپنے ذمے لیے اور ہندوستان کے اُس مشہور ضابطہ فوجداری کا پہلا مسودہ تیار کیا جو دنیا کے فوجداری قوانین سے اب بھی بہتر سمجھا جاتا ہے۔ لارڈ ولیم بین ٹنک کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد مٹکاف نے اس کی پالیسی پر عمل کیا اور اپنے چھوٹے سے زمانۂ حکومت میں ہندوستان کے اخبارات کو تحریر کی آزادی دی۔

حقیقی اصلاحات سے ہمیشہ اخراجات میں کمی ہوتی ہے اور لارڈ ولیم بین ٹنک نے ہندوستان کے بجٹ میں ہمیشہ ہونے والے خسارے کو بچت میں تبدیل کر دیا۔ سنہ 1814ء اور سنہ 1828ء کی درمیانی پندرہ برسوں میں مجموعی خسارہ تقریباً 2 ملین پاؤنڈ تھا جب کہ اس مدت کی آخری چھ برسوں کا خسارہ تین ملین پاؤنڈ سالانہ تھا۔ لارڈ ولیم بین ٹنک کی حکومت نے اس کو 3 ملین پاؤنڈ کی بچت میں تبدیل کر دیا۔

ہندوستانی حکومت میں حقیقی اصلاح کرنے والے ہر شخص کو بدنامی اور مذمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہندوستانی حکام کے سول اختیارات کی توسیع ہندوستان میں کام کرنے والے یورپینوں کی ناراضگی کا باعث ہوتی تھی اور اس ایکٹ کو کالے ایکٹ کا نام دیا گیا تھا جس کی

رو سے کلکتہ کے سپریم کورٹ میں سول اپیلیں دائر کرنے کے اُن کے حقوق کی تنسیخ کردی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے میکالے اور لارڈ ولیم بینٹنک کو بہت برا بھلا کہا گیا تھا[5]۔ مورخ تھارنٹن (Thornton) بھی نسلی امتیاز سے دامن نہ بچا سکا اور اس نے بینٹنک کے متعلق لکھا کہ "اس کی طبیعت میں ایک ڈچ کی احتیاط کے ساتھ ایک اٹلین (اٹلی کا باشندہ) کی غدّاری شامل ہے"۔ جن انگریز حاکموں نے ان لوگوں کے مفاد کا تحفظ کرنا چاہا جن کو نمائندگی حاصل نہیں تھی انھیں بار بار اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تازہ مثالیں کیننگ اور رپن ہیں۔

بمبئی کے مقابلے میں کلکتہ میں انگریزی تعلیم نے زیادہ فروغ پایا تھا۔ کلکتے کے ایک گھڑی ساز ڈیوڈ ہیر (David Hare) نے ایک انگریزی کا اسکول قائم کیا۔ اس کو بنگال کے لوگ انگریزی تعلیم کے پتا کی حیثیت سے آج تک یاد کرتے ہیں۔ اس کے کچھ مدت بعد لارڈ ہیسٹنگز نے کلکتہ کے ہندو کالج کی بنیاد ڈالی۔ اس کے کچھ دن بعد یہ مسئلہ اٹھایا گیا کہ ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو یا سنسکرت، عربی اور مقامی زبانیں مستشرقین نے، جو مشرق کے کلاسیکی ادب کی عظمت کو سمجھتے تھے، زور دینا شروع کیا کہ لوگوں کو خود ان کی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جانی چاہیے۔ لیکن میکالے اور ٹریویلین کی طرح کے زیادہ عملی انسانوں کا خیال تھا کہ جدید علوم اور سائنسوں کی صحیح تعلیم اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک ذریعہ تعلیم کوئی جدید زبان نہ ہو۔ اس بحث کا خاتمہ میکالے کی اُس طاملانہ روداد نے کر دیا جس نے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کر لی ہے حالانکہ وہ سنسکرت ادب سے زیادہ واقف نہیں تھا پھر بھی وہ صحیح نتیجے پر پہنچا یعنی جدید تعلیم صرف جدید زبان کے

---

[5] میکالے نے یورپینوں کی اس تحریک کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یہ کہ رائے عامہ کے معنی ہیں اُن پانچ سو آدمیوں کی رائے جو اُن پچاس ملین انسانوں سے، جن کے درمیان وہ رہتے ہیں، مفاد، احساسات یا ذوق کی کوئی قدر مشترک نہیں رکھتے ہیں۔ یہ کہ آزادی کی محبت کے معنی وہ اعتراض ہیں جو پانچ سو ہر اس اقدام کے خلاف کرتے ہیں جو انھیں پچاس ملین کے خلاف من مانی حرکتیں کرنے سے روکے"۔ ٹریویلین۔

Life and letters of Lord Macaulay.

ذریعے دی جا سکتی ہے۔

" فرض کیجیے کہ مصر کا پاشا، جو علوم کے میدان میں ایک زمانے میں یورپ کی قوموں سے زیادہ ترقی یافتہ تھا لیکن اب ان سے بہت پچھڑا ہوا ہے، ادب کی تجدید و ترقی کے لیے ایک رقم مخصوص کرے اور مصر کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہمت افزائی کرنا چاہیے تو کیا اس کے معنی یہ سمجھے جائیں گے کہ وہ اپنی سلطنت کے نوجوانوں کو تصویری تحریر کے مطالعے میں عمریں بتانے، اُن معتقدات کے متعلق تحقیقات کرنے جو اُوسی رس (وہ دیوتا جو مرنے کے بعد سزا و جزا کا فیصلہ کرتا تھا) کی کہانیوں میں مضمر تھے اور نہایت صحت کے ساتھ ان مذہبی رسموں کے متعلق معلومات کرنے کی ترغیب دلانا چاہتا ہے جن کے ذریعے بلیوں اور پیاز کی پرستش کی جاتی تھی۔ اگر وہ اپنے نوجوانوں کو قدیم مسودوں کی علامتوں کے حل تلاش کرنے کے بجائے انگریزی یا فرانسیسی زبانوں کے ذریعے اُن سائنسوں کی تعلیم حاصل کرنے کا حکم دے جن کے لیے ان زبانوں کی کلیدی حیثیت ہے تو ہم اس پر غیر مستقل مزاجی کا الزام عائد نہیں کر سکیں گے.....

ہمیں ایسے لوگوں کو تعلیم دینا ہے جنھیں اس وقت مادری زبان کے ذریعے تعلیم نہیں دی جا سکتی ہے۔ ہمیں انھیں کوئی بدیسی زبان پڑھانی چاہیے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ ہم اپنی زبان کے دعووں کو دہرائیں۔ خود مغربی زبانوں میں اس کی اہمیت دوسری زبانوں سے زیادہ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ ہندوستان میں حاکم طبقہ انگریزی زبان بولتا ہے۔ دارالسلطنتوں میں خود ہندوستانیوں کا بالائی طبقہ انگریزی بولتا ہے۔ مشرق کے سمندروں کی کاروباری زبان غالباً انگریزی ہوگی۔ یہ اُن دو ابھرتی ہوئی یورپی قوموں کی زبان ہے جن میں ایک جنوبی افریقہ میں پروان چڑھ رہی ہے اور دوسری آسٹریلیا میں۔ یہ وہ قومیں ہیں جن کی اہمیت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور ہندوستان کی سلطنت سے جن کے روابط بڑھ رہے ہیں۔ چاہے ہم اپنے ادب کی ذاتی قدر و قیمت پر نظر ڈالیں یا اس ملک کے خصوصی حالات پر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام بدیسی زبانوں میں محض انگریزی ہی وہ زبان ہے جو ہماری ہندوستانی رعایا کے لیے سب سے زیادہ مفید ہے۔"[1]

---

[1] میکالے کی روداد مورخہ 2 فروری 1835ء۔

میکالے کی زوردار روداد اور دلیلوں نے مستشرقین کو پسپا کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کہ ہندستان کے لوگوں کو انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ اس فیصلے کے انیس سال بعد 1854ء کے مشہور تعلیمی مراسلے نے اس کو تقویت پہنچائی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی اسکولوں میں ابتدائی تعلیم مقامی زبانوں کے ذریعے دی جائے اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم انگریزی کے ذریعے دی جائے۔ آج تک حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی یہی ہے۔

سات سال تک نہایت منفعت بخش اور کامیاب حکومت کے بعد 20 مارچ 1835ء کو لارڈ ولیم بینٹنک ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ کلکتہ میں لارڈ بینٹنک کے مجسمہ کی کرسی پر میکالے کے وہ الفاظ درج ہیں جو اس کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں "وہ اس بات کو کبھی نہیں بھولا کہ حکومت کا مقصد محکوموں کی مسرت ہے۔"

ہندوستان کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد 1837ء میں گلاسگو کے شہر سے لبرل امیدوار کی حیثیت سے لارڈ ولیم بینٹنک پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا، لیکن وہ اپنا زیادہ وقت فرانس میں گزارا کرتا تھا جہاں اس کا دوست لوئی فلپ اُس زمانے میں بادشاہ تھا اور 1839ء میں پیرس میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ ملامت اور بدگوئی بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئی جو ہندوستان کے حقوق یافتہ طبقے اس کے خلاف کیا کرتے تھے۔ اس کے انتقال کے چودہ سال بعد سر چارلس ٹریویلین نے، جو ہندوستان میں اس کا رفیق کار رہ چکا تھا، ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے بینٹنک کے زمانہ حکومت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے جنھیں ہندوستان کے تمام لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

"میں لارڈ ولیم بینٹنک کے متعلق یہ بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ہماری حکومت قائم کرنے کا فخر حالانکہ دوسرے حضرات کو حاصل ہے پھر بھی لارڈ ولیم بینٹنک کا یہ کارنامہ قابل تعریف ہے کہ اس نے اس اصول کو تسلیم کر کے ہندوستان کی سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا کہ ہندوستان پر ہندوستانیوں کے مفاد میں حکومت کی جانی چاہیے اور ہمیں اس حکومت سے جو فائدے پہنچیں ان کی حیثیت حالات کے ضمنی نتائج کی سی ہونی چاہیے۔"

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان پر حکومت کرتے وقت منرو، الفنسٹن، بینٹنک، ٹریویلین۔ مٹکاف اور میکالے جیسے لوگوں نے اس اعلیٰ تصور کو اپنا نصب العین بنایا اور

اگر یہ ممکن ہوتا کہ ایک قوم دوسری قوم کے مفاد میں کام کرے تو آج ہندوستان پر "ہندوستانیوں کے مفاد میں" حکومت کی جاتی۔ لیکن یہ بات انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے لیے کام کرے اور اس امر سے آنکھیں چرانا فضول ہے کہ آج تک ہندوستان کے تمام مفادات چاہے وہ تجارتی ہوں یا صنعتی، معاشی ہوں یا مالیاتی انگلستان کے مفادات کے تابع ہیں۔ انسان آج تک محکوم قوموں پر ان کے مفاد میں حکومت کرنے کے طریقے دریافت نہیں کر پایا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے انھیں اپنے معاملات کے انتظام وانصرام میں تھوڑا بہت دخل حاصل ہو، تھوڑی بہت نمائندگی حاصل ہو اور حکومت خود اختیاری کا حق حاصل ہو۔ جب تک ہندوستان میں اس پالیسی پر عمل نہیں کیا جائے گا اس وقت یہ کہنا کہ "ہندوستان پر ہندوستانیوں کے مفاد میں حکومت کی جانی چاہیے" اگر ایک دلخراش طنز نہیں تو مہمل کلیہ ضرور سمجھا جائے گا۔

لہ ٹریولین کا بیان، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، سنہ 1853ء صفحہ 159

باب ۔ 20

الفنسٹن بمبئی میں [1827-1817ء]

آخری مرہٹا پیشوا باجی راؤ کی ریاست پر 1817ء میں قبضہ کرلیا گیا اور طویل تعاقب کے بعد اگلے سال اس کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس نے وظیفہ لینا قبول کرلیا اور اُس کی وسیع ریاست اب صوبۂ بمبئی کا اہم ترین حصّہ بن گئی ہے۔

اس وسیع علاقے میں امن و امان قائم کرنے کا کام کمپنی کے سب سے باصلاحیت اور لائق ملازم کے سپرد کیا گیا۔ جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا جاچکا ہے ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن جو گیارہویں لارڈ الفنسٹن کا بیٹا تھا، 1796ء میں ہندوستان آیا تھا اور مختلف قسم کے تجربات حاصل کرنے کے بعد 1811ء میں پونا میں اُس کی تقرری عمل میں آئی تھی۔ 1818ء میں وہ ان علاقوں کا کمشنر مقرر کیا گیا جو باجی راؤ سے حاصل کیے گئے تھے۔

غالباً اس سے بہتر انتخاب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ الفنسٹن عمر میں ٹامس منرو سے بیس سال چھوٹا تھا لیکن اُسی کی طرح مال گزاری کے کام کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اُسی کی طرح لوگوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اُسی کی طرح اَدبی ذوق رکھتا تھا اور اُسی کی طرح ہندوستان کی خوش حالی کو فروغ دینے کی مُدبرانہ خواہش رکھتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے پہلے نصف حصے نے ہندوستان میں ایسے بڑے حاکم پیدا کیے جو محض عام لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی وجہ سے نمایاں نہیں تھے بلکہ تنظیم اور کام کی اِمتیازی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ غالباً اس کو کمپنی کے دوسرے ملازموں کی شاندار خدمات کے ساتھ ناانصافی نہیں سمجھا جائے گا اگر ہم کہیں کہ مدراس کے منرو اور بمبئی کے الفنسٹن کی گرد کو بھی وہ نہیں پہنچتے۔ تمام ذی فہم مشاہدین کو بھی یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں ایسے ہمدرد حاکموں کا طبقہ نایاب ہوگیا ہے اور اِس زمانے کی حکومت خود اختیاری کے جذبے کو فروغ دینے کے بجائے لوگوں کی سیاسی ترقی میں رُکاوٹیں ڈالنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔

الفنسٹن کی "پیشوا سے چھینے ہوئے علاقوں کی رپورٹ" جو اُس نے اکتوبر 1819ء میں گورنر

جنرل کو پیش کی تھی اُس علاقے کے حالات اور امن وامان قائم کرنے کے اقدامات کی عالمانہ روداد ہے۔ یہ رپورٹ بہت ضخیم ہے اور "ایسٹ انڈیا پیپر" کی چوتھی جلد کے ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم صرف اُس کے کچھ ٹکڑے یہاں پیش کرسکتے ہیں۔

دیہی آبادی

ہم دکن کی دیسی حکومت کا جائزہ کسی نقطۂ نظر سے لیں اُس کی اہم ترین نوعیت یہ ہے کہ وہ گانووں یا چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ آبادیاں چھوٹی موٹی ریاستیں ہوتی ہیں۔ تمام دوسری حکومتوں کے ختم ہوجانے کے بعد بھی یہ اپنے اراکین کے تحفظ کے لیئے کافی ہوتی ہیں۔ ایک اچھی حکومت سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن وہ ایک خراب حکومت کا اچھا نعم البدل ہیں۔ وہ اس کی کمزوری اور کم توجہی کے بُرے اثرات کا تدارک کرتی ہیں اور اُس کے ظلم وہوس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔

ہر گانو میں کچھ آراضی ایسی ہوتی ہیں جس کا انتظام گانو کے لوگوں کے سپرد ہوتا ہے۔ بہت احتیاط کے ساتھ اُس کی حد بندی کی جاتی ہے اور سختی کے ساتھ اس کی نگرانی کی جاتی ہے۔ وہ آراضی کھیتوں میں تقسیم کی جاتی ہے جن کا رقبہ سب کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ ہر کھیت کا نام ہوتا ہے اور اُس صورت میں بھی جب کہ اس میں مدتوں کاشت نہ کی جائے وہ برقرار رہتا ہے۔ گانو کے تقریباً سب باشندے زمین جوتا کرتے ہیں۔ اُن کے علاوہ کچھ تاجر اور دست کار ہوتے ہیں جو اُن کی ضرورتیں پوری کیا کرتے ہیں۔ ہر گانو کا سربراہ پیٹل ہوتا ہے اُس کے تحت ایک نائب ہوتا ہے جس کو چوگلا کہتے ہیں اور ایک محرر ہوتا ہے جو کل کرنی کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ گانو کے بارہ کارکن ہوتے ہیں۔ جو بارہ بالوئی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان میں نجومی، پروہت، بڑھئی، نائی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ لیکن گانو کی حکومت چلانے میں جو حصہ لیا کرتے ہیں اُن میں سے ایک کو سنار یا پوٹ دار کہتے ہیں جو چاندی کا کام کرتا ہے روپئے پرکھتا ہے اور دوسرے کو مہار کہتے ہیں جو دوسرے اہم فرائض ادا کرنے کے ساتھ گانو کی چوکیداری کرتا ہے۔ ان میں سے ہر طبقہ ایک یا ایک سے زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا انحصار ابتدائی خاندان کی شاخوں پر ہوتا ہے۔ مہار چار یا پانچ سے کم نہیں ہوتے اور جہاں جہاں اُن قبیلوں کے لوگوں کی تعداد کافی ہے وہاں بھیلوں اور راموشیوں کو چوکیدار کی حیثیت سے ملازم رکھا جاتا ہے۔ لیکن انھیں مہار کے دوسرے فرائض پورے نہیں کرنے ہوتے ہیں۔

پاٹل گانو کا سب سے اہم کارکن ہوتا ہے اور غالباً وہ ملک کا اہم ترین طبقہ ہیں۔ ان کے منصب کی بنیاد حکومت (عام طور سے مغل حکومت) کی سند ہوتی ہے جس کی رو سے وہ آراضی اور فیس وصول کرنے کے حقدار

ہوتے ہیں اور انھیں چھوٹے موٹے دوسرے حقوق و اعزاز حاصل ہوتے ہیں۔ اُن حقوق کی حفاظت بھی وہ اسی طرح کرتے ہیں جیسے اپنی اراضی کی حفاظت کرتے ہیں اُن کا منصب اور اُن کی یافت موروثی ہوتے ہیں اور حکومت کی منظوری کے بعد فروخت کیئے جا سکتے ہیں لیکن جب تک شدید ضرورت نہ ہو وہ فروخت نہیں کیے جاتے۔ کبھی کبھی وہ لوگ کسی کو ساجھی دار بنا لیتے ہیں لیکن پرانے مالک کی فوقیت کو برقرار رکھنے کیلئے ضروری کاروائی کر لی جاتی ہے۔ پاٹل گانو کے عدالتی اور چوکیداری شعبو کا سربراہ ہوتا ہے لیکن یہیں اُس کا ذکر محکمہ مال کے ایک حاکم کی حیثیت سے کرنا ہے۔ اُس حیثیت سے وہ چھوٹے پیمانے پر وہ کام کرتا ہے جو معاملت دار یا کلکٹر بڑے پیمانے پر کیا کرتا ہے۔ جن کسانوں کے پاس زمین نہیں ہوتی ہے اُنھیں پاٹل زمین دیتا ہے، وہ تمام کسانوں سے مال گزاری وصول کرتا ہے، حکومت کی طرف سے اُن سے معاملات طے کرتا ہے اور گانو کی زراعت اور خوشحالی کو ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ شروع میں وہ حکومت کا مختار ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ کسانوں کا نمائندہ بھی سمجھا جاتا ہے اور جس طرح حکومت کے احکامات کی تعمیل میں معاون ثابت ہوتا ہے اُسی طرح لوگوں کے حقوق کے تحفظ میں یا کم از کم اُن پر ہونیوالی زیادتیوں سے مطلع کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔"

میراث دار یا حق دار قبضہ مالکانہ کسان

زیادہ تر کسان اپنی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ زمین کا معینہ محصول حکومت کو ادا کرتے رہیں۔ ان کی جائیداد موروثی اور قابل بیع ہوتی ہے اور وہ جب تک محصول ادا کرتے رہیں اُن کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی (کم سے کم تیس سال) انھیں حق حاصل ہوتا ہے کہ حکومت کے مطالبات ادا کر کے وہ جائیداد پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیں۔ اُن کی زمین کا محصول معیّن ہوتا ہے لیکن گزشتہ مرہٹا حکومت نے اُن پر بہت سے ابواب عائد کر دیئے تھے جن کی وجہ سے معینہ محصول کے فوائد انھیں حاصل نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی اس سے زمین کی قیمت کم نہیں ہوئی۔ زمین سے اُن کے لگاؤ کے پیش نظر حکومت اُن سے ایک اُپری کے مقابلے میں بہت زیادہ محصول وصول کیا کرتی تھی اور ہر میراث دار عام طور سے مجبور ہوتا تھا کہ اپنے طبقے کے ہر فرد کا بقایا محصول ادا کرے پھر بھی اُن کی زمینیں بیع کی جا سکتی تھیں اور عام طور سے دس سال کی پیداوار کی شرح سے فروخت کی جاتی تھیں......

مرہٹوں کے علاقے میں یہ خیال عام طور سے پایا جاتا ہے کہ قدیم ہندو حکومت کے زمانے میں تمام زمینیں میراثداروں کے قبضے میں تھیں اور مسلمانوں کے مظالم نے جب پرانے مالکوں کو ختم کر دیا تو اُپری وجود میں آئے۔ اس خیال کو ایک اور واقعے سے تقویت ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جن کھیتوں میں اب اُپری کاشت کرتے ہیں

اُن کے متعلق گانوں کے کاغذات میں ملکیت کے خانوں میں غیر حاضر مالکان درج ہیں۔جزیرہ نما کے دوسرے حصوں میں پائے جانے والے حالات اور منو کے منظور کردہ زمین کے ہلکے محصول پر جب اس واقعے کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہندؤوں کے زمانے میں مال گزاری کے طریقے (اگر اُن کے زمانے میں کوئی یکساں طریقہ تھا) کی بنیاد زمین کی ذاتی ملکیت تھی "

انگریزی راج میں ہونے والی تبدیلیاں

اس ملک پر ہمارا قبضہ ہونے کے بعد مال گزاری کے طریقے کا خاکہ مندرجہ ذیل مراسلات میں درج ہے۔ مراسلہ مورخہ ۱۰ رجولائی جس کے ذریعے کلکٹروں کو ہدایتیں دی گئی تھیں اور مراسلہ مورخہ ۱۴ رجولائی جس کے ذریعے معاملت داروں کو ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ صرف ٹھیکے ختم کر دیے جائیں اور دیسی طریقہ برقرار رکھا جائے حقیقی کاشت کی مناسبت سے مال گزاری لگائی جائے، مال گزاری کی شرح کم رکھی جائے، نئے محصول نہ لگائے جائیں اور پُرانے محصول جب تک بالکل غیر معقول نہ معلوم ہوں ختم نہ کیے جائیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جدت سے بچا جائے بہت سی جدتیں تو بدیسی حکمرانوں اور حکومت کے بدیسی کلیوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جہاں تک مال گزاری کے محکمے کا تعلق ہے اُن میں سے زیادہ تر مُفید ثابت ہوئیں۔ پہلے ملک بہت سے معاملت داروں کے تحت تھا جن کے رقبے اور اختیارات میں فرق تھا۔ اب پانچ اعلا حاکم مقرر کیے گئے (استارا کو شامل کر کے) جن کو زیادہ اختیارات و وقار حاصل ہے۔ اب اعلا افسر ضلع میں رہتا ہے اور اس کے معاملات کی دیکھ بھال میں اپنا پورا وقت صرف کرتا ہے۔ اس کے نائبین اس کی تقلید کرنے پر مجبور ہیں۔ مرہٹوں کی مال گزاری کے منتشر حلقوں کو جو 5 روپیہ سے لے کر ۷۰،۰۰۰ روپے تک مال گزاری ادا کرتے تھے اب مناسب اصلاع میں تبدیل کر دیا گیا ہے "

بدیسی حکومت کی خرابیاں

بدیسی حکومت کا جز ہوا کرتی ہیں

بہت سی خرابیاں جن سے ابھی تک یہ ملک محفوظ رہا ہے۔ بدیسی حکومت کی لازمی جز ہوا کرتی ہیں پھر بھی مناسب تدابیر اختیار کر کے اُن میں سے اکثر سے بچا جا سکتا ہے۔ بہت سے بالائی طبقے نسبتاً غریب ہو جاتے ہیں اور دربار اور فوج کے ملازمین میں سے اکثر بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ باجی راؤ کی حکومت کے شروع میں یہ دونوں خرابیاں کسی نہ کسی حد تک وجود میں آئیں پھر بھی حکومت کا ڈھانچہ چونکہ مکمل تھا اس لیے ان جزوی خرابیوں کے اثرات زائل کیے جا سکیں۔ کیا ہم حکومت کے اس ڈھانچے کو برقرار رکھ سکیں گے؟

یہ ایسا سوال ہے جس پر ابھی ہمیں غور کرنا ہے۔ پولیس کے موجودہ طریقے کا جہاں تک گانوؤں سے تعلق ہے اُس کو آسانی سے برقرار رکھا جاسکے گا۔ لیکن میرے خیال میں اتنا کافی نہیں کہ گانوں کا عملہ برقرار رکھا جائے اور ایک معالمت دار کو اُس پر اختیار حاصل ہو۔ پاٹل کو گانو کے اخراجات میں دخل دینے اور چھوٹے موٹے جرائم کا سدباب کرنے کے اختیارات دیکر گانوؤں میں اُس کے وقار اور اثر کو برقرار رکھا جائے۔ میری یہ خواہش نہیں کہ یوروپین حکام ہر موضوع کے متعلق ہر شکایت سنیں بلکہ میں تو اس کو خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس تفتیش کے لیے وقت نہیں ہے۔ میری تو یہ بھی خواہش ہے کہ معالمت دار بھی اس کام کو پاٹلوں کے سپرد کردیں اور اس طرح ایک ایسی طاقت کو زندہ رکھیں جس کی امداد پر حکومت کے تمام شعبوں کے لیے ہم تکیہ کرتے ہیں۔ پاٹل کا پرجوش تعاوُن جتنا مال گزاری کے کلکٹر کے لیے ضروری ہے اتنا ہی عدالت دیوانی اور پولیس کے لیے ضروری ہے اور اس لیے یہ تعاون بہرحال حاصل کیا جانا چاہیئے۔ اُن کے فرائض کو ناگوار نہ بنانے اور اُن کے اثر کو زائل نہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حکام اعلا بار بار اُنھیں فہمائش نہ کریں۔ اگر ان کے ظلم کی شکایت کی جائے تو میں اُس شکایت کو سُننے کے لیے تیار ہوں لیکن رسم ورواج پر توجہ نہ دینے کے سلسلے میں اُنھیں میں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں اُنھیں اس امر کی پوری پوری آزادی دوں گا کہ چھوٹے موٹے استغاثوں کا فیصلہ وہ اپنے طریقے سے کریں بشرطیکہ کسی فریق کو سخت سزا نہ دی جائے۔"

تعلیم

"کتابیں کمیاب ہیں اور جو عام طور سے استعمال کی جاتی ہیں وہ سوچ سمجھ کر منتخب نہیں کی گئی ہیں پھر بھی ہندوؤں کی زبان میں ایسی کہانیاں اور حکایتیں پائی جاتی ہیں جن کو لوگ پڑھنا پسند کریں گے اور جو اُن کے اخلاق کو سدھار سکیں گی۔ ایسی مذہبی کتابیں بھی ہونی چاہئیں جو براہ راست اُن کے اخلاق کو متاثر کریں۔ اگر اس قسم کی زیادہ تر کتابیں شائع کی جاسکیں اور کم قیمت پر فروخت یا مفت تقسیم کی جاسکیں تو بلاشبہ اُن کا بہت اچھا اثر پڑیگا۔ شرط یہ ہے کہ وہ صرف ہندوؤں کی کتابیں ہوں۔ ہم نہایت خاموشی کے ساتھ ایسے حصے حذف کرسکتے ہیں جن میں اخلاق کے متعلق نزاعی باتیں کہی گئی ہوں لیکن ہم نے اگو مذہبی بحث کو اُن میں تھوڑی سی بھی جگہ دی تو ہمارا مقصد فوت ہوجائے گا۔

بہتر یہ ہوگا کہ ہندوؤں کی اصلاح کے لیے ہم اُن کے رجحانات سے فائدہ اٹھائیں اور اُنکی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے مذہب سے اُن کے لگاؤ کو استعمال کریں جو قانون سے اُن کے لگاؤ کے مقابلے میں زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اُن میں روشن خیالی پیدا کرنے کے ساتھ اُن کے معتقدات کو برقرار رکھ کر اور اُن کی

اصلاح کرلے ہم اُنھیں اس معیار کے قریب لے آئیں گے جو مسلمہ خواہش کے مطابق اُنھیں حاصل کرنا چاہیئے اگر ان کے مذہب پر حملہ کیا گیا اور اس میں کامیابی ہوگئی، جس کا نظریاتی طور سے امکان ہے اور تجربہ جس کا شاہد ہے، تو مذہب کے تقدس میں اُن کو اعتماد نہیں رہے گا اور وہ بندشیں بھی ٹوٹ جائیں گی جو قوم پرستی بھی انسانی جذبات پر عائد کرتی ہیں۔"

گانؤ پنچایتیں

"ان تمام خرابیوں کے باوجود مرہٹوں کا ملک خوش حال تھا اور لوگ اُن برائیوں میں سے کچھ سے محفوظ تھے جو ہماری زیادہ بہتر حکومت کے زمانے میں پائی جاتی ہیں۔ بہر حال اُن کی حکومت میں کچھ ایسی اچھائیاں بھی ہوں گی جو بَیِّن خرابیوں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہوں گی۔ میرے خیال میں زیادہ تر اچھائیوں کی بنیاد یہ واقعہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکنے کے باوجود حکومت نے انھیں پوری آزادی دی تھی کہ وہ انصاف کے ذرائع خود پیدا کریں۔ اس کے مفید نتائج کو خصوصیت کے ساتھ نچلے طبقوں نے محسوس کیا جو اپنے حکمرانوں تک رسائی نہیں پا سکتے تھے اور جنھیں عام طور سے ہر حکومت نظر انداز کرتی ہے۔ پنچایتوں کے ذریعے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھوڑا بہت انصاف کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس ادارے پر جو اعتراضات پہلے کیے گئے ہیں اُن کا اطلاق ان لوگوں پر نہیں ہوتا ہے ....

"اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ اس دیسی طریقے کو زندہ رکھا جائے، اُس کی خرابیوں کو دور کرنے اور اس کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ مکمل تبدیلی کے بجائے دیسی لوگ اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اگر اس میں کامیابی نہ حاصل ہو سکے تو عدالت کسی وقت بھی قائم کی جا سکتی ہے .....

"ہمارے اصل آلہ کار کی حیثیت سے پنچایتوں کو برقرار رہنا چاہیئے اور اُنھیں ہمارے رسمی طریقوں، دخل اندازیوں اور ضابطوں سے حسبِ معمول مستثنیٰ رہنا چاہیئے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ الفنسٹن چاہتا تھا کہ مرہٹوں کے پُرانے ادارے برقرار رکھے جائیں۔ اگر الفنسٹن کے جانشین جدّتوں کے معاملے میں اُسی حد تک محتاط ہوتے تو یہ ملک کے لیے مفید ہوتا لیکن اُس کے بعد آنے والی حکمرانوں کی نسلوں نے گانؤ پنچایتیں ختم کر دیں اور قبضہ مالکانہ رکھنے والے کسانوں کے اس حق کو کہ وہ کھیت کا معینہ لگان ادا کریں مال گزاری کے بڑھتے ہوئے مطالبوں نے پیس ڈالا۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

الفنسٹن کی عظیم صلاحیتوں نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ حکومت کا سربراہ بننے کا اہل ہے اور سر ٹامس منرو کے مدراس کا گورنر مقرر ہونے سے ایک سال پہلے یعنی 1819ء میں وہ بمبئی کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی اُن کوششوں کا اجمالی ذکر کر دیا جائے جو اُس نے اپنے آٹھ سال کے زمانہ حکومت میں بمبئی میں مناسب بندوبست کرنے کے لئے کیں۔

بروچ

1820ء میں گورنر نے بروچ کی مال گزاری کے انتظام کے متعلق ایک روداد لکھی اور برطانوی حکومت میں زمین کے محصول میں جو اضافہ شروع کر دیا گیا تھا اُس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"افراد کے حالات کے متعلق تحقیقات کیے بغیر تشخیص مال گزاری محض گاؤں کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ ہر فصل کی پیداوار کی پڑتال کرنے کے لیے ایک موروثی حاکم مال بھیجا جاتا ہے۔ وہ ہر کسان سے زیر کاشت زمین کی نوعیت کے بارے میں اور ہر قسم کی پیداوار کے بارے میں بیان لیتا ہے اور اُسکی بنا پر ہر کھیت کی مختلف پیداوار کا پرتا پھیلاتا ہے۔ ان کو جوڑ کر گاؤں میں پیدا ہونے والے ہر غلّے کی مجموعی پیداوار نکالی جاتی ہے ......
عام اُصول یہ ہے کہ پیداوار کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو اُس کا نصف بطور مال گزاری وصول کر لیا جائے اور نِصف کسان کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

"یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ تشخیص مال گزاری کی شرح کم ہے یا زیادہ۔ یہاں جو طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اُس نے تو اس کام کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اِمسال مال گزاری میں ساڑھے چار لاکھ (45,000 پاونڈ) کا اضافہ ہوا ہے جس کو میں پسند نہیں کرتا ہوں۔"

احمد آباد

اسی دن الفنسٹن نے احمد آباد اور کیرا میں مال گزاری کی تشخیص کے متعلق ایک روداد لکھی۔ اس روداد میں اُس نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ قدم بڑھانا چاہتا تھا۔

۱۔ پیشوا سے چھینے جانے والے علاقوں کے متعلق رپورٹ، مورخہ 25 اکتوبر 1819ء

۲۔ روداد مورخہ 15 اگست 1821ء

احمد آباد کے ضلع میں اُن گانوؤں کی تعداد نے جو سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو دیے گئے ہیں، اُس کی وجہ سے مال گزاری کے ذرائع میں پڑنے والی رکاوٹوں نے اور کچھ حالتوں میں پنچایتوں کی بگوتیوں نے جو ٹھیکیداروں کی سفارشوں پر منظور کی گئی تھیں مال گزاری کی شرح بہت اونچی کر دینے کا رجحان پیدا کر دیا ہے۔[1]

سورت

مئی 1821ء میں الفنسٹن نے سورت کے متعلق ایک روداد لکھی جس میں ایک دفعہ پھر اس نے مال گزاری کی بہت اونچی شرح تشخیص پر اظہار افسوس کیا۔

"اگر میں اس ضلع کے لوگوں کی موجودہ حالت کے متعلق کوئی فیصلہ کرتا تو میں یہ کہتا کہ اُن کی حالت نہایت سقیم ہے۔ کسانوں کے پاس نہ پہننے کو کپڑا ہے نہ رہنے کو گھر۔ حالانکہ اس ضلع کے کچھ حصّوں میں بڑی اچھی پیداوار ہوتی ہے لیکن دوسرے حصّوں میں کاشت کا طریقہ بہت ناقص ہے ..... ان خرابیوں کو کسی طرح بھی موجودہ طریقے کی دین نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ ہمارے موجودہ اقدامات ہمیں اس طریقے سے نجات دلا دیں گے جو ہمیں پیش روؤں سے وراثت میں ملے ہیں۔ ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مال گزاری کی بھاری اور غالباً غیر مساوی شرح تشخیص ہے۔[2]"

کونکن

شمالی کونکن بدنظمی کا شکار تھا۔ کلکٹر نے سفارش کی تھی "کہ حکومت کا مطالبہ مجموعی پیداوار کا ایک تہائی حصہ ہونا چاہیئے۔ خراب زمینوں کی حد تک اس تناسب میں کمی کر دینی چاہیئے۔ زمین کی یہ درجہ بندی تین یا زیادہ سے زیادہ چار اقسام پر مشتمل ہونی چاہیے۔ جنس کی صورت میں لگان نہیں وصول کرنا چاہیئے۔ یہ طریقہ حکومت کے اخراجات میں اضافہ کر دیتا ہے اور چھوٹے موٹے دیسی حکام کو بددیانتی کا موقع دیتا ہے۔ رقم میں تبدیل کیا ہوا لگان چھ سال کے لیے معین کر دیا جائے۔ شرح تشخیص دائمی نہ ہو بلکہ بارہ سال کے لیے بندوبست کیا جائے[3]"

---

[1] روداد مورخہ 6 مئی 1821ء

[2] مال گزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بمبئی سے بھیجا جانے والا مراسلہ مورخہ 19 اپریل 1822ء

[3] روداد مورخہ 15 اگست 1821ء۔

اُسی سال جنوبی کنارا کے متعلق ایک اور مراسلہ لکھا گیا تھا جس سے ہمیں کھوٹوں اور عام کسانوں کے حقوق کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

"گاؤں کو لارجی یا کھوتی کہا جاتا ہے۔ اوّل الذکر میں ہر کسان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ سرکاری کاغذات میں اُس کا معینہ لگان درج ہے جس سے زیادہ اُس سے وصول کرنا نامناسب ہے۔ لیکن کھوتی گاؤں میں کھوٹ یا گاؤں کا سربراہ حالانکہ کسانوں کے ایک مخصوص طبقے سے صرف ایک معینہ رقم وصول کر سکتا ہے پھر بھی دوسرے کسانوں سے وہ اپنی مرضی کے مطابق لگان وصول کرنے کا حق دار ہوتا ہے چاہے وہ نئی زمین پر قابض ہوں یا کھوٹ کی زمین جوتیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ضلع میں صرف دو قسم کے لگان دار ہوتے ہیں دھالے کاری اور آدھیلی۔

"پہلی قسم کا لگان دار دکن کے میراثدار کے مماثل ہوتا ہے۔ ملک کے رواج کے مطابق جب تک وہ لگان ادا کرتا ہے اُس کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ چاہے اپنی زمین کو بیع نہ کر سکے پھر بھی اُس کو رہن رکھ سکتا ہے۔ عام طور سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اُسے بیع کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔

"آردھیری لگان دار اُس کسان کے مماثل ہوتا ہے جس کو دوسرے مقامات پر اُپری کہا جاتا ہے۔ وہ کھوٹ یا دوسرے مالک آراضی کا لگان دار ہوتا ہے۔ جس زمین پر وہ قابض ہوتا ہے اُس کو بیع یا رہن نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ قاعدے سے وہ زمین دوسرے کی ہوتی ہے جس پر وہ مالک کی اجازت سے قبضہ حاصل کرتا ہے۔ اگر مالک زمین کو خود جوتنا چاہے یا کسی دوسرے کو اٹھانا چاہے تو آردھیری کو بے دخل کر سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسان اگر وقت پر لگان ادا کرتا رہے تو دوسری صورت کو اس کے ساتھ زیادتی تصوّر کیا جائے گا۔ لیکن اس قسم کی لگان داری کا پٹّا زیادہ تر ایک سال کے لیے ہوتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ زمین کا مالک ہر سال اپنے مطالبے میں اضافہ کر کے کاشت کو ناممکن بنا سکتا ہے اور اس طرح کسانوں کو بے دخل کر سکتا ہے۔ آردھیری کسان جو عام طور سے دھان کی کاشت کرتے ہیں مالکان آراضی کو پیداوار کا نِصف حِصّہ دیا کرتے ہیں ......

"مندرجہ بالا تشریح سے عزّت مآب کورٹ کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ کھوٹ بنگال کے چھوٹے موٹے زمین داروں کی طرح ہوتے ہیں۔[16]"

دکن

ابھی تک ہم نے بروچ سے کوکن تک مغربی ساحل کے ان بندوبستوں کی رپورٹوں کا حوالہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیا ہے جو تجربے کے طور پر کیے گئے تھے۔ الفنسٹن کی جگہ مسٹر چیپلن دکن کا کمشنر مقرر ہوا تھا۔ نومبر 1821ء اور اگست 1822ء میں اُس نے جو رپورٹیں لکھی تھیں وہ اپنے منسلکات کے ساتھ ایسٹ انڈیا پیپرز کے تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

نئے حاصل ہونے والے علاقے کی آبادی بشمول، پونا، احمد نگر، خاندیش، دھاراواڑ، ستارہ اور جنوبی جاگیر قریب قریب چالیس لاکھ تھی۔ ابتدائی بندوبستوں کے وقت کوشش کی گئی کہ رعیت داری طریقے کو جسے سر ٹامس منرو نے مدراس میں شروع کیا تھا گانو کے طریقے سے ملا دیا جائے جس کی زور دار وکالت مدراس کے بورڈ آف ریونیو نے کی تھی۔ اس بندوبست کو رعیت داری کہا گیا اور حقیقت میں وہ رعیت داری تھا لیکن انفرادی تقسیم بڑی حد تک گانو کے کارکنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دی گئی۔ ابتدا میں نئے طریقے اور اُس طریقے میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا جس پر مرہٹوں کی حکومت میں اُن کے مشہور وزیر نانا فرنویس کے زمانے میں عمل کیا جاتا تھا البتہ معاملت داروں یا ضلع کے حاکموں کے مال گزاری میں اضافہ یا تخفیف کرنے کے اختیارات کم کر دیئے گئے تھے۔ کسانوں پر لگان کی تشخیص اُن کی کاشت کی مناسبت سے یا پچھلی رسیدات کے حوالے سے کمپنی کے ملازمین کیا کرتے تھے اور سرکاری مطالبے کی وصولیابی میں پہلے سے زیادہ سختی برتی جاتی تھی۔ 1817ء میں اس نئے علاقے کی مال گزاری 8,000,000 پاؤنڈ تھی۔ 1818ء میں یہ بڑھ کے 11,5,000,000 پاؤنڈ ہو گئی اور کچھ برسوں بعد 15,00,000 پاؤنڈ ہو گئی۔ گانو کے کارکنوں کا اختیار مداخلت کم ہوتا چلا گیا۔ کمپنی کے ملازمین ہر کسان سے رابطہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جس طرح گانو کے ادارے مدارس میں ختم ہو گئے تھے اُسی طرح چند سال میں بمبئی میں بھی ختم ہو گئے۔

خاندیش

خاندیش کے ضلع کا انتظام کیپٹن برگس (CAPTAN BRIGS) کے سپرد تھا۔ عمر کے آخری زمانے میں اُس نے ہندوستان کے زمین کے محصول پر ایک کتاب لکھ کر اور فرشتہ کی تاریخ ہند کا ترجمہ کر کے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ الفنسٹن، مالکم، گرانٹ ڈف، ٹاڈ (TADD) اور ہورس ہیمن ولسن (HORACE HAYMAN WILSON) کے ساتھ اس کا شمار اُنیسویں صدی کے نصف اول کے چوٹی کے انگلو انڈین مصنفین و مؤرخین میں ہوتا ہے۔ اُس نے خاندیش میں ۳سو سے زیادہ مضبوط بندوں کے نشانات دیکھے جن سے پانی آب پاشی

لہ مال گزاری کے متعلق بنگال سے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو بھیجا جانے والا مراسلہ مورخہ 3 ستمبر فروری 1822ء۔

کی نہروں میں جایا کرتا تھا۔ اُن میں کئی ایسے ہیں جن کی تعمیر پر بے اندازہ روپیہ خرچ ہوا ہوگا" اور جن سے "مسلمان حکمرانوں کی روشن خیالی اور فراخ دلی" کا ثبوت ملتا تھا۔ لیکن اُس کے زمانے میں خاندیش تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بار بار ہوتے والی جنگوں نے، بھیلوں کے حملوں نے اور شیروں کی پھیلائی ہوئی تباہی نے، جنہوں نے تین مہینے میں پانچ سو انسانوں کو اور بیس ہزار جانوروں کو ہلاک کر دیا تھا، ضلع کے دکھوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ کیپٹن برک گو، وسائل کے مصدقہ ریکارڈ کی عدم موجودگی میں مناسب اور اونچی شرح تشخیص کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے میں دشواری ہوئی"۔

پونا

پونا کے ضلع کا انتظام کیپٹن رابرٹسن (CAPTAIN ROBERTSON) کے سپرد تھا۔ کمشنروں نے اس سے جو سوالات کیئے گئے تھے اُن کے جوابات سے دکن کے کسانوں کی حالت اور اُن کے اداروں پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ دکن کا موروثی لگاندار حق دار قبضہ مالکانہ ہوا کرتا تھا بشرطیکہ وہ زمین کا محصول حکومت کو ادا کرتا رہے۔ کیپٹن رابرٹسن نے لکھا تھا "ابتدائی صورت میں اس کی لگان داری، جس کی تشریح حوالوں میں کی گئی ہے، کسی صورت میں انگلستان کے غیر مشروط حق ملکیت سے کم تر نہیں ہے۔ دکن کی زمینوں کے موجودہ مالکوں کے بزرگ مسلمانوں کے حملے سے پہلے غالباً ان زمینوں کے مالک تھے اور اُنھیں اپنی زمین کی پیداوار کا چھٹا حصہ لگان کے طور پر دینا پڑتا تھا۔" اگر میں دکن کے تھال کاریوں (موروثی لگان داروں) سے وصول ہونے والی رقم میں فرق کرتا تو میں اُسے لگان کے بجائے محصول کا نام دیتا[1]۔ جدید حکام کہتے ہیں کہ جنوبی ہند میں زمین پر کسانوں کے حقوق اور شمالی ہند میں آراضی کے تعلق سے زمین داروں کے حقوق برطانوی قانون سازی کا نتیجہ ہیں۔ وہ ابتدائی برطانوی حکام کی ضخیم رپورٹوں سے معلوم کر سکتے ہیں کہ زمین کی نجی ملکیت، جو موروثی بھی ہوتی تھی اور قابل انتقال بھی، جدید بندوبست کے مقابلے میں انگریزوں کی فتح سے پہلے کے ہندوستان میں زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ زمین ریاست کے بجائے قوم کی ملکیت تھی اور ریاست کو میراث داروں سے ایک معینہ محصول وصول کرنے کے علاوہ اور کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

کیپٹن رابرٹسن نے کسانوں کے خاندانوں کے گانوؤں پر مشترکہ قبضے کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ "تھال کاریوں (میراثی لگان داروں) اور آراضی پر اُن کے

---

[1] رابرٹسن کی رپورٹ کے پیراگراف ۱۹، ۲۰ اور ۲۲، مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۲۱ء۔

قبضے کے تعلق سے ابتدائی کاغذات ، اُن کے متعلق اضلاع سے حاصل کی ہوئی معلومات اور زمین کی پُرانی تقسیم پوری طرح ثابت کرتی ہے کہ پُرانے زمانے میں گاؤں کی تمام قابل کاشت زمین کچھ خاندانوں میں تقسیم ہو جاتی تھی ..... اُن کے تمام وارثوں کو جوتھا کہا جاتا ہے ، اُن کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کل کی کل جائداد پر مشترک طور سے قابض ہیں اور تمام جائداد کی حد تک حکومت اور دوسرے لوگوں کے مطالبوں کی ادائیگی کی مشترک ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے یا دوسرے جوتھوں نے ایک جوتھا پر یہ ذمہ داری ڈال دی کہ وہ خاندان کی قدیم تر شاخ کی نمائندگی کرے اور دوسرے تمام جوتھوں سے وہ مطالبہ وصول کرے جو حکومت کو ادا کرنا ہو۔ اس طرح مشترک طور سے اُن لوگوں نے اس ادارے کے لیے ایک شخص کو سربراہ تسلیم کر لیا جس کو کچھ ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتی ہیں اور کچھ حقوق حاصل ہیں ۔ جوتھوں نے جن اراکین کو اس کام کے لیے منتخب کیا وہ پاٹل کے لقب سے مشہور ہوئے اور غالباً ہمیشہ سے اُنھیں اس نام سے یا دوسرے کسی امتیازی نام سے یاد کیا گیا ہے اور اس خاندان کے بزرگوں میں سے ایک کو بر بنائے عہدہ مقدم کہا جاتا تھا ۔ اُس کو لوگوں کی مرضی اور حکومت کی اجازت سے مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل ہوتے تھے اور اب بھی ہیں وہ اُن ضابطوں کی تعمیل کرواتا ہے جن کو انگلستان میں میونسپلٹی کے قواعد کے نام سے یاد کیا جائے گا ۔ پہلے چندہ کر کے وہ رقم جمع کیا کرتا تھا جس سے مشترک اخراجات پورے کیے جاتے تھے اور سربراہ کی حیثیت سے خود اُس کا وقار قائم رکھا جاتا تھا ۔ وہ مشترک فوائد کے لیے ترقی کی تجاویز پیش کیا کرتا تھا اور امن قائم رکھنے کے لیے لوگوں کو مدد دینے پر آمادہ کیا کرتا تھا ۔ وہ ان لوگوں کے دیوانی مقدمات فیصل کیا کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے جو اس کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں اور ثالث کی حیثیت سے اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں یا وہ اُن ثالثوں کا صدر ہوتا ہے جنہیں وہ خود یا فریقین نامزد کرتے ہیں[1] ۔"

اس کے علاوہ کیپٹن رابرٹسن نے بہت سی دستاویزات سے یہ ثابت کیا کہ میراثی لگان دار کی زمین موروثی ہوتی ہے اور منتقل کی جا سکتی ہے ۔ اُس نے مزید کہا "ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ضلع کے تمام گاؤں میں میراثی لگان داری موجود رہی ہے ۔ اس وقت بھی بہت کم گاؤں ایسے ہیں جن میں یہ نہ پائی جاتی ہو[2] ۔" یہ تحریر 1821ء میں لکھی گئی تھی اور اس سے ہم کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں کہ مرہٹوں کے زمانۂ حکومت میں بمبئی کے کسانوں کے حقوق اور حیثیت کیا تھی ؟

---

[1] رابرٹسن کی رپورٹ کے پیراگراف 26، 27، اور 32 ۔

[2] رابرٹسن کی رپورٹ پیراگراف 132 ۔

احمد نگر

احمد نگر کے ضلع کا انتظام کیپٹن پوٹنگر (CAPTAIN POTTINGER) کے سپرد تھا۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "وہ کسان جو میراث دار ہیں اپنی زمین کو بیع یا رہن کر سکتے ہیں۔ موروثی لگان داری ہندوستان کے اُس حصے میں (اور میرے خیال میں تمام دوسرے حصوں میں) قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ جب میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ طریقہ کب شروع ہوا تھا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ پوچھئے کہ زمین کب وجود میں آئی۔ میں نے دیکھا ہے کہ مسٹر ایلس نے میراثداروں کے متعلق بہت سے جواب دیتے ہوئے اپنے نوٹ میں کہا ہے "واقعہ یہ ہے کہ وہ (میراثدار) ہندوستان میں اس وقت بھی پائے جاتے تھے جب قدیم ہریا شاستر لکھے گئے اور میری ناقص رائے میں اُن کی تصدیق بالکل واضح ہے"۔[1]

دھاروار

دھاروار کے ضلع کا انتظام مسٹر سینٹ جان تھیکرے (MR-ST. JOHN THECKRAY) کے سپرد تھا۔ وہ ایک تجربہ کار حاکم مال تھا، کسانوں سے ملتا جلتا رہتا تھا اور اُس کو جو سوالات بھیجے گئے تھے اُس نے اُن کے عجیب جواب بھیجے تھے۔ اس نے لکھا تھا "جہاں تک زراعت کو ترقی دینے میں حکام مال کی ذاتی کوششوں کا تعلق ہے اُس کے بارے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ کسانوں کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے اُن کو پریشان کرنے کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے بجائے وہ کاغذ پر زراعت میں اضافہ دکھا دیں۔۔۔۔ کسان اپنے فائدے کے لیے کاشت کرتا ہے اور جب معقول فائدہ ہوتا ہو تو اُسے کسی محرک کی حاجت نہیں ہوتی ہے"۔[2]

دکن

اضلاع کی رپورٹوں کے ساتھ کمشنر چیپلن نے دکن کے بندوبست کے متعلق اپنی تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔ اس نے ملک عنبر کے ایک پچھلے بندوبست کا حوالہ دیا جو دکن میں اسی طرح مشہور تھا جس طرح شمالی ہند میں ٹوڈرمل کا بندوبست۔ ملک عنبر کے بندوبست کی نوعیت یہ تھی کہ اس نے ہر گاؤں سے

---

[1] پاٹنگر کی رپورٹ مورخہ 31 جولائی 1822ء۔ سوال نمبر 37 کا جواب۔

[2] مسٹر تھیکرے کی رپورٹ، پیراگراف 51۔

ایک معینہ رقم کا مطالبہ کیا اور اُس کی پالیسی یہ تھی کہ اُس نے قدیم موروثی لگان داری کی ہمت افزائی کی جس کی بنا پر ملک کی قابل زراعت زمین کو "نجی ملکیت کے ضروری حقوق حاصل ہوگئے۔"

حال میں قائم ہونے والے انگریزی راج میں تشخیص لگان کے موضوع کا ذکر کرتے ہوئے چیپلن نے فرض کیا کہ ایک درمیانی طبقے کے کسان کے پاس دس ایکڑ بارانی زمین اور غالباً ½ ایکڑ باغ ہوتا ہے۔ اُس کے پاس دو ہل اور چار بیل ہوتے ہیں اور سال میں اُس کی آمدنی 12 پاؤنڈ ہوتی ہے۔ اس کے اخراجات کا تخمینہ اُس نے مندرجہ ذیل لگایا تھا۔[1]

زمین کا محصول	پاؤنڈ	شلنگ	پینس
	6	6	
اگر یہ فرض کیا جائے کہ بیل سے آٹھ سال کام لیا جا سکتا ہے تو بیل کی سالانہ قیمت	1	5	
ہل کی قیمت اور کبھی کبھی کام کرنے والے مزدور کی اجرت		16	
بارانی زمین اور باغ کے لیے بیج		19	
افسروں کی فیس اور گاؤں کے مطالبے		12	
کسان اور اُس کے خاندان کے لیے غلہ	2	4	
کسان اور اُس کے خاندان کے لئے کپڑا	1	10	
دوسری ضروری اخراجات۔		12	
	12	2	

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 12 پاؤنڈ کی تخمینی آمدنی میں سے 6 پاؤنڈ 6 شلنگ سرکاری مطالبہ جو حکومت نے ابتدا میں بمبئی اور مدراس کے کسانوں سے طلب کیا مجموعی پیداوار کے 56 یا 55 فی صدی سے کم تھا۔ پھر بھی 12 پاؤنڈ میں سے دیئے جانے والے 6 پاؤنڈ اور 6 شلنگ کے محصول کے بعد کسان کے پاس نہ کوئی منافع باقی بچتا تھا اور نہ کوئی وسائل باقی رہتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کمپنی کے ڈائرکیٹروں نے اسی وجہ سے رعیت داری طریقے کو پسند کیا تھا یعنی اس میں یہ فائدہ تھا کہ کوئی درمیانی مالک آراضی یا گانو

---

[1] مسٹر چیپلن کی رپورٹ مورخہ 20 اگست 1922ء پیراگراف 85۔ ابتدائی رپورٹ کی رقموں کا میزان لگانے میں غلطی ہوئی ہے۔ چیپلن کا خیال تھا کہ دودھ وغیرہ سے کسان کو 4 شلنگ سالانہ ملتے ہیں۔

پنچایت منافع کے ایک حصے کی حق دار نہیں تھی۔ کسانوں پر کمپنی کی گرفت اُسی طرح مضبوط تھی جس طرح غلام کے مالک کی گرفت غلام پر ہوتی ہے اور اُن سے وہ سب کچھ چھین لیا جاتا تھا جو اُن کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری نہیں تھا۔ ایک ڈائریکٹر نے کہا تھا "میرے خیال میں نہ اس کو چھپایا جا سکتا ہے اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس کا (رعیت داری کا) مقصد یہ ہے کہ زمین جس حد تک لگان دے سکے وہ حکومت کے لیے حاصل کر لیا جائے[1]"

موروثی لگان دار کے متعلق چیپلن نے لکھا تھا "تمام مفتوحہ علاقے میں جو کرشنا سے گھاٹوں تک پھیلا ہوا ہے اور خاندیش سے گنگ تری کو علاحدہ کرتا ہے یہ بات عام ہے،، کہ "ایک کسان نے جب موروثی لگان داری کے حقوق حاصل کر لیے تو دکن کے رواج کے مطابق وہ یا اُس کے وارث حکومت کی اجازت کے بغیر اُس زمین کو بیع،، ہبہ یا رہن کر سکتے ہیں۔" ایک میراثدار کو" گانو کے معاملات میں دخل دینے، گانو کی چراگاہ کو استعمال کرنے، گھر بنانے یا گھر کو بیع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔" پونا میں میراث داروں اور اُوپریوں یا غیر موروثی لگان داروں کا تناسب 'قریب قریب تین اور ایک ہے"، گوداوری کے پار کے شمالی علاقے میں میراثدار کے حقوق زیادہ عام نہیں اور اُن میں اُوپری لگان داروں میں زیادہ واضح اور بین فرق نہیں" مرہٹوں کے جنوبی علاقے میں" میراثدار کے حقوق نہیں پائے جاتے،، لیکن "حق دار قبضہ مستقل لگان داروں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔" "ستارہ میں میراثدار کے حقوق وہی ہیں جو دکن کے دوسرے حصوں میں ہیں[2]۔"

چیپلن نے لکھا تھا" کلکٹر (پونا کا) بجا طور سے اس امر کی وکالت کرتا ہے کہ میراث داروں کے حقوق برقرار رکھے جائیں۔ اُس نے کئی جگہ پر زوردار الفاظ میں اس پالیسی کی سفارش کی ہے۔ لیکن میرے خیال میں چونکہ کوئی اُن کے حقوق نہیں چھینا چاہتا ہے اس لیے اس سوال پر بحث کرنا فضول ہے[3]۔" مسٹر چیپلن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریزی راج کے اگلے دور میں دکن کے قدیم میراثی حقوق قریب قریب ختم کر دیے جائیں گے۔

چیپلن نے اپنی طویل رپورٹ کے آخر میں انگریز حکام کو نصیحت کی ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں سے اچھی طرح پیش آئیں۔

"اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ حکومت کی تبدیلی نے انھیں اعزاز و اختیار سے محروم کر دیا ہے

---

[1] ہنری سینٹ جان ٹکر MEMORIALS OF INDIAN GOVERNMENT (لندن 1853ء) صفحہ 113

[2] مسٹر چیپلن کی رپورٹ پیراگراف 107، 116، 125، 131، 133، 135، 136۔ [3] ایضاً پیراگراف 143

اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم حتی الوسع اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ ہم اُنہیں اپنے سے کتنا ہی کم تر کیوں نہ سمجھیں پھر بھی وہ دیسی حکمرانوں کے زمانے میں بڑے بڑے منصب رکھتے تھے۔ اب جب کہ ہم نے دیسی حکمرانوں کی جگہ حاصل کر لی ہے ہمیں اُن کی عزت اور وقار کو برقرار رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرنی چاہیئے۔

نوجوان جب ہندوستان آتے ہیں اور پہلے پہل کسی عہدہ پر اُن کا تقرر کیا جاتا ہے تو وہ اس رائے کے برعکس رائے قائم کرتے ہیں جو میں نے ابھی ظاہر کی ہے اور ان کے عمل کی بنیاد جن تصورات پر قائم ہوتی ہے وہ اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ مجھے دکن میں مقرر ہونے والے نائبین کے سامنے یہ اُصول پیش کرنا پڑا۔ اُن کی رہنمائی کے لیے اس موضوع پر سرجان مالکم کی بیش بہا ہدایتیں میں اُن تک پہنچا چکا ہوں۔ میرے خیال میں اس سے بہت فائدہ ہوگا اگر انگلستان سے ہر نئے آنے والے کو اس قسم کے اصولوں کا مجموعہ دیا جائے جس کو وہ ہدایت نامے کے طور پر استعمال کرے۔ اس کا عنوان شکسپیئر کے مندرجہ ذیل الفاظ ہونے چاہئیں

ہائے انسان، وائے مغرور انسان
اس کے اختیار کی حقیقت کیا ہے
علم کے دعوے کے باوجود وہ جہالت کے اندھیروں میں ہے
اس کا مائل بہ شکست وجود
فطرت کے ساتھ ایسی عجیب و غریب چالیں چلا کرتا ہے۔
کہ فرشتوں کو اُس پر رونا آتا ہے۔"

اس بیش بہا تفصیلی رپورٹ اور اُس کے منسلکات ملنے کے بعد بمبئی کے گورنر ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے ہدایت جاری کی کہ تمام مفتوحہ علاقے کی بتدریج پیمائش کی جائے اور مال گزاری تشخیص کی جائے اُس نے ہر گاؤں میں پاٹل کے اختیارات بحال رکھنے پر بھی اصرار کیا، اس نے سفارش کی کہ تشخیص مال گزاری کی شرح کم رکھی جائے اور مساوی طور سے تقسیم کی جائے اور کمشنر کو اس امر کی اہمیت بتائی کہ ہر قسم کی لگانداری کے تحت کسانوں کے حقوق برقرار رکھے جائیں۔ عام پیمائش کی تجویز پر کورٹ آف ڈائریکٹرز نے بھی اطمینان ظاہر کیا۔[1]

دکن کے کمشنر نے ستمبر 1824ء میں پیمائش کے ضابطے تیار کر کے پیش کیے اور فروری 1825ء میں ترمیم شدہ ضابطے پیش کیے گئے۔ سر ٹامس منرو نے مدراس میں زمین کے محصول کو کم کر کے کھیت کی پیداوار کا

---

[1] مال گزاری کے متعلق بمبئی کا مراسلہ ڈائریکٹروں کے نام مورخہ 5 نومبر 1823ء اور مال گزاری کے متعلق ڈائریکٹروں کا مراسلہ بمبئی کو مورخہ 4 مئی 1825ء۔

ایک تہائی کردیا تھا اور چیپلین نے پیمائش کے ترمیم شدہ ضابطوں کے ساتھ جو گشتی چٹھی بھیجی تھی اس کے پیراگراف نمبر ۷ میں دکن کے لیے اس معیار کو تسلیم کرلیا تھا۔ ریاست کے اس بھاری مطالبے نے جنوبی ہند میں زراعت کو تباہ کردیا۔ مدراس میں اس کو زیادہ سے زیادہ سرکاری مطالبے کی صورت میں اب بھی برقرار رکھا جارہا ہے۔ حالانکہ بمبئی میں پیداوار کے کسی مخصوص حصے کو معین کرنے کی تمام تر کوششیں ترک کردی گئی ہیں پھر بھی حقیقت میں وصول ہونے والا زمین کا محصول پیداوار کا ایک تہائی اور کبھی کبھی اُس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ رعیت داری طریقے کی توسیع کے سلسلے میں ہنری سینٹ جان ٹکر کا مندرجہ بالا بیان، جو نہایت سمجھ داری پر مبنی تھا، واقعات نے صحیح ثابت کردیا۔

عام پیمائش کی تجویز پر غور ہوتا رہا۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کی کوشش تھی کہ دکن کے گانو کے طریقے میں مداخلت نہ کی جائے۔ جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے وہ چاہتا تھا کہ رعیت داری طریقے کے اُصول کو گانو کے طریقے کے اُصول کو یکجا کردیا جائے۔ اُس کا مقصد تھا کہ پیمائش کے بعد ہر کاشت کار کے متعلق فیصلا کرلیا جائے کہ وہ ریاست کو کتنی رقم ادا کرے گا اور پھر یہ رقم پاٹل کے ذریعے گانو سے وصول کی جائے ۔۔۔ "پیمائش کے ذریعے ہر کسان کے حقوق اور اس کے لگان کا تعین کردیا جائے اور اس کے بعد کچھ برسوں کے لیے گانو کا ٹھیکہ پاٹل کو دیدیا جائے"[1]

اس بات کو تسلیم کرلینا چاہیئے کہ اُس کی تجویز میں ایک بنیادی کمزوری تھی۔ اگر گانو کے پاٹل اور گانو کی پنچایت کو مجوزہ پیمائش اور گانو کی مجموعی تشخیص کو گانو کے کسانوں پر تقسیم کرنے کے اختیار سے محروم رکھنا تھا تو پاٹل اور پنچایت کو برقرار رکھنے کا فائدہ کیا تھا؟ اگر مجموعی سرکاری مطالبے کے لیے کسانوں پر لگان تشخیص کرنے کے لیے اختیارات اُن سے چھیننے ضروری تھے، جو اُنھیں صدیوں سے حاصل رہے تھے تو اُنھیں مال گزاری کے ٹھیکیداروں کی حیثیت سے برقرار رکھنا فضول تھا۔

پہلے اصول کی بنیاد پر مدراس میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی۔ مدراس کا ریونیو بورڈ "نظریۂ اجتماعیت کا حامی،، تھا اور اس کی خواہش تھی کہ گانو کے اِداروں کو اور اُن کے اختیارات کو جوں کا توں رکھا جائے۔ ٹامس منرو شدید "انفرادیت پسند،، تھا اور مُصِر تھا کہ زمین کے محصول کی حد تک گانو کے عملہ کو مداخلت کی اجازت نہ دی جائے اور ہر کسان اور ریاست میں راست ربط قائم کیا جائے۔ ٹامس منرو کامیاب ہوگیا اور گانو پنچایتوں کے سپرد دوسرے اختیارات کرنے کی خود اس کی کوشش کے باوجود مدراس

---

[1] مال گزاری کے متعلق بمبئی سے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو بھیجا جانے والا مراسلہ مورخہ 5 نومبر 1823ء، پیراگراف 452

کی گاؤں پنچایتیں بے جان ہوگئیں۔

ان تجربوں اور اُن کے نتیجوں سے کچھ سبق بھی ملے۔ زمانۂ قدیم کی طرح ہندوستان میں گاؤں سماج کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ تشخیص لگان کا کام پنچایتوں پر چھوڑ دیا جاتا۔ زمین کی پیداوار کے پیش نظر بھاری لگان عائد کرنے کے خلاف کچھ قاعدے بنا دیے جاتے اور گاؤں کے بزرگوں کو اجازت دی جاتی کہ ان قاعدوں کے تحت وہ کسانوں پر علاحدہ علاحدہ لگان تشخیص کریں، وصول کریں اور ریاست کو مجموعی زمین کا محصول ادا کریں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ ہندوستان کا قدیم طریقہ برقرار رہتا اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ ہندوستان کے ہر گاؤں میں ایک منظم عومی ادارہ باقی رہتا لیکن اس قسم کا انتظام کمپنی کی حکومت کے بنیادی اُصول کے منافی تھا۔ کمپنی کی پالیسی تھی کہ ملک کے ہر محصول دینے والے سے انفرادی طور سے معاملہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ جتنی رقم وہ دے سکے اُس سے وصول کرلی جائے۔ الفنسٹن بھی اس جذبے سے اس حد تک متاثر تھا کہ اس نے اسی قسم کی پیمائش منظور کی تھی جس کی بنا پر ہر کسان کے لگان کی تشخیص کی جا سکے۔ اس کے بعد جب اُس نے گاؤں کے مکھیا کے ذریعے مجموعی اعتبار سے گاؤں سے معاملہ کرنا چاہا تو اُس کے منصوبے پر عمل کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ گاؤں کے مکھیا کا اثر و دخل ختم ہوچکا تھا۔

1827ء میں الفنسٹن ہندوستان سے واپس چلا گیا۔ اسی سال کورٹ آف ڈائریکٹرز نے الفنسٹن کے منصوبے کی کمزوریاں دریافت کیں اور اُن سے فائدہ اُٹھایا۔

"اگر پیمائش کی بنا پر ہر کسان کے حقوق اور ادائگی کی رقمیں معین کی جاسکیں اور حقوق کی خلاف ورزی کے سلسلے میں کسان کو فوری دادرسی کی سہولت حاصل ہو تو پاٹل کے سپرد وہ کام کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر اس مراسلہ کے مندرجہ بالا پیراگراف میں کیا گیا ہے۔ سابق پیشوا کی حکومت میں مالگزاری کے ٹھیکوں کے خراب اثرات کا جو تجربہ آپ کو ہوچکا ہے اُس کی بنا پر ایسے اختیارات اُن افراد کے سپرد کرنے میں آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے جن کی عادت اور طریقہ کار یہ ظاہر کرتے ہوں کہ وہ ناجائز فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ ہم یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مناسب تشخیص لگان جو گاؤں کے ٹھیکیدار حکومت کو ادا کریں گے زیادہ وصولیابی کے بارے کسانوں کو محفوظ رکھ سکے گی۔"[1]

---

[1] مال گزاری کے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کا مراسلہ بمبئی کو مورخہ 23 مئی 1827ء، پیراگراف 8۔

باب - 21

ونگیٹ اور بمبئی کا رعیت واری بندوبست [1827ء / 1835ء]

اب ہماری کہانی اُس سال تک آگئی ہے جس سال ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن ہندوستان سے رخصت ہوا تھا۔ نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ کمپنی کے ملازمین اور حکام مال بھی محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں مال گزاری کی شرح تشخیص بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ ہم باب بارہ میں دیکھ چکے ہیں مدراس کے حکام مال نے ڈاکٹر بکانن کو بتایا تھا کہ زمین کے بھاری محصول کی وجہ سے زراعت اور لوگوں کی خوشحالی کے راستوں میں رکاوٹیں پڑ رہی ہیں اور سر ٹامس منرو نے رفتہ رفتہ اس کی شرح کو کم کر کے مجموعی پیداوار کے نصف کے بجائے ایک تہائی کر دیا تھا۔ لیکن اب بھی محصول بہت زیادہ تھا۔ شمالی ہند میں سر ایڈورڈ کول برک اور یکے بعد دیگرے کئی گورنر جنرلوں نے کورٹ آف ڈائرکٹرز پر زور دیا تھا کہ برطانوی حکومت کے وعدے پورے کیے جائیں اور زمین کا محصول دائمی طور سے معین کر دیا جائے تاکہ لوگ کچھ پس انداز کر سکیں اور اپنی حالت سدھار سکیں۔ بمبئی کے ہر ضلع میں مال گزاری میں تیزی سے ہونے والے اضافے نے الفنسٹن کو پریشان کر دیا تھا اور خیال تھا کہ چیپلن کے اس فیصلے سے کوئی سہولت نہیں ملے گی کہ محصول مجموعی پیداوار کا ایک تہائی کر دیا جائے۔ بجز اُن علاقوں کے جہاں زمین کا محصول دائمی طور سے معین کر دیا گیا تھا، ہندوستان کے برصغیر میں لوگ نئے حکمرانوں کی شرح تشخیص کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ ڈائرکٹروں پر درخواستوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کمپنی کے جو ملازمین یہ محسوس کرتے تھے کہ لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے وہ اپنی رائے دبی زبان سے ظاہر کرتے تھے اور لوگوں کو سہولت مہیا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

اس زمانے میں ہندوستان میں سب سے نمایاں انگریز بشپ ہبر تھا۔ اُس نے 1824ء اور 1825ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اس سفر کے دوران اُس نے نہایت احتیاط کے ساتھ مختلف صوبوں کے لوگوں کی حالت کے متعلق تحقیقات کی۔ جن باتوں نے اُسے سب سے زیادہ دکھ پہنچایا وہ لوگوں کی

غربت تھی اور زمین کا بھاری محصول تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے مفبوضات میں عائد کیا کرتی تھی۔ یہ بات اُس نے وضاحت کے ساتھ اپنے روزنامچے میں نہیں لکھی ہے جو اشاعت کے خیال سے لکھا جا رہا تھا۔ لیکن نجی خطوں میں اُس نے اپنا دل چیر کے دکھا دیا ہے اور زیادہ کھل کر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ مثال کے طور پر ہم اُس کا ایک خط پیش کر رہے ہیں جو اُس نے مارچ 1826ء میں کرناٹک سے عزت مآب چارلس ولیمس ون (CHAR-LES WILLIAMS WIYNN) کو لکھا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ موجودہ شرح محصول کا بوجھ نہ ہندوستانی کسان برداشت کر سکتا ہے نہ یورپین کسان حکومت زمین کی مجموعی پیداوار کے نصف حصے کا مطالبہ کرتی ہے۔ جہاں بندوبست استمراری نہیں کیا گیا ہے وہاں کی یہ اوسط شرح ہے۔ یہ شرح بہت زیادہ ہے۔ ہندوستانی کسانوں میں روایتی جزرسی ہے۔ پھر بھی اُن کے غیر مصنوعی اور کم خرچ طریقۂ کاشت کے باوجود اُن کے پاس ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مناسب رقم نہیں بچتی۔ اس کے علاوہ اس سے ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ اس کی وجہ سے اچھی فصلوں کے زمانے میں بھی لوگ قلت و تنگ دستی کے شکار رہتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے فصلوں کی خرابی کی صورت میں حکومت کی طرف سے دی جانے والی چھوٹ اور تقاوی پر بھاری اخراجات کے باوجود مرد، عورت اور بچے ہزاروں کی تعداد میں گلی کوچوں میں مرا کرتے ہیں اور سڑکوں پر انسانی ڈھانچے بکھرے ہوتے ہیں۔ بنگال کی زرخیزی کے علاوہ وہاں استمراری بندوبست ہے اس لیے قحط کبھی نہیں پڑتے۔ لیکن ہندوستان میں (شمالی ہند میں) ملک معظم کے افسروں میں یہ عام احساس پایا جاتا ہے، اور کچھ صورتوں میں خود مجھے اتفاق کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ کمپنی کے صوبوں کے کسان دیسی حکمرانوں کی رعایا کے مقابلے میں زیادہ بری حالت میں ہیں، زیادہ غریب ہیں اور زیادہ دبے ہوئے ہیں۔ مدراس میں یہ فرق زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے جہاں کی زمین مجموعی اعتبار سے شمال کے مقابلے میں کم زرخیز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے طریقے وغیرہ کے بہتر انتظام کے باوجود کوئی دیسی حکمران اتنے لگان کا مطالبہ نہیں کرتا ہے جتنا ہم کرتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ بہت کم ملے جنہوں راز دارانہ انداز میں یہ نہ کہا ہو کہ لوگوں پر بہت زیادہ محصول لگایا جا رہا ہے اور ملک رفتہ رفتہ تباہ ہو رہا ہے۔ کلکٹر اس بات کو سرکاری سطح پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ کبھی کبھی کوئی لائق کلکٹر شرح میں تخفیف کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اپنی محنت سے سرکار کی رقم میں اضافہ کر دیتا ہے۔ لیکن عام طور سے وہ تاریک پہلو پر گفتگو نہیں کرتے۔ اُسکے انعکاسات خود اُن پر بھی پڑتے ہیں جس کی بنا پر مدراس اور کلکتے کے سکریٹری اُن کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ سکریٹری خود بھی اپنے کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے کہتے ہیں انگلستان کے ڈائرکٹر زیادہ روپے کے لیے سختی سے تقاضہ کرتے رہتے ہیں۔

"میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ کسانوں سے کم روپیہ وصول کیا جائے، جو روپیہ وصول کیا جائے اس کا زیادہ حصہ ملک میں خرچ کیا جائے، ہندوستان کے مصنوعات کو یورپ آنے دیا جائے اور لوگوں کے فوجداری مقدمات فیصل کرنے میں ہندوستان کے لوگوں کو زیادہ موقع دیا جائے۔ اس سے سلطنت مستحکم بھی ہوگی اور خوش حال بھی[1]۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بہت کم ایسے حاکم تھے جنہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ لوگوں پر بہت زیادہ محصول لگایا جاتا ہے لیکن وہ کھل کر یہ بات نہیں کہنا چاہتے تھے۔ پھر بھی سرکاری ملازموں کی عزت کرنی پڑتی ہے کہ جب انگلستان میں اُن سے اس موضوع پر سوال کیے گئے تو اُن میں سے کچھ نے نہایت زوردار الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی۔ اُن میں سے ایک رابرٹ رچرڈ تھا۔ ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے اُس نے کچھ ایسے جواب دیے جو پیش کیے جانے کے قابل ہیں۔

"جہاں ہندوستان کی طرح مال گزاری وصول کرنے کا یہ اُصول ہو کہ حکومت مجموعی پیداوار کے آدھے حصے کی حق دار ہے اور اس مال گزاری کو وصول کرنے کے لیے حکام کی ایسی بڑی تعداد مقرر کی جائے جن کے کام کی نگرانی ممکن نہ ہو وہاں لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں اور پھول پھل سکیں تاکہ اُن کے ساتھ بڑے پیمانے پر تجارت کی جا سکے......

"یہ (برآمد کیے جانے کے لیے اشیا سازی) صرف اُن ملکوں میں کی جا سکتی ہے جہاں مندرجہ بالا بھاری محصول نہ لگایا جاتا ہو۔ یہ بنگال کی حد تک بھی ممکن ہے جہاں کئی سال سے بندوبست استمراری نافذ ہے اور جہاں محصول کا ابتدائی تباہ کن اثر اب اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن ان علاقوں میں اشیا سازی ممکن نہیں جہاں مثال کے طور پر رعیت داری طریقہ محصول نافذ ہے یا جہاں مجموعی پیداوار کا 45 فی صدی سے 50 فی صدی تک مال گزاری کے طور پر وصول کیا جاتا ہے......

---

[1] بشپ ہیبر "MEMARIES AND COURESPONDENCE"، از مسز ہیبر، لندن، 1830، جلد ۲، صفحہ 413۔ بشپ ہیبر کے زمانے کے بعد بمبئی اور مدراس میں زمین کے محصول میں کچھ تخفیف ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی وہ زیادہ ہے اور زیادہ بری بات یہ ہے کہ وہ غیر یقینی ہے۔ اس کی وجہ سے اب بھی "اچھی فصلوں کے زمانے میں بھی لوگ قلت و تنگ دستی کے شکار رہتے ہیں"۔ ستر سال پہلے کے مقابلے میں آج ہندوستان کو قحط و غربت سے بچانے کے لیے زیادہ ضروری ہے "کہ کسانوں سے کم روپیہ وصول کیا جائے اور جو وصول کیا جائے اُس کا زیادہ حصہ ملک کے اندر خرچ کیا جائے"۔

"میرے ذاتی علم میں کچھ ایسے واقعات ہیں جہاں زمین پر تشخیص ہونے والی مال گزاری مجموعی پیداوار سے زیادہ تھی۔ میرے علم میں ہندوستان کی دوسری زمینوں کے متعلق یہ واقعات بھی ہیں کہ اُن پر مالگزاری تشخیص کرتے وقت یہ فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ دھان پیدا کرنے والی زمین سے، پھلوں کے باغوں سے، کالی مرچ، انگور اور دوسری اشیا پیدا کرنے والی زمینوں سے ایک خاص رقم بطور مال گزاری وصول کی جائے گی لیکن جب تشخیص کا مقابلہ مذکورہ زمینوں سے کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا ہے اُن زمینوں پر جنگل کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا ہے"[1]

ہندوستان میں تشخیص مال گزاری کرنے والے حکام کا عام احساس ایک عظیم اور ناقابل فراموش صورت میں ظاہر ہوا۔ لیفٹیننٹ کرنل برگس نے قوانین اور قدیم و جدید رواجوں کی تحقیقات کرنے کے بعد پہلی دفعہ ہندوستان میں زمین کے محصول کی نوعیت کو ظاہر کیا۔ اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو اپنی جاگیر سمجھتی تھی اور قدیم حقوق اور رواجوں کو نظرانداز کر کے زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کرنا چاہتی تھی۔ جان برگس کا موقف اس کے خلاف تھا۔ اُس نے اپنی عظیم اور تاریخ ساز کتاب[2] کے ذریعے اپنے زمانے کے انگریزوں کو اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کو بتایا کہ ہندوستان میں زمین کسی زمانے میں بھی ریاست کی ملکیت نہیں تھی، یہ کہ تمام دوسری متمدن قوموں کی طرح ہندوستان میں زمین ذاتی ملکیت ہے اور یہ کہ تمام دوسری ذاتی اَملاک کی طرح حکومت اس پر بھی صرف محصول لگانے کی حق دار ہے۔

ہماری تنگ دامانی اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس ضخیم کتاب کا جائزہ لے سکیں جو تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے پھر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے پڑھنے والوں کے سامنے برگس کے نکالے ہوئے کچھ نتیجے پیش کر دیں جن کی قدر و قیمت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی ستّر[70] سال پہلے تھی۔ جان برگس نے بتایا کہ قدیم قوموں میں ــــ یونانی، رومن، ایرانی اور چینی ــــ حکومت کو صرف اتنا حق حاصل تھا کہ پیداوار کا $\frac{1}{10}$ حصہ بطور محصول وصول کرے۔ ہندوستان میں راجا یا ریاست کو حق حاصل تھا کہ زمین کی قسم اور زراعت کے لئے کی جانے والی محنت کے تناسب سے غلّے کا $\frac{1}{8}$، $\frac{1}{6}$، $\frac{1}{12}$ حصہ وصول کرے[3]۔ مختلف زمانوں میں پائے جانے والے رواجوں کے متعلق تفصیلی تحقیقات کرنے کے بعد برگس نے بتایا:-

---

[1] سوالات نمبر 2825، 2828 اور 2829 کے جوابات۔

[2] جان برگس۔ THE PRESENT LAND-TAX IN INDIA لندن 1830ء۔

[3] جان برگس، THE PRESENT LAND-TAX IN INDIA، صفحات 393، 410، 414، 416

"زمین پر قابض کسان بلا شرکت غیرے اُس کا مالک ہوا کرتا تھا۔ ریاست کی امداد کے لیے اس سے رقم کا مطالبہ ایک قسم کا انکم ٹیکس تھا یعنی اُس کی زمین کی پیداوار کا ایک چھوٹا سا حصہ اور اس حصے کا تعین زمانہ امن میں کیا جاتا تھا لیکن زمانہ جنگ میں اُس میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ مالک کے پاس بہر حال کچھ منافع بچ جایا کرتا تھا جو لگان سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ بادشاہ نے کبھی زمین کے مالک ہونے کا دعوا نہیں کیا۔ وہ صرف زمین کے محصول کا مالک ہوا کرتا تھا"[1]

جان برگس کے خیال میں انگریزی راج میں ہندوستان کی غربت کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس اہم اصول کو نظر انداز کر دیا تھا اور وہ کوشش کرتی تھی کہ زمین سے ہونے والے تمام تر منافع کو غصب کر لے اور کسان کے پاس اتنا بھی نہ چھوڑے کہ وہ زندہ رہ سکے۔

"پچھلی تین صدیوں میں مشرق آنے والے مسافروں نے لکھا ہے کہ مغلوں کی حکومت میں ملک بہت خوش حال تھا اور انھیں اس پر تعجب تھا کہ یورپ میں انہوں نے جو حالات دیکھے تھے اُن کے مقابلے میں ہندوستان میں دولت، آبادی اور قومی خوش حالی زیادہ تھی۔ چوں کہ ہم خود کہتے ہیں کہ ہماری حکومت میں ملک کے لوگوں کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ حقیقت ہے ......

"اگر میں یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ ہم اپنے پیش رؤں کے راستے سے ہٹ گئے ہیں اور ہم نے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی ہے جو اُن کی بدترین حکومتوں کے طریقے سے کہیں زیادہ سخت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں کسی نہ کسی حد تک اصلاح کی طرف مائل ہونا چاہیے اور کم سے کم تفتیش ضرور کرنی چاہیے...

"میں ایمان داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ کسی ایسی حکومت کے تحت، چاہے وہ ہندوؤں کی حکومت ہو یا مسلمانوں کی، جو تسلیم کرتی ہو کہ وہ قانون کی بنیاد پر قائم ہے، مجموعی طور سے لوگوں کی خوش حالی کو تباہ کرنے والا ایسا طریقہ نہیں تھا جیسا کہ ہماری حکومت میں پایا جاتا ہے ....

"حالاں کہ ہم نے ہمیشہ یہ تسلیم کیا ہے کہ اُن پر ہونے والا سب سے بڑا ظلم محاصل کا بوجھ ہے لیکن ہم نے کسی حالت میں بھی اس بوجھ کو کم نہیں کیا۔ بوجھ کم کرنے کے بجائے ہم نے محصول مقرر کرتے وقت ایک غلط پیمانہ استعمال کیا یعنی پیداوار کے بجائے رقم طلب کی۔ ہم نے ظاہر تو یہ کیا کہ دوسرے طبقوں پر عائد ہونے والے چھوٹے موٹے محاصل ختم کر رہے ہیں لیکن ہم نے ان کا بوجھ مالک آراضی کے کاندھوں پر ڈال دیا اور ہر شخص کے حالات کی چھان بین کرنے کے بعد خود اپنے ساتھ انصاف کرنے کے بہانے سے

---

[1] منو کی شاستر کا اقتباس، مندرج برگس کی کتاب صفحہ 31۔

ہم نے اکثر صورتوں میں کسانوں کو اُن کے ذرائع سے محروم کر دیا جن کی بنا پر وہ بھاری محاصل ادا کر کے ہماری حکومت میں محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ وصول یابی میں اس قدر سختی برتی گئی کہ ہماری مال گزاری میں تو اضافہ ہو گیا مگر لوگ محض مزدور بن کر رہ گئے۔ یہ ہماری حکومت کا مسلمہ اصول ہے جو زمین کی تمام تر فاصل آمدنی حاصل کرنے کا لازمی نتیجہ ہے......

"یہ فرض کرنے کے بعد کہ حکومت زمین کی قطعی اور واحد مالک ہے اُس نے (موجودہ حکومت نے) زمین کو تمام آمدنی کا منفعت بخش ذریعہ سمجھنا شروع کر دیا، ملازمین کی ایک فوج کو سپرد کسانون کی نگرانی کا کام کیا اور تمام منافع حاصل کرنے کا دعوا کیا۔ اُس قسم کا زمین کا محصول جو اس وقت ہندوستان میں پایا جاتا ہے اور جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ مالک آراضی کے تمام تر لگان پر حاوی ہونا چاہیے، ایشیا اور یورپ کی کسی حکومت کے تحت اُس کا وجود نہیں تھا۔"[1]

دنیا کے کسی دوسرے ملک میں اس قسم کی اہم اور خیال انگیز کتاب انقلاب برپا کر سکتی تھی لیکن ہندوستان میں اور بمبئی کے حکام مال کے طریقہ کار میں تھوڑی سی تبدیلی بھی نہ لا سکی۔ پیمائش کی بنیاد پر کیے جانے والے بندوبست، جن کی سفارش الفنسٹن نے کی تھی، 28-1824ء میں بمبئی کی سول سروس کے ایک رکن، پرنگل (PRINGLE) نے شروع کر دیے تھے۔ یہ بندوبست زمین کی پیداوار کے غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز تخمینے کی بنا پر کیے گئے اور اس لیے اُن کے نتائج تباہ کن ثابت ہوئے۔

اُس کی (پرنگل کی) تشخیص کی بنیاد کھیتوں کی پیمائش، مختلف قسم کی زمینوں کی پیداوار کا تخمینہ اور کاشت کے اخراجات تھے۔ جس اصول پر عمل کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ حکومت کا مطالبہ خالص پیداوار کا 55 فی صدی ہونا چاہیے...... پیمائش کے ابتدائی کام میں بہت سی غلطیاں کی گئیں اور پیداوار کا تخمینہ، جو شرح تشخیص کا ایک اہم جز تھا اور جس کی تیاری میں تفصیلات پر نظر رکھی گئی تھی، اتنا زیادہ غلط تھا کہ اُس کو فضول محض کہنا مناسب ہوگا۔ بندوبست کر دیا گیا لیکن یہ بندوبست اُن خرابیوں کا مجموعہ تھا جن کو دور کرنے کی خاطر اس کو عمل میں لایا گیا تھا۔ ابتدا ہی سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ تمام مال گزاری یا قریب قریب تمام مال گزاری وصول کرنا محال ہے۔ کچھ اضلاع میں تو آدھی مال گزاری بھی وصول نہ ہو سکی۔ اب حالات تیزی سے بگڑنے لگے۔ ہر سال بقایا مال گزاری کی رقم میں اضافہ ہوتا رہا جس کی وجہ سے چھوٹ اور شرح میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی..... تباہ حال کسانوں سے زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے ہر قانونی اور غیر

---

[1] جان برگس، THE PRESENT LAND-TAX IN INDIA، صفحات 393، 410، 414، 416۔

قانونی طریقہ استعمال کیا گیا۔ انھیں جسمانی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ کچھ صورتوں میں جب انھوں نے مُطالبہ ادا نہ کیا یا ادا نہ کرسکے تو انھیں ناقابل بیان سزائیں دی گئیں۔ بہت سے کسانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پڑوس کی دیسی ریاستوں میں پناہ لی۔ بہت سی زمینیں غیر مزروعہ پڑی رہیں۔ کچھ ضلعوں میں تو قابل زراعت علاقوں کا مشکل سے ایک تہائی حصہ زیرِ کاشت تھا۔[لے]

آخرکار یہ طریقہ ترک کر دیا گیا۔ 1835ء میں بمبئی کی سول سروس کے ایک اور رکن گولڈس مِڈ (GOLDSMID) اور لیفٹیننٹ وِن گیٹ (LT. WINGATE) نے، جو بعد میں سرجان وِن گیٹ کے نام سے مشہور ہوا، دوبارہ پیمائش شروع کی۔

"... زمین کی پیداوار کے متعلق معلومات حاصل کرکے اور اُس کے ایک حصے کے بقدر حکومت کے مطالبے کا یقین کرکے خالص علمی معیار پر پہنچنے کی تمام کوششیں ترک کر دی گئیں۔ پیمائش کرنے والے حکام نے ہر کھیت کی نوعیت اور مٹی کی گہرائی معلوم کرکے اُس کی قسم بندی کرنے کا سیدھا سادھا طریقہ اختیار کیا۔ اس کام کے لیے کھیت کی تشخیص قیمت کے نو مدارج مقرر کیے گئے۔ شرح تشخیص کا تعین کرتے وقت وہ صرف کھیت کی پیداواری صلاحیت اور ضلع کے عام حالات کے عملی پہلو پر نظر رکھتے تھے۔"[ھے]

حالاں کہ اس دوسرے طریقے کو سرکار کی منظوری حاصل ہوگئی تھی لیکن قاری یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقہ اُصولاً درست نہیں تھا۔ کھیت کی اوسط پیداوار کی بنیاد پر مال گزاری تشخیص کرنے کا اُصول قدیم بھی تھا اور درست بھی۔ لیکن پرنگل نے اُس کا عمل درآمد چونکہ غلط انداز سے کیا اس لیے اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن "کھیت کی اوسط نوعیت اور مٹی کی گہرائی معلوم کرنے" کا اُصول تو انتہائی احمقانہ تھا۔ پھر بھی وِن گیٹ نے چونکہ اعتدال پسندی اور نرمی سے کام لیا، جو اُس کے مزاج میں شامل تھیں، اس لیے وہ کامیاب ہوگیا۔ زمین کی ساخت کو اُس کی اوسط پیداوار کی بنیاد قرار دینا خطرے سے خالی نہیں۔ اس ناقابل اعتماد بنیاد پر آئندہ ہونے والے بندوبستوں میں مال گزاری میں برابر اضافہ کیا جاتا رہا جس کے نتیجے میں صوبہ تباہ ہوگیا اور وہاں کے لوگوں کو بڑے دُکھ جھیلنے پڑے۔

بمبئی کے موجودہ مال گزاری کے نظام کی ابتدا اُس پیمائش سے ہوئی جو 1835ء میں شروع کی گئی تھی۔ اور اُس صوبے میں پہلا باضابطہ بندوبست اُس کے دوسرے سال ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے ذرا

لے بمبئی کی سرکاری رپورٹ برائے 73-1872ء، صفحہ 41۔

ھے بمبئی کی سرکاری رپورٹ برائے 73-1872ء، صفحہ 42۔

پہلے شروع کیا گیا۔ چوں کہ بمبئی میں اب بھی بڑی حد تک اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے اس لیے اس بندوبست کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

کئی سال تک بندوبست کا کام ہوتا رہا اور رفتہ رفتہ پورے صوبے میں پھیل گیا۔ جب زیادہ تجربہ حاصل ہو گیا تو اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اُس کے نتیجوں کو یکجا کر کے آئندہ ہدایت کے لیے ضابطوں کی شکل دیدی جائے۔ اس کے لیے 1847ء میں جو رپورٹ تیار کی گئی وہ مشترک رپورٹ کے نام سے مشہور ہے جس پر گولڈسمتھ، کپیتن ون گیٹ اور کیپٹن ڈیوڈسن کے دستخط تھے[1]۔

بندوبست کے اُصول جن کا ذکر مشترک رپورٹ میں کیا گیا تھا مندرجہ ذیل تھے: (1) پوری جوت یا گاؤں کی مشترک بنیاد کے بجائے علاحدہ علاحدہ کھیت کی بنیاد پر تشخیص کی گئی تھی۔ (2) گزشتہ زمانے کے کم مدتی پٹوں کے بجائے تیس سال کی طویل مدت کے پٹے کیے گئے تھے۔ (3) پیداوار کے تخمینے کے بجائے زمین کی تخمینی قیمت کی بنیاد پر تشخیص کی گئی تھی۔ یہ بات مشترک رپورٹ کے کچھ اقتباسات سے واضح ہو جائے گی۔

"جب تک کسان کھیت پر عائد ہونے والا سرکاری مطالبہ ادا کرتا ہے اُس پر قابض رہنے کا اس کا حق ختم نہیں کیا جا سکتا۔ حالاں کہ اُسے ہر کھیت کے پٹے کی تجدید سال بہ سال کرنی ہوگی۔ اُس کی تمام تر زمین کے بجائے ہر کھیت پر علاحدہ علاحدہ تشخیص کی گئی ہے تاکہ جب بھی حالات کے پیشِ نظر اس امر کی ضرورت محسوس ہو تو وہ اپنے کھیت سے دست بردار ہو سکے یا ایسے کھیت پر قبضہ کر سکے جس پر کوئی اور قابض نہ ہو اور اس طرح اپنی ذمہ داریوں اور اُن کو پورا کرنے کے ذرائع میں مطابقت پیدا کر سکے۔ تیس سال کی مُدت کے لئے کھیت کے معینہ لگان سے، جس کو ہماری پیمائش نے رواج دیا ہے، کِسان کو تیس سال کے پٹے کے تمام فوائد حاصل ہو گئے ہیں اور اُس پر اس شرط کے علاوہ اور کوئی بار نہیں ڈالا گیا کہ جس سال کا معاہدہ کرے اس سال کا مطالبہ ادا کر دے۔"

ہم نے ہر طرح کی زمین کو نو قسموں میں تقسیم کرنے کا طریقہ برقرار رکھا ہے۔ تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس طرح کی قسم بندی سے تمام مقاصد عملاً پورے ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ کوئی مخصوص کھیت کس قسم کا ہے قسم بندی کرنے والوں کی قوت فیصلہ پر اعتماد کرنے کے بجائے ہم نے کھیت کی قسم معلوم کرنے کے لیے کچھ قاعدے بنائے ہیں اس ملک کی زمین کی زرخیزی کا، یا کم از کم اُن علاقوں کی زمین کی زرخیزی کا جہاں تک ہمارا کام پھیل گیا ہے، انحصار نمی کو جذب کرنے

---

[1] مشترک رپورٹ، مورخہ 2 اگست 1847ء۔

اور برقرار رکھنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ چوں کہ اس صلاحیت کا دارومدار مٹی کی تہہ کی دبازت پر ہوتا ہے اس لیے ہم نے مٹی کی گہرائی کو ایسا اُصول تسلیم کیا جس کی بنا پر تخمینہ لگایا جا سکتا ہے :

"اگر مٹی کی یکساں گہرائی میں یکساں زرخیزی کی صلاحیت ہوتی تو محض گہرائی کی بنا پر قسم بندی کی جاسکتی لیکن ایسا نہیں ہے...... قیمت کا تخمینہ لگانے کے لیے ہماری رائے میں اتنا کافی ہے کہ اُن کی زرخیزی (زرخیزی کے اعتبار سے مختلف قسم کی زمینوں کی) تین نوعیتیں قرار دی جائیں اور پھر گہرائی کی مناسبت سے ہمارے بنائے ہوئے نو درجوں میں اُنھیں تقسیم کر دیا جائے جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

		مٹی		
قسم	آنے یا روپے میں سولھویں حصے میں قسم کی مناسب قیمت	اول درجے کی جس کی ساخت یکساں اور نفیس ہو اور گہرے سیاہ سے لیکر گہرا بادامی رنگ ہو۔	دوسرے درجہ کی جس کی ساخت یکساں مگر ادنا قسم کی ہو اور رنگ ہلکا ہو جو عام طور سے سرخ ہوتا ہے۔	تیسرے درجے کی جس کی ساخت ادنا اور کنکریلی ہو یا جو آسانی سے توڑی جا سکے اور رنگ ہلکے بادامی خاکستری تک ہو۔
		گہرائی ہاتھوں میں (ایک ہاتھ = $1\frac{1}{2}$ فٹ)	گہرائی ہاتھوں میں (ایک ہاتھ = $1\frac{1}{2}$ فٹ)	گہرائی ہاتھوں میں (ایک ہاتھ = $1\frac{1}{2}$ فٹ)
1	16	$1\frac{3}{4}$	$1\frac{3}{4}$	
2	14	$1\frac{1}{2}$	$1\frac{1}{2}$	
3	12	$1\frac{1}{4}$	$1\frac{1}{4}$	
4	10	1	1	
5	8	$\frac{3}{4}$	$\frac{3}{4}$	
6	6	$\frac{1}{2}$	$\frac{1}{2}$	1
7	$4\frac{1}{2}$	$\frac{1}{4}$	$\frac{1}{4}$	$\frac{3}{4}$
8	3			$\frac{1}{2}$
9	2			$\frac{1}{4}$

"اس نقشے کا پہلا خانہ ہماری بنائی ہوئی نو قسموں پر مشتمل ہے۔ دوسرے خانے میں اُن کی متناسب قیمتیں دی ہوئی ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ قیمت 16 آنے یا ایک روپیہ فرض کی گئی ہے جو ہندوستانیوں میں قیمت نکالنے کا عام طریقہ ہے۔"

"ایسا تفصیلی بیان پیش کیا جائے جس میں اعداد و شمار شامل ہوں اور ہر قسم کی زمین سے ابھی تک وصول ہونے والی مال گزاری کی ہر مد کی رقم اور ذریعے کو ظاہر کیا گیا ہو۔

اس طرح حاصل ہونے والی معلومات اس معلومات کے ساتھ مل کر جو ضلع کی گزشتہ تاریخ کے متعلق موقعہ پر حاصل کی جائے ہمیں اُن اسباب کو تلاش کرنے کے قابل بنا دیگی جن کا اثر اس کے گزشتہ حالات پر پڑا۔ اس قسم کی معلومات اور آس پاس کے ضلعوں سے اُس ضلع کی صلاحیتوں کا تقابلی مقابلہ تشخیص مال گزاری کے متعلق کسی اطمینان بخش نتیجے پر پہنچنے میں ممد ثابت ہوگا۔

"لیکن کسی ضلع پر ایک مخصوص رقم تشخیص کرنے کے بجائے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے اور اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا کہ اُس ضلع کی مختلف قسم کی زمینوں اور کاشت پر مختلف شرح کے مطابق اسی طرح تشخیص کی جائے کہ مطلوبہ رقم حاصل ہو جائے۔ یہ کرنے کے لیے صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف قسم کی کاشت کی زیادہ سے زیادہ شرح کا تعین کر دیا جائے۔ کم شرح ہماری قسم بندی کی متناسب قیمتوں سے فوراً نکالی جاسکے گی۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباسات میں مشہور مشترکہ رپورٹ کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے جو بمبئی کے مال گزاری کے طریقے کی بنیاد تھی۔ اس نے تسلیم کیا کہ کسان کو اپنے کھیت پر موروثی اور قابل انتقال حق حاصل ہے۔ لیکن اس نے زمین کے معینہ محصول کے اُتنے ہی قدیم حق کو ختم کر دیا جو مرہٹوں کے زمانے میں میراندار کسانوں کو حاصل تھا۔ اس نے ضلع کی مال گزاری کے مطالبے کو اُن لاکھوں کھیتوں پر تقسیم کرنے کے لیے بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ نقشے تیار کیے لیکن اُس نے مطالبے پر کوئی حدود نہیں قائم کیں۔ اس نے کھیت کی پیداوار کے منصفانہ طریقے کے بجائے زمین کی ساخت کے ناقابل عمل طریقے کو تشخیص کی بنیاد بنایا اور اس نے دس بارہ شلنگ مہینہ پانے والے قسم بندی کرنے والوں کی ایک فوج کو زمین کی گہرائی اور کیفیت معلوم کرنے اور ہر کھیت کی متناسب قیمت مقرر کرنے کے کام پر لگا دیا۔ ضلع کے مجموعی مطالبے کو کھیتوں کی متناسب قیمت کے اعتبار سے تقسیم کرتا تھا۔ لیکن ضلع کے مجموعی مطالبے کا تعین "ضلع کی گزشتہ تاریخ" اور لوگوں کی گزشتہ حالت کی غیر واضح بنیاد پر کرنا تھا۔ چنانچہ صوبے پر تیس سالہ انگریزی راج کے بعد لوگ جس امر کی یقین دہانی

---

[1] مشترکہ رپورٹ، پیراگراف 9، 14، 43، 75، 76 اور 77۔

چاہتے تھے وہ حکومت نہ کرسکی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اُس کے ملازمین اپنے مطالبے پر کسی قسم کے حدود عائد کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لوگوں کے حالات کے مطابق ہر بندوبست میں مطالبہ کی تشکیل، ترمیم اور اس میں اضافہ کرنے کا اختیار وہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ ایک زراعت پیشہ قوم کو ہمیشہ غریب اور بے وسیلہ رکھنے کے لیے اس سے بہتر تدبیر سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی کہ حکام مال کو ہر بندوبست کے وقت سرکاری مطالبے میں اضافہ کرنے کے غیر محدود اور مطلق اختیارات دیدیے جائیں۔ زمین کا محصول مقرر کرنے میں کسان کی کوئی آواز نہیں ہوتی تھی اور محصول مقرر کرتے وقت اُس سے مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔ محصول مقرر ہونے کے بعد اُس سے کہا جاتا تھا کہ وہ محصول ادا کرے یا اپنی آبائی زمین سے دست بردار ہو کر فاقے کرے۔

اُن لوگوں کی شہادت سے جنہوں نے بندوبست میں حصہ لیا تھا یہ واضح ہو جائے گا کہ ہم مبالغے سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ 1853ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہونی تھی اور حسب معمول چارٹر کی تجدید سے پہلے ہندوستان میں کمپنی کے نظم و نسق کے تمام شعبوں کی پارلیمانی تحقیقات ہوئی۔ 1852ء میں ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹیوں نے شہادت قلم بند کی اور رپورٹیں تیار کیں۔ اور انہوں نے 1853ء میں مزید شہادت قلم بند کی ہاؤس آف لارڈ کی کمیٹی نے تین رپورٹیں پیش کیں اور ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی نے چھ رپورٹیں۔ سلیکٹ کمیٹیوں کے سامنے پیش ہونے والی اس ضخیم شہادت میں ہم ایک نوجوان افسر گولڈ فنچ (GOLD FINCH) کی شہادت کا انتخاب کریں گے جس نے بمبئی میں بندوبست کا کام کیا تھا اور اُس کے متعلق 20 رجون 1853ء کو بیان دیا۔ "6714۔ پیمائش کے بعد جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ کھیت نمبر ۱ پر، جس کا رقبہ پانچ بیگھ (تقریباً دو ایکڑ) تھا، کوئی خاص آدمی قابض ہے تو کلکٹر نے اُس پر من مانی مال گزاری تشخیص کردی یا اُس نے قابض یا مالک سے دریافت کیا کہ وہ مال گزاری کی رقم ادا کرنے کو تیار بھی ہے"؟ "کسان سے پوچھے بغیر پیمائش کے سپرنٹینڈنٹ نے مال گزاری مقرر کردی اور جب مال گزاری کی نئی شرح کا فیصلہ ہو گیا تو ہر کھیت کا قابض کلکٹر کے یہاں طلب کیا گیا اور اس کو بتایا گیا کہ آئندہ اُس کی زمین پر اُس شرح سے مال گزاری تشخیص کی جائے گی اگر اُس شرط پر اُس نے کھیت رکھنا چاہا تو رکھا۔ نہ رکھنا چاہا تو وہ دست بردار ہو گیا۔"

"6720۔ ضلع کے تمام گانوؤں میں پیداوار اور تشخیص کا تناسب یکساں ہے یا مختلف؟"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں صرف از روئے قیاس بتا سکتا ہوں کہ زمین کی خالص پیداوار اور تشخیص میں کیا تناسب ہے۔"

"6722۔ کیا پورے ضلع کی پیمائش کی نگرانی ایک افسر کرتا ہے؟

"جی ہاں!

" 6723 - اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری پریسیڈنسی میں تشخیص کا اُصول یکساں ہے۔

" بلاشبہ!

" 6724- پیمائش کا سپرنٹینڈنٹ کس محکمے سے تعلق رکھتا ہے؟

" کیپٹن ون گیٹ انجینیر ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولڈ فنچ کے نزدیک یہ اُصول منصفانہ تھا کہ" کسان سے پوچھے بغیر" زمین کا محصول مقرر کر دیا جائے اور اس کے بعد کسان سے کہا جائے کہ وہ اُسے تسلیم کرے یا زمین سے دست بردار ہو جائے۔ اُسے یہ خیال نہیں آیا کہ زمین کسان کی ہے اور اُس کے باپ دادا معینہ زمین کے محصول کی بنا پر اُس پر قابض رہے ہیں اور یہ کہ زمین سے دست بردار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی آبائی جائداد اُس سے چھین لی جائے۔ اس بندوبست کے نتائج کا زیادہ تفصیلی حال دوسری کتاب میں دیا جائے گا جس کا نام ہے "ہندوستان عہد وکٹوریہ میں"۔

کیپٹن ون گیٹ کے لیے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اس ناقص طریقے پر اعتدال پسندی اور نرمی کے ساتھ عمل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بھی یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس طریقے کی ناانصافی کو محسوس کیا اور تشخیص پر کچھ حدود عائد کرنے کی کوشش کی۔ چارٹر کی تجدید کے تین سال بعد کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اپنا مشہور مراسلہ مؤرخہ 17، دسمبر 1856ء لکھا جس میں اُنہوں نے کہا "حکومت کو ایسا لگان وصول کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جو کاشت کے اخراجات اور زراعتی سامان کے منافع کی تہائی کے بعد تمام تر فاضل پیداوار پر مشتمل ہو۔ اُسے صرف مال گزاری وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔"
ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے بعد سر چارلس وڈ نے (جو بعد میں لارڈ ہیلی فیکس کے نام سے مشہور ہوا) جو اُس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند تھا، 1864ء کے اپنے مشہور مراسلے میں لکھا تھا کہ وہ چاہتا ہے کہ زمین کے محصول کے طور پر صرف ایک حصہ اور وہ بھی لگان کا نصف حصہ وصول کیا جائے۔

جب بمبئی کے طریقے کے تحت کھیت کی پیداوار اور اُس کے مناسب لگان کا تعین نہ ہو سکا اور ہر ضلع کی زمین کا محصول مقرر کرتے وقت اس پر غور کیا گیا کہ لوگ گزشتہ زمانے میں کتنا محصول ادا کرتے تھے اور آئندہ کتنا ادا کر سکیں گے تو اس نیک خواہش کو کس طرح عملی صورت دی جا سکتی تھی۔ اس نظام میں کسانوں سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا اور وہ کسی عدالت مال میں اپیل دائر نہیں کر سکتے تھے، ہر بندوبست کے وقت مال گزاری کے مطالبے میں اضافہ کر دیا جاتا تھا اور کسان بے وسیلہ اور غریب تھے۔

لارڈ کیننگ نے ،جو 1858ء سے 1862ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا تھا ، یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بمبئی میں مال گزاری کا دائمی بندوبست کر دیا جائے لیکن 1883ء میں لندن کے انڈیا آفس نے یہ تجویز مسترد کردی۔ لارڈ رپن نے، جو 1880ء سے 1884ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا ، تجویز پیش کی کہ قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر مال گزاری میں اضافہ نہ کیا جائے لیکن 1885ء میں انڈیا آفس نے اس کی یہ تجویز بھی مسترد کر دی۔

زمین کے محصول پر منصفانہ اور قابل فہم حدود عائد کرنے کی تجویزیں جو وقتاً فوقتاً پیش ہوئیں یا تو نظر انداز کی گئیں یا مسترد کر دی گئیں اور بمبئی کے کاشت کار کو ہمیشہ کے لیے بے وسیلہ بنا دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اس کو انسانی تدبیر کا شاہکار کہنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے کسان ساہوکار کے جال میں زیادہ سے زیادہ پھنستا چلا گیا اور انیسویں صدی کے آخری دنوں میں بمبئی میں اتنا شدید اور اتنے وسیع پیمانے پر قحط پڑا کہ خود ہندوستان میں اُس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

باب - 22

برڈ اور شمالی ہند کا نیا بندوبست [1822ء - 1835ء]

شمالی ہندوستان کے اس بندوبست کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جو 1822ء میں شروع ہوا تھا اور جس کا ذکر اس کتاب کے گیارھویں باب میں کیا گیا ہے۔ خسرہ تیار کرنے کے لیے جو تحقیقات شروع کی گئی وہ پوری نہ کی جا سکی۔ کھیتوں کی پیداوار کی تفصیلات معلوم کرنے کا کام پریشان کن اور بے سود ثابت ہوا۔ حکومت کا مطالبہ جو لگان کے 80 فی صدی پر مشتمل تھا بہت زیادہ بھی تھا اور اُس کی وصولیابی بھی محال تھی۔ خود اُس کی سختی نے اس نظام کو توڑ کے رکھ دیا۔ ایک مصلح اس وقت منظر عام پر نمودار ہوا جب اصلاح کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

1828ء میں لارڈ ولیم بین ٹنگ گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرلوں میں وہ ہندوستان کے لوگوں کا سب سے زیادہ بہی خواہ تھا۔ اُس نے شمالی ہندوستان کا دورہ کیا اور اس دورہ میں جو کچھ دیکھا وہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کر دیا۔

"2۔ عزت مآب کورٹ کے علم میں ہے کہ مغربی صوبہ جات کے دورے کا بڑا محرک میرا یہ خیال تھا کہ 1822ء کے ریگولیشن نمبر 7 کی دفعات کے تحت بندوبست کا جو کام ہو رہا ہے اُس کے متعلق ذاتی مشاہدے کی بنا پر معلوم کروں کہ اُس میں کتنی ترقی ہوئی ہے اور یہ بھی معلوم کروں کہ اس کام کی رفتار بڑھانا یا کوئی دوسرے ایسے طریقے اختیار کرنا ممکن ہو گا یا نہیں جو ملک کی خوش حالی میں اضافہ کرنے کے اُن مقاصد کو پورا کر سکیں جو عزت مآب کورٹ کے پیش نظر ہیں۔"

"4۔ جن افسروں سے میں نے مشورہ کیا اُن میں جوش اور سمجھ بوجھ کی کمی نہیں پھر بھی میرا فرض ہے کہ میں عزت مآب کورٹ کے علم میں یہ واقعہ لاؤں کہ ناکامی کی چاہے جو بھی وجہ ہو مگر ان صوبوں میں بندوبست کا کوئی کام نہیں ہوا ہے۔

"8۔ عزت مآب کورٹ کے مراسلے مورخہ ۹ فروری کے پیراگراف 58 میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کے لیے میں واقعی ممنون ہوں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ طویل مدّت کے پٹوں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ بندوبست کی رفتار تیز کرنے کی تدابیر اور ذیلی کسانوں کے حقوق کے تحفظ کے متعلق آپ نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں اُن میں اور خود میرے خیالات میں بڑی حد تک مطابقت ہے"[1]

لارڈ ولیم بین ٹنک نے اُسی سال بورڈ آف ریونیو کو بھی ایک خط لکھا تھا جس میں 1822ء کی اسکیم کی ناکامی کے خاص خاص اسباب بتائے گئے تھے۔ اُس نے لگان کے 80 فی صدی کے بھاری سرکاری مطالبے کی مذمت کی تھی اور اُس میں تخفیف کا مشورہ دینے کی جرأت کی تھی۔

اُس نے لکھا تھا کہ ریگولیشن کی رو سے "اضافے کی صورت میں تشخیص اس طرح کی جانی چاہیئے کہ زمین داروں اور دوسروں کو جمع بندی (سرکاری مطالبے) کی رقم پر، جو وہ ادا کریں یا اُن کے ذریعے سے ادا کی جائے 20 فی صدی خالص منافع ملے۔ لیکن گورنر جنرل کی رائے ہے کہ اُن حکام مال میں یہ خیال پایا جاتا ہے جن کی رائے کو اہمیت حاصل ہے کہ زمین داروں کو کسی حالت میں سرکاری جمع بندی کا 30 یا 35 فی صدی سے کم منافع نہیں ملنا چاہیے کیا یہ واقع نہیں ہے کہ اس رقم کو ایسا سرمایہ سمجھا جانا چاہیے جس سے زمین کو ترقی دی جا سکے؟

اس میں وصولیابی کے اخراجات شامل نہیں ہیں اور خالص لگان کی بنیاد پر اس کا حساب لگایا گیا ہے۔ ہر قسم کے لگان سے زمین داروں اور دوسرے مالکان کے حق میں جو بٹائی کی جانی چاہیے اُس کے متعلق گورنر جنرل کا خیال ہے کہ وہ معین کر دی جائے۔ گورنر جنرل نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو مشورہ دوں کہ مناسب شرح کچھ سہی پھر بھی کیا اس میں زیادہ سہولت نہیں ہوگی کہ مجموعی لگان میں سے زمین داروں کے حق میں محسوب ہونے والے تمام اخراجات کو یکجا کر دیا جائے اور اس تعین کو ایک افسر کے اختیار تمیزی پر نہ چھوڑا جائے، جیسا کہ اب تک ہوتا رہا ہے۔ اس تعین کا اطلاق سب پر یکساں طور سے ہو"[2]

اِن اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 1831ء ہی میں لارڈ ولیم بین ٹنک نے نئے بندوبست کے اس اہم اصول کو سمجھ لیا تھا کہ طویل مدّت کے پٹے کیے جائیں تاکہ زمین دار اور کسان میں زمین کو ترقی دینے کی خواہش پیدا ہو اور مناسب سرکاری مطالبہ مقرر کیا جائے تاکہ زمین کے لئے اُن کے پاس کچھ رقم باقی رہے۔"

---

[1] گورنر جنرل کا خط کورٹ آف ڈائرکٹرز کے نام، مورخہ 15 ستمبر 1831ء۔

[2] بورڈ آف ریونیو کے نام مراسلہ مؤرخہ 7 اپریل 1831ء پیراگراف 106 اور 107۔

ایک اور بات جس پر گورنر جنرل نے توجہ دی یہ تھی کہ شمالی ہندوستانی گانووٗں کی طرزِ زندگی کو برقرار رکھا جائے۔ سر چارلس مٹکاف نے، جو گورنر جنرل کی کونسل کا ایک رکن تھا اور بعد میں ہندوستان کا قائم مقام گورنر جنرل رہ چکا تھا، 1830ء کی اپنی مشہور روداد میں اس کو زوردار الفاظ میں بیان کیا تھا جس کے اقتباسات اکثر پیش کیے گئے ہیں۔

گانووٗں کی آبادی چھوٹی موٹی جمہوریہ ہوتی ہے جس کے پاس ضرورت کی قریب قریب ہر چیز ہوتی ہے۔ اُس کے لیے گانو سے باہر والوں سے امداد حاصل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ دنیائے بے ثبات میں صرف اُس کو ثبات حاصل ہے۔ خاندان کے بعد خاندان ختم ہوئے۔ انقلاب کے بعد انقلاب آئے۔ ہندو، پٹھان، مُغل، مرہٹے، سکھ، انگریز باری باری ہندوستان پر حکومت کرتے رہے لیکن گانو کی زندگی جوں کی توں رہی۔ بدامنی کے زمانے میں وہ مسلح ہو جاتے ہیں اور قلعہ بندی کر لیتے ہیں۔ جب دشمن کی فوج دیہات سے گزرتی ہے تو گانو کے لوگ اپنے جانور گھروں میں لے آتے ہیں اور دشمن سے تعرض نہیں کرتے۔ اگر اُنہیں لوٹنے اور برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور دشمن کی قوت ناقابلِ مزاحمت ہوتی ہے تو وہ دور دراز کے ایسے گانووٗں میں پناہ لیتے ہیں جن سے دوستانہ مراسم ہوتے ہیں۔ طوفان گزر جانے کے بعد وہ اپنے گانو کو واپس آجاتے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب کسی عِلاقے میں کئی سال تک لُوٹ مار اور قتل و غارت کا سِلسلہ جاری رہتا ہے تو گانووٗں کو آباد کرنا محال ہوتا ہے پھر بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے گانو کے لوگ امن قائم ہونے کے بعد اپنے گانو کو واپس آجاتے ہیں۔ اگر ایک نسل ختم ہو جائے تو دوسری نسل واپس آتی ہے۔ بیٹے اپنے باپوں کی جگہ لیتے ہیں۔ پُرانی جگہ پر گانو آباد کیا جاتا ہے۔ گھر وہیں بنائے جاتے ہیں جہاں پہلے تھے اور گانو کی تباہی کے وقت جو لوگ وہاں سے نکال دیے گئے تھے اُن کے وارث اُن کی زمینوں پر قبضہ و دخل حاصل کرتے ہیں۔ اُنھیں گانو سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ بدامنی اور بدانتظامی کے زمانوں میں اکثر اپنے مورچوں پر ڈٹے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے میں اتنی قوت پیدا کر لی ہے کہ لوٹ مار اور مظالم کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔

"گانووٗں کی اُن آبادیوں کے اتحاد نے، جن میں سے ہر ایک چھوٹی موٹی ریاست ہوتی ہے، تمام انقلابوں اور تبدیلیوں کے دوران ہندوستان کے لوگوں کو برقرار و بحال رکھنے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے اور بڑی حد تک اُن کی مسرت، آزادی اور خود مختاری کی وجہ اُس کو قرار دیا جا سکتا ہے — اس لیے میری خواہش ہے کہ گانو کے دستور میں رخنہ اندازی نہ کی جائے اور میں ہر اُس چیز سے ڈرتا ہوں جس میں اُس دستور کو ختم کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رعیت داری بندوبست کی طرح اگر

اگر گانو کی پوری آبادی کے بجائے انفرادی کسانوں سے بندوبست کیا گیا اور گانو کے نمائندوں اور مکھیاؤں کو نظرانداز کیا گیا تو اُس قسم کا بندوبست اس دستور کو ختم کر دے گا۔ اِس بنا پر اور محض اس بنا پر میں نہیں چاہتا کہ مغربی صوبہ جات میں رعیت داری بندوبست کو رواج دیا جائے[1]"

مسٹر چارلس مٹکاف کا یہ خیال درست تھا کہ رعیت داری بندوبست کے رائج ہونے کے بعد مدراس اور بمبئی کے گانوؤں کی مشترکہ ملکیت کا رواج ختم ہوگیا۔ جب ہر کسان سے علیحدہ علیحدہ بندوبست کیا جائے تو مشترکہ ملکیت کی علّت نمائی ختم ہو جاتی ہے۔ منرو اور الفنسٹن نے کوشش کی تھی کہ گانو سماج کو تمام اختیارات و فرائض منصبی سے محروم کر کے زندہ رکھا جائے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شمالی ہندوستان میں بھی اُن ہی اسباب کی بنا پر پچھلے ستّر سال میں گانوؤں کی پنچایتی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ مغربی تصورات کی پیروی کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے یہ کوشش کی کہ زمین کے محصول کی ذمہ داری کچھ مخصوص افراد پر یعنی زمین داروں اور گانو کے سربراہوں پر ڈالی جائے۔ وہ لوگ ذمہ دار قسم کے مال گزار تو بن گئے مگر گانوں کی مشترک زندگی ختم ہونے لگی۔ مغربی اداروں کی تقلید کرتے ہوئے حکومت نے کوشش کی کہ تمام انتظامی اور عدالتی اختیارات اُس کے افسروں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جائیں اور اس طرح اُس نے پنچایتوں کے قدیم اختیارات اُن سے چھین لیے یا کم کر دیے جس کی بنا پر وہ اُن درختوں کی طرح خشک ہو کر زمین پر آ رہیں جن کی جڑیں کاٹ دی جائیں۔ حکومت خود اختیاری کے اس قدیم نمونے کو برقرار رکھنے کی خواہش کے باوجود، جس کو منرو، الفنسٹن اور مٹکاف نے محسوس بھی کیا اور ظاہر بھی کیا، وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ان چھوٹی چھوٹی جمہوریوں کو حکومت خود اختیاری سے محروم کر دیا، تمام اختیارات دیوانی عدالتوں اور انتظامی افسروں کے سپرد کر دیے۔ انھیں لوگوں کے قدیم اداروں پر اعتماد نہیں تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا سب سے افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ گانو کی حکومت خود اختیاری کا وہ طریقہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا جو دنیا کی قوموں میں سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا اور سب سے زیادہ مدت تک یہاں باقی رہا۔

لارڈ ولیم بین ٹنک نے اپنی کاؤنسل کے اراکین، بورڈ آف ریونیو اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے مشوروں سے اپنی اسکیم تیار کرلی تھی۔ اُس نے 1833ء میں حکام کا ایک جلسہ الٰہ آباد میں کیا جس کی صدارت خود اُس نے کی۔ اس جلسے کا نتیجہ 1833ء کے ریگولیشن نمبر 9 کی صورت میں نمودار ہوا جو شمالی

---

[1] سر چارلس۔ ٹی۔ مٹکاف کی روداد، مورخہ 17 نومبر 1830ء۔

ہندوستان کے بندوبست کی حقیقی اساس ہے۔ اس ریگولیشن کے ذریعے زیادہ تر ایسے مقدمات بندوبست کے حکام کی عدالتوں سے منتقل کر دیئے گئے جن میں قانونی چارہ جوئی کی گئی تھی، پیداوار اور لگان کا تخمینہ لگانے کے طریقوں کو آسان بنا دیا گیا، مختلف قسم کے کھیتوں کے اوسط لگان کے طریقے کو رائج کیا گیا، کھیتوں کے نقشے اور خسرے کے استعمال کو پہلی دفعہ رواج دیا گیا۔ اور حکومت کے مطالبے کو کم کر کے مجموعی لگان کا دو تہائی کر دیا گیا۔ یہ بندوبست، جو 1833ء میں شروع ہوا تھا اور سولہ سال بعد یعنی 1849ء میں مکمل ہوا تھا تیس سال کیلئے کیا گیا تھا۔

اس کام کی نگرانی ایک ایسے شخص کے سپرد ہوئی جو اس کا اہل تھا۔ اس شخص کا نام تھا رابرٹ مرٹنس برڈ (ROBERT MERTTINS BIRD) جس کو شمالی ہند کے بندوبست کا امام کہنا چاہیے۔ ابتدا میں اس کا تعلق عدالتی محکمے سے تھا اور عدالتی کاموں کی انجام دہی میں اس نے جو تربیت پائی تھی اس کی بنا پر حاکم مال کے فرائض ادا کرنے کی بڑی اہلیت اس میں پیدا ہو گئی تھی۔

اس نے 1842ء میں لکھا تھا "جن مراحل سے گزر چکا ہے اُن میں سے زیادہ تر ایسے تھے جن کو میں نے اُس زمانے میں جب عدالتی کام میرے سپرد تھے اور میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے محکمہ مال کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں گی، عدالتی نوعیت کے مراحل سمجھا اور اُن کے متعلق تفصیلی منصوبے بنائے۔

"عدالتی محکمے سے تعلق رکھنے والے حکام کو ایسی سرکاری سہولتیں میسر نہیں ہوتی ہیں کہ وہ ایسی قسم کے منصوبے بنا سکیں جو عملی طور پر مفید ہوں۔ اس لیے مجھے گورکھپور کی کمشنری میں بندوبست کی نگرانی کرنے کے لیے جب مال گزاری کے کمشنر کے عہدہ کی پیش کش کی گئی تو میں نے اس کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔ میں نے اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل اور تجربے کی بنا پر اپنے خیالات کی صحت اور عملی افادیت کے امتحان کا ایک موقع سمجھا۔

مجھے یقین تھا کہ مناسب و معقول مال گزاری کی تشخیص کے ساتھ نجی حقوق اور گاؤں کی مشترکہ کاشت کے متعلق معلومات حاصل کی جا سکیں گی، اس قسم کی دستاویزات تیار کی جا سکیں گی، اس قسم کے اُصول بنائے جا سکیں گے اور اس قسم کے مفید طریقے اختیار کیے جا سکیں گے جن سے وہ خرابیاں دور کی جا سکیں جو زمینی جائیداد اور زراعتی خوش حالی کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں۔

ان اصولوں کی بنا پر میں نے گورکھپور میں کام شروع کیا۔ مرحوم لارڈ ولیم بین ٹنک نے اگلے سال ضلع کا دورہ کیا اور میرے منصوبے کے متعلق مجھ سے تفصیلی گفتگو کی اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اس موضوع پر اُن سے خط و کتابت جاری رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1832ء میں میرا تقرر اُس عہدے

پر ہو گیا جس کی بنا پر شمال مغربی صوبجات میں بندوبست کی نگرانی کا قریب قریب سارا بوجھ مجھے اُٹھانا پڑا۔

"میرے خیال میں یہ دعویٰ بیجا نہیں ہوگا کہ زمین کا ایسا مطالبہ مقرر کر دیا گیا ہے جو اعتدال پسندی، انصاف اور مساوات پر مبنی ہے اور جس کو دولت پس انداز کرنے اور زراعت کو ترقی دینے کے راستوں میں رکاوٹ ڈالے بغیر وصول کیا جا سکتا ہے اور وصول کیا جانا چاہیے"[1]

موجودہ کتاب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ شمالی ہندوستان کی مختلف کمشنریوں اور ضلعوں میں ہونے والے بندوبست کے کام کی تاریخ بیان کی جائے۔ لیکن تشخیص کے نتائج مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے معلوم کیے جا سکتے ہیں جو اُس بیان سے حاصل کیے گئے ہیں جو برڈ کی رپورٹ میں ضمیمے کے طور پر شامل ہے[2]

کمشنری اور ضلع کا نام	مجموعی رقبہ ایکڑ میں	مزروعہ رقبہ ایکڑ میں	مزروعہ زمین پر فی ایکڑ سرکاری مال گزاری		
			روپیہ	آنہ	پائی
ضلع ہریانہ	16,57,975	6,94,147		14	4
" دہلی	3,64,534	1,74,605	2	1	3
" رہتک	8,44,666	4,74,465	1	5	2
" گڑگاؤں	1,60,437	6,47,353	1	9	
میرٹھ کمشنری					
سہارن پور	10,8,705	6,06,847	1	10	6
مظفر نگر	6,91,706	3,92,377	1	11	2
میرٹھ	17,76,430	10,34,016	2	1	9
بلند شہر	10,25,096	5,92,630	1	9	8
علی گڑھ	11,19,238	9,00,562	1	4	
روہیلکھنڈ کمشنری					
بجنور	10,27,532	4,59,409	2	2	10

[1] شمال مغربی صوبجات کے بندوبست کے متعلق ٹی۔ ایم۔ برڈ کی رپورٹ، مؤرخہ 21 جنوری 1842۔

[2] اس کے بیان میں اُن علاقوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جہاں بندوبست استمراری ہو گیا تھا۔ ہریانے کے ضلع کے متعلق ایک غلطی درست کر دی گئی ہے۔ ایکڑ کی کسریں اور پائیاں چھوڑ دی گئی ہیں۔

ضلع مرادآباد	دیا ہوا نہیں ہے	دیا ہوا نہیں ہے	دیا ہوا	نہیں	ہے
" بدایوں	14 , 50,148	7 , 52,103	1	7	6
" پیلی بھیت	دیا ہوا نہیں ہے	دیا ہوا نہیں ہے	2		1
" بریلی	11 , 16 , 174	6 , 39,579	1	15	7
" شاہجہاں پور	13 , 09 , 211	6 , 51 , 549	1	9	
آگرہ کمشنری					
ضلع متھرا	دیا ہوا نہیں ہے	دیا ہوا نہیں ہے	دیا ہوا	نہیں	ہے
" آگرہ	9 ,35 ,815	6 ,46,818	2	2	5
" فرخ آباد	12,47,288	6 ,14,253	2	2	
" مین پوری	12,80,927	6 ,13,422	2	4	
" اٹاوہ	10 , 71 756	4 ,77,901	2	11	10
الہ آباد کمشنر					
ضلع کانپور	14 ,97,795	7,82,276	2	1	3
" فتح پور	9,90,584	5 ,06,905	2	12	9
" الہ آباد	17,90, 244	9 ,97, 508	2	2	6
بنارس کمشنری					
ضلع گورکھپور	41 ,15,214	19,27 ,234	1	1	3
" اعظم گڑھ	16,52,293	7 ,73 ,616	1	15	4

ہندوستان چھوڑنے تک برڈ نے جو کام کیے تھے اُن کے نتائج یہ تھے دس سال بعد جب ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی نے اُس کی شہادت قلم بند کی تو اُس نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنے اُس طریقے کی تشریح کی جس پر اُس نے ہندوستان میں عمل کیا تھا۔

سب سے پہلے میں نے زمین کی پیمائش کی۔ اُس کے بعد میں نے نقشہ تیار کیا جس میں کھیت کو اُس طرح دکھایا گیا تھا جیسے انگلستان کے دسویں حصے کا حساب لگانے والے نقشوں میں دکھایا جاتا ہے۔ اُس کے بعد گاؤں کی سرحد کی پیمائش کا کام کسی تعلیم یافتہ حاکم کے سپرد کیا گیا اُس نے مزروعہ اور غیر مزروعہ زمین کی نشان دہی کی اور باضابطہ پیمائش کے بعد گاؤں کی جو شکل اُبھری اُس کو پیش کیا...... ہم نے پھر اُس علاقے پر تشخیص ہونے والے زمین کے محصول کی تفتیش کی...... جب اُس کے متعلق ضمنی طور سے معلوم ہو گیا تو ہم نے پورے علاقے کے لیے محصول کی رقم کا تعین کر دیا اور اُس کے بعد ہم نے ہر گاؤں کے لیے رقم تعین کرنے کا کام شروع کر دیا...... اُس کے بعد لوگوں نے کلکٹر سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات ہندوستان کے رواج کے مطابق

درختوں کے سائے میں یا کھلے میدانوں میں ہوتی تھی...... بہت سے لوگوں نے اعتراضات کیے۔ وہ کہتے تھے "شرح تشخیص زیادہ ہے۔ میرا گانو اتنی رقم ادا نہیں کر سکے گا۔ یہ غریب گانو ہے۔"

ہم اُن سے کہتے تھے کہ یہ رقم پورے علاقے سے وصول کی جائے گی۔ اگر انھیں اپنے گانو کے متعلق اعتراض ہے تو انھیں یہ بتانا چاہیے کہ کون زیادہ رقم دے سکتا ہے۔ اُس کے بعد وہ آپس میں بحث کرنے لگتے تھے...... دوسرے علاقے میں تشخیص ہونے والی رقم کے معاملے میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی سختی برتنا ہمارا مقصد بھی نہیں تھا۔ معقول اسباب کی بنا پر ہم اُس میں تخفیف کرنے کو بھی تیار رہا کرتے تھے۔ لیکن یکمشت مطالبے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے حالات کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو جائیں اور آپس میں ایسا سمجھوتا کر لیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

یہ طریقہ جس کی وضاحت خود رابرٹ برڈ نے کی تھی کسی طرح مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ بمبئی کے اُس طریقے سے بہت بہتر تھا جس میں بقول گولڈ فنچ ہر کسان سے کہا جاتا تھا کہ وہ حکومت کی مقرر کی ہوئی مال گزاری ادا کرے یا کھیت سے دست بردار ہو جائے۔

جب اُس سے پوچھا گیا کہ اُس کی تشخیص کردہ مال گزاری کا زمین کی پیداوار سے کیا تناسب تھا تو رابرٹ برڈ نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ پیداوار کے دسویں حصے سے زیادہ نہیں تھا"[1] اس کے بعد اُس نے مزید کہا،

"مدراس اور دوسرے مقامات کے متعلق یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اصل غلطی یہ کی گئی کہ ابتدا میں مال گزاری کی شرح بہت اونچی رکھی گئی جس کی وجہ سے لوگ تباہ ہو گئے۔"[2]

رابرٹ برڈ کے بندوبست کا تفصیلی ذکر دوسری کتاب میں کیا گیا ہے یعنی "ہندوستان وکٹوریہ کے عہد میں"۔ شمالی ہندوستان کی مال گزاری کی داستان کو مکمل کرنے کے لیے ہم موجودہ باب میں صرف چند لفظوں کا اضافہ کریں گے۔

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ۔ پیداوار کا دسواں حصہ منو کے ہندو دھرم شاستر اور مسلمانوں کے قانون ہدایہ سے مطابقت رکھتا ہے اور اُن مقامات پر جہاں بندوبست استمراری نہیں ہوا ہے حکومت کا مطالبہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہونا چاہیے۔ مدراس اور بمبئی میں اب بھی مال گزاری بہت زیادہ ہے جس سے کسان تباہ ہو رہے ہیں۔ مدراس میں مجموعی پیداوار کی 12 سے 31 فی صدی تک مالگزاری وصول کی جاتی ہے جس کا ذکر بورڈ آف ریونیو کے بیان میں درج ہے جو 1880ء کے قیمین کمیشن کو پیش کیا گیا (ضمیمہ 3، صفحہ 394) اور 1901ء کی قیمین کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بمبئی کے کچھ حصوں میں 20 فیصدی ہے

جب رابرٹ مرٹنس برڈ ہندوستان سے روانہ ہوا تھا تو اس کے قریب الختم کام کی نگرانی ایک باصلاحیت جانشین کے سپرد کی گئی۔ جیمس تھامسن (JAMES THOMASON) 1843ء سے 1853ء تک شمالی مغربی صوبجات کا لیفٹیننٹ گورنر رہ چکا تھا۔ اُس سے زیادہ نرم دل انگریز ہندوستان نے نہیں دیکھا ہے۔ اُس نے 1844ء میں "بندوبست کے حکام کو ہدایتیں"، کے نام سے ہندوستان میں بندوبست کا پہلا مکمل ضابطہ تیار کیا۔ پانچ سال بعد ان ہدایتوں کو "کلکٹروں کو ہدایتیں" کے ساتھ شائع کردیا گیا اور اُس کو "حکام مال کو ہدایتیں"، کا نام دیا گیا۔ مدتوں یہ کتاب سرکاری حوالوں کی معیاری کتاب سمجھی جاتی رہی۔ اِن ہدایتوں کے دیباچے میں شمالی ہندوستان کے نظام آراضی کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں۔

"اول — علاقے کے ایسے حصے جو آباد ہیں ٹکڑوں میں بانٹ دیے گئے ہیں جن کے حدود معین ہیں اور جنھیں محال کہا جاتا ہے۔ ہر محال پر بیس یا تیس سال کے لیے ایک رقم تشخیص کی جاتی ہے۔ اُس رقم کا حساب لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زمین کی خالص آمدنی کے علاوہ معقول منافع بھی بچ سکے۔ اُس رقم کی بروقت ادائگی کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین ہمیشہ کے لیے حکومت کے پاس رکھی ہوئی ہے۔"

"دوم — اس امر کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ فاضل منافع حاصل کرنے کا حق دار کون شخص یا اشخاص ہیں۔ جس کے موافق فیصلہ ہوتا ہے اُسے موروثی اور قابل انتقال حق حاصل ہوتا ہے اور وہ زمین کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اُس شخص سے معاہدہ کیا جاتا ہے کہ محال پر حکومت نے جو رقم تشخیص کی وہ سال بہ سال کرتا رہے۔"

"سوم — محال پر حکومت جو رقم تشخیص کرتی ہے اُس کی ادائگی کی ذمہ داری انفرادی اور مشترک طور سے محال کے سب مالکوں پر جاتی ہے جو اپنی ذات اور املاک کی حد تک اُس کے ذمہ دار ہوتے ہیں[1]۔"

لارڈ ولیم بین ٹنک نے شمالی ہندوستان میں جو کام شروع کیا تھا اُس کو مکمل کرنے کے لیے تھامسن دس سال تک محنت کرتا رہا۔ اگر بین ٹنک کو مٹکاف، ٹریویلین اور میکالے جیسے ممتاز نمایاں رفیق رفیق کار نصیب ہوئے تو تھامسن کے تحت بھی جان لارنس (JOHN LOWENCE)، رابرٹ منٹگمری

SELECTION OF PAPERS RELATING TO REVENCE SURVEY AND ASSESSMENT-1 IN THE NORTH — WESTERN-PROVICES, 1853، 5،4 صفحات

(ROBERT MONTGOMERY) اور ولیم میور (WILLIAM MUIR) جیسے نمایاں حکام نے تربیت پائی۔ لوگوں کے مفاد میں کام کرنے کے جن عزائم نے لارڈ ولیم بین ٹنک میں جوش پیدا کر دیا تھا اُنہوں نے اُن لوگوں کو بھی متاثر کیا تھا اور اُن میں عمل کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ یہ خواہش بدقسمتی سے اُنیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اُتنی نمایاں نہیں رہی تھی۔ انگلستان میں تھامسن کے دس سالہ کام کو سراہا گیا اور 27 ستمبر 1853ء کو ملکہ معظمہ کے ارشاد کی تعمیل میں اُس حکم پر دستخط کیے گئے جس کی رو سے شمالی ہندوستان کے اُس باصلاحیت حاکم کو مدراس کے گورنر کے اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا۔ لیکن اُس کی خدمات کے اعتراف میں تاخیر ہوگئی۔ اُسی دن یعنی 27 ستمبر 1853ء کو جیمس تھامسن کا انتقال اُس ملک میں ہو گیا جس کے لوگوں کی خدمت میں اُس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ گزارا تھا۔

ولیم بین ٹنک نے سرکاری مطالبے میں تخفیف کر کے جس دانش مندی کا ثبوت دیا تھا وہ دو سال بعد ظاہر ہوگئی۔ اس نے سرکاری مطالبہ لگان کا دو تہائی کر دیا تھا لیکن یہ بھی عملاً سخت اور ناقابل عمل ثابت ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں 1855ء کے سہارن پور کے مشہور قواعد کی رو سے اس کو لگان کا نصف کر دیا گیا۔

کسی کی اِملاک کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پچھلے زمانے کے مقابلے میں اب اوسط خالص اَملاک کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کی وجہ سے شرح تشخیص میں ضرورت سے زیادہ اضافہ ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ دو تہائی یا 66 فیصدی حقیقی اوسط املاک کا ایک بڑا حصہ ہے اور زیادہ مدت تک مالکان یا مشترکہ ملکیت رکھنے والے اس کو ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ حکام بندوبست کی ہدایتوں کے پیراگراف نمبر 52 میں جو قاعدہ دیا ہوا ہے اسکو اسطرح ترمیم کرے کہ حکومت کا مطالبہ اوسط خالص اَملاک کا پچاس فی صدی ہو جائے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر زمین داری کی جمع بندی خالص اوسط اَملاک کی نصف مقرر کی جاتی ہے۔ لیکن من جملہ دیگر اُمور املاک پر غور کرتے وقت کلکٹر اس بات کو دھیان میں رکھے گا کہ دو تہائی کے بجائے، جیسا کہ ابھی تک طریقہ رہا تھا، سرکاری مطالبہ مسلمہ خالص املاک کا نصف ہونا چاہیے۔ کلکٹر کو اُن خطرات پر نظر رکھنا چاہیے جن کا ذکر محولہ بالا کی کتاب کے پیراگراف 47 تا 51 میں کیا گیا ہے اور زیر بندوبست زمین داریوں کی اوسط خالص املاک کے متعلق قطعی اور حتمی معلومات حاصل کرنے کی سعی لاحاصل میں اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔[5]"

حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

چنانچہ آدھی صدی کی مسلسل غلطیوں کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ سرکاری مطالبہ لگان کا نصف ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے جن علاقوں میں بندوبست استمراری نہیں ہوا ہے وہاں اس اُصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ سر چارلس وڈ کے 1864ء کے مراسلے کی رو سے مدراس اور بمبئی میں زمین کا محصول مناسب لگان کا نصف مقرر کیا گیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں 1855ء کے سہارن پور کے قواعد کی رو سے سرکاری مطالبہ لگان کا نصف مقرر کیا گیا ہے۔ اگر اس اُصول پر سختی اور دیانت داری سے عمل کیا گیا تو ہندوستان کی حکومت کو زیادہ مفید اور بہتر بنانے میں اس سے مدد ملے گی۔

جس حکومت کی مالی پالیسی مال گزاری وصول کرنے والے کلکٹروں کی مرضی کے مطابق بنائی جاتی ہے اور اُس میں عام لوگوں کی آواز شامل نہیں ہوتی ہے، ہاں عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ واضح قاعدوں میں بھی کھینچ تان کی جاتی ہے، ان کو غلط معنی پہنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ بمبئی اور مدراس میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر دوسرے مقامات پر کیا جا چکا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جو کچھ کیا گیا وہ انتہائی افسوس ناک تھا۔ لارڈ کیننگ نے 1862ء میں سفارش کی تھی کہ پورے ہندوستان میں بندوبست استمراری رائج کر دیا جائے۔ اس کی حمایت لارڈ لارنس، سر چارلس وڈ اور سر اسٹیفورڈ نارتھ کورٹ نے کی لیکن 1883ء میں اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔ عام طور سے سہارن پور کے قواعد پر بھی عمل کیا جاتا تھا حالانکہ اُن کی پابندی کلکٹروں کے لیے لازمی تھی۔ سہارن پور کے قاعدوں کے مفہوم میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہے۔ مندرجہ بالا قاعدے کی رو سے حکومت کا مطالبہ[1] اوسط خالص اَملاک“ کا نصف مقرر کیا گیا ہے جو ”حقیقی اوسط املاک“ ہونا چاہیے۔ لیکن بعد میں ہونے والے بندوبستوں میں حکومت نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ حکومت کا مطالبہ زمینداریوں کے ”آئندہ اور امکانی“ لگان کا نصف ہونا چاہیے۔ اگر کسی زمین داری کا لگان 1200 پاؤنڈ سالانہ ہو تو سرکاری مطالبہ 650 پاؤنڈ یا 700 پاؤنڈ ہو سکتا ہے

---

[1] 1855ء کے سہارن پور قواعد کا قاعدہ 36۔ قاری کو یاد رکھنا چاہیے کہ تعجب کی بات یہ ہے کہ شمالی ہند کی زرعی اصلاحات ہر گیارہ سال بعد عمل میں آتی ہیں۔ پہلا زرعی قانون 1822ء کا ریگولیشن نمبر 7 تھا۔ 1833ء کے ریگولیشن نمبر 9 نے سرکاری مطالبے کو کم کر کے لگان کا دو تہائی کر دیا اور اُس کے بعد آر۔ ایم۔ برڈ نے نیا بندوبست شروع کیا۔ 1844ء میں تھامسن کی حُکّام بندوبست کو ہدایتیں نافذ ہوئیں۔ 1855ء میں سہارن پور قواعد منظور کیئے گئے جن کی وجہ سے سرکاری مطالبہ لگان کا نصف ہو گیا

اور حکومت یہ کہہ سکتی ہے کہ کچھ مدت بعد لگان بڑھ کے 1300 پاؤنڈ یا 1400 پاؤنڈ ہو جائے گا۔ حالانکہ تسلیم اب بھی کیا کیا جاتا ہے کہ زمین کا محصول لگان کا نِصف ہے مگر تعلیم، ڈاک خانے وغیرہ کے لیے کئی نئے محاصل لگان پر عائد کر دیے گئے ہیں جن کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں حکومت کا حِصہ زیادہ ہو گیا ہے۔ کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ دُہرا فریب کیا جا رہا ہے۔ اُن کے کانوں میں وعدوں کا رس گھولا جا رہا ہے لیکن اُن کی توقعات کا خون کیا جا رہا ہے۔

باب — 23

مالیات اور دولت کا نکاس [1793ء–1837ء]

1833ء میں اپریل 1834ء سے بیس سال کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کی گئی۔ اس باب میں ہم اُن مالیاتی انتظامات پر غور کریں جو اس ایکٹ سے متاثر ہوئے۔

اس ایکٹ میں کہا گیا تھا کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی فوراً تمام کاروبار ختم کردے اور آئندہ اُس میں حصہ نہ لے" اور ہندوستان کے حکمران و منتظم کے فرائض سنبھالے۔ اِس قانون میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ کمپنی کے علاقہ محروسہ سے متعلق اور تمام دوسرے قرض ہندوستان کے "مذکورہ بالا علاقوں کی آمدنی سے واجب الادا سمجھے جائیں گے اور ادا کیے جائیں گے۔" یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی آمدنی میں سے کمپنی کو "۱۰ پاؤنڈ ۱۰ شلنگ سالانہ کے حساب سے اُن کے مشترکہ سرمائے پر سال بہ سال منافعہ دیا جائے گا۔" مزید فیصلہ کیا گیا تھا کہ "1874ء کے بعد پارلیمنٹ کو حق حاصل ہوگا کہ کمپنی کے مشترکہ سرمائے کے ہر ۱۰۰ پاؤنڈ کے عوض 200 پاؤنڈ ادا کر کے کمپنی کا منافعہ حاصل کرنے کا اِستحقاق اُس سے واپس لے لے۔" ایکٹ میں آخری بات یہ کہی گئی تھی کہ 1854ء کے بعد اگر کمپنی بحال و برقرار نہ رہ سکے یا پارلیمنٹ اپنے اِختیارات کی رو سے اُسے ہندوستان کے قبضے و دخل اور حکومت سے محروم کردے تو وہ ایک سال کی مدت کے اندر درخواست کرنے کی مجاز ہوگی کہ مذکورہ بالا منافع حکومت برطانیہ معاوضہ دیکر حاصل کرلے" اور اس قسم کی درخواست کرنے کے تین سال کے اندر حکومت مذکورہ بالا شرح کے مطابق معاوضہ دیکر مذکورہ بالا منافع حاصل کرنے کا انتظام کرے گی۔"

اس تصفیے کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے۔ دُنیا کے دوسرے حصّوں میں مقبوضات حاصل کرنے پر برطانوی قوم خود بھی لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرچکی تھی۔ لیکن ہندوستان میں خود ہندوستانیوں کے روپے سے سلطنت قائم کی گئی تھی، جنگیں لڑی گئی تھیں اور ملک کا اِنتظام کیا گیا تھا۔ اس پر برطانوی

قوم کا ایک پیسہ بھی نہیں خرچ ہوا تھا۔ ایک تجارتی کمپنی نے سلطنت قائم کی تھی اور دو نسلوں تک وہ اُس سلطنت کی آمدنی میں سے اپنا منافعہ حاصل کرتی رہی تھی۔ 1834ء میں جب اُس کی تجارت ختم ہوگئی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُس کے مشترکہ سرمائے کا منافعہ اُن محاصل سے حاصل ہونے والی رقم میں سے ادا کیا جائے جو ہندوستان کے لوگوں پر عاید کیے جاتے تھے۔ 1858ء میں جب کمپنی ختم ہوگئی تو اُن کا مشترکہ سرمایہ قرض لیکر ادا کیا گیا اور یہ قرض ہندوستان کے قرض میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح سلطنت کمپنی سے شاہ انگلستان کو منتقل ہوگئی لیکن اُس کی قیمت ہندوستان کے لوگوں کو ادا کرنی پڑی۔ ہندوستان کے لوگ اُس قرض کے سود کی صورت میں آج تک اُس کمپنی کے سرمائے کا منافعہ ادا کر رہے ہیں جو صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہے۔

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 1792ء سے اس سال تک جب ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی ہندوستان میں کمپنی کی سالانہ آمدنی اور خرچ قاری کے سامنے پیش کر دیا جائے[1]"

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1792-93ء			
بنگال	30 , 91 , 616	55 ,12 ,791	38 ,73 ,859
مدراس	7 ,42 , 760	24 ,76 ,312	22 ,22,878
بمبئی	79 ,025	2 ,36, 555	8 , 44 ,096
میزان	39 , 13 , 401	82, 25 ,628	69 , 40 , 833
1793-94ء			
بنگال	31 ,77 , 028	58 , 71 , 945	37 ,14 , 160
مدراس	7 , 89 , 050	21 , 10, 089	19 ,72,224
بمبئی	8 , 2 , 050	2 , 94 , 736	9 ,06,745
میزان	41 , 97 , 137	80 , 26 , 193	65 , 67 ,808

[1] 1792ء سے ہندوستان میں کمپنی کی مجموعی آمدنی وغیرہ کا حساب۔ یہ حساب ہاؤس آف کامنز کے حکم سے شائع ہوا 22 جون 1855ء۔

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1794-95ء			
بنگال	32,35,259	59,37,931	38,63,566
مدراس	8,91,640	17,75,782	18,80,332
بمبئی	7,238	3,12,480	8,23,910
میزان	41,97,137	80,26,193	65,67,808
1795-96			
بنگال	31,30,697	56,94,194	39,86,744
مدراس	9,29,200	18,94,304	21,19,196
بمبئی	64,085	2,77,596	7,83,057
میزان	41,23,982	78,66,094	68,88,997
1796-97ء			
بنگال	31,18,556	57,03,906	41,26,644
مدراس	9,00,538	19,96,328	24,49,000
بمبئی	39,724	3,15,937	9,32,324
میزان	40,58,814	80,16,171	75,08,038
1797-98			
بنگال	30,97,443	57,82,741	43,51,926
مدراس	7,32,983	19,38,950	26,65,232
بمبئی	38,872	3,38,189	9,98,169
میزان	38,69,298	80,59,880	80,15,327

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1798-99			
بنگال	30,72,743	61,53,615	41,46,954
مدراس	8,56,666	61,23,831	34,42,094
بمبئی	37,007	3,74,587	12,80,315
میزان	39,66,416	86,52,033	91,39,363
1799-1800ء			
بنگال	32,13,230	64,98,473	50,58,661
مدراس	8,83,539	28,22,536	33,19,547
بمبئی	31,364	4,15,663	15,77,182
میزان	41,28,133	97,36,672	99,55,390
1800-1ء			
بنگال	32,18,766	66,58,334	54,20,966
مدراس	9,57,799	35,40,268	46,14,387
بمبئی	45,130	2,86,457	14,32,832
میزان	42,21,695	1,04,58,059	1,14,68,185
1801-2ء			
بنگال	32,96,303	71,27,988	56,47,415
مدراس	10,95,972	47,29,609	53,47,805
بمبئی	54,571	3,05,992	14,14,825
میزان	44,46,846	1,21,63,589	1,24,10,045

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1802-3ء			
بنگال	32,95,761	83,80,087	57,98,858
مدراس	9,33,108	47,24,904	51,17,769
بمبئی	68,015	3,59,546	14,10,253
میزان	42,96,884	1,14,64,537	1,23,26,188
1803-4ء			
بنگال	32,52,621	80,60,993	61,93,638
مدراس	9,21,646	46,51,744	63,06,284
بمبئی	3,05,861	5,58,648	18,95,483
میزان	44,80,128	1,32,71,385	1,43,95,405
1804-5ء			
بنگال	32,25,436	93,36,707	74,64,291
مدراس	9,93,849	48,97,140	63,12,613
بمبئی	3,84,740	7,15,548	23,38,279
میزان	46,04,025	1,49,49,395	1,61,15,183
1805-6ء			
بنگال	33,11,673	95,42,430	89,31,958
مدراس	10,97,416	50,14,493	57,28,064
بمبئی	4,71,344	8,46,486	27,61,296
میزان	48,80,433	1,54,03,409	1,74,21,418

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1806-7ء			
بنگال	32 , 96,684	91 ,60,149	92,91,826
مدراس	9 , 63, 440	46,02,721	57,42,829
بمبئی	3 ,8 8,536	7,72,869	24,74,209
میزان	46 ,48,660	1,45,35,739	1,75,08,864
1807-8			
بنگال	37, 29,098	99 ,71 ,695	77,60,920
مدراس	10,39,671	49,27,519	57 , 17,228
بمبئی	4, 17,186	7 ,70,691	23,72,142
میزان	51 ,85, 955	1,56,69,905	1,58,50,290
1808 -9ء			
بنگال	38, 51,128	98,16,458	78 ,98,924
مدراس	10, 57,628	49,68,321	54 ,31, 151
بمبئی	4,27, 33	7.40, 276	20 .62,814
میزان	53 ,35 ,789	1,55,25,055	1,53,92,889
1809-10ء			
بنگال	37 ,06, 200	95, 90,880	78, 15, 675
مدراس	11, 84, 253	53 ,73 ,191	56,37 ,365
بمبئی	3,96, 482	6, 91 , 914	20,81,671
میزان	52 ,86,935	1,56,55,985	1,55,34,711

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاونڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1810-11ء			
بنگال	32,95,382	1,06,82,249	72,41,839
مدراس	10,71,666	52,38 , 576	51,10,977
بمبئی	4 ,37,108	7,58 , 372	15,57,165
میزان	48,04,156	1,66,79,197	1,39,09,971
1811-12ء			
بنگال	32, 96,905	1,07,06,172	70,58,871
مدراس	10,48,844	51,56,717	46,19,610
بمبئی	4,33,785	7,42,726	15,42,485
میزان	47,79,534	1,66,05,615	1,32,20,966
1812-13ء			
بنگال	33,10,874	1,03,90,257	72,22,936
مدراس	11,59,778	52,58,244	47,99,630
بمبئی	4,20,323	6,87,789	14,93,262
میزان	48,90,975	1,63,36,290	1,35,15,878
1813-14			
بنگال	33,10,617	1,11,70,471	71,35,172
مدراس	8,92,793	52,97,088	48,93,224
بمبئی	4,00,802	7,59,152	15,89,329
میزان	46,04,212	1,72,28,711	1,36,17,725

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1814–15			
بنگال	73,701,741	1,11,55,912	91,45,560
مدراس	38,89,555	53,22,164	51,34,246
بمبئی	4,48,998	8,19,204	16,75,200
میزان	1,17,49,294	1,72,97,280	1,59,55,006
1815–16			
بنگال	75,66,439	1,13,12,896	98,33,062
مدراس	36,09,668	51,06,107	52,89,476
بمبئی	4,67,777	8,18,816	19,37,430
میزان	1,16,43,884	1,72,37,819	1,70,59,968
1816–17			
بنگال	78,75,647	1,18,56,953	1,02,00,303
مدراس	38,26,107	53,60,220	52,01,399
بمبئی	4,98,102	8,60,405	19,02,460
میزان	1,21,99,856	1,80,77,578	1,73,04,162
1817–18			
بنگال	76,39,154	1,16,92,068	1,06,85,154
مدراس	38,56,433	53,81,307	54,75,254
بمبئی	8,28,047	13,02,445	18,85,786
میزان	1,23,63,634	1,83,75,820	1,80,46,194

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1818-19			
بنگال	85,48,138	1,24,37,385	1,19,25,349
مدراس	37, 99,410	53,61,432	59,79,045
بمبئی	11, 43,041	16,60,200	24,92,193
میزان	1,34,90,589	1,94,59,017	2,03,96,587
1819-20			
بنگال	81,63,919	1,22,45,526	1,15,98,419
مدراس	37,91,931	54,07,004	56,94,844
بمبئی	10,78,164	15,77,932	23,95,844
	1,30,34,014	1,92,30,462	196,89,104
1820-21ء			
بنگال	81,39,415	1,35,47,423	1,12,87,397
مدراس	37,38,460	54,03,506	55,72,489
بمبئی	18,18,314	24,01,312	31,97,366
میزان	1,36,96,189	2,13,52,241	2,00,57,257
1821-22ء			
بنگال	82,58,903	1,33,90,339	1,08,41,003
مدراس	37,08,404	55,57,029	54,04,592
بمبئی	17,61,990	18,55,740	36,09,894
میزان	1,37,29,297	2,18,03,108	1,98,45,489

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1822-23			
بنگال	82,61,843	1,43,12,044	1,07,46,301
مدراس	37,69,369	55,85,210	50,72,992
بمبئی	15,51,592	32,74,447	42,64,448
میـــزان	1,35,82,804	1,31,71,701	2,00,83,741
1823-24			
بنگال	82,11,251	1,29,92,069	1,13,97,024
مدراس	37,41,100	54,98,765	62,28,823
بمبئی	16,07,088	27,89,550	32,28,150
	1,35,59,439	2,12,80,384	2,08,53,997
1824-25ء			
بنگال	80,81,462	1,35,24,223	1,35,09,910
مدراس	37,65,212	54,40,743	57,14,848
بمبئی	12,08,735	17,58,217	32,79,389
میـــزان	1,30,55,409	2,07,50,183	2,25,04,156
1825-26ء			
بنگال	81,33,625	1,31,51,080	1,44,56,164
مدراس	39,78,682	57,14,915	57,04,829
بمبئی	16,27,237	22,62,393	40,07,020
میـــزان	1,37,39,544	2,11,28,388	2,41,68,013

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1826-27ء			
بنگال	83,55,800	1,48,12,833	1,39,04,322
مدراس	36,69,312	59,81,681	54,32,562
بمبئی	18,73,427	25,88,983	29,75,411
میزان	1,38,98,539	2,33,83,497	2,23,12,295
1827-28ء			
بنگال	83,31,604	1,49,73,110	1,40,12,763
مدراس	36,05,226	53,47,828	60,07,597
بمبئی	18,17,873	25,42,325	50,33,477
میزان	1,37,54,703	2,28,63,263	2,40,53,837
1828-29ء			
بنگال	82,00,779	1,48,33,840	1,25,63,550
مدراس	36,49,012	55,75,049	55,02,224
بمبئی	17,22,335	33,31,802	36,52,786
میزان	1,35,72,126	2,27,40,691	2,17,18,560
1829-30ء			
بنگال	81,97,563	1,38,58,178	1,17,10,870
مدراس	25,22,100	54,15,587	52,56,647
بمبئی	15,85,432	34,21,423	36,00,841
میزان	1,33,05,095	2,16,95,208	2,05,68,358

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1830-31ء			
بنگال	82,28,161	1,41,19,914	1,15,32,398
مدراس	34,60,329	53,58,260	51,07,020
بمبئی	16,50,061	25,41,136	35,94,472
میزان	1,33,38,551	2,20,19,310	2,02,33,890
1831-32			
بنگال	69,41,324	1,17,48,757	1,34,64,520
مدراس	32,52,117	44,72,137	61,67,574
بمبئی	13,95,891	20,96,343	14,16,079
میزان	1,15,90,332	1,83,17,237	1,70,48,173
1832-33			
بنگال	70,99,249	1,22,44,523	1,05,39,527
مدراس	29,40,703	41,08,061	43,12,452
بمبئی	14,41,986	21,25,340	26,62,741
میزان	1,14,81,938	1,84,77,924	1,75,14,720
1833-34ء			
بنگال	66,37,961	1,16,16,954	98,81,927
مدراس	31,76,708	43,58,207	43,82,368
بمبئی	16,29,580	22,92,207	26,60,037
میزان	1,14,44,249	1,82,67,368	1,69,24,332

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1834—35ء			
بنگال	22,34,336	1,52,90,414	84,70,472
شمال مغربی صوبجات	40,18,344	48,99,374	14,94,047
مدراس	32,56,855	44,80,025	41,28,753
بمبئی	15,44,183	21,86,934	25,91,244
میزان	1,20,53,718	2,68,56,647	1,66,84,496
1835—36			
بنگال	33,04,294	82,86,287	79.42,501
شمال مغربی صوبجات	42,17,981	48,38,133	16,40,478
مدراس	32,97,602	45,99,261	38,39,758
بمبئی	17,19,895	24,24,444	25,72,067
میزان	1,25,39,772	2,01,48,125	1,89,94,804
1836—37ء			
بنگال (مع اکسائیز)	35,75,059	86,18,470	84,55,287
شمال مغربی صوبجات	44,78,417	50,56,489	17,35,419
مدراس	31,61,490	46,18,309	41,72,784
بمبئی	18,42,759	27,05,862	29,99,878
میزان	1,30,57,725	2,09,99,130	1,73,63,368

	مال گزاری پاؤنڈ	مجموعی آمدنی پاؤنڈ	مجموعی خرچ پاؤنڈ
1837-38ء			
بنگال (مع اکسائز)	36, 15 ,975	90 ,81 ,014	85,36 .423
شمال مغربی صوبجات	37 ,65 , 973	43 ,69 ,351	18,07,209
مدراس	34 ,31 , 270	48 ,19 ,890	42,95 ,036
بمبئی	18 ,58,525	25,88,565	29,14,857
میزان	1,26 ,71 ,743	2,08,58 ,820	1,75, 53,525

اگر ہم ان خشک اعداد وشمار میں نصف صدی کی سیاسی تاریخ کی جھلکیاں دیکھ سکیں تو ان کے مفہوم اور اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی کی ہر تبدیلی نے اور جنگ یا امن اور اخراجات میں کمی کی پالیسی کے ہر رجحان نے ہندوستان کی مالیات پر اپنا اثر چھوڑا ہے مدرجہ بالا اعداد وشمار ہندوستان کی اُن انتظامی اِصلاحات کے خاموش شاہد ہیں جو کارنوالس اور بارلو کے زمانے سے بین ٹنگ اور میٹکاف کے زمانے تک رائج کی گئیں۔

1793ء میں ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت لارڈ کارنوالس نے میزانیہ میں توازن پیدا کردیا تھا اور اخراجات کو گھٹا کر سات ملین سے کم کردیا تھا جس کی وجہ سے ڈیڑھ ملین کی بچت ہونے لگی تھی۔ لیکن بارہ سال کے اندر لارڈ ویلزلی کی جنگ جویانہ پالیسی نے اخراجات کو بڑھا کر پندرہ ملین کردیا جسکی وجہ سے دو ملین سے زیادہ خسارہ ہوا۔ اس نے ڈائرکٹروں کو ناراض کردیا۔ ایک تجارتی ادارے کے وہ قابل احترام سربراہ اس وقت تک جنگ یا امن کے متعلق زیادہ پرواہ نہیں کیا کرتے تھے جب تک اُن کا منافعہ محفوظ رہا کرتا تھا۔ اُن کی نظر میں نظم ونسق کا پیمانہ وہ رقم تھی جو اُن کو ملتی تھی۔ جب بچت کے

بجائے خسارہ ہونے لگتا تھا تو وہ اُس کو کسی حال میں معاف نہیں کیا کرتے تھے ۔ چونکہ ویلزلی کی جنگوں پر بہت روپیہ خرچ ہوا تھا اس لیے انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ذلت کے ساتھ گورنر جنرل کو ہندوستان سے واپس بلا لیا۔

1795ء سے 1810ء کی پندرہ سالہ مدت میں بنگال میں بچت ہوتی رہی لیکن مدراس اور بمبئی میں خسارہ ہوا۔ ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بنگال کے بندوبست استمراری کی وجہ سے زمین سے برابر آمدنی ہوتی رہی ، یہ ایسی آمدنی تھی جس میں کمی بیشی کا خطرہ نہیں تھا اور اس آمدنی کی بنا پر برطانوی قوم ہندوستان میں سلطنت قائم کر سکی ۔ شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگوں کے اور وہاں علاقے حاصل کرنے کے اخراجات بنگال نے ادا کیے ۔ اس زمانے میں مدراس اور بمبئی تو نظم و نسق پر ہونے والے مصارف بھی پوری طرح ادا نہیں کر سکتے تھے ۔ انگلستان کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑا تھا۔

لارڈ ویلزلی کے رخصت ہونے کے بعد میزانیہ میں ایک دفعہ پھر توازن پیدا ہو گیا۔ 1810ء اور 1814ء کی درمیانی مدت میں ہندوستان کے پر امن حالات کی بنا پر ہندوستان کے اخراجات میں کمی ہو گئی اور وہ گھٹ کر تقریباً 13 ملین ہو گئے جس کی وجہ سے دو سے چار ملین تک کی سالانہ بچت ہونے لگی ۔ اس نے ڈائریکٹروں کو خوش کر دیا۔ لیکن لارڈ ہسٹنگز کی جنگ جویانہ پالیسی نے پھر بچت کو خسارہ میں تبدیل کر دیا۔ 1818ء میں ایک دفعہ پھر خسارہ ہوا جب مرہٹوں کے ساتھ لڑی جانے والی آخری جنگ ختم ہوئی ۔ لیکن لارڈ ہسٹنگز نے 1822ء میں دو ملین کی بچت دکھا کر ڈائریکٹروں کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا۔ بمبئی اب بھی اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا تھا پیشوا کے علاقے پر قبضہ کرنے کے پانچ سال بعد بھی وہاں ایک ملین کا خسارہ تھا۔ لیکن بنگال میں تین ملین کی بچت ہوئی۔ اس لیئے ہم بجا طور سے کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ ویلزلی کی فتوحات کی طرح لارڈ ہسٹنگز کی فتوحات کے لیے بھی تمام وسائل اُس بنگال نے مہیا کیے جہاں بندوبست اِستمراری ہو چکا تھا۔

برما کے ساتھ لارڈ ایمہرسٹ کی جنگ نے ایک دفعہ پھر میزانیہ کو غیر متوازن بنا دیا اور 1824ء سے 1827ء تک برابر خسارہ ہوتا رہا سلطنت کی توسیع اور زمین کے محصول کے سلسلے میں برتی جانے والی سختی کی بنا پر ہندوستان کی آمدنی اب بڑھ کے 22 ملین ہو گئی تھی ۔ لیکن اس دوران اخراجات بڑھ کے 23 یا 24 ملین ہو گئے تھے۔

اُس کے بعد لارڈ ولیم بین ٹنک کی امن ، اخراجات میں کمی اور آصلاحات کی پالیسی کے نمایاں

نتیجے سامنے آئے۔ مالیات میں اصلاح کرنے والے کی حیثیت سے بھی لارڈ ولیم بین ٹنک ہندوستان آنے والے برطانوی حکام میں منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ ہندوستان کی حد تک مالیاتی اصلاح کے معنی یہ نہیں کہ آپ نئے نئے محاصل عائد کریں جن کی گنجائش نہیں ہے۔ اُس کے معنی صرف اتنے ہیں کہ آپ اخراجات میں کمی کریں۔ زمین کے بہت زیادہ محصول میں ہر جگہ کمی کی گئی اور چھ سال (1825ء - 1831ء) میں وہ 13 ملین کے بجائے $11\frac{1}{2}$ ملین رہ گیا۔ لیکن اخراجات میں تخفیف کر کے اس کمی کو پورا کر دیا گیا۔ جب 1828ء میں لارڈ ولیم بین ٹنک ہندوستان آیا تھا اُس وقت مجموعی اخراجات 24 ملین تھے اور ایک ملین کا خسارہ ہوا کرتا تھا۔ 1835ء میں جب وہ ہندوستان سے رُخصت ہوا تو مجموعی اخراجات 16 ملین تھے اور چار ملین کی بچت تھی۔

اگر اُس کی طرح کے حکام اُس کے بعد آتے رہتے تو اُس کو ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھا جاتا مگر ہندوستان میں اخراجات میں تخفیف ملک کے حقوق یافتہ طبقوں کو متاثر کرتی ہے جس کی وجہ سے چیخ پکار ہوتی ہے۔ لارڈ ولیم بین ٹنک کو جتنا برا بھلا کہا گیا شاید ہی کمپنی کے کسی دوسرے گورنر جنرل کو کہا گیا ہو۔ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ ایک انگریز حاکم ہندوستان کے لوگوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر اپنے ہم وطنوں کو ناراض کرے اور موجودہ نظام حکومت میں اخراجات میں اضافہ کرنے پر برابر زور دیا جاتا ہے اخراجات میں تخفیف کی کوئی حمایت نہیں کرتا ہے۔ لارڈ ولیم بین ٹنک کے دور حکومت کے بعد سے اخراجات اور سرکاری قرض میں انتہائی اضافہ ہو چکا ہے۔ اس روز افزوں خرابی کے تدارک کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ عام لوگوں کو، جو لازمی طور سے اخراجات میں تخفیف کے حامی ہیں ملک کے نظم و نسق میں کچھ حصہ لینے دیجئے۔ تمام دنیا میں اسی اصول کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ہندوستان پر بھی یہ صادق آتا ہے۔

اس سے پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگوں کے اور یہاں کے نظم و نسق کے کل اخراجات کی ادائیگی ہندوستان کے وسائل سے کی گئی۔ اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ تمام اخراجات پورے کرنے کے بعد بھی اُن چوالیس برسوں میں جو ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے ساتھ ختم ہوئے ہندوستان میں برابر خاصی بچت ہوتی رہی۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ سال تک اگر خسارہ ہوتا رہا تو بتیس برسوں میں بچت بھی ہوئی۔ خسارہ کی مجموعی رقم اگر تقریباً 17 ملین تھی تو بچت کی مجموعی رقم تقریباً 49 ملین تھی۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ 46 سال میں ہندوستان کی حکومت کو 32 ملین کی بچت ہوئی۔ لیکن اس

بجت سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نہ یہ رقم آب رسانی کے ذرائع تعمیر کرنے پر خرچ کی گئی نہ دوسرے ترقیاتی منصوبوں پر۔ یہ رقم خراج کے طور پر انگلستان بھیجی جاتی رہی تاکہ کمپنی کے حصہ داروں کو منافع دیا جاسکے۔ چونکہ ہندوستان سے جانے والی دولت منافعہ تقسیم کرنے کے لیے ناکافی تھی اس لیے وہ قرض بڑھتا رہا جس کو ہندوستان کا سرکاری قرض کہا جاتا تھا اور جس کا سود ادا کرنے کا بار محصول دہندگان کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستان کی افسوس ناک مالیاتی تاریخ کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہی ہے۔

1792ء میں ہندوستان کا قرض جس پر سود ادا کرنا پڑتا تھا سات ملین سے کچھ زیادہ تھا۔ 1799ء میں یہ قرض بڑھ کے 10 ملین ہوگیا۔ لارڈ ویلزلی کی جنگوں کے نتیجے میں 1805ء میں یہ قرض تقریباً 21 ملین ہو چکا تھا اور 1807ء تک بڑھ کے 27 ملین ہوگیا۔ کئی سال تک اس میں اضافہ نہیں ہوا مگر 1829ء میں یہ 30 ملین ہوگیا۔ لارڈ ولیم بین ٹنک کی خوش انتظامی نے رفتہ رفتہ قرض کم کر دیا اور 30 اپریل 1836ء کو اس کی مجموعی رقم 27 ملین تھی[1]

اگر دو قوموں میں برابر کا معاہدہ ہوتا تو ہندوستان کو اپنے نظم و نسق کے اخراجات برداشت کرنے چاہیئے تھے اور انگلستان کو ایک ایسی سلطنت قائم کرنے کے لیے کمپنی کو معاوضہ دینا چاہیئے تھا جو اس کی تجارت اور طاقت کے لیے مفید تھی اور ان لوگوں کے لیے فائدہ مند جو مشرق میں روزگار تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اگر ہندوستان کی برطانوی سلطنت دونوں قوموں کے لیے مفید تھی تو دونوں کو اس کے اخراجات برداشت کرنے چاہیئے تھے۔ ہندوستان ملک کے نظم و نسق کے مصارف برداشت کرتا اور انگلستان وہ اخراجات برداشت کرتا ہندوستان کے لیے انگلستان میں کیے جاتے تھے اور گھریلو اخراجات کہلاتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں انگریزی راج کی ابتدا سے مختلف طریقہ عمل اختیار کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے مسلسل دولت کا نکاس ہوتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا حجم بڑھتا رہا اور اُس نے ایک جفاکش، پرامن اور خوش حال قوم کو تباہ کر دیا۔ اُس ابتدائی زمانہ میں جس کا ذکر اس باب میں کیا جارہا ہے یہ نتائج ذی فہم انگریزوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھے۔

1۔ درحقیقت یہ رقم 2,69,47,000 پاؤنڈ تھی۔ ANUAL ACCOUNT OF THE TERRITORIAL REUENNES AND DISHURSEMENTS OF THE EAST INDIA COMPANY, جو ہاؤس آف کامنز کے حکم سے شائع ہوئی، 12 اگست 1842ء۔

1838ء میں منٹگمری مارٹن نے لکھا تھا" برطانوی ہند سے ہونے والا 30,00,000 پاؤنڈ کا سالانہ نکاس 12 فی صدی (جو ہندوستان میں عام شرح سمجھی جاتی ہے) سود در سود کے حساب سے بارہ سال میں 917، 97، 39، 72 پاؤنڈ کی بڑی رقم بن جاتا ہے۔ اگر انگلستان سے مسلسل اور مجموعی اعتبار سے اتنی دولت کا نکاس ہو تو وہ بھی جلد تباہ و برباد ہو جائے۔ سوچیے کہ ہندوستان پر اس کا کتنا شدید اثر پڑتا ہوگا جہاں ایک مزدور کی روزانہ اُجرت دو یا تین پینس ہوتی ہے۔"

"پچھلے پچاس سال سے ہم ہندوستان سے دو، تین اور کبھی کبھی چار ملین پاؤنڈ سالانہ حاصل کرتے رہے ہیں جو انگلستان بھیجے جاتے ہیں تاکہ اُس سے تجارتی خسارہ پورا کیا جاسکے۔ قرضوں کا سود ادا کیا جاسکے، انگلستان میں رہنے والے عملے کے اخراجات پورے کیے جاسکیں اور انگلستان میں ان لوگوں کی جمع کی ہوئی پونجی کو کاروبار میں لگایا جاسکے جنہوں نے اپنی زندگیاں ہندوستان میں گزار دی ہیں۔ میرے خیال میں کوئی ایسی تدبیر نہیں جو ہندوستان جیسے دور دراز ملک سے تین یا چار ملین پاؤنڈ کے سالانہ نکاس کے مضر اثرات کو دور کر دے جو اُسے کسی صورت میں اور کبھی واپس نہیں ملتے ہیں[1]۔"

دولت کے سالانہ نکاس کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اُن کے اقتباسات پیش کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب چاہیئے۔ ہندوستان کے لوگوں کو تمام اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھ کر اس میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ہم صرف چار نمایاں حکام کے خیالات پیش کریں گے جو ہندوستان کے چار بڑے صوبوں میں کام کر چکے تھے یعنی بنگال اور مدراس، شمالی ہندوستان اور بمبئی۔

اُنیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بنگال کے بہترین حاکموں میں سے عزت مآب جان شور بھی تھا جس کا نام تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے ہندوستان کے متعلق اپنی فکر انگیز کتاب میں اپنے مشاہدات کا نتیجہ وضاحت کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

"سترہ سال سے زیادہ مدت گزری جب میں ہندوستان آیا تھا۔ جس وقت میں یہاں آیا تھا اور کلکتے کے ایک سال کے دوران قیام میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس زمانے میں جو انگریز یہاں آباد تھے اُن کو یقین تھا کہ ہندوستان پر انگریزی راج قائم کر کے دیسی لوگوں پر احسان کیا گیا ہے اور یہ راج اُن کے لیے نعمت عظمیٰ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اُن دیسی حکومتوں پر ہمیں فوقیت حاصل ہے جن کی جگہ ہم نے لی ہے، وہ عدالتی نظام بہت نفیس ہے جس کو ہم نے رواج دیا ہے، ہم اعتدال پسند ہیں، ہم لوگوں کے

1۔ منٹگمری مارٹن، EASTERN INDIA، لندن، 1838ء جلد دوم اور جلد سوم کے دیباچے۔

بہی خواہ ہیں غرض کہ ہماری اچھائیوں کے گن گائے جاتے تھے اور انھیں مسلمہ حقیقت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا جس کے خلاف کچھ کہنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی وہ لوگ جو ملک کے اندرونی حصوں میں عمریں بتا چکے تھے دبی زبان سے اس کی مخالفت بھی کرتے تھے لیکن مخالفت کرنے والے بدقسمت شخص کے خلاف جو مفروضہ حقیقت کے متعلق شکوک و شبہات کا اظہار کیا کرتا تھا ایسا طوفان کھڑا کر دیا جاتا تھا کہ جری سے جری شخص بھی خائف ہو جایا کرتا تھا۔

"اس نے مجھے رفتہ رفتہ برطانوی ہند کے نظم و نسق کے اصولوں اور کاموں کے متعلق تحقیقات کرنے پر آمادہ کر دیا۔ جب میں نے یہ تحقیقات شروع کی تو مجھے آسانی سے حکومت کی طرف اور خود ہماری طرف لوگوں کے جذبات کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اگر دقت ہوتی تو مجھے تعجب ہوتا۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہندوستانی قوم کو ہر حال میں اپنے مفادات کے تابع رکھنا چاہیئے۔ اُن پر بہت بھاری محاصل لگائے گئے، جو صوبہ ہمارے قبضے میں آتا گیا اسے زیادہ سے زیادہ وصول یابی کا میدان بناتے گئے اور ہم نے اس پر ہمیشہ فخر کیا کہ دیسی حکمراں جتنی مال گزاری وصول کرتے تھے اس سے زیادہ ہم وصول کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو ہر اُس وقار، منصب اور عہدے سے محروم رکھا گیا جس کو قبول کرنے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی حیثیت کے کسی انگریز کو آمادہ کیا جا سکا۔"[1]

جان سولیون (JOHN SULLIVON) 1804ء میں ہندوستان آیا اور 1841ء میں ریٹائر ہوا اُس نے میسور کے ریزیڈنٹ، کیمبٹور کے کلکٹر، مدراس کے بورڈ کے ممبر اور مدراس کی کاؤنسل کے ممبر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1833ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے موقعہ پر اُس کی شہادت لی گئی تھی اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں ہندوستان کے لوگوں کو ملک کے اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھنے کا ذکر کیا۔

"503۔ برطانوی حکومت میں دیسی لوگوں کو کس قسم کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

"انہیں تمام ایسے عہدوں سے محروم رکھا جاتا ہے جن پر کام کرنے کے لیے ان پر اعتماد کرنا ضروری ہو اور انھیں اچھی تنخواہیں دینی پڑیں اور ملک میں اُنھیں وہ سول اور فوجی اہمیت نہیں دی جاتی ہے جو خود اُن کے حکمرانوں کے زمانے میں اُنہیں حاصل تھی۔"

"509۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دیسی حکومتوں کے زمانے میں جو منصب اُن کو حاصل تھے اور جن سے وہ اب محروم ہو گئے ہیں اُن کی کمی برطانوی حکومت کے اُس نظام نے بڑی حد تک پوری کر دی

1۔ عزت مآب ایف۔ جے۔ شور NOTES ON IDIAN AFFAIRS، لندن 1837ء، جلد دوم، صفحہ 516۔

ہے جس کے تحت دیسی لوگ مدتوں سے چین کی زندگی گزار رہے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ اس کمی کو کسی طرح پورا نہیں کیا جا سکتا ہے[1]۔"

بیس سال بعد 1853ء میں جب کمیٹی کے چارٹر کی تجدید زیر غور تھی اُس وقت اس گواہ کا بیان پھر لیا گیا۔ اُس نے زیادہ زوردار الفاظ میں شہادت دی۔

"4866۔ کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ اُن میں (ہندوستان کے لوگوں میں) اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں کہ موجودہ زمانے کے مقابلے میں قدیم دیسی حکمرانوں کی حکومت میں لوگوں کی معاشی حالت بہتر تھی؟۔

"میرے خیال میں خود تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ جہاں تک ہمیں تاریخ سے معلوم ہو سکا ہے وہ لوگ قدیم زمانے میں بہت خوش حال تھے۔"

"4869۔ اس بات کے پیش نظر کہ ہمارے مقابلے میں وہ لوگ جنگوں میں بہت دولت بھی برباد کرتے تھے اور انسانی جانیں بھی ضائع ہوتی تھیں آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کی معاشی حالت بہتر تھی اور وہ لوگ نہروں، تالابوں اور آب رسانی کے دوسرے ذرائع پر روپیہ خرچ کیا کرتے تھے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اُن کی زیادہ تر جنگیں سرحد پار لڑی جانے کے بجائے خود اُن کے ملک کے اندر ہوا کرتی تھیں؟

"ہماری حکومت میں ایک ایسا عنصر بھی شامل ہے جس پر بہت خرچ ہوتا ہے یعنی سول اور فوجی یورپین حکام جن پر ملک کی آمدنی کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے نظم و نسق پر زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں بڑی وجہ یہ ہے۔"

جب جان سلیون سے پوچھا گیا کہ سلطنت کا فوجی انتظام اگر انگریزوں کے ہاتھوں میں رہے تو کیا وہ برطانوی علاقہ دیسی حکمرانوں کو واپس کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا تو اس نے اپنی رائے کے منطقی نتیجے کو ظاہر کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

"4890۔ کیا آپ از روئے انصاف زیادہ تر علاقہ دیسی حکمرانوں کو واپس کرنے کے لیے تیار ہیں؟

جی ــــــ !

"جی ہاں ــــــ !"

1۔ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت، 1832ء، جلد اول، صفحات 65 اور 66۔

"ہمیں اُس علاقے پر قبضہ کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ ہم نے اُس پر تشدد یا دوسرے ذرائع سے قبضہ کیا ہے۔

"میں انصاف کی رو سے اور معاشی اُصولوں کی بنا پر اُس کو واپس کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔"[1]

شمالی ہندوستان کے بندوبست کے سلسلے میں ہولٹ میکنزی کی نمایاں خدمات کا ذکر موجودہ کتاب کے گیارھویں باب میں کیا جا چکا ہے۔ اُس نے 1830ء میں ہندوستان کے مالیاتی اور عدالتی نظام کے متعلق اپنی روداد میں مندرجہ ذیل باتیں لکھی تھیں۔ اُس کی روداد میں 1833ء میں ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں شامل کر لی گئی تھی۔

"تعجب تو یہ ہے کہ اُن لوگوں نے بھی جو کریم النفس تھے اور فیض رسانی پر یقین رکھتے تھے لوگوں کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کیا۔ ابتدائے آفرینش سے کسی ایسی حکومت کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی ہے جس نے سول نظم و نسق کے ذریعہ اس حد تک مطلق العنانیت اور استبدادیت کے اُصولوں پر عمل کیا ہو۔ ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اُس نظم و نسق کو جس سے عسکریت کی شان جھلکتی ہے سول کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ایسا نظام ہے جس میں لوگوں کو اپنے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کا اتنا حق بھی حاصل نہیں جتنا فوجی حکومت کے ایک سپاہی کو ہوتا ہے۔ قانون سازی کی اعلیٰ ذمہ داری سے لے کر چھوٹی چھوٹی ملازمت تک اُن کا ہر عمل اس اُصول پر مبنی ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب ہم نے سرکاری افسروں کو اس امر کی اجازت دیدی ہے کہ وہ لوگوں کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی مسلسل دخل اندازی کرتے رہیں تو یہ سوچنا فضول ہے کہ ہم قانون کے ذریعے لوگوں کا بالجبر وصولیابیوں اور پریشانیوں کے خلاف تحفظ کر سکیں گے۔ بدقسمتی سے ہم نے ایک منفی اُصول پر عمل کیا۔ ہم نے ہر کام میں دخل اندازی کی، جہاں جہاں عمومی ادارے موجود تھے اُنھیں نظر انداز کیا اور جہاں اُن کی کمی محسوس ہوئی وہاں اُن کی تشکیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔"[2]

1832ء میں ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے جس شخص نے نہایت وثوق کے ساتھ اپنی بات کہی وہ سر جان مالکم تھا جس کا منرو اور الفنسٹن کے ساتھ برطانیہ کی

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی تیسری رپورٹ، 1853ء، صفحات 19 اور 20۔

[2] ہولٹ میکنزی، روداد، مورخہ یکم اکتوبر 1830ء پیراگراف 67۔

ہندوستانی سلطنت کے معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں آنے والے حاکموں میں وہ سب سے زیادہ لائق اور لوگوں کا ہمدرد حاکم تھا۔ اُس نے اپنی بہادری اور کامیابی کی بنا پر مرہٹوں کے ساتھ لڑی جانے والی دو جنگوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اس نے اپنی شرافت اور شفقت کی بنا پر ہندوستان کے سپاہیوں اور عام لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ چوتھائی صدی کی شاندار خدمات کے بعد وہ 1827ء میں الفنسٹن کی جگہ بمبئی کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ چنانچہ 1832ء میں جب ہاؤس آف کامنز کے سامنے اُس نے شہادت دی تو اُس نے اِتنے وثوق اور اعتماد کے ساتھ اپنی بات کہی کہ اُس سے زیادہ تو کیا اُتنے وثوق کے ساتھ بھی اُس کے زمانے یا آئندہ کسی زمانے میں کوئی انگریز شاذ ہی بات کر سکتا تھا۔

"278 - کیا آپ کی رائے میں دیسی حکمرانی کی بدانتظامی کے بجائے ہماری حکومت نے زراعت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگوں کی خوش حالی میں اضافہ کر دیا؟۔

میں ہندوستان کے ہر صوبے کے تعلق سے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں صرف اپنے تجربے کی روشنی میں اس کا جواب دوں گا۔ میرے خیال میں اس تبدیلی سے بہت سی دیسی ریاستوں کے دولت مند، کاروباری اور زراعتی طبقوں کو نہ کوئی فائدہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ دوسری ریاستوں کے لوگوں کو فائدہ ہوا ہو۔ 1803ء میں جب موجودہ ڈیوک آف ولنگٹن کے ساتھ مجھے مرہٹوں کے جنوبی اضلاع میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں میں نے جیسی کاشت اور زمین کی ہر قسم کی پیداوار دیکھی اُس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ خصوصیت کے ساتھ میرا اشارہ اس بڑے علاقے کی طرف ہے جو کرشنا کے کنارے کے پاس واقع ہے۔ پونا جو پیشوا کا دارالسلطنت تھا، ایک دولت مند اور تجارتی شہر تھا اور دکن میں اتنی کاشت ہوتی تھی جتنی کہ ایک غیر زرخیز اور بنجر علاقے میں ہو سکتی تھی......

"جہاں تک مالوے کا تعلق ہے...... چونکہ میرے سپرد اُس علاقے پر قبضہ کرنے اور وہاں کے سول، فوجی اور سیاسی اِنتظامات کی نگرانی کرنے کا کام کیا گیا تھا اس لیے مجھے وہ معلومات حاصل کرنے کے مواقع میسّر تھے جو حکومت کی دستاویزات سے اور دوسرے ذریعوں سے اُس علاقے کے متعلق حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے اس یقین کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا کہ وہاں کے لوگ تجارت سے ناآشنا ہوں گے اور قرض کی سہولتوں کا وجود نہیں ہوگا...... مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ راجپوتانہ۔ بندیل کھنڈ، اور ہندوستان (شمالی ہند) کے علاوہ گجرات کے دولت مند

اور تجارت پیشہ لوگوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے اُجین اور دوسرے شہروں میں بڑی بڑی رقموں کا لین دین ہوتا تھا۔ وہاں کے ساہوکار خوش حال تھے، اچھے کردار کے مالک تھے اور بڑی ساکھ رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ تجارتی مال بھاری مقدار میں صوبے سے گزرا کرتا تھا بلکہ مال کے بیمہ کا کاروبار بھی ہندوستان کے اُس حصے میں پھیلا ہوا تھا جس کو خاص خاص دولت مند لوگ چلایا کرتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ خطرے کے زمانے میں بیمے کی رقم میں اضافہ ہو جاتا تھا......
... میرا خیال ہے کہ اُس علاقے میں ہماری راست حکومت قائم ہو جانے سے تجارتی اور زراعتی مفادات کو اُتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا کہ گزشتہ حکمرانوں اور سرداروں کی اچھی حکومت کی صورت میں ہوتا تھا۔

"جہاں تک مرہٹوں کے جنوبی اضلاع کا تعلق ہے جن کی خوش حالی کا ذکر میں کر چکا ہوں..... میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ علاقے جو کرشنا کے کنارے واقع ہیں اور پٹ وردھن اور دوسرے سرداروں کے قبضے میں ہیں ان کی تجارتی اور زراعتی خوش حالی کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ وہاں کا انتظامی ڈھانچہ ہے۔ کچھ دور ایسے بھی آئے کہ وہاں بالجبر وصولیابیاں بھی کی گئیں۔ لیکن بہ اعتبار مجموعی اُن کا طریقہ نرم اور مشفقانہ ہے، وہاں تبدیلیاں بہت کم ہوتی ہیں، ہندو زراعت کے متعلق پوری معلومات رکھتے ہیں اور اُس سے اُنھیں دلی لگاؤ ہے، نظم و نسق کے کچھ شعبوں کے متعلق اور خاص طور سے گانوؤں اور قصبوں کی خوش حالی میں اضافہ کرنے کے متعلق وہ ہم سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں یا کم سے کم ہم سے بہتر اندازسے اُن پر عمل کرتے ہیں، مالدار لوگوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ پونجی جمع کرنے کا رواج بڑھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جاگیردار اپنی جاگیروں میں رہتے ہیں اور اُن علاقوں کی دیکھ بھال اُن باحیثیت لوگوں کے سپرد ہے جو وہیں زندگی گزارتے ہیں اور وہیں مرتے ہیں اور اُن کے وارث اُن کے بیٹے یا قریبی عزیز ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ کبھی کبھی من مانے انداز سے روپیہ وصول بھی کر لیتے ہیں۔ پھر بھی وہ جو روپیہ خرچ کرتے ہیں اور جو روپیہ وصول کرتے ہیں وہ ملک کے اندر رہتا ہے۔ خوش حالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گانوؤں اور دوسرے دیسی اداروں کی امداد کی جاتی ہے اور ہماری حکومت کے مقابلے میں تمام طبقوں کو بہت زیادہ روزگار کے مواقع ملتے ہیں۔"[1]

---

[1] وہ شہادت جو سلیکٹ کمیٹی وغیرہ کے سامنے پیش ہوئی، 1832ء، جلد دوم، صفحات 23 اور 31۔

چنانچہ سر جان مالکم اور دوسرے اہم گواہوں نے جن باتوں کی طرف سلیکٹ کمیٹی کی توجہ دلائی اُن میں سے پہلی بات تو یہ تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کو خود اپنے ہی ملک میں اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ سال بہ سال ہندستان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملک کے باہر بھیجا جاتا ہے۔ کچھ سال پہلے اس کا علاج بشپ ہیبر نے یہ تجویز کیا تھا کہ اپنے ملک کے انتظام میں زیادہ لوگوں کو شامل کیا جائے اور ہندوستان کی آمدنی ہندوستان میں خرچ کی جائے جہانتک پہلی بات کا تعلق تھا منرو، الفنسٹن اور بین ٹنک نے لوگوں کو کچھ نہ کچھ سہولت بہم پہنچائی تھی 1833ء میں میں جب کمیٹی کے چارٹر کی تجدید پر غور کیا جا رہا تھا برطانوی پارلیمنٹ نے ایکٹ میں اُس مشہور دفعہ کا اضافہ کر دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ نسل اور مذہب کے امتیاز کے بغیر تمام عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر کیا جائے گا۔ لیکن دوسری بات کی حد تک پارلیمنٹ نے ہندوستان کے لوگوں کی شکایت دور کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ حالانکہ اپریل 1834ء میں کمپنی کو تجارت کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ کمپنی کے مشترکہ سرمائے پر $10\frac{1}{2}$ فی صدی کی شرح سے ہندوستان کی آمدنی میں سے سود ادا کیا جائے گا۔ 1858ء میں جب سلطنت کمپنی سے شاہ انگلستان کو منتقل ہوئی تو ایک اور ممتاز و نمایاں انگریز نے ہندوستان کے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

جیسا کہ ہم اکیسویں باب میں دیکھ چکے ہیں سر جارج ونگیٹ نے بمبئی کے بندوبست میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ اُس کو ایک ناقص نظام کے تحت کام کرنا پڑا تھا لیکن اس نے ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ کام کر کے اس میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اُس نے تیس سال تک ہندوستان کے لوگوں کے درمیان کام کیا تھا اور ہندوستان کے متعلق بہت سی معلومات اور تجربے حاصل کرنے کے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن واپس گیا تھا۔ حکومت نے اُس کو اعزاز بخشا اور عام لوگوں نے اُسے بمبئی نگر کی مال گزاری کے نظام کا سربراہ تسلیم کیا۔ لیکن انگلستان اور ہندوستان کے مالی رشتوں سے اُسے تکلیف ہوتی تھی۔ جب سلطنت کا انتظام شاہ انگلستان کے ہاتھ میں آگیا تو اُس نے اپنے ہم وطنوں سے درخواست کی کہ نئے انتظامات میں ہندوستان کے ساتھ زیادہ منصفانہ برتاؤ کیا جانا چاہیئے۔

اگر ہم نے ہندوستان پر دیسی لوگوں کے بجائے خود اپنے لیے حکومت کی ہے تو خدا اور انسان دونوں کی نظروں میں ہم گنہگار ہیں کہ ہم نے اُس حکومت کے اخراجات برداشت کرنے میں

کوئی حصہ نہیں لیا۔ جس حد تک ہندوستان کی پالیسی کی تشکیل میں برطانوی مفادات کا حصہ ہے انصاف کی رو سے اُس حد تک اخراجات ہمیں برداشت کرنے چاہیے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا جس کی بنا پر ہم ہندوستان کے مقروض ہوگئے ہیں۔ مدتوں سے یہ قرض ہماری طرف واجب الادا ہے اور اب اس کو چکانا چاہیئے۔ انگلستان طاقت ور تھا اور ہندوستان اس کے رحم و کرم پر تھا اور کمزور کسی طرح طاقت ور کو ادائگی پر مجبور نہیں کر سکتا۔

"جہاں تک ہندوستان کے لوگوں کے حالات پر اس کے معاشی اثرات کا تعلق ہے انگلستان کو ادا ہونے والا خراج ہماری پالیسی کا سب سے زیادہ قابل اعتراض پہلو ہے۔ ایک ملک سے وصول کر کے اُسی ملک میں خرچ کیے جانے والے محاصل کے اثرات اُن محاصل کے اثرات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو ایک ملک سے وصول کیے جائیں اور دوسرے ملک میں خرچ کیے جائیں۔ پہلی صورت میں لوگوں سے وصول کیے جانے والے زیادہ تر محاصل آبادی کے اُس حصّے کو ادا کر دیے جاتے ہیں جو سرکاری ملازمت میں ہوتا ہے۔ جب وہ لوگ روپیہ خرچ کرتے ہیں تو محنت کش طبقوں کو وہ رقم واپس مل جاتی ہے جو محصول کی صورت میں اُن سے وصول کی گئی تھی۔ اُن کی وجہ سے تقسیم کا انداز تو بدل جاتا ہے لیکن قومی آمدنی کا نقصان نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُن ترقی یافتہ اور متمدن ملکوں میں جہاں انسان کی پیداواری صلاحیت میں مشینوں اور قدرتی طاقتوں کے مناسب استعمال سے اضافہ ہو جاتا ہے بڑے سے بڑے محاصل کا بھی زیادہ بوجھ لوگ محسوس نہیں کیا کرتے ہیں۔ لیکن وہ صورت حال بالکل مختلف ہوتی ہے جب محاصل کے ذریعے وصول ہونے والا روپیہ اُس ملک میں خرچ نہ کیا جائے جہاں سے وہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں محاصل کے معنی صرف یہ نہیں ہوتے کہ قومی آمدنی کا ایک حصہ شہریوں کے ایک طبقے سے دوسرے طبقے کو منتقل کر دیا گیا بلکہ تمام تر رقم اُس ملک کے لیے گم ہو جاتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے جس ملک سے وہ وصول کی گئی تھی۔ جہاں تک قومی پیداوار پر اُس کے اثرات کا تعلق ہے ایک رقم دوسرے ملک کو منتقل کر دینے اور اُسکو سمندر میں پھینک دینے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بہر حال اُس کا کوئی حصہ اُس ملک کو کسی صورت واپس نہیں ملے گا جہاں سے وہ وصول کیا گیا ہے۔ ہم ابھی تک ہندوستان سے جو خراج حاصل کرتے رہے ہیں اُس کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہے۔"

"ہندوستانی خراج کو چاہیئے انصاف کے پیمانے سے ناپا جائے یا ہمارے حقیقی مفاد کی روشنی میں دیکھا جائے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ انسانیت، سمجھداری اور معاشی سائنس کے مسلّمہ

کلیات کے منافی ہے۔ چنانچہ عقل مندی اس میں ہے کہ حکومت ہند کے انگلستان میں ہونے والے ایسے اخراجات کی آئندہ شاہی خزانے سے ادائیگی کا انتظام کیا جائے جن کو حقیقت میں خراج کا نام دیا جا سکے یہ اخراجات مندرجہ ذیل ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مشترکہ سرمائے کا منافعہ، انگلستان میں حاصل کیے جانے والے قرضوں کا سود، حکومت ہند کے گھریلو محکمے (یا اُس محکمے کے جو انگلستان میں واقع تھا) کے افسروں کی تنخواہیں اور عملے اور عمارتوں پر ہونے والا خرچ، ہندوستان کی فوجی اور سول ملازمتوں کے اراکین جب انگلستان میں ہوں تو اُن کی تنخواہوں اور پینشن پر ہونے والا خرچ، ہندوستان میں مقیم برطانوی فوج کے تعلق سے ہونے والا ہر طرح کا خرچ اور ہندوستان کو فوج بھیجنے اور وہاں سے واپس بلانے کے اخراجات کا ایک حصّہ۔"

"اگر ہندوستان پر سے خراج کا یہ بھاری بوجھ ہٹا دیا جائے اور اس ملک میں وصول ہونے والے تمام تر محاصل وہیں خرچ ہونے لگیں تو اُس کی آمدنی میں ہماری توقع سے کہیں زیادہ اضافے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔"[1]

اس اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے وقت گھریلو اخراجات تین ملین تھے لیکن اُس عظیم ملکہ کی موت کے وقت وہ بڑھ کے سولہ ملین ہو چکے تھے۔ کسی ملک کے وسائل میں سے دولت کا اتنا زیادہ نکاس دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند ملک کو بھی تباہ کر سکتا تھا۔ اس نے ہندوستان کو بار بار پڑنے والے، ملک گیر اور ہلاکت خیز قحطوں کے ملک میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایسے قحط جن کی نظیر ہندوستان یا دنیا کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔

---

[1] ونگیٹ، OUR FINANCIAL RELATIONS WITH INDIA، لندن، 1859ء، صفحات 56 - 64۔

باب 24

ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی ۔ 1837ء کا قحط

1833ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت جو مالی انتظامات کیے گئے تھے اُن کا ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن اُس ایکٹ کی کچھ دوسری اہم دفعات پر بھی ہمیں غور کرنا چاہیئے۔

1802ء اور 1803ء میں لارڈ ویلزلی نے شمالی ہندوستان میں جو فتوحات کی تھیں اور علاقوں پر قبضہ کیا تھا اُن کی وجہ سے صوبہ بنگال کے رقبے میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ان علاقوں کو بنگال سے علیحدہ کر کے ایک نئے صوبے کی شکل دیدی گئی۔ اس کے بعد ہندوستان میں تین کے بجائے چار صوبے ہو گئے اور پچھلے باب میں دیے ہوئے آمد و خرچ کے نقشے میں شمالی ہندوستان کو اس وقت سے ایک علیحدہ صوبے کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے۔

وارن ہسٹنگز کے زمانے سے گورنر جنرل اصطلاحی معنی میں بنگال کا گورنر جنرل ہوا کرتا تھا جس کو دوسرے صوبوں کی نگرانی کے اختیارات حاصل ہوا کرتے تھے۔ لیکن 1834ء میں اس ایکٹ کی رو سے بنگال کے گورنر جنرل کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا اور اس طرح لارڈ ولیم بینٹنک ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ ابھی تک ہر صوبہ اپنے لیے علیحدہ ریگولیشن بنایا کرتا تھا۔ اب گورنر جنرل ان کونسل کو ایسے ایکٹ بنانے کا اختیار دیدیا گیا جن کا نفاذ پورے ہندوستان میں ہوتا تھا۔ ابھی تک کونسل گورنر جنرل کے علاوہ چار اراکین پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ اب اس میں پانچویں ممبر کا اضافہ کر دیا گیا۔ جو ممبر قانون کہلاتا تھا۔ پہلے ممبر قانون کی حیثیت سے میکالے ہندوستان بھیجا گیا۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ ہندوستان کے قانونوں کے مسودے تیار کرنے کے لیے قانون کے کمشنر مقرر کرے۔ قانون کے کمشنروں کے صدر کی حیثیت سے میکالے نے

مشہور تعزیرات ہند کا مسودہ تیار کیا جس کو پچیس سال بعد قانون کی شکل دیدی گئی۔

یورپ کے لوگوں کے ہندوستان میں آباد ہونے پر جو بندشیں عاید کی گئیں تھیں وہ ہٹادی گئیں۔ کلکتہ کے بشپ کے علاوہ بمبئی اور مدراس میں بشپ مقرر کیے گئے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر جن لوگوں کو ہندوستان کی سول سروس کے لیے نامزد کرتے تھے اُن کے لیے انتظام کیا گیا کہ ہندوستان جانے سے پہلے ہیلی بری کالج میں اُن کو تعلیم دی جائے۔ ہندوستان میں کمپنی کے نظم ونسق کی نگرانی کے لیے شاہ انگلستان کے مقرر کردہ کمشنروں کو برقرار رکھا گیا جو 1784ء کے پٹ کے انڈیا ایکٹ کی رو سے مقرر کیے جاتے تھے۔

کمپنی کے لائق ترین ملازموں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کے اشتراک کے بغیر ہندوستان پر مناسب انداز سے حکومت کرنا ممکن نہیں ہے اور جیسا کہ پچھلے ابواب میں کہا جا چکا ہے منرو، الفنسٹن اور بینٹنک نے محکمہ عدالت میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا ذمہ دار عہدوں پر تقرر کیا تھا۔ فراخ دلی کی اس پالیسی کا اعلان اُس ایکٹ کی ایک دفعہ میں کیا گیا تھا جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"از روئے قانون ہذا مذکورہ علاقوں کا کوئی باشندہ یا وہاں رہنے والا کوئی شخص، جو ملک معظم کی پیدائشی رعایا ہو، اپنے مذہب، جائے پیدائش، نسل، رنگ یا اُن سے کسی کی بنا پر کمپنی کے تحت کوئی منصب، عہدہ یا روزگار حاصل کرنے سے باز نہیں رکھا جائے گا۔"

جب یہ ایکٹ منظور ہوا تھا اس زمانے میں میکالے ہاؤس آف کامنز کا رکن تھا۔ اس دفعہ کے متعلق اُس نے جو تقریر کی تھی اُس کے حوالے اکثر دیے جا چکے ہیں لیکن ہمارے خیال میں وہ اس قابل ہے کہ اُسے پھر پیش کیا جائے۔

قانون کے اس مسودے کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کے متعلق اُن حالیہ تبدیلیوں کے پیش نظر میں چند الفاظ کہنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں جو کہیں اور رونما ہوئی ہیں۔ میرا اشارہ اس دفعہ کی طرف ہے جو سمجھ داری، جذبہ فیض رسانی اور شرافت پر مبنی ہے اور جس کی رو سے ہماری ہندوستانی سلطنت کا کوئی باشندہ اپنے رنگ نسل یا مذہب کی بنا پر کسی عہدے سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس خطرے کے باوجود کہ مجھے اُس نام سے پکارا جا سکتا ہے جس کو خود غرض اور تنگ ظرف لوگ ملامت و دشنام سمجھتے ہیں۔ اس خطرے کے باوجود کہ وہ مجھے فلسفی کے نام سے پکاریں مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں پوری زندگی اِس بات پر فخر کروں گا کہ اُس بل کی تیاری میں میرا بھی

ہاتھ تھا جس میں یہ دفعہ شامل ہے۔

"برنیر کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے بدبخت ظالموں کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ اپنی رعایا میں کسی ممتاز و نمایاں شخص کی صلاحیتوں اور جرات سے خائف ہوا کرتے تھے اور اُس کو قتل کروانے کی ہمت خود میں نہیں پاتے تھے تو اُس کو روزانہ تھوڑا تھوڑا پوست دینے لگتے تھے جو افیم سے تیار کیا جاتا تھا۔ پوست کھانے کا اثر یہ ہوتا تھا کہ کچھ مہینے میں اُس بدبخت انسان کی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں ختم ہو جاتی تھیں اور وہ ایک بے بس پاگل بن کر رہ جاتا تھا۔ یہ قابل نفرت طریقہ، جو قتل سے زیادہ خوفناک تھا، ان لوگوں کے شایان شان تھا جو اُس پر عمل کیا کرتے تھے۔ انگریز قوم کی حد تک اس کو مثال نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہم اُس پوری قوم کو پوست کھلانے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے جس کو خدا نے ہماری حفاظت میں دیا ہے۔ ہم ان کے جسموں اور ذہنوں کو ماؤف کر کے اُنھیں زیادہ اطاعت گزار بنانا نہیں چاہتے۔ اس طاقت کی حقیقت ہی کیا ہے جس کی بنیاد گناہ، لاعلمی اور دُکھ پر قائم ہو اور جس کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں اُن مقدس فرائض سے روگردانی کرنی پڑے جو حاکم کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ایسی قوم کی حیثیت سے جسے سیاسی آزادی اور روشن دماغی کی نعمت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ میسر ہے اس قوم کی طرف ہمیں اپنے فرائض پورے کرنے چاہئیں جس کو تین ہزار سال کی مطلق العنانی اور توہم پرستی نے ذلیل و خوار بنا دیا ہے۔ ہماری آزادی و تہذیب سے کیا فائدہ اگر ہم یہ برداشت نہ کر سکیں کہ دوسرے انسان بھی آزادی و تہذیب کی دولت سے مالامال ہوں۔ کیا ہم ہندوستان کے لوگوں کو علم سے اس لیے محروم رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اطاعت کرتے رہیں؟۔ کیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم اُن کے دلوں میں توقعات پیدا نہیں کرے گی؟۔ کیا ہمارا یہ ارادہ ہے کہ اُن کے دلوں میں توقعات پیدا کی جائیں لیکن اُن کے جائز مطالبات پورے نہ کیے جائیں؟ کیا کسی میں اتنی ہمت ہے کہ اُن سوالوں کے جواب میں "ہاں" کہہ سکے۔ لیکن ان سوالوں میں سے ایک کے جواب میں ہر اُس شخص کو "ہاں" کہنا پڑے گا جس کا خیال ہے کہ دیسی لوگوں کو اعلیٰ عہدوں سے ہمیشہ محروم رکھا جا سکتا ہے۔ میں خائف نہیں ہوں۔ ہمارا فرض واضح ہے۔ یہی راستہ سمجھداری، قومی خوشحالی، اور قومی وقار کا راستہ بھی ہے۔

ہماری ہندوستانی سلطنت کا مستقبل گہرے اندھیروں میں چھپا ہوا ہے۔ ایک ایسی ریاست کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے جس کی مثال تاریخ نہیں پیش کر سکتی

اور جو اپنے قسم کے ایک علیحدہ سیاسی مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن قوانین کی بنا پر اُس کا ارتقا یا زوال ہو سکتا ہے ہم اُن سے واقف نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کا اجتماعی ذہن ہماری حکومت میں نشو و نما پائے اور رفتہ رفتہ ہمارا نظم و نسق اُس کے لیے ناکافی ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اچھے نظم و نسق کے ذریعے اپنی رعایا کی تربیت کر سکیں اور بہتر حکومت کی صلاحیت اُن میں پیدا کر سکیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یورپین علوم کی تعلیم پانے کے بعد وہ کسی آئندہ زمانے میں یورپین اداروں کا مطالبہ کر سکیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا دن کبھی آبھی پائے گا۔ لیکن میں اُسے دور رکھنے یا پیچھے دھکیلنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گا۔ وہ دن کبھی آئے مگر وہ جب بھی آئے گا تو انگلستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ قابل فخر دن ہو گا۔ یہ واقعہ کہ ایک عظیم قوم کو غلامی اور توہم پرستی کے گہرے کھڈ میں ہم نے پایا اور اُن پر اس انداز سے حکومت کی کہ اُن میں شہری حقوق پانے کی خواہش اور صلاحیت پیدا ہو گئی ایسا شاندار کارنامہ ہو گا کہ اُس پر ہم جتنا بھی فخر کریں وہ کم ہے۔ طاقت ہمارے ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔ غیر متوقع حادثات ہماری پالیسی کی سوچی سمجھی اسکیموں میں خلل ڈال سکتے ہیں۔ فتح شکست میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ لیکن کچھ فتوحات ایسی بھی ہوتی ہیں ایک ایسی سلطنت بھی ہوتی ہے جو زوال کے فطری اسباب سے مستثنیٰ ہوتی ہے۔ وہ فتوحات وحشت پر عقل کی فتوحات ہیں اور وہ سلطنت ہمارے فنون، ہمارے اخلاق، ہمارے ادب اور ہمارے قوانین کی لافانی سلطنت ہے۔[1]

میکالے کی تمام تقریروں اور تحریروں کی طرح مندرجہ بالا تقریر میں بھی دھوپ چھاؤں کا سا سماں نظر آتا ہے اُس کا یہ کہنا کہ مغل شہنشاہ "بدبخت ظالم" تھے یا "تین ہزار سال کی مطلق العنانی اور توہم پرستی" کا ذکر یا یہ کہنا کہ ہندوستانی لوگ "غلامی اور توہم پرستی کے گہرے گڑھے" میں تھے، یہ

---

[1] میکالے کی تقریر۔ مندرجہ بالا تقریر 10 جولائی 1833ء ایوان میں اُس وقت کی گئی جب بہت کم اراکین موجود تھے۔ اس واقعہ سے اُن لوگوں کو تعجب ہو سکتا ہے جنھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ بدھ کے دن جب ہندوستان کے متعلق سوال پوچھا جانے والا ہو تو لوگ پوری تعداد میں اس وقت بھی نہیں آئیں گے اگر ہورتین بیٹس کو جواب سسرو کی طرف سے دیا جانے والا ہو۔ حالانکہ لوگ کم تھے پھر بھی لارڈ جان رسل، پیل اور اُوکونل جیسے پارلیمانی امام موجود تھے۔

حکومت کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی اس لیے اصولوں کے بجائے محض فروعاتی تبدیلیوں کے ساتھ وہ جیت جایا کرتی تھی اسں بل کو حکومت اور ملک کی پوری حمایت حاصل تھی اور وہ قانون بن گیا۔"

LIFE OF LORD MACANLAY. ٹریولیین،

ظاہر کرتا ہے کہ عام انگریزوں کی طرح وہ بھی اُن قوموں کے رسم و رواج، اداروں اور کارناموں کو سمجھنے سے قاصر تھا جو انگلستان کے باہر آباد تھیں۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نئی پالیسی جس کی میکالے نے زور دار الفاظ میں وکالت کی تھی 1833ء کے انگلستان کی پالیسی تھی اور وہ انگریز جنھوں نے اصلاحات کا ایکٹ منظور کیا تھا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں اُس کو رائج کیا جائے اور اُس پر عمل کیا جائے۔ اُس زمانے کے انگریزوں کو اجارہ داری پسند نہیں تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ حقوق صرف کچھ لوگوں تک محدود رہیں۔ جو لوگ ابھی حق رائے دہندگی کی توسیع کر چکے تھے وہ یہ کیسے پسند کر سکتے تھے کہ ایک پوری قوم کو اُن کے ملک میں اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا جائے۔ محکوم قوم کے ساتھ بھی انصاف کرنے کا خیال تمام سنجیدہ مصلحین اور انگلستان کے عام لوگوں کے ذہنوں میں تھا مندرجہ بالا دفعہ روح عصر کی دین تھی یعنی اُس پالیسی کا مظہر تھی جو ہندوستان کے تعلق سے برطانوی قوم اختیار کرنا چاہتی تھی۔

اگر پچھلے ستّر سال میں بھی اُس عاقلانہ اور فراخ دلانہ منصوبے پر عمل کیا گیا ہوتا تو اُس سے ہندوستان کو بہت فائدہ ہوتا۔ اگر ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کے انتظام میں مناسب حصہ دیا گیا ہوتا تو آج انگریزی راج زیادہ ہر دل عزیز اور کامیاب ہوتا۔ اگر ہندوستان کی آمدنی کا زیادہ بڑا حصہ لوگوں کو واپس مل جاتا اور اُس سے اُن کی تجارت اور صنعت بارور ہو سکتی تو لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہوتی۔ لیکن جس ملک میں لوگوں کی آواز نہیں ہوتی وہاں اجارہ داری مشکل سے ختم ہو سکتی ہے اور پچھلے ستّر سال میں اُس "سمجھداری، جذبۂ فیض رسانی اور شرافت پر مبنی" دفعہ کی عملاً خلاف ورزی کی گئی جس کی میکالے نے بڑی تعریف کی تھی۔

ہندوستان کے ایک وائسرائے نے آدھی صدی بعد لکھا تھا "ایکٹ منظور ہونے کے فوراً بعد حکومت نے اُس کے نفاذ سے بچنے کے لیے بہانے تلاش کرنے شروع کر دیے۔ اُس ایکٹ کی دفعات کی رو سے جن کا تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے اُس بڑھتے ہوئے طبقے نے غور سے مطالعہ کیا ہے اور ازبر کر لیا ہے حکومت جن کی ترقی کی ہمت افزائی کرتی ہے حالانکہ اُن کے موجودہ افراد کی توقعات پوری نہیں کی جاتی ہیں۔ جب کسی دیسی آدمی کا حکومت کسی ایسے عہدہ پر تقرر کرتی ہے جو پہلے معہودہ ملازمین کے لیے وقف تھا تو اُس کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس امر کی توقع رکھے کہ رفتہ رفتہ ترقی پا کر اس ملازمت کے اعلیٰ ترین عہدے حاصل کر سکےگا۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس قسم کے توقعات نہ پورے ہو سکتے ہیں اور نہ کبھی پورے ہوں گے۔ ہمارے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ہم اُنھیں ملازمت دینے سے انکار کر دیں یا دھوکہ دیں اور ہم نے اُس طریقہ کا انتخاب کیا جو زیادہ سیدھا اور سچا تھا۔ ہندوستانیوں پر انگلستان میں ہونے والے مقابلے کے امتحان کے طریقہ کا اطلاق اور اُمیدوار کی عمر میں کمی، جو حال میں کی گئی ہے، ایکٹ کو غیر مؤثر بنانے اور اُس کی تردید کرنے کے کھلے ہوئے بہانے ہیں جن پر بامقصد عمل کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ تحریر خفیہ ہے اس لیے بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیال میں انگلستان اور ہندوستان کی دونوں حکومتیں ابھی تک اس الزام کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکی ہیں کہ جو وعدے کیے گئے تھے اُن کی خلاف ورزی کی ہر امکانی کوشش وہ کر رہی ہیں[1]۔"

1833ء میں جب ایکٹ بنا تھا اُس وقت یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی اور جس کو برطانوی قوم نے اتنی شد و مد کے ساتھ منظور کیا تھا بلکہ اُس وقت تو کہا تھا کہ بلا امتیاز نسل، مذہب، رنگ ہندوستانیوں میں تعلیم کو فروغ دینے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اُن کے ملک کی اعلیٰ ملازمتوں کے لیے بھرتی کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ انگریز انصاف کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں ایک انصاف پسند اور راست باز قوم کے تحت ترقی کرنے اور حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کی توقعات جنم لینے لگی تھیں۔

اس کے چار سال بعد یعنی 1837ء میں ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں آیا جب انگریزی راج نے ہندوستانیوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی کا مظاہرہ کیا ہو اور اُنھیں زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہو اور جواب میں لوگوں نے زیادہ عزّت کی ہو اور اُس

---

[1] لارڈ لٹن کی 1878ء کی خفیہ روداد جس کا حوالہ دادابھائی نوروجی نے POVERTY AND UN-BRITISH RULE IN INDIA میں دیا۔ 1901ء، صفحات 317 اور 318۔ "ایکٹ کی تردید" اتنے مؤثر انداز سے کی گئی ہے کہ آج بھی سول، فوج، تعمیرات عامہ، پولیس، طبی محکمے، تعلیمی محکمہ، ڈاک تار کے محکمے اور جنگلات کے محکمے کے تمام اعلیٰ عہدے اُسی طرح یوروپینوں کے لیے وقف ہیں جیسے 1833ء کے ایکٹ سے پہلے تھے۔ پارلیمنٹ میں دیئے جانے والے ایک جواب کی رو سے جو 1892ء میں دیا گیا تھا کہ اُن تمام ملازمتوں میں جن میں سو پاؤنڈ سالانہ یا اس سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ یوروپیوں کی تنخواہوں اور پنشنوں کی مجموعی رقم چودہ ملین سالانہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ملین یوریشین لوگوں کو ملتے ہیں اور ہندوستان کے لوگوں کو صرف ساڑھے تین ملین سالانہ ملتے ہیں جن میں زیادہ تر چھوٹے موٹے عہدوں پر کام کرتے ہیں۔

کی طرف زیادہ وفاداری دکھائی ہو۔ لارڈ ویلیزلی، لارڈ ہسٹنگز اور لارڈ ایمہرسٹ کی جنگیں ختم ہو چکی تھیں اور ملک میں امن تھا۔ نظم ونسق کی غلطیوں کا بڑی حد تک تدارک کیا جا چکا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کو اپنے ملک کے انتظام میں تھوڑا بہت حصہ لینے کی دعوت دی جا چکی تھی۔ ابھی لوگوں کو مدراس، بمبئی اور بنگال میں منرو، الفنسٹن اور بینٹنک کا زمانہ یاد تھا۔ ہندوستان میں انگریزی کی تعلیم کو فروغ دینے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ غیر ضروری اخراجات میں تخفیف کی جا چکی تھی اور ہندوستان کا میزانیہ بچت ظاہر کر رہا تھا۔ مال گزاری کے ظالمانہ مطالبے میں کمی کی جا چکی تھی اور شمالی ہندوستان میں برڈ اور بمبئی میں وینگٹ طویل مدت کے لیے زیادہ ہمدردی کے ساتھ بندوبست کر رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور اب وہ حکمراں کے فرائض ادا کر رہی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کے لوگوں سے وعدہ کر چکی تھی کہ بلا امتیاز مذہب و رنگ اپنے ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر ان کی تقرری عمل میں آئے گی۔ برطانوی سلطنت کے تخت پر ایک نوجوان ملکہ بیٹھ چکی تھی جس نے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں امید و توقع کے چراغ جلا دیے تھے جو ایک عورت کی مشفقانہ مآل اندیشی مشرقی لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ جلایا کرتی ہے۔

اگر انتظامی اصلاحات کے لیے یہ دور شاندار ثابت ہوا تو ادب و تہذیب کے لیے بھی کم شاندار نہیں تھا۔ میکالے نے ہندوستان کو ادبی وسیع المشربی سے روشناس کرایا۔ ہورس ہیمن ولسن (HORACE HAYNAN WILSON) ایک نمایاں مستشرق تھا اور بعد میں نمایاں مؤرخ بن گیا۔ الفنسٹن بہت پڑھا لکھا آدمی تھا اور اپنی مشہور تاریخ ہند شائع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ برگس ہندوستان کے زمین کے محصول کے متعلق اپنی اہم کتاب شائع کر چکا تھا اور فرشتہ کے ترجمے میں مصروف تھا۔ کرنل ٹاڈ (COLONEL TOD) کو راجپوتوں کے ساتھ اتنی زیادہ ہمدردی تھی کہ جذباتی طور سے وہ راجپوت بن گیا تھا۔ اُس نے راجستھان کی وہ تاریخ لکھی جس میں ایک رومانی کہانی کا لطف اور کشش پائی جاتی ہے۔ گرانٹ ڈف مرہٹوں کی اُس عظیم تاریخ کے لکھنے میں مصروف تھا جس کی افادیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس نسل کے انگریزوں کے علاوہ نہ کبھی انگریزوں نے ہندوستان میں اتنی ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا نہ یہاں کے لوگوں کی طرف اتنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُس زمانے کے اہم حاکموں اور مصنفوں نے 1831ء اور 1832ء میں پارلیمانی کمیٹیوں کے سامنے جو شہادتیں دیں اُن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہندوستانیوں کی کتنی عزت کرتے تھے اور اُن کے دلوں میں اس ملک کے لوگوں کی کتنی قدر و قیمت تھی۔

چیپلن نے کہا تھا "دیسی لوگوں کے کردار کے متعلق میرا خیال ہمیشہ اچھا رہا ہے میرا خیال

ہے کہ دنیا کے کسی ملک کے باشندوں کے مقابلے میں وہ بہتر ثابت ہوں گے۔"

مدراس سول سروس کے جان سلیون سے سوال کیا گیا "کیا آپ ہندوستانیوں پر اُتنا اعتماد کریں گے جتنا آپ اپنے ہم وطنوں پر کرتے ہیں"

اُس نے جواب دیا "جی ہاں! اگر اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔"

جیمس سودھر لینڈ (JAMES SUTHER LAND) نے جو کلکتہ کے ابتدائی انگریزی اخباروں میں ایک اخبار "بنگال ہرکارہ" ایڈیٹر رہ چکا تھا، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے متعلق کہا "وہ اُتنے ہی قابل اعتماد ہیں جتنے دنیا کے لوگ[1]۔"

لوگوں پر اعتماد کے اس جذبے کا جواب بھی پرجوش انداز میں دیا گیا۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں نے، سماجی اور مذہبی مصلحین نے اور ہندوستان کے اُن ممتاز و نمایاں طلبار نے جنھوں نے کلکتہ کے ہندو کالج میں تعلیم پائی تھی، برطانوی ادب و تصوّرات کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور برطانوی کردار اور انگریزی راج پر مکمل اعتماد ظاہر کیا۔ راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج یا ہندوستان میں ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جو خدا کے وجود کا قائل ہے اور خدا پرستی کی تلقین کرتا ہے اور اُس زمانے کی سماجی اور تعلیمی اصلاحات کی حمایت کی۔ لارڈ ولیم بین ٹنک نے بڑے اچھے الفاظ میں اُن کی اُس حمایت کا ذکر کیا ہے جو ستی کی ظالمانہ رسم کو ختم کرنے کے سلسلے میں اُنھوں نے کی تھی۔ اُس کے بعد راجہ انگلستان آگئے اور اُس وقت ہاؤس آف کامنز میں موجود تھے جب لارڈ ولیم بین ٹنک کے اس اقدام کے خلاف پیش کی جانے والی ایک یادداشت زیر بحث آئی اور اُنھیں اس سے بڑا اطمینان ہوا تھا کہ حکومت ہند کے فیصلے کی توثیق برطانوی پارلیمنٹ نے بھی کر دی تھی۔ برطانوی کردار اور برطانوی حکومت پر جس اعتماد نے راجہ رام موہن رائے میں اتنا جوش پیدا کر دیا تھا اُس نے ہزاروں اُن نوجوانوں میں بھی جوش پیدا کر دیا جو نئے اسکولوں اور کالجوں سے نکلے تھے، جذبہ اصلاح سے متاثر ہوئے تھے اور جن کے دل مغربی ادب و تصوّرات کی محبت سے لبریز تھے۔

ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے وقت چونکہ انگلستان نے فراخ دلی اور اعتماد کی پالیسی اختیار کی تھی اس لیے ملکہ کی ہندوستانی رعایا میں وفاداری اور اطاعت کا شدید جذبہ پایا جاتا تھا۔

---

[1] چیپلن، سلیون اور سودھر لینڈ کی شہادت جو 1931ء اور 1932ء میں دی گئی۔

ملکہ کے طویل زمانۂ حکومت کے اختتام تک اگر فراخ دلی اور اعتماد کی یہ پالیسی برقرار رہتی تو اس سے ہندوستان اور انگلستان دونوں کا بھلا ہوتا۔ برطانوی قوم نے اپنے ذمے جو کام لیے ہیں اُن میں سب سے مشکل کام ہندوستان کا نظم ونسق چلانا ہے اور اس کو بحسن وخوبی پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کا اشتراک حاصل کیا جائے اور اُن پر اعتماد کیا جائے۔

ملکہ جس سال تخت پر بیٹھی اُسی سال ہندوستان کے نظم ونسق کی دشواریاں سامنے آنے لگیں۔ لارڈ ویلزلی کی جنگوں کے بعد 1803ء اور 1804ء میں بمبئی اور شمالی ہندوستان میں قحط پڑ گئے تھے۔ 1813ء میں بمبئی میں ایک اور قحط پڑا۔ 1807ء، 1823ء اور 1833ء میں مدراس میں قحط پڑ چکے تھے جہاں بندوبست بڑے ظالمانہ انداز سے کیا گیا تھا۔ ملکہ کی حکومت کے پہلے سال میں شمالی ہندوستان کو جہاں کا بندوبست بھی اُتنے ہی ظالمانہ انداز سے کیا گیا تھا، ایک ایسے شدید اور وسیع پیمانے پر پڑنے والے قحط نے تباہ وویران کر دیا جس کی مثال اُنیسویں صدی پیش نہیں کر سکتی۔ رابرٹ مرٹنس برڈ کا نیا بندوبست ابھی مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ لوگوں کے پاس وسائل نہیں تھے اور وہ قرض کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ 1837ء میں بارش نہیں ہوئی جس کی وجہ سے یہ تباہ کن قحط پڑ گیا۔

جان لارنس نے، جو بعد میں لارڈ لارنس کے نام سے مشہور ہوا۔ لکھا تھا "ہوڈل اور پلول کے پرگنوں میں جو تباہی اور بربادی دیکھنے میں آئی تھی ایسی تباہی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی"۔ بے شمار لوگ فاقوں کا شکار ہو گئے۔ اُن کی گنتی کون کرتا۔ کانپور میں ایک بڑا عملہ سڑکوں اور دریا سے لاشیں ہٹانے کے کام پر لگایا گیا تھا۔ فتح پور اور آگرہ میں بھی اسی قسم کے اقدامات کرنے پڑے تھے۔ لاکھوں انسان گمنام گانوؤں میں مر گئے جن کی کسی کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ راستوں میں لاشیں پڑی رہتی تھیں۔ نہ کوئی دفن کرنے والا تھا نہ جلانے والا۔ اُنہیں جنگلی جانور کھایا کرتے تھے۔

چنانچہ نئے دورِ حکومت کی ابتدا میں ہندوستان کے نظم ونسق کی دشواریوں کا اندازہ ہو گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ اس ملک کے لوگ کتنے غریب ہیں اور اُنھیں کتنے دُکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس دورِ حکومت میں سندھ اور پنجاب، اودھ اور صوبۂ متوسط، برما اور بلوچستان پر قبضہ کر کے سلطنت کی توسیع کی گئی، برصغیر میں ریلوں کا جال بچھایا گیا اور ڈاک اور تار کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملایا گیا، مختلف